PDFBOOKSFREE.PK

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

اگست 2012

معراج رسول

مسافر

نئی سنسنی خیز داستان کی

چھٹی قسط اندر کے صفحات پر

سسپنس ڈائجسٹ
مدیرہ اعلیٰ عذرا رسول

11 — اِنشائیہ — جون ایلیا — غلامی سے آزادی تک کی ان دیکھی زنجیروں کا قصہ یادگار لمحات کا عکس

12 — آپ کے خط — مدیرہ اعلیٰ — سسپنس کی مجلس مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

20 — فیصلے فقیروں کے — ڈاکٹر ساجد امجد — ماضی کا آئینہ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

49 — نئی دنیا — کاشف زبیر — پرخطر راستوں پر مشتمل موت کے جزیرے میں زندگی کی جولانیاں

63 — آدم خور مگرمچھ — نجمہ مودی — شکار اور شکاری کے مابین کھیلے جانے والا دلچسپ کھیل

68 — کشکول — انوار صدیقی — اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

99 — قرض حسنہ — ایم اے راحت — زرخیز زمین کے ہاتھوں تباہ ہونے والے ایک بے وقوف انسان کا احوال

116 — پردہ نشیں — ملک صفدر حیات — گاؤں کی خاموش فضا میں بہتے لہو کی چیخ و پکار

141 — جنت — تنویر ریاض — حسنی خیر جزائم کی دنیا میں مغرب کا ایک دلچسپ انداز

154 — محفل شعر و سخن — قارئین — آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

157 — ویلنٹائن کے وحشی — نسیم اقبال — گلابی لمحوں میں سرد موسم کا حصار اور متنازع احساسات کا اظہار

174 — مسافر — ناصر ملک — گل و گلزار سے راہ پر خار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

217 — امانت — بابر نعیم — سیاحوں کے روپ میں چند ستم گروں کا قصہ

227 — حضرت سلیمان علیہ السلام — رضوانہ ساجد — ایک عظیم بادشاہ اور عظیم پیغمبر حضرت سلیمانؑ کی روداد حیات

237 — چھوٹا بخش — نجمہ شکور — وہ جیسی کرنی ویسی بھرنی کی کھلی تفسیر

239 — وارث — ثمر عباس — پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے ایک شاطر مجرم کی عیاری

248 — پانچواں آدمی — ایچ اقبال — طبقاتی نظام کی کشمکش، بکھرتی سوچوں کا انتشار اور محبت کے مہربان لمحات کا احوال

000 — کترینہ — ادارہ — دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے، اقتباسات مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کیلئے

انشائیہ

جون ایلیا

آزادی

وقت نے بہت سے دشمنوں کو دوست بنایا ہے اور بہت سے دوستوں کو دشمن۔ سیاسی اور اجتماعی حکمتِ عملی کے تقاضے حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ سیاسی اور اجتماعی حکمتِ عملی تو کیا، خود کائنات ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ یونان کے عظیم ترین فلسفی ہرقلیطاس نے کہا ہے کہ آپ ایک دریا میں دوبار پاؤں نہیں ڈال سکتے۔ ہرقلیطاس نے جو بات کہی ہے وہ اپنی جگہ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ آپ دریا میں ایک بار بھی پاؤں نہیں ڈال سکتے اس لیے کہ آپ جس لمحے دریا میں پاؤں ڈال رہے ہوں گے، اس لمحے کے لاکھویں حصے میں دریا یکسر بدل چکا ہوگا۔

آج کا دشمن آنے والی کل کا بہترین دوست اور آج کا دوست آنے والی کل کا بدترین دشمن ثابت ہوسکتا ہے۔ جو لوگ حقیقت کو، چاہے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، ایک ٹھہرا ہوا پانی سمجھتے ہیں، ان کی رگوں میں جو ہڑ سڑتے ہیں اور ان کے سانس زندگی کی زندگی پرور فضا میں زہر پھیلاتے ہیں۔

ہمارے عہد کی دشمن ترین قومیں آج ایک دوسرے سے افہام و تفہیم کی دانش مندانہ حالت میں گفتگو کر رہی ہیں۔ تاریخ سیاست کے وقتی رویّوں سے کہیں بڑی حقیقت ہے۔ تاریخ عظیم اور جلیل وقت کی نمائندگی کرتی ہے اور تاریخ کے حساب سے پچاس ساٹھ برس لمحوں کے ٹھٹول سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ قوموں کو تاریخ کا اور تاریخ کی خلاق حرکیت کا پوری طرح احترام کرنا چاہیے اور اس کی عظمت کو سلام کرنا چاہیے، مؤدبانہ سلام۔ جو قومیں تاریخ کے شعور کا ثبوت دینے میں ہچکچاہٹ سے کام لیں گی، وہ اپنے قتل نامے کے ''محضر'' پر مہر ثبت کریں گی۔ زندگی کی تمام حقیقتوں کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے لیکن تاریخ، پُرجلال تاریخ کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخ کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے کی جو بھیانک سزا بھگتنی پڑتی ہے اسے ہم میں سے بہت سے لوگ جانتے ہیں۔

پاکستان اور ہندوستان گزشتہ چونسٹھ پینسٹھ برس سے باہمی دشمنی کو اپنا اخلاقی اور سیاسی فرض سمجھتے رہے ہیں۔ تاریخ سے مخول کرنا ان کی عادت بن چکا ہے۔ ہمیں اپنے نقطۂ نظر کے صحیح ہونے پر ہرگز کوئی اصرار نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کی باہمی دشمنی ہی ان دونوں کے پیچیدہ ترین مسئلوں کا حل ہو لیکن میں اور معراج رسول ایک سوال کرنا چاہتے ہیں اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا آپ دونوں کی باہمی دشمنی نے آپ کے پیچیدہ ترین مسئلوں کو حل کیا ہے یا انہیں اور پیچیدہ تر بنا دیا ہے۔ اگر آپ ہمارے اس سوال کا جواب دینے سے گریز کرتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے اس سوال کا خود ہی جواب دینا ہوگا اور وہ جواب یہ ہے کہ آپ ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہیں بلکہ دردناک حد تک خود اپنے دشمن ہیں، آپ دونوں اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے جس سمت میں چلتے اور آگے بڑھتے رہے ہیں، اس سمت کی ہوا میں آپ کے سانسوں کے لیے زہر ہی زہر ہے۔

سمت کے لفظ پر خیال آیا کہ نفرت اور خونریز عداوت اور تباہ کن خیالوں اور رویوں کا سارا کھیل شمال کے آسمان کے نیچے اور شمال کی زمین کے اوپر کھیلا جاتا رہا ہے۔ دوسری سمت کا عیب و ہنر تو بس یہ تھا کہ وہ تھیں اور یہ ہے کہ وہ ہیں۔ ان سمتوں کو یہ بات سن کر ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کی ''اہمیت'' کو نظر انداز کیا جارہا ہے، یہ تو ایک اور ہی بات ہے جو نہایت اذیت کے ساتھ کہی جارہی ہے۔

آسمان شام کے پرندے شمال کی طرف پرواز کر رہے ہیں اور معراج رسول اور میں اسلام آباد، دلی، لاہور اور لکھنؤ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر ان پرندوں کے پروبال پر کیا گزرتی ہے؟ ہمیں بتایا جانا چاہیے کہ آخر کیا گزرتی ہے ان پرندوں کے پروبال پر اور ان کے ساتھ دوسری سمتوں کی طرف پرواز کرنے والے پرندوں کے پروبال پر؟

ہم بہت سوچتے ہیں مگر یہ بات کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہمارے بزرگوں نے انگریزی سامراج کی پتھریلی دھاندلی سے آخر کیوں ٹکر لی تھی۔ انہوں نے اس سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لیے کیوں اپنا لہو بہایا تھا، کیوں اذیتیں اٹھائی تھیں اور کیوں عذاب بھگتے تھے، کیا یہ وہی آزادی تھی جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں؟

©2012

آپ کے خط

عزیز قارئین!

تسلیمات!

ماہِ اگست کا سسپنس آپ کے ذوق مطالعہ کے لیے حاضر ہے۔ سب سے پہلے تو تمام قارئین کو ماہ رمضان المبارک اور قیام پاکستان کی 65ویں سالگرہ کی مبارک باد قبول ہو۔ کیا حسین اتفاق ہے کہ اس سال بھی 1947ء کی طرح اگست اور رمضان المبارک ایک ساتھ ہی آئے ہیں اور 14 اگست اور شب قدر بھی قریباً ساتھ ساتھ ہی ہیں مگر حالات کی ستم ظریفی کہ تب غیروں پر غیروں کے ظلم تھے مگر آج..... اپنوں کا اپنوں کے ساتھ بدتر سلوک..... ایک بدترین مثال..... اسے عوام کا مقدر کہا جائے یا حالات کی سازش..... کہ آج بھی تفرقات نے اس قوم کو ایک نکتے پر سرکوزنہ ہونے دیا۔ بقول شاعر

مست ہیں لوگ سبھی حالِ دگر میں اپنے
گھر کی سی بات نہیں ہے کوئی گھر میں اپنے

حال ہی میں نیٹو سپلائی لائن بحال کردی گئی ہے، ایک بار پھر پارلیمنٹ کی بالادستی کا راگ الاپنے والے حکمرانوں نے پارلیمنٹ کی ''بالادستی'' کا ایک نہایت شاندار مظاہرہ کیا۔ کسی زمانے میں سرسام کی بیماری بڑی موذی تصور کی جاتی تھی، ہمارے حکمرانوں کو بھی یہ "Sir Sam" (انکل سام یعنی امریکا بہادر) کا مرض ایک عرصہ سے لاحق ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس مرض سے شفا نصیب فرمائے۔ جبکہ وزارت عظمیٰ پر بھی چہرہ بدل دیا گیا مگر..... حالات جوں کے توں، اس بدلاؤ سے کیا حاصل جس میں کوئی کمال نہ ہو۔ وطن عزیز میں آج کل کچھ عجیب حالات چل رہے ہیں۔ اللہ ہماری ملک اور قوم پر اپنا رحم اور فضل وکرم عطا فرمائے۔ رحمتوں کے سائے سائے چلتے ہیں ہم بھی اپنی محفل کی جانب.....!

✠ **گستاخ انجم** اپنے گستاخیانے کے ساتھ دھنی سیداں، کھاریاں سے ''امید واثق ہے کہ غربت وافلاس، بیروزگاری وفاقہ کشی، مہنگائی اور لوڈشیڈنگ سے بے حال عوام لاقانونیت کے کٹہرے میں کھڑے انصاف کی گھڑی کے انتظار میں سانس لے رہے ہوں گے' حالات کی چکی میں پسنے والے بے حال ہوتے ہیں اور بے حال لوگوں کا حال دریافت کرنا ان کے رستے زخموں میں نمک چھڑکنے کا نام ہے۔ یہ بات تو زیر ادراک نہیں کہ جریدہ کب سرائے عامہ میں وارد ہوا تاہم اس بات کی سچائی میں کسی قسم کی بھی تشکیک شدہ بات نہیں کہ یہ دلدار 24 جون کو ہماری چشم تر کا مہمان ہوا۔ ایک مدت بعد دیکھا تو شناسائی کی جھلک ابھری۔ قلب منفتح میں ایک ہوک سی اٹھی۔ کانپتے ہاتھوں سے تھاما۔ اضطراری اور اضطرابی کیفیت میں چاک گریباں کی بائیں سمت سے پل دو پل کے لیے لگایا۔ کچھ چبھن کا تاثر کم ہوا اور نظر سے ''نظر'' کو جی بھر کے دیکھا۔ سرورق کا پس منظر ساحل سمندر پہ دوڑتے ہوئے گھوڑے اور گیلی ریت پہ پاؤں کے نشانات پر متبع دل کو بھلا محسوس ہوا تاہم حسینہ سرورق اک نگاہ نہ بھائی۔ اس کی وجہ بھی بیان کیے دیتا ہوں۔ اپنے سونے کے جھمکوں کی نمائش کروا رہی ہے۔ سونے کے بھاؤ کا اندازہ کیے بغیر.....! ویسے مصور کا مخصوص انداز ''ذاکر'' کہیں بھی موجود نہیں ملا۔ کیا یہ فن پارہ کسی اور کے دست کمال کا مرقع ہے؟ فہرست کا تفصیلاً موازنہ کرتے ہوئے نگاہوں نے بارہا نواب صاحب کے اسم کمال کو ڈھونڈا مگر ان کو کہیں بھی نہ پاکر دل ہلکا سا مغموم ہوا تاہم بقیہ مستند قلم کاروں کے اسمائے گرامی نے دل گستاخ کی مغمومیت پل بھر میں رفع کردی۔ فہرست کے بعد جون ایلیا کے انشائیے کو بہ غور پڑھا۔ ''مشاعرے'' کے ارتقا وافزا کے بارے میں بے حد معلومات میسر آئیں۔ عصر حاضر میں مشاعرہ خال خال ہی سننے میں ملتا ہے تاہم نئے شاعر کافی میدان کارزار میں بے خطر کود رہے ہیں۔ محفل میں آپ کی خوب صورت باتوں نے دل دہلا کے رکھ دیا۔ کاش یہ سب جھوٹ ہو۔ ہم بھی ایسی عوام بن جائیں جو ایسی باتوں کو دیوانے کے خوابوں سے تشبیہہ دیتی ہیں۔ کاش میرے گلستاں میں ایسے مالی آئیں جو پھول توڑنے والے نہ ہوں، پھول بانٹنے والے ہوں..... لیکن! کاش بے بسی اور مایوسی کی انتہا ہے۔ محفل میں تفسیر عباس بابر کے خوب صورت تبصرے نے بے حد احظاظ سے نوازا۔ دیگر تبصروں میں ثاقب نواز ثاقب صاحب ''مختصر، پراثر'' کے فارمولے پر عمل پیرا نظر آئے۔ خوب صورت تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ عمران حیدر بلوچ صاحب ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ بابر عباس صاحب بھی محفل پر چھائے ہوئے تھے۔ ہمایوں سعید راج کی نوک جھوک خوب ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آخری صفحات کو زیر مطالعہ کرتے ہوئے ''در اور دروازہ'' کے تجسس کو پرکھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب اپنے مخصوص انداز میں ''در اور دروازہ'' کے اسرار ورموز کو وا کرتے ہوئے ملے۔ کہانی بے حد لطافت آمیز اور تیز رفتار ثابت ہوئی۔ سائیں ساون فقیر اور نور خاتون کا کردار بہت اچھا لگا۔ سائیں کی قربانی کی داد نہ دینا بہت بڑی حماقت ہے۔ کہانی کا سب سے خوب صورت جملہ جو دل کی دھڑکن پہ دل بن کے دھڑکا۔ وہ یہ ہے ''در کو جھٹلانے والے جب نفس کے دروازے کا رخ کرتے ہیں تو.....'' بہت ہی خوب صورت بات کہی ہے۔ بہت ہی پراثر تحریر پڑھنے کو ملی جو عشق حقیقی کی طرف رغبت کو بڑھاتی ہے اور عشق مجازی کو بھی اسی کے عوض قبول کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ غلام قادر کی ''گھن چکر'' مکالموں پر متبع تحریر پڑھنے میں مزہ آیا۔ ''طوائف'' شیر شاہ سید صاحب کی تحریر بے سرو پا محسوس ہوئی۔ کہانی تیز رفتار تھی مگر پسند نہیں آئی۔ کاشف زبیر صاحب کی تحریر ''راکھ کے پھول'' دوسری جنگ عظیم کی ایک دیدہ ودل کو متاثر کرنے والی تحریر تھی جس نے احظاظ بھی بخشا اور درد بھی ہرا کیا۔ لولیتا کی مظلومیت پر ترس آیا۔ جیڈ کی بہادری قابل تعریف ہے۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی تحریر ''غیر ضروری'' نے بہت متاثر کیا۔ کردار کی ایک غیر ضروری سی حرکت نے ایک ہنستے بستے گھر کو اجاڑ کے رکھ دیا۔ کہانی پڑھنے کے بعد دل رنجیدہ سا ہوگیا۔ کیم جاوید سید صاحب کی تحریر ''چشم کم'' میں وائلٹ کی غلط بات بھی صحیح ثابت ہوئی اور جارج کی قسمت بدخوش کے پیرائے میں ڈھل گئی۔ ''غلامی'' مغربی رشتوں کی ناقدری کی عمدہ مثال ثابت ہوئی۔ معصوم بچوں پر بہت ترس آیا۔ باقی تحاریر میں تمکین لاش، ایش ٹرے کی چوری، عمدہ سبق خاصے کی تحاریر تھیں۔ مرزا صاحب کی ''سازشی کردار'' نے بہت محظوظ کیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی ''چراغ افغاں'' نے تاریخ کے دھندلکوں کو اجاگر کیا۔ عظیم بادشاہ اور عظیم پیغمبر حضرت سلیمانؑ کی سوانح حیات پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔ انوار صدیقی صاحب کی ''کشکول'' اور ناصر ملک صاحب کی ''مسافر'' ابھی تک زیر مطالعہ ہیں۔ پرانے جریدوں کا متلاشی ہوں اور بہت سے احباب کی عنایات بھی ہیں کہ نوازرہے ہیں۔ امید واثق ہے کہ ہمارا سنگم ماند زیست قائم ودائم رہے گا۔ پچھلے کافی عرصے سے ہم واسۂ یاراں نہ ہو پائے تاہم اس سہو کے لیے گستاخی معاف.....! امید واثق ہے کہ گستاخ کو کسی جگہ پر ضرور پذیرائی ملے گی خواہ وہ آخری کالی فہرست ہی کیوں نہ ہو۔ تمام اہل وطن کے باسیوں کو آزادی مبارک.....! خدا حافظ.....!'' (آپ کے ثقیل تبصرے کا از حد شکریہ۔)

✠ **جویریہ بنت ڈاکٹر نعیم اکبر سحر**، مانسہرہ سے محفل کی زینت بنی ہیں ''پہلی مرتبہ میں کسی بھی رسالے میں خط بھیج رہی ہوں (خوش آمدید) اس بار سسپنس 2 کو ہی مل گیا تھا۔ سب سے پہلے میں نے سرورق والی ''خالہ'' کو ہائے کہا اور پھر ان کے حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے میں نے ان کو ایک منٹ کے اندر اندر ہی بائے کہا اور ایک ہی لمبی سی چھلانگ مار کر میں ''آپ کے خط'' کی محفل میں پہنچ گئی اور کرسی صدارت پر قابض تفسیر عباس بابر کا تبصرہ پڑھا اور واقعی۔۔۔ ان کا تبصرہ تو تھا ہی کرسی صدارت کے لائق اور عمران حیدر بلوچ آپ کو 24ویں سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ اور اللہ کرے کہ یہ آپ کی آخری سالگرہ ہو..... زندگی میں نہیں جی جیل میں آخری ہو۔ ابو جب بھی سسپنس لے کر آتے ہیں تو میں سب سے پہلے آخری کہانی پڑھتی ہوں پھر اس کے بعد ملک صفدر حیات اور کاشف زبیر اگر موجود ہوں تو ان کی کہانیاں پڑھتی ہوں۔ مرزا امجد بیگ میرے موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ میں ان کی کوئی بھی تحریر نہیں مس کرتی۔ اس مرتبہ کی محفل شعر وسخن بھی بہت زبردست تھی۔ انوار صدیقی کی کشکول بھی بہت زبردست جارہی ہے۔ لگتا ہے میں کچھ زیادہ ہی بول گئی ہوں اور ہاں یاد آیا اس مرتبہ لطائف بہت مزیدار تھے۔ اتنا لمبا تبصرہ کرنے کا موقع تب ہی ملا کیونکہ فرسٹ ایئر کے ایگزام دینے کے بعد چھٹیاں ہیں۔ آپ سب قارئین سے گزارش ہے کہ میرے رزلٹ کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بہت اچھے نمبروں سے پاس کریں۔'' (آمین)

✠ **عمران حیدر بلوچ** ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ''اس ماہ کا شمارہ پوری آب وتاب کے ساتھ 20 تاریخ کو ہماری کال کوٹھریوں میں ستارے کی طرح چمکا۔ سرورق پر ساحل سمندر پر حسینہ بیٹھی شاید کراچی کے حالات پر حیران ہو رہی تھی کہ نہ جانے روشنیوں کے شہر کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔ محفل میں تفسیر عباس بابر کرسی زرداری پر براجمان تھے۔ مبارک باد کے بعد ان کی آرا سے اتفاق کرتے ہیں، خطوط کے صفحات بڑھا کر زیادہ سے زیادہ خط شامل کیے جائیں۔ حسنین عباس بلوچ کو داد دی کہ انہوں نے عون لکھنے کی دیدہ دلیری کی۔ طاہرہ یاسمین آپ کے کزن سے کئی بار ملاقات ہوئی گزشتہ محرم الحرام میں عزاداری کے لیے پہلا عشرہ اکٹھے ہی رہے۔ آپ کے کزن کو کراچی والا کے نام سے پکارتے ہیں۔ عمران علی بھیا دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ۔ ساجدہ راجا کو محفل میں خوش آمدید۔ بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے نواحی گاؤں سے کسی نے محفل میں شرکت کی، آپ کے شہر کے ظفر اقبال کھوکھر میرے ساتھ رہتے ہیں اور میرے بھائیوں کی طرح ہیں محفل میں شمولیت یقینی بنائیں۔ انور یوسف زئی ویلکم! بابر عباس بھائی پڑھ کر دکھ ہوا کہ آپ نے جیل جیسی منحوس جگہ دیکھی۔ اگر جرم کیا ہو تو معاشرے کا توازن برقرار رکھنے کے لیے سزا ضروری ہے۔ اگر کوئی میری طرح بے گناہ قید کاٹ رہا ہو تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ ہمایوں سعید راج بھائی رابطہ نمبر دیں میرے چھوٹے بھائی نے آرمی جوائن کرلی ہے اور کوہاٹ میں ٹریننگ کررہے ہیں تاکہ وہ آپ سے مل سکیں، ایسا کہاں غائب ہیں بتائیں کہ زرسالانہ جمع کروادیں اور کتابوں کے بارے میں بھی آگاہ کریں۔ ہمارے دوست ریاض شاہد پینٹر کا کیس ہائی کورٹ میں سماعت ہو رہا ہے تمام دوست دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو رہائی نصیب فرمائے۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی، معلوم ہوا پروین کو اغوا کیا گیا ہے۔ شہریار نے جیت شاہ کو قتل کردیا اور شکیلہ کا اس سے اظہار محبت اور جس شخص کو شہزاد دیکھ کر چونکا تھا یقیناً کھالا ہی ہوگا۔ کشکول میں سراج اور ادرنگ زیب کو لیاقت حسین نے محفوظ کرلیا۔ شبنم کا اغوا اور شیخ حامد کے گھر پر حملہ اس کے لیے کاری ضربیں تھیں۔ رضوانہ ساجد کی تحریر کردہ حضرت سلیمانؑ کی روداد ایمان افروز ہے۔ ملکہ سباء کی ملکہ بلقیس کو دعوت توحید کا طریقہ زبردست لگا۔ نسیم جاوید سید کی چشم کم میں وائلٹ کی غلطی جارج کے کام آئی اور پیری اس کے قابو آگیا۔ سلیم انور کی عمدہ سبق میں نمک نے کرسٹی سے رقم لی اور اس کے شوہر کو نہ قتل کیا، ابھی ہوئی کہانی تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید نے طوائف میں بینکاک کے بازار حسن کی تفصیل بیان کی اور آگاہی دی۔ محفل شعر وسخن میں تمام اشعار اچھے تھے۔''

✠ **شیر علی خان**، نامعلوم مقام سے تبصرہ کررہے ہیں ''اس دفعہ سسپنس 17 کو ملا اور نائٹل معمول سے کچھ ہٹ کر اور بہار جیسا لگا جس میں ایک لڑکی کے خیالات کا گھوڑا کسی کے نقش پا کو تلاش کرتا بھاگا جارہا ہے۔ جون ایلیا کے ''مشاعرہ'' سے انشائیہ کا ذائقہ کچھ تبدیل ہوا ہے اور شاعرانہ معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔ لوڈشیڈنگ کی صورت حال یہ ہے کہ یہ خط بھی موم بتی کی روشنی میں لکھا جارہا ہے۔ بہرحال ملکی حالات واقعات کو پھلانگتے ہوئے محفل یاراں میں پہنچے تو تفسیر عباس بھائی مسند خلافت پر تمثمار ہے تھے۔ میں ان کی بزم یاراں کے صفحات بڑھانے کی بات سے بالکل متفق ہوں۔ ایسا انصاری اب بہت ہوگئی ہے اس لیے مجھے لگتا ہے پڑھائی سے جی چرانے کے بجائے اپنی گم شدہ کتابیں پڑھنی شروع کردی ہوں گی۔ راجا ثاقب مختصر تبصرے کے لیے میں بھی آپ کا ہم خیال ہوں۔ قدرت اللہ نیازی صاحب ماہا ایمان کی عمر کا اندازہ لگانے کے لیے سب دوستوں نے کیلکولیٹرز پکڑ لیے ہیں۔ جعفر حسین لگتا ہے آپ نے ایسا انصاری کے محاورات چرا لیے ہیں کہ آپ کا خط محاورات سے بھرپور ہے۔ حاجی عبدالحکیم صاحب آپ پلیز زیادہ انتظار نہ کروایا کریں۔ ہمایوں سعید آپ حجاب والوں کا خیال نہ رکھ کر بے حجاب نہ ہوں۔ اس دفعہ کشکول کو پڑھ کر ایسا لگا کہ یہ کہانی اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ دیکھتے ہیں صدیقی صاحب کے پاس اور کتنے واقعات باقی ہیں۔ شہریار کی مسافر گاڑی اب گاؤں سے نکل کر شہر کے ہنگاموں میں داخل ہوچکی ہے، لحہ بہ لحہ بدلتی صورت حال کے باوجود کہانی بہت ترتیب سے آگے بڑھ رہی ہے۔ مرزا امجد بیگ کی ایک اور پرتجسس تفتیش نے آخر سازشی کردار کو بے نقاب کردیا۔ غیر ضروری کچھ خاص لوگوں کے لیے نصیحت آموز کہانی ہے کہ انسان اپنی خوشیوں کے حصول کے لیے دوسروں کی خوشیوں کا خون کردیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تاریخ کے جھروکوں سے خوب صورت تحریر لے کر آئے جو کہ حقیقی طور پر دل کو بہت اچھی لگی اور علم میں بھی اضافہ ہوا۔ راکھ کے پھول جنگ عظیم کے اقتدار کی جنگ کے ہنگاموں

میں آخر کار لولیتا اور جیڈ کے ایک خوب صورت انجام پر ختم ہوئی۔ تنویر ریاض نے ہمیں بتایا کہ بچوں کی صحیح طور پر پرورش حقیقی والدین ہی کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی طوائف شاید کچھ لوگوں کو عام سی تحریر لگے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بھی لوگ جانے پہچانے ناموں سے ایسے راستوں کے مسافر ہیں۔ رضوانہ ساجد کی تحریر سے حضرت سلیمانؑ کی زندگی کے حالات سے آگاہی ہوئی اور اللہ تعالیٰ ان کے قلم کو نہ روکے۔ (آمین) میرے والد صاحب 24 مارچ کو اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ آپ تمام ان کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں بہت اعلیٰ مقام عطا کرے۔" (آمین)

✠ **ریاض شاہد**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "ماہنامہ ڈائجسٹ سسپنس کا شمارہ اکیس تاریخ کو ملا اور سرورق پر دوشیزہ بس واجبی سی تھی کیونکہ میں خود آرٹسٹ کے شعبے سے وابستہ ہوں اور اس وقت ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا میں سزائے موت کا قیدی ہوں، ماہنامہ سسپنس اور جاسوسی کا عرصہ 2 ½ سال سے قاری ہوں اور بڑی شدت سے ہر ماہ ایڈیشن کا انتظار رہتا ہے پہلی دفعہ خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں امید ہے پذیرائی ملے گی۔ (خوش آمدید، بہت خوب صورت پھول بوٹے اور نقش و نگار سے سجا خط ہے آپ کا) باقی کشکول اور مسافر دونوں اچھی کہانیاں ہیں اور جب تک ایڈیشن پڑھ نہ لیں بند کرنے کو دل نہیں کرتا۔ بابر عباس صاحب، ادریس احمد خان صاحب، محمد قدرت اللہ نیازی صاحب، حمیرا رضا صاحبہ، ماہا ایمان صاحبہ، حاجی عبدالحکیم صاحب اور ساجدہ راجا صاحبہ کا تبصرہ پڑھ کر حقیقت میں ایسا لگا کہ جیسے کسی بہت مجھے ہوئے رائٹر نے تبصرہ لکھا ہے۔ مختصر اور جامع تبصرہ لکھنے پر میری طرف سے ساجدہ راجا صاحبہ آپ کو دلی طور پر مبارک باد قبول ہو۔ محض شعر و سخن میں تمام اشعار معیاری تھے تقریباً سب پسند آئے۔ آخر میں تمام قارئین سے استدعا ہے کہ میری لاہور ہائی کورٹ میں اپیل ساعت ہو رہی ہے۔ تمام قاری دل سے دعا دیجیے گا کہ اس گناہ گار انسان کو خدا معافی دے اور رہائی نصیب کریں۔" (آمین، ثم آمین)

✠ **حکیم سید محمد رضا شاہ**، نورنگہ، میانوالی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "جولائی 2012ء کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ جون ایلیا صاحب کا بیدار مغز مشاعرہ پڑھا۔ گہرائی کی تحریر ہے۔ محترم معراج رسول صاحب کی ملکی صورت حال کے بارے میں تشویش بجا ہے۔ خاص کر لڑکیوں کے قتل پر دلی صدمہ ہوا، اللہ تعالیٰ ملک کو انتہا پسند مذہبی جنونیوں سے محفوظ رکھے، آمین۔ سرورق میں حسینہ کے ساتھ گھوڑا اور پھر قدموں کے نشان کیسے ہیں؟ برادرم و محترم جناب تفسیر عباس اس پر کچھ لب کشائی کریں گے کیا؟ صدر محفل میں ان کا خط پڑھا۔ ان کی فرمائش کہ خطوط کے لیے ایک ورق بڑھا دیں۔ بہتر تجویز ہے۔ راجا ثاقب نواز کا مختصر اور جامع تبصرہ دل کو بھا گیا۔ راجا صاحب مبارک باد۔ قارئین حضرات خط مختصر لکھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ حضرات شاملِ محفل ہو سکیں۔ جیل کے بھائیوں حسنین عباس بلوچ، عمران حیدر بلوچ آپ کی تکلیف خدا تعالیٰ جلد ختم کرے اور آپ حضرات کو جیل سے رہائی نصیب ہو۔ قدرت اللہ خان نیازی کا تبصرہ پڑھا۔ آپ تو محفل کی جان ہیں۔ نیازی صاحب، طاہر الدین بیگ، عمران علی، جعفر حسین، حاجی عبدالحکیم کے محبت نامے پڑھے اور خاص کر بابر عباس صاحب کی طویل عرصے کے بعد آمد پر خوشگوار حیرت ہوئی۔ بابر صاحب دنگا فساد سے دور رہا کریں۔ میانوالی کے احسان سحر صاحب شاملِ محفل ... ہونے کے بعد اب خوش و خرم ہوں گے۔ ہمایوں سعید راج اور رائے قیصر عباس کھرل کی تحریریں بھی بہتر تھیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی چراغ افغان میں بہلول لودھی کے حالات زندگی پڑھے اور تاریخی حقائق سے آگاہی ہوئی۔ ایک بزرگ کی دعا نے بہلول لودھی کو دہلی کی حکومت دلا دی۔ انوار صدیقی کا طویل سلسلہ کشکول ایک خوب صورت تحریر ہے جس میں نیکی اور بدی کی جنگ جاری ہے۔ خاص کر لیاقت حسین کا کردار عمدہ ہے۔ دوسرا طویل سلسلہ ناصر ملک کا مسافر نے بے حد متاثر کیا ہے۔ سیدھی سادی تحریر اور گاؤں کی مخصوص فضا میں گاؤں کے باسیوں کی رہائش کی بود و باش پر عمدہ تحریر ہے اور خاص کر پیر فرتوت سائیں دل جیت کے انجام پر خوشی ہوئی۔ ہاں ایک بات اور ان طویل سلسلوں میں شہریار اور غزالہ یہی نام مصنف بار بار دہراتے ہیں کیوں؟ پہلے بھی طویل سلسلوں میں یہ نام چلتے رہے ہیں۔ میرے خیال میں ان ناموں میں چارم ہے۔ ایش ٹرے میں نک و یلوٹ سے ایک بار پھر ملاقات ہوئی ہے۔ طاہر جاوید مغل کی ہر کہانی میں وہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ غیر ضروری میں کیا ہوتا کہ اگر مغل صاحب دونوں فیصلے کو یکجا کر دیتے۔ سازشی کردار امجد بیگ نے معاشرتی ناسوروں کو اجاگر کیا ہے۔ غلام قادر کی گھن چکر اور ڈاکٹر شیر شاہ کی طوائف مختصر تحریریں ایک نیا مزہ دے گئیں۔ مریم کے خان کی انتخاب میں جون مالکو اور ایلس جوزف کی محبت آخر کار رنگ لائی۔ حضرت سلیمانؑ کے واقعات پڑھ کر قارئین کو حقیقت کا پتا چلتا ہے۔ واقعات انبیا کی تحریریں سسپنس ڈائجسٹ کا زیور ہیں۔ عمدہ سبق میں سلیم انور نے نک کے ذریعے بیوی شوہر کو ایک عمدہ سبق دیا ہے۔ آخری کہانی در اور دروازہ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی عمدہ کاوش ہے۔ الف خان اور اس کا بیٹا وزیر خان اپنی سازش کا شکار ہو گئے۔ کترنیں بھی خوب تھیں اور خاص کر محمد جاوید بلوچ، ماہا ایمان صاحبہ، ریاض بٹ، حسنین بلوچ کی کترنیں اور لطائف خوب تھے۔ سسپنس ڈائجسٹ میں قارئین کی دلچسپی کا سامان موجود ہے، ایک بہتر اور مکمل جریدہ ہے۔"

✠ **عبدالغفور خان خٹک**، چھب ضلع اٹک سے تبصرہ کر رہے ہیں "ڈائجسٹ 18 کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو اس کی خوب صورتی پس منظر میں گھوڑے کے چال اور سب سے بہترین چیز جو کہ خوب صورت ٹائٹل کو بناتی ہے وہ ہے، پانی کا ہونا عورت کی تصویر بھی اچھی ہے۔ محفل میں جا کر دیکھا تو ہمارے برادرم جناب تفسیر عباس بابر صدارت کی کرسی سنبھالے صنف نازک کو منہ چڑا رہے تھے۔ عمران حیدر آپ کو سالگرہ ایڈوانس مبارک ہو۔ میری دلی دعا ہے کہ یہ آپ کی آخری سالگرہ ہو اور اگلی اپنے گھر والوں کے ساتھ منائیں (آمین) ادریس بھائی، شکر ہے کہ پانچ ماہ کے بعد آپ کو اپنا خط نظر آیا ویسے نظر کمزور تو نہیں ہے کہ پہلے نہیں دیکھا۔ حاجی عبدالحکیم صاحب، بزرگوار آپ تو ہماری محفل کی چھت ہیں، ٹھنڈی چھاؤں اگر ہم سے ہرنا تا توڑا تو ہم ایک سایہ دار درخت سے محروم ہو جائیں گے۔ ہماری محفل میں آتے رہا کریں۔ شکریہ (ہم بھی التجا کریں گے) ہمایوں سعید، بابر عباس، حسین نظامی کے خط اچھے تھے۔ باقی محفل میں نوک جھوک جاری تھی۔ ویسے معراج انکل میرے گاؤں کے ایک انکل اکبر ہیں جو کہ ہم سے بھی پہلے کے سسپنس کے قاریوں میں ہیں لیکن وہ خاموش قاری ہیں۔ ان کے بھائی اقبال کی وفات کراچی میں ہوئی ہے۔ میں سسپنس کی معرفت ان سے افسوس کرتا ہوں کہ اللہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین) چچا اقبال جو کہ مجھے جب میں 2009ء میں کراچی سول اسپتال کے ساتھ رہائش پذیر تھا تو ملنے آتے تھے (اللہ مرحوم کے درجات بلند اور لواحقین کو صبر عطا کرے۔ آمین) سسپنس نمبر 1 پر جا رہا ہے، اس کے بعد میرے خیال میں نمبر 2 جاسوسی ہے اور نمبر 3 سرگزشت ہے۔ انکل اگر مغربی کہانیوں کی جگہ پر اپنے وڈیرے سندھ کے یا پھر اور کسی کلچر پر کہانی لکھی جائے تو وہ شائع کروائیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کشکول پڑھی، اس میں ابھی رائٹر انوار صدیقی کو کہانی پر مکمل گرفت نہیں ہے۔ لیاقت حسین کی پراسرار سرگرمیاں اور سراج صاحب اور اورنگ زیب کے ساتھ وفاداری تعریف کے قابل ہے۔ مسافر پڑھی جس میں شہریار کی بہن کا لاپتا ہونا تھا۔ میڈم کی کاوش رنگ لائے گی اور وہ شہریار کی ہمشیرہ مل جائے ناصر ملک کی کہانی مسافر میں اس ماہ کچھ زیادہ پاور فل قسط تھی اور تھرل والی بھی۔ شہریار کو میڈم بھی جان گئی کہ یہ ایک جی دار آدمی ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی دو اقساط پڑھیں اکثر و بیشتر پڑھ چکا ہوں لیکن ایک دفعہ دل کا دروازہ پھر کھل گیا۔ حضرت سلیمانؑ کی داستان پڑھ کر سکون ملا۔ در اور دروازہ بھٹی صاحب کی ان تحریروں میں سے ایک تھی جو کہ اکثر ہمارے سندھ کے معاشرے سے تعلق رکھتی ہے۔ نور کی قرآن سے (نعوذ باللہ) شادی کی جاتی ہے کہ ایک امید کی کرن خالقو آ جاتا ہے وہ لے کر بھاگ جاتا ہے لیکن سائین بی بی نے جتنی قربانی نور اور خالقو کے لیے دی، اس قربانی کی مثال نہیں ملتی۔ مختصر کہانیوں میں چشم کم نسیم جاوید کی ایک معمولی سی غلطی سے ایک آدمی کا کام بن گیا۔ اچھی تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر طوائف بھی اچھی تھی۔ اس کے بعد گھن چکر پڑھی وہ بھی اچھی کاوش تھی اور آخر میں طاہر جاوید مغل کے تو کیا ہی کہنے۔ غیر ضروری پڑھی ایک ہمزاد سے شروع ہوئی کہانی کا اختتام والد پر ہوا عجب اتفاق تھا۔ بہترین کہانی تھی۔"

✠ **سید محی الدین اشفاق**، فتح پور، لیہ سے تشریف لائے ہیں "ٹائٹل، ساحل سمندر اور حسینہ کی سوچتی نگاہیں واہ! جون ایلیا مرحوم ایک زندہ تحریر اور ایک زندہ جاوید شخص محترم انکل معراج رسول کی بات کر رہے تھے۔ تفسیر عباس بابر مبارک باد۔ ویسے آپ کے بغیر یہ محفل اداس ہو جائے گی۔ راجا ثاقب نواز صاحب، اس ملک کو اللہ ہی چلا رہا ہے آپ پریشان نہ ہوں۔ طاہرہ یاسمین آپ نے سعدیہ بخاری کو دیکھا ہے؟ قدرت اللہ نیازی صاحب آپ نے بی اے اسی عمر میں کیا تھا پھر ایسا انصاری کو طعنہ کیوں؟ طاہر الدین بیگ بھی لوڈشیڈنگ سے پریشان تھے۔ بابر عباس اور جعفر حسین کے تبصرے منفرد تھے۔ مسافر کا پس منظر اور محترم رائٹر صاحب کا تعلق ہمارے ہی علاقے سے ہے۔ سو کہانی ڈبل مزہ دے رہی ہے۔ شہرے اور میڈم شکیلہ کا تعلق شاید شہرے کو بہت آگے پہنچا دے گا۔ البتہ انوار صدیقی صاحب نے کہانی کو ایک ہی ڈگر پر کر دیا ہے، پلیز کہانی تھوڑی سی پراسرار کریں جیسا کہ آغاز میں تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب نے در اور دروازہ ایک اچھی کہانی لکھی۔ دو محبت کرنے والے مل گئے اور دو دل کرادھورے رہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ایک تلخ حقیقت کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ گرمیوں کی لمبی دوپہریں اور سسپنس کے مزے۔"

✠ **حسنین عباس بلوچ** ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے چلے آ رہے ہیں "اس ماہ کا شمارہ اکیس کی صبح کو ملا، ٹائٹل پر موجود دوشیزہ خوب صورت تو تھی لیکن آئیڈیل نہ تھی۔ محفل میں تفسیر عباس بابر صاحب کو پہلی پوزیشن سے نوازا گیا۔ مبارک باد قبول کیجیے، جناب کے تمام خیالات ماشاءاللہ بہت ہی اعلیٰ تھے۔ عمران حیدر اسیر بھائی جی، جناب کی سننے کی سماعت تو پہلے ہی بند تھی اب شاید دیکھنے کی بصارت بھی جاتی رہی۔ محمد قدرت اللہ نیازی جی، جناب نے جو اپنے خوب صورت تبصرے میں موتی پروئے وہ لائق تحسین ہیں۔ عمران علی، اللہ آپ کو ہر امتحان میں کامیاب کرے۔ میں جھنگ موڑ منڈی کا رہائشی ہوں۔ احسان سحر جی پر خلوص دعاؤں کے لیے شکریہ۔ حسن نظامی صاحب موسٹ ویلکم، جی آیاں نوں۔ شبانہ حسن جی نے مختصر لیکن خوب صورت الفاظ کا چناؤ کیا۔ انکل بابر عباس جی، اللہ تمام مسلمانوں کو اس عقوبت خانے کی زندگی سے دور رکھے، آپ کی اسیری کا دکھ ہوا۔ ہمایوں سعید راج صاحب بہن بھائی کے رشتے پر کسی کو بھلا کیا اعتراض ہوگا اور ہاں میری مانیں تو پہلے سہرا سجالیں بعد میں حج کروا لیا جائے گا اور حاجن والی مراد پوری ہو جائے گی نہیں تو.....؟ حمیرا رضا بہن جی اپنے اس بھائی کے لیے اب خصوصی دعا کرنا کیونکہ پانچ برس تین ماہ ہو گئے ہیں ان کال کوٹھریوں میں، اب کیس ایک دو ماہ ہائی کورٹ میں سماعت ہونے والا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کے دربار پر ضرور جانا۔ حاجی عبدالحکیم صاحب، جناب ہمارے بزرگ ہیں جناب کی تہ دل سے کی جانے والی دعائیں انشاءاللہ کبھی بے اثر نہ ہوں گی۔ جناب کا سایہ مبارک مجھ جیسے اور بچوں پر تا زندگی قائم و دائم رکھے (آمین) کہانیوں میں کشکول کی آٹھویں قسط اچھی تھی۔ انوار صدیقی صاحب کی اچھی تحریر تھی۔ مسافر اپنے سفر پر رواں دواں بڑی دلکش اسٹوری ہے۔ انکل طاہر جاوید مغل صاحب غیر ضروری میں جلوہ گر ہوئے۔ تمام ہی اسٹوریز سسپنس کی شان و شوکت کی عکاس تھیں۔ محفل شعر و سخن میں تمام دوستوں کے اشعار قابل داد تھے لیکن ریاض شاہد پینٹر کے شعر کو میری طرف سے پذیرائی ملی۔"

✠ **رائے قیصر عباس کھرل** سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "میں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ میرا خط چار پانچ مہینے کے انتظار اور کوشش کے بعد شائع ہو گیا ہے۔ یقین کریں بڑی خوشی ہوئی (خوش رہیے) خطوط کے میلے میں ماہا ایمان جی غیر حاضر تھیں۔ ماہا جی کہاں گئی ہیں، حاجی عبدالحکیم صاحب ہم سب آپ کی واپسی کا انتظار کریں گے۔ سرگودھا والوں نے کافی رونق لگائی ہوئی ہے۔ طاہرہ یاسمین صاحبہ آپ کا کوئی کزن گوجرانوالہ جیل میں ہے۔ اگر ہے تو بتا دیں۔ ہم اس کا خیال رکھیں گے (اللہ آپ سب کی مدد فرمائے، آمین) اب کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی۔ شہریار بھی جرم کی دنیا میں داخل ہو گیا ہے۔ اللہ ہی خیر کرے۔ کہانی میں لڑکیاں بہت زیادہ انٹر ہو گئی ہیں، مولا بچائے۔ اس کے بعد کشکول پڑھی۔ واقعی بڑا مزہ آیا۔ لیاقت اپنے ہاتھ اچھے دکھا رہا ہے۔ آخری صفحات پر در اور دروازہ ایک اچھی تحریر تھی لیکن کہانی اپنا ماحول نہیں پیدا کر سکی۔ تاریخی کہانی

چراغ افغان بھی ٹھیک تھی۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔"

✠ **راجا ثاقب نواز ثاقب**، رتی ٹبی، ساہیوال سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "ویسے تو اس مہنگائی، بدامنی، سیاسی ابتری اور لوڈشیڈنگ کے عذاب کے باعث کسی کی خیریت پوچھنا گویا کہ جلتی پر تیل ڈالنا ہے مگر بہرکیف جینے کا سامان تو کرنا ہی ہے۔ انسان کا ذہن جب ذاتی اغراض، مفادات اور اہداف سے اٹ جائے تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے جو ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔ ان گنت مسائل کا عفریت ملک میں غربت کا باعث بن رہا ہے اور غربت اور بے روزگاری ملک میں جرائم کا سبب بن رہے ہیں۔ کیونکہ پاپی پیٹ تو ہر کسی کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اسے بھی تو بھرنا ہے، چاہے حرام سے بھرے یا حلال مال سے۔ جولائی کا شمارہ شعبان کی ابتدا میں ملا۔ سرورق پر مسافر ساحل کی ریت پر اپنے نقش پا چھوڑتا ہوا کہیں بہت دور نکل گیا۔ جو بہت دور نکل جاتے ہیں ناں، پھر ایک روز وقت کی بے رحم لہریں ان کا نشان بھی دھو ڈالتی ہیں۔ شاید یہی بات ٹائٹل گرل بھی سوچ رہی ہے۔ ابتدائیہ میں جون جی مشاعرہ میں شریک تھے۔ تاریخی کہانی چراغ افغان میں تاریخ چیخ چیخ کر ہر حکمران وقت کو کہتی نظر آتی ہے کہ مجھ سے سبق سیکھو، مجھ سے عبرت پکڑو مگر کوئی نہیں جو اس سبق آموز ندا پر آواز دھرتا ہو۔ دوسری جنگ عظیم کے بھڑکتے شعلوں کے مابین پیار کی چنگاری کو راکھ کے پھول میں سلگتا ہوا محسوس کیا۔ ہر بار ہمارے دل کو چرا لینے کے فن سے آشنا نک ویلوٹ اب کی بار ایک فیس میں دو بار ایش ٹرے چراتے نظر آئے۔ غیر معمولی مشابہت نے غیر ضروری میں تو جیسے آغا انکل کے ہنستے بستے گھر میں بم ہی پھوڑ دیا۔ سازشی کردار میں بیگ صاحب جان توڑ محنت کے بعد اصل قاتل طارق شاہ کا چہرہ قانون کے سامنے لانے میں کامیاب رہے۔ گمن چکر کہانی کم اور دو افراد کے مابین ہونے والی مکالمہ بازی زیادہ لگی۔ سسپنس ڈائجسٹ کے مستقل مصنف ڈاکٹر شیر شاہ سید نے طوائف کے روز شپ کا احوال قلم بند کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری ہائی کلاس سوسائٹی کے طرز زندگی کے منہ پر طمانچا مارا ہے۔ انتخاب میں جان مالکو اصلی کو اس کی محبت ایلس جوزف مل گئی، بس اقرار محبت کرنے میں تھوڑا وقت لگ گیا۔ غلامی میں مارٹن کا باپ تو بالکل مشرقی دادا ثابت ہوا۔ چشم کم کے اختتام نے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ حضرت سلیمانؑ کی اسلامی داستان کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ایک بار پھر اگلے حصے کا ابھی سے انتظار ہے اور یوں ہم ممکین لاش سے عمدہ سبق حاصل کرتے ہوئے در اور دروازہ پر جا پہنچے۔ صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ عشق حقیقی اور عشق مجازی کے درمیان فرق جاننے والے باذوق قارئین کے لیے در اور دروازہ تحفۂ خاص ثابت ہوگی۔ ہمارے محبوب سسپنس ڈائجسٹ کا اگلا شمارہ رمضان المبارک اور آزادی کی خوشیاں ایک ساتھ لائے گا۔ میری طرف سے یہ خوشیاں سسپنس کی پوری ٹیم کو خصوصی طور پر اور سسپنس کے باذوق قارئین کو مجموعی طور پر مبارک ہوں۔" (آپ کو بھی مبارک ہوں۔)

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ناؤن، خانیوال سے تشریف لائے ہیں "جولائی 2012ء کا شمارہ بہت تاخیر سے ملا۔ اس تاخیر کا سبب 18 جون کو لوڈشیڈنگ کے خلاف ہونے والا خونی احتجاج تھا۔ عوام احتجاج کرتے ہوئے وزیراعظم کے مشیر اور "ایرا" کے چیئرمین احمد یار ہراج کے محل نما مکان پر پہنچے تو پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈز نے بجائے ہوائی فائرنگ کر کے ہجوم کو منتشر کرنے کے عوام پر سیدھا فائر کھول دیا جس سے 3 افراد ہلاک اور 5 زخمی ہوگئے۔ اس خونی واقعے کے بعد خانیوال شہر میدان جنگ بن گیا (اللہ اس ملک پر رحم فرمائے) سرورق پر موجود لڑکی نہ ہوتی یا کچھ بہتر ہوتی تو سرورق یقیناً لائق تحسین ہوتا۔ جون ایلیا مشاعرہ کو تجارتی بنیادوں پر استوار کرنے کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ کیا کہا جائے کہ اب تو میل ملاقات میں بھی نفع کا پہلو دیکھا جاتا ہے۔ خطوط کی محفل میں تفسیر عباس اپنے مخصوص انداز میں لکھے گئے تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر موجود ہیں۔ مبارک باد قبول فرمائیں اور آپ کی رائے سے ایک بار پھر اتفاق کرتے ہیں کہ محفل کے صفحات بڑھا کر بلیک لسٹ سے جان چھڑائی جائے۔ تفسیر عباس کے تبصرے میں ان کی ذاتی زندگی سے آگاہی ہوئی اچھا لگا، وگرنہ سسپنس کی طرح سارے دوست جو محفل میں شامل ہوتے ہیں وہ بھی سسپنس ہی بنے ہوئے ہیں۔ طاہر الدین خواتین کو مکھن لگاتے نظر آئے بھائی میرے اس کے لیے ہمایوں سعید ہی کافی ہے آپ اپنی انرجی ضائع نہ کریں۔ عمران علی نان اسٹاپ تبصرہ کرتے ہوئے مصروف پائے گئے ایسا کا بھوت یہاں بھی سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ ساجدہ راجا! ویلکم۔ محفل میں دوست نوک جھوک کرتے ہیں، تنقید نہیں۔ جواب دینے کے لیے ایک ماہ کا انتظار عجب کیفیت میں مبتلا رکھتا ہے۔ اس دور میں جہاں 8 روپے میں تین گھنٹے بات ہو سکتی ہے وہاں شمارے کے معیار کے علاوہ یہ دوستوں کی محفل ہی ہے جو ہمیں خط لکھنے پر مجبور کرتی ہے (نوازش ہے آپ کی) حاجی عبدالحکیم صاحب! ہم نہ آپ کو بھولے ہیں اور نہ ہی آپ کو محفل سے جانے دیں گے۔ احسان سحر میانوالی! بھئی کافی لمبی غیر حاضری کے بعد آئے ہیں؟ اپنے حکیم رضا شاہ اور خواجہ مدنی کو بھی ساتھ لیتے آنا تھا۔ بابر عباس کھاریاں! بہت افسوس ہوا آپ کے بارے میں پڑھ کر، آپ کی اسیری کے دوران آپ سے رابطہ کرنا چاہا تو تمام نمبر بند تھے اللہ کا شکر ہے کہ آپ کو رہائی نصیب ہوئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی، پروین اور امیر نواز کا ایک ساتھ غائب ہونا واقعی معنی خیز ہے۔ میڈم کا کردار ابھی تک اسرار میں ہی لپٹا ہوا ہے۔ کشکول میں شیخ حامد کی بوکھلاہٹ مزہ دے رہی ہے۔ جولیانا یقیناً شیخ حامد کے لیے ایک نیا ٹریپ ہے۔ دارا میجر عاطف کے ساتھ مل کر اچھی خاصی کامیابی حاصل کر چکا ہے جس کی مدد سے وہ شیخ حامد سے سودے بازی کر سکتا ہے۔ "راکھ کے پھول" جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے آشکار کر رہی تھی۔ جیڈ جیسے محب وطن ایجنٹس تقریباً ہر دور میں رہے ہیں جو گمنام ہی رہ جاتے ہیں۔ سب سے اچھی بات ماضی کو بھول کر حال کو بہتر بنانے کا پیغام لگا۔ طاہر جاوید مغل کی "غیر ضروری" اتفاقات سے بھرپور رہی۔ دوسری شادی کو جس طرح معاشرتی جرم بنا دیا گیا ہے وہاں خفیہ شادیوں یا بے راہ روی کا قاعدہ ہی ہونا ہے۔ ارے! بچ کے کہیں بیگم ہی نہ پڑھ لے مرزا امجد بیگ سازشی کردار سے آشنا کراتے نظر آئے۔ حنیف کی خوش قسمتی کہ بیگ صاحب جیسا وکیل مل گیا ورنہ اس طرح پھنسنے والے اکثر ملزم جرم بے گناہی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ "در اور دروازہ" جاگیردارانہ ظلم و استبداد کی روایتی کہانی تھی تاہم انجام غیر روایتی ہوا۔ وڈیرا الف خان اور وزیر خان خدا کی بے آواز لاٹھی کا شکار ہو گئے۔ خالق داد اور نور خاتون کے علاوہ سائین بھی بامراد ہو گئی۔ "گمن چکر" غلام قادر کے مخصوص انداز میں لکھی گئی تحریر تھی۔ کیا یہی وہ غلام قادر ہیں جو اکثر جاسوسی میں سرورق کے رنگ لکھتے رہے ہیں اور کافی عرصہ سے غائب ہیں؟ (جی جناب

اور اب آپ ان کی کہانیاں اکثر پڑھا کریں گے) تنویر ریاض کی "غلامی" پڑھ کر اپنے معاشرے میں والدین اور اولاد کے درمیان پائے جانے والے تعلق پر فخر محسوس ہوا۔ مریم کے خان کی "انتخاب" کمیونی کیشن کے غلط استعمال سے آگاہ کر رہی تھی جہاں انٹرنیٹ پر چیٹ اور چند فون کالز نے ایلی جوزف کو اتنا بے چین کر دیا کہ وہ اسے ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی۔ یہ تو خوش قسمتی تھی اس کی کہ جون مالکو ایک شریف جوان تھا۔ ام رباب کی کترنیں کافی بہتر تھیں۔ محفل شعر و سخن میں ہمیشہ کی طرح لاجواب انتخاب پڑھنے کو ملا۔" (بھرپور تبصرے کا شکریہ)

✠ **این ایس آر مدثر**، بلدیہ ناؤن کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں "سب سے پہلے تو تمام سسپنس اسٹاف اور قارئین و دوستوں کو ماہ صیام رمضان المبارک بہت بہت مبارک ہو۔ دعا ہے اللہ تبارک و تعالیٰ اس مبارک مہینے کے صدقے ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ ہمارے ملک کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ ہمیں اس مہینے کی برکتیں اور رحمتیں سمیٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس شہر قائد میں قتل و غارت ختم ہو، آمین۔ سرورق سمندر کی موجوں سے دلکش لگ رہا تھا۔ دوشیزہ متاثر کن نہیں تھی جبکہ پس منظر میں گھوڑے کی ایڈیٹنگ نہایت بری لگی۔ اشتہارات سے صرف نظر کرتے ہوئے محفل میں پہنچے جہاں مدیر اعلیٰ کوہستان کے واقعے پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ اس مرتبہ تفسیر عباس بھائی بازی لے گئے مبارک ہو آپ کو۔ آپ کا تبصرہ لفاظی کا خوب صورت شاہکار تھا۔ ماہا ایمان کو آپ کا دیا ہوا جواب پسند آیا۔ راجا ثاقب بھائی آپ کے جذبے کو داد دیتا ہوں جو آپ مختصر تبصرہ کرتے ہیں۔ رجی پٹیل کی ہر کہانی ایسی ہی ہوتی ہے جانے کیوں لوگ ان کی بولڈ کہانیاں پسند کرتے ہیں؟ حسین عباس بلوچ بھائی کیسے ہیں آپ اور آپ کے دوست؟ طاہرہ یاسمین صاحبہ کیسی ہیں اب آپ کی والدہ؟ عمران حیدر بلوچ آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام قیدی دوستوں کو رہا کرے، آمین۔ قدرت اللہ نیازی کیسے ہیں جناب آپ؟ گیاری سیکٹر میں مسلسل برف باری کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی پر کچھ پیش رفت ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ ان جوانوں کی شہادت قبول فرمائے۔ عمران علی ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ حاجی صاحب محفل کے تمام دوستوں کے لیے دعا کیجیے گا۔ آپ ایک ماہ کے وقفے سے بھی محفل میں شریک ہو سکتے ہیں۔ 17 جون کو ہی بابر عباس بھائی کا فون آیا جس میں اپنے جیل جانے کا قصہ، دل پزیر سنایا۔ وہ بھی عام پاکستانی کی طرح پولیس سے بدظن دکھائی دیے۔ ہمایوں تنولی خوش آمدید۔ آپ کا اس دفعہ شعر شاندار لگا۔ ہمایوں سعید اپنا انداز بدلو پیچھے نہ ہٹو۔ طاہرہ گلزار بلیک لسٹ میں نظر آئیں ہمت نہ ہاریں۔ جون کے شمارے میں حمیرا رضا کی انٹری ہوئی۔ محترمہ آپ کہاں رہی ہیں اتنے دنوں؟ روشنی رشید آپ تو بہت مصروف ہو گئیں، شادی تو نہیں ہو گئی آپ کی؟ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی چراغ افغان شاندار کہانی ہے، سلطان بہلول بہادر بادشاہ گزرا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں پڑھ کر ایمان کو تقویت ملی جس واقعے کا ذکر آخر میں کیا جا رہا ہے وہ میں پڑھ چکا ہوں بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے انہیں شاندار معجزے عطا فرمائے (ارے کہانیوں پر اتنا سا تبصرہ!) محفل شعر و سخن میں ہمایوں تنولی، ماہا ایمان اور قدرت نیازی کے شعر اچھے لگے۔ کترنیں اس مرتبہ کافی سے زیادہ تھیں اور خوب تھیں۔ محترمہ غذار اسول صاحبہ گریاد ہو آپ کو میں نے جنوری یا فروری میں آپ سے گزارش کی تھی کہ سید منصور حلاج اور حجاج بن یوسف کے بارے میں لکھیے۔ یہ 7 واں مہینا ہے ابھی تک میری درخواست پر عمل نہیں ہوا۔" (آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے)

✠ **عبدالرؤف عدم**، راولپنڈی سے چلے آ رہے ہیں "لیجیے جناب! مصروفیت جیسے جابر جاگیردار کے قبضہ سے اپنی "فرصت کی زمینیں" مشکل سے "واگزار" کراتے ہی ہم "عالی جاہ شہنشاہ سسپنس" کی سلطنت کی حدود میں قدم رنجہ فرما چکے ہیں۔ اب کوئی ہمارے بارے میں یوں اظہار خیال فرمائے کہ "ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے" تو ہمارے سر آنکھوں پر..... اور اگر کوئی یوں طنز فرمائے کہ "لوٹ کے بدھو گھر کو آئے" تو بھی ہمارے ماتھے پر..... سرورق کی دوشیزہ پر اک "نگاہ درست" ڈالی لیکن دوشیزہ کی نگاہوں کا مرکز کسی اور کو پایا..... تو ہمیں غصہ آیا..... لیکن ہم نے اپنے غصے پر قابو پایا اور جون ایلیا کے "مشاعرہ" میں جگہ بنائی..... مشاعرے کے بارے میں سچی اور کڑوی باتیں پڑھ کر مزہ آیا۔ پھر ہم نے قدم آگے بڑھایا..... تو اپنے سامنے ایک بار رونق محفل کو پایا..... تفسیر عباس بابر، کرسی صدارت مبارک ہو بھیا، لیکن ذرا احتیاط سے، سنا ہے آج کل کوئی کرسی محفوظ اور مضبوط نہیں ہے۔ محمد قدرت اللہ نیازی، بھیا آپ نے یہ نہیں لکھا کہ نیازی کے آنے کے بعد سرورق کی حسینہ کی کیفیت کیا ہوئی؟ ساجدہ راجا، آپ کو ایسا کیوں لگا کہ آپ کو "بوڑھی نائپ" سمجھا جائے گا..... ویسے آپ کی اس بات سے ہمیں اتفاق ہے کہ تنقید سے دوسروں کی شرمندہ نہیں کرنا چاہیے۔ حاجی عبدالحکیم صاحب، جانے کی باتیں جانے دیں۔ ابیہا انصاری کا مسئلہ ہم نے پڑھا تھا، ہم سے جو ہو سکا ہم ضرور ان کی مدد کریں گے، اگر ابھی تک ان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا تو ہمیں بتایا جائے (جی جناب مسئلہ ہنوز باقی ہے) دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی راکھ کے پھول بہت پسند آئی، لولیتا کا کردار بہت خوب صورت تھا۔ ایش ٹرے کی چوری میں نک ویلوٹ نے آخر کار اپنی ذہانت کے باعث اپنا معاوضہ وصول کر ہی لیا۔ اپنے پسندیدہ مصنف طاہر جاوید مغل کی "غیر ضروری" کو پڑھنا بہت ضروری تھا اس لیے پڑھی اور واقعی مزہ آ گیا۔ بعض اوقات معمولی سا واقعہ بھی زندگی کا رخ بدل دیتا ہے۔ مرزا امجد بیگ نے سازشی کردار میں معاشرے کی ایک اہم برائی کو بے نقاب کیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی طوائف نے وقت ضائع کیا۔ مریم کے خان کی انتخاب بہت پسند آئی۔ مغرب میں جون مالکو اور ایلس جیسے معصوم اور محبت سے بھرپور کردار کم کم نظر آتے ہیں۔ غلامی میں دادا کی اپنے پوتے پوتیوں سے محبت لاجواب ہے۔ چشم کم دلچسپ اور مزے دار کہانی ثابت ہوئی۔ در اور دروازہ میں عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف سفر کی کوشش دکھائی گئی۔ اوسط درجے کی کہانی ہے۔"

✠ **سعدیہ بخاری** ضلع اٹک سے محفل میں شریک ہوئی ہیں "جولائی کا شمارہ بہت ہی لیٹ ملا۔ جولائی کے شمارے کا ٹائٹل کا بیک گراؤنڈ بہت خوب صورت ہے لیکن حسینہ کی ناک مجھے پسند نہیں آئی البتہ آنکھیں اور بال بہت خوب صورت ہیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا، شاعروں اور مشاعروں پر تبصرہ کر رہے تھے۔ واقعی پرانے زمانے کے مشاعروں کی تو کیا بات ہے صحیح معنوں میں ادبی مشاعرے کہلاتے تھے۔ اداریے میں مدیرہ اعلیٰ جس واقعہ کا ذکر کر رہی تھیں اس کے انجام کا تو تا حال پتا نہیں چل سکا البتہ یہ بات خوش آئند ہے کہ اب میڈیا کی وجہ سے ایسے واقعات چھپے نہیں رہ سکتے۔ آپا محفل یاراں میں تو

بڑے بڑے نام نظر آرہے ہیں گرمیاں آچکی ہیں نا تو سب پرانے بزرگ پر جھاڑتے چونچیں ہلاتے میدان میں آدھمکے ہیں، ویلکم بیک۔ صدارت کے فرائض تفسیر عباس انجام دے رہے تھے، بہت بہت مبارک باد اور ریکویسٹ ہے کہ تبصرہ ذرا مختصر کیا کریں۔ بلوچ فیملی کے ایک ممبر غائب ہیں بھاگ گئے ڈر کے، ماہا بھی اس بار غائب ہیں..... خیریت؟ تمام نیو کمرز کو تہ دل..... سے خوش آمدید۔ بابر عباس بہت افسوس ہوا سن کر کہ آپ ڈیڑھ ماہ جیل میں رہ کر آئے، خیر۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح..... سحر احسان داہ بھئی، اس بار تمہارا تبصرہ کافی میچور لگا، ویلڈن۔ ایبہا تو تمہارا مسئلہ تو حل ہو گیا اب آتی رہنا، او کے؟ محفل شعر و سخن میں ماہا ایمان، عون عباس، طاہرہ اور ادریس خان کے اشعار قابل داد ہیں۔ کترنیں معمول سے زیادہ ہیں اور اقتباسات بہت معلوماتی تھے جو کہ اچھا اضافہ ہے۔"

✠ **بابر عباس، حسنین عباس، کمیل عباس**، گلیانہ روڈ کھاریاں سے محفل کی زینت بنے ہیں "سر جی خوب صورت کہانیوں سے مزین سسپنس ڈائجسٹ جو کہ جولائی 2012ء کا شمارہ تھا، بڑے جاں گسل انتظار کے بعد 19 جون کو اپنا دیدار کروانے میں کامیاب ہوا۔ سولہ جون کو کراچی سے این ایس مدثر کا فون آیا کہ بابر بھائی آپ کا اس بار سسپنس میں خط شائع ہو گیا ہے اور یہ جیل کا کیا چکر ہے۔ اس بار سرورق زبردست تھا، ذاکر صاحب نے اس بار ایک جل پری کو سرورق پر جگہ دی مگر افسوس جل پری کچھ کچھ خوں آشام لگتی ہے اور چوڑیاں شاید ماہا ملک سے لے کر پہن رکھی ہیں۔ عقب میں ساحلی سمندر پر اچھلتا کودتا گھوڑا صنف وجاہت کے پیروں کے نشان جو شاید خوف صورت سوری سوری صنف نازک برا مان جائے گی خوب صورت جل پری کو چڑیل سمجھ کر ڈر سے بھاگ گیا ہے۔ اشتہارات کو بالکل اسی طرح نذر انداز کیا جس طرح کوئی امیر آدمی غریب آدمی کی تنخواہ کو نظر انداز کرتا ہے جبکہ جون ایلیا مرحوم صاحب کو نظر انداز نہ کر سکا۔ جون ایلیا صاحب کا مشاعرہ پڑھ کر مجھے جیل کا مشاعرہ یاد آ گیا۔ دوستوں کی محفل میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے اپنا خط تلاش کیا حالانکہ این ایس مدثر نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ بابر بھائی آپ کا خط محفل میں جگہ بنا چکا ہے۔ بہر کیف خود اپنی آنکھوں سے اپنا خط دوستوں کے درمیان پا کر اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی کسی غریب ملک کو امداد پا کر ہوتی ہے۔ مہدی حسن صاحب کی موت نے بہت سوگوار کیا ہے شاید ہی ان کا خلا کوئی پورا کر سکے۔ ان کے گائے ہوئے گیت ہمیشہ ہمارے درمیان خوشبو بن کر مہکتے رہیں گے۔ سر جی آپ کی تلخ باتوں پر بھلا میں کیا بات کروں آپ جو بھی بات کرتے ہیں وہ صحیح اور حقیقت کے قریب تر ہوتی۔ اس بار ایک ماہ کے لیے تخت و تاج کے حق دار ہمارے پیارے دوست تفسیر عباس بابر پائے، مبارک ہو عزیزی آپ کا خوب صورت اور پیارا سا تبصرہ پسند آیا پر بھیا جی ایک درخواست تھی اگر جان کی امان پاؤں تو جناب محترم تفسیر عباس بابر صاحب، گزارش یہ ہے کہ اتنے روکھے روکھے الفاظ مت استعمال کیا کریں ضروری نہیں ہر کسی کو اتنے اوکھے لفظ سمجھ آ جائیں۔ حسنین عباس بلوچ، بیٹا خدا تمہیں اس کرب اور اذیت سے نجات دلائے جس سے تم اس وقت گزر رہے ہو تمہیں ہی کیا بلکہ ان سب کو جو اس وقت جون جولائی کی گرمی میں ان کال کوٹھریوں میں جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ طاہرہ یاسمین ارے شاگرد رشید بہت اچھی جا رہی ہو، جان عزیز ایک وہ وقت تھا کہ خط لکھنا نہیں آتا تھا اور اب ایک یہ وقت ہے ہر ماہ خط شائع ہو رہا ہے آخر شاگرد کس کی ہو اور یہ سعدیہ بخاری کو کس خوشی میں مسکا لگا رہی ہو؟ عمران حیدر میری تمام ترنیک دعائیں تمہارے ساتھ ہیں بس ایک درخواست کر دوں گا اگر مان لو تو صرف اور صرف نماز پڑھا کرو۔ پھر دیکھو تمہاری مشکلیں کیسے آسان ہوتی ہیں۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب اور سنا کیں کیا حال ہے۔ تبصرہ اچھا تھا آخر کو ماسٹر جو ٹھہرے۔ طاہر الدین بیگ صاحب لوڈ شیڈنگ صرف میر پور خاص کا مسئلہ نہیں، یہ پورے پاکستان کا مسئلہ ہے۔ ادریس احمد خان بھایا جگ جگ جیتے رہیں۔ کسی بات کو دل پر نہیں لینا چاہیے، اس سے دل کی بیماری لگ جاتی ہے۔ ساجدہ راجا صاحبہ آپ نے عرصہ نہیں لکھا کہ کتنے عرصے سے آپ سسپنس پڑھ رہی ہیں۔ آپ اپنی عمر چھپانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ حسن نظامی صاحب سب سے پہلے تو یہ بتائیں کہ حمید نظامی، خالد نظامی ان دونوں حضرات سے آپ کا کیا تعلق ہے۔ ایڈیٹر صاحب کو اتنا بھی مکھن نہ لگائیں کہ وہ ہمارے ہاتھوں سے ہی پھسل جائیں۔ ہمایوں سعید راج پوائنٹ تو بہت تھے۔ رمضان پاشا صاحب کے خط میں مگر آپ اسکور نہ کر سکے۔ اریبہ بخاری، بشریٰ افضل، آمنہ افضل، سمیرا افضل، سعدیہ ہماشیخ، عظمیٰ بشیر، نورین خاکوانی اور بہت سی بوڑھی عورتیں..... ارے ہاں یاد آیا رو بینہ نفیس انصاری صاحبہ بھی ہیں، پتا نہیں یہ سب ڈر کے مارے کہاں چلی گئی ہیں دراصل سر جی میری دہشت ہی بہت ہے۔ کہانیوں میں سرفہرست تو نا صر ملک صاحب کی مسافر ہے جو کہ ابھی صرف پانچ ماہ کی ہوئی ہے، آگے آگے دیکھیں ہوتا ہے کیا، بہر حال مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مسافر اپنے تخلیق کار کو اور پڑھنے والوں کو مایوس نہیں کر رہی۔ اس دفعہ انوار صدیقی کی کشکول پڑھ کر مزہ نہیں آ رہا جتنا کہ اقبال، سونا گھاٹ کا پجاری، غلام روحیں، خالی گھر اور کہکشاں پڑھ کر آیا تھا۔ کچھ پراسراریت پیدا کریں، کچھ تجسس پیدا کریں۔ آخری صفحات پر اس بار ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کو موقع دیا گیا اور کیا خوب موقع دیا گیا۔ دراور دروازہ ان کی ایک اچھی پیشکش تھی، ویل ڈن ڈاکٹر صاحب۔ عرصے بعد تین نام ایک ساتھ پیش ہوئے۔ اپنی اپنی تخلیق لے کر ڈاکٹر ساجد امجد چراغ افغان تاریخی صفحات لے کر آئے۔ طاہر جاوید مغل صاحب غیر ضروری اور غلام قادر صاحب گمن چکر۔ ان تینوں نے اپنے اپنے انداز تحریر کو بہتر انداز میں پیش کیا، اس کے لیے یہ تینوں حضرات مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جب کبھی ملک صفدر حیات یا پھر مرزا امجد بیگ کو پڑھتا ہوں تو مرحوم عبدالقیوم شاد صاحب بہت یاد آتے ہیں۔ جناب ایم اے راحت صاحب سے کوئی سلسلے وار کہانی لکھوائیں، بڑی مہربانی ہوگی۔"

✠ **چوہدری احمد خان**، راولپنڈی سے تبصرہ کر رہے ہیں "محفل میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں (خوش آمدید) انشائیہ میں جون ایلیا، معراج رسول صاحب سداحق اور دل کی بات کرتے ہیں۔ تفسیر عباس او کاڑہ اول اچھا تبصرہ مگر لمبا۔ راجا ثاقب، حسنین عباس، عمران حیدر، ماہا، طاہرہ یاسمین سرگودھا کے اچھے تبصرے تھے۔ بھائی حسنین و عمران کس جرم میں کب تک جیل میں؟ اللہ آزادی عطا فرمائیں۔ قدرت اللہ نیازی صاحب آپ نے سعدیہ بخاری اٹک کو بادام کھانے کا مشورہ دیا۔ میرے ساتھ گلگت، سوات شمالی علاقہ جات کے کام کرنے والے ساتھی بادام اور دیگر سوغات خوب کھلاتے ہیں۔ سعدیہ بخاری پتا دیں، ساتھ کام کرنے والے اٹک کے ساتھیوں کے ہاتھ بادام بھیج دیں گے۔ دیگر ساتھیوں کے تبصرے اچھے تھے۔ ڈاکٹر ساجد صاحب آپ کا تاریخی مطالعہ اچھا ہے، جنرل ناج میں، میں نے بھی ایم اے کیا ہے۔ لکھنے کا وقت نہیں ملتا۔ کشکول اور مسافر پسندیدہ کہانیاں ہیں۔ لیاقت حسین نے ہر موقع پر دشمن عناصر کی گردن ناپی۔ شیخ حامد جیسے فرعون کا انجام جاننے کے لیے بے چین ہیں آغا رستم کا بیٹا دارا اپنے دوست میجر عاطف کے ساتھ مل کر دیکھیں کیا کرتا ہے؟ ایس پی اورنگ زیب اور سراج نے چوتھے آدمی کو چھوڑ کر اچھا کیا۔ ایش ٹرے کی چوری جیسے لوٹ مار میں مصروف ہیں۔ غیر ضروری آغا کا دھوکا..... قلبی دکھ ہوا۔ خوب صورت محبت والا گھر اجڑ گیا۔ طوائف فی الوقت پورے ملک میں اسٹیل مل کیا ہر ادارے کی تباہی کا یہی حال ہے۔ لیڈر کے روپ میں ڈکٹیٹ کو نکیل کے لیے حضرت عمرؓ جیسے رہبر کی اشد ضرورت ہے۔ مرزا امجد بیگ اور ملک صفدر حیات اصل مجرم تک پہنچ کر دم لیتے ہیں۔ ماہا ایمان، نصیر سیال، تفسیر عباس اور احساس سحر اچھے اشعار ہیں۔ غلامی انگریز معاشرہ تو بے حس ہے۔ اب ہم بھی مغرب کی تقلید میں رنگ گئے۔ مسافر، شہر یار نے پیر فرتوت شاہ کو جلا کر اچھا کیا۔ پروین کے اغوا کا بہت افسوس ہوا۔ حضرت سلیمانؑ اچھی کہانی ہے میں نے کلام پاک اور قصص الانبیا میں سب تفصیل پڑھی ہوئی ہے۔ دراور دروازہ دلچسپ کہانی تھی۔ سائمن بیگم پر خلوص لیڈی ہیں۔"

✠ **ہمایوں سعید راج بنوں** سے تبصرہ کر رہے ہیں "سرورق والی لڑکی بہت زیادہ اچھی لگی۔ اسپینشی اس کے خوب صورت نیناں، کیوٹ سی ناک، دلکش ہونٹ، سچ چہرہ، کشادہ پیشانی، خوب صورت بال، حسین ہاتھوں کی حسین چوڑیاں اور بس..... ساحل سمندر پہ ٹیڑھے میڑھے قدموں کے نشانات چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے کہ ہم نے اس ہستی کے قدموں تلے جنم لیا ہے جس کے پاؤں میں پیدائشی نقص ہے اور خود کو ماہا ایمان کہلاتی ادھر ادھر بھٹکتی رہتی ہے۔ تفسیر صاحب کا ڈھلتی عمر اور تیزی سے ڈھانچا ہوتے وجود کے پیش نظر ذاتی بچوں کا پرائمری اسکول کھولنے کا جذبہ اچھا لگا۔ طاہرہ یاسمین صاحبہ! یہ سب کو خوش رکھنے کی پالیسی چھوڑ دیجیے۔ قدرت برادر! آپ کی ریسرچ کو جھٹلاتے ہوئے افسوس تو ہو رہا ہے مگر سچ یہی ہے کہ ماہا ایمان نے یہ نام ایک سال پہلے ہی کسی سے لیز پہ لیا ہے لہٰذا 1990ء میں اس نام کے ساتھ ان کی شمولیت ناممکن ہے۔ طاہر الدین بیگ صاحب آئے تو لوڈ شیڈنگ کا رونا روتے ہوئے مگر جیسے ہی ان کی نظر محفل میں خواتین کے ٹولے پہ پڑی۔ انہوں نے مساوی طور پر ہر لڑکی پہ تعریفوں کی ٹھنڈی پھوار برسانا شروع کر دی۔ عمران علی! آپ ایم بی بی ایس تو کجا ماسٹرز اردو ابھی فرار ہے ہو جبکہ کلینک پچھلے تین سال سے بڑی ڈھٹائی سے چلا رہے ہو۔ کیا ہو گا اس دیش کا۔ جعفر صاحب! آپ نے کون سا ادب کا نوبل پرائز جیتا ہے جو لوگ آپ کے انداز تحریر، اسلوب اور مکالموں کی جولانیوں سے متاثر ہونے لگے۔ ساجدہ رانا صاحبہ! آپ پہلے دوسرے چھوٹے چھوٹے مسائل جیسے افغانستان، کشمیر، ایران وغیرہ حل کر کے تجربہ حاصل کریں۔ پھر محفل میں سیز فائر کرنے کی کوشش کریں۔ حکیم انکل ہم تو ہر پل، ہر گھڑی آپ کو یاد کرتے ہیں۔ باقی جن کے نام آپ نے لیے ہیں تو وہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے عقیدے پہ ایمان رکھتے ہیں۔ فہرست میں طاہر جاوید مغل کا نام دیکھا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ان کی جانب چل دیے مگر ہمیں یہ کہانی بالکل بھی پسند نہیں آئی اور دل کو بہ مشکل پاسنگ مارکس دینے پہ راضی کیا۔ بیگ صاحب ایک بار پھر سازشی کرداروں سے نمٹتے ہوئے نظر آئے۔ بیگ صاحب کی شاندار جرح سے مقابل کو چاروں شانے چت ہوتا دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ناصر ملک کا مسافر اب مستقل سفر میں آ چکا ہے۔ شہر یار کے دل جیت پہ ڈھائے گئے مظالم نے ہمیں سوچنے پہ مجبور کیا کہ حالات انسان کو کتنا جلد بھیڑیا بنا دیتے ہیں۔ دراور دروازہ نے صحیح معنوں میں آخری صفحات کا حق ادا کیا۔ سائمن نے دو دلوں کے ملن کے لیے اپنا سب کچھ قربان کیا جس کا اللہ نے اسے بہترین صلہ دیا۔ حضرت سلیمانؑ کی داستان کو دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ کاشف زبیر نے جنگ عظیم دوم کی سیر کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ چشم کم میں جارج کی خوش قسمتی پہ رشک آیا۔ مریم کے خان کی کہانی خاص الخاص ثابت ہوئی۔ مشرقی رنگ میں ڈھلی انتخاب ناقابل فراموش کہانی رہی۔ جون نے ایلس کی بے لوث مدد کی جس نے ایلس کے دل کی دنیا بدلنے میں دیر نہیں لگائی۔ آخر میں ڈاکٹر ساجد امجد سے گزارش ہے کہ وہ ابتدائی صفحات پہ جلال الدین اکبر کی مکمل داستانِ حیات پیش کریں۔"

✠ **رمضان پاشا**، گلشن اقبال کراچی سے محفل کو رونق بخش رہے ہیں "تازہ سسپنس کا سرورق سارے کا سارا نمکین تھا، سمندر نمکین، ریت نمکین، دوشیزہ بھی نمکین ہی لگ رہی تھی۔ سرورق جتنا نمکین تھا پس ورق اتنا ہی میٹھا تھا۔ اس بار فہرست میں عنوانات کے حاشیے بہت خوب صورت تھے۔ اس دفعہ کا انشائیہ پسند نہیں آیا۔ خطوط کی محفل میں اس عاجز کا خط بھوکی کچرا رانی روی کی نوکری کی شکم پری کے کام آیا جبکہ تفسیر عباس کا خط اوّل نمبر پر لگا تھا، کیا مبارک باد دوں؟ ویسے موصوف کا طویل تبصرہ قابل داد تھا، کیا خوب! (داد بھی دیتے رہے کرتے رہے بے داد بھی.....) جعفر حسین بھوانہ صاحب میرا شکریہ ادا کرنے کا شکریہ۔ کھاریاں والے بابر عباس بھائی میرا نام پڑھ کر دیوتا کا منفی کردار والا پاشا کیوں یاد آیا۔ مثبت کردار کے حامل پاشا کیوں یاد نہیں آئے مثلاً مصطفیٰ کمال پاشا، انور کمال پاشا، غفار پاشا، جنرل پاشا وغیرہ، آپ کے خیالات ہی منفی ہیں، اکیلے میں کیا کرتے ہو؟ دیگر تبصروں میں راجا ثاقب نواز ثاقب، طاہرہ یاسمین، جعفر حسین بھوانہ کے تبصرے اچھے لگے۔ اشعار کی محفل میں ہمایوں تنولی کا انتخاب اچھا تھا، ماہا ایمان کا قطعہ بھی لاجواب تھا، کھاریاں والے بابر عباس کا چناؤ بھی دل کو بھایا، قدرت اللہ نیازی کا شعر بھی پسند آیا۔ مجھ فقیر کا شعر غائب تھا۔ انا للہ۔ اور اب کہانیوں پر تبصرہ۔ کافی عرصہ بعد تک ولیوٹ ایش ٹرے چوری کرنے آ گیا، دوسری تمام غیر ملکی کہانیاں بہت خوب تھیں، خصوصاً نمکین لاش بہت پسند آئی۔ دل دہلانے والی کہانی راکھ کے پھول نے بہت متاثر کیا۔ قسط وار کہانیاں کشکول اور مسافر کی اس دفعہ کی اقساط بہت ہی دبنگ تھیں۔ اغوا، قتل اور مار دھاڑ سے بھرپور قسطیں تھیں۔ سازشی کردار میں عدالتی کارروائی میں خوب لطف آیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ دراور دروازہ دلکش میں لگا دیتے۔ کترنیں سب کی سب پُرلطف تھیں۔ آخر میں میری جانب سے عملے کے تمام افراد کو سلام اور دعائیں خاص کر ثمر عباس صاحب کو خصوصی سلام۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

اختر شاہ عارف، جہلم۔ کومل رباب، لاہور۔ احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل کراچی۔ انور یوسف زئی، اسلام آباد۔ ماریہ علی بھٹو، ضلع شکار پور۔ محمد زریان سلطان، کراچی۔ ثمرہ عروج، کراچی۔ اطہر حسین، لیاقت آباد، کراچی۔ مونا صدیقی، ملتان



فیصلے فقیروں کے

ڈاکٹر ساجد امجد

وقت کے مانند آگے بڑھنا انسان کی سرشت سہی مگر کبھی کبھی پلٹنے کو بھی دل چاہتا ہے اور... بس وہی ایک لمحہ اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیتا ہے۔ ماضی میں ڈھلنے والے لمحوں کی یہی ایک خوبی ہے کہ وہ اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیتے۔ یہ بھی ان لمحوں کی روداد ہے جب دہلی کی گلیوں میں خوف کے سائے منڈلا رہے تھے کیونکہ سلطان غیاث الدین نے بنگال سے اللہ کے ولی نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کو دہلی چھوڑنے کا پیغام بھیجا تھا... اس موقع پر آپ نے وہ تاریخی جملہ کہا جو آج بھی محاورۃً استعمال ہو رہا ہے... "ہنوز دلّی دور است" پھر اس ولی کی پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی اور دلّی بادشاہ سے ہمیشہ کے لیے دور ہوگئی۔ جب اس کا جانشین سلطان محمد تغلق تخت نشین ہوا تو علما اور مشائخ کے قتلِ عام سے بغداد اور مصر کا ہم پلہ ایک سو ستّر سال پرانا شہر دہلی ویران ہو کر رہ گیا۔ اس کی ضد نے ہندوستان کی سرزمین کو خون میں نہلا دیا۔ دنیاوی تختِ شاہی پر بار بار چہرے بدلنے میں اللہ کی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ سمجھنے والوں کے لیے بہت بڑی بات ہے۔ چند روزہ اقتدار میں اختیارات کا بے دریغ غلط استعمال... اور پھر بالآخر وہی فانی زندگی... بس یہی ایک وہ نکتہ ہے جسے بشر بھلائے ہوئے ہے۔ عروج و زوال پر مشتمل شاہوں کا جاہ و جلال اور تاریخ کی نیرنگی۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

دہلی کی سڑکوں پر دھوپ کی حکومت تھی۔ سورج زمین پر اتر آیا تھا۔ بھری دوپہر میں بازار انسانوں سے خالی تھے۔ پرندے پتوں میں، لوگ گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ آگ کے آسمان تلے تانبے کی زمین پر چلتے ہوئے دو سوار دہلی سے باہر نکل رہے تھے۔ ان میں سے ایک مشہور شاعر عبید تھا دوسرا اس کا ساتھی شیخ زادہ دمشقی تھا۔ یہ دونوں اتنے غیر معروف نہیں تھے کہ کوئی انہیں دیکھتا اور یہ نہ پوچھتا کہ برستی آگ میں گھوڑے پر سوار کہاں کا ارادہ ہے۔ ان کی قسمت اچھی تھی۔ سڑک سنسان تھی، کوئی انہیں دیکھنے والا نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے یہ وقت انہوں نے جان بوجھ کر منتخب کیا ہو۔

یہ وقت وہ تھا جب غیاث الدین تغلق کا بڑا بیٹا ملک فخر الدین جونا عرف الغ خان تلنگانہ کی مہم پر نکلا ہوا تھا۔ پرانے ارکان دولت اور ممتاز علائی امیر اس کے ساتھ تھے۔ حاکم ورنگل اور دیواس کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکا اور قلعہ بند ہو گیا۔

الغ خان نے عاجز آ کر ایک طرف نقب زنی کا حکم دیا، دوسری طرف حملہ شروع کر دیا۔ اب راجا کے پاس کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ قلعہ ہاتھ سے نکلتا ہوا معلوم ہوا تو اس نے روایتی تدبیر کی۔ الغ خان کی خدمت میں ہاتھی اور بیش بہا جواہرات بھیجے اور وعدہ کیا کہ جو رقمیں اور ہدیے وغیرہ علاؤ الدین خلجی کے عہد حکومت میں دیا کرتا تھا وہ بہ دستور جاری رکھے گا۔ الغ خان نے ان شرائط کو منظور نہیں کیا اور محاصرہ جاری رکھتے ہوئے قلعہ فتح کرنے میں مشغول ہو گیا۔

محاصرہ طول پکڑتا جا رہا تھا لیکن ایک مہینا ہو گیا تھا اور دہلی سے کوئی ڈاک نہیں پہنچی تھی۔ یہ غیر معمولی بات تھی کیونکہ ہفتے میں دو مرتبہ ڈاک ضرور آتی تھی۔ الغ خان بادشاہ کی طرف سے ہدایت کا منتظر تھا، اب اسے دہلی کے حالات کی

فکر ستانے لگی تھی۔

عبید شاعر اور شیخ زادہ دمشقی دہلی سے نکل کر سیدھے اس کے پاس پہنچے تھے۔ یہاں پہنچ کر انہیں سب سے پہلی خبر یہ ملی تھی کہ دہلی سے ڈاک کا سلسلہ بند ہوگیا ہے اور الغ خان اس صورتِ حال سے سخت پریشان ہے۔ ان کے سازشی ذہنوں نے اسی وقت ایک سازش تیار کرلی۔

الغ خان کے لیے یہ دونوں اجنبی نہیں تھے۔ دونوں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے۔ الغ خان بھی حضرت کا عقیدت مند تھا۔ ان دونوں سے وہاں ملاقات کر چکا تھا۔ عبید کی شاعرانہ حیثیت کا بھی قائل تھا۔ اس نے جب سنا کہ وہ دونوں دہلی سے یہاں پہنچے ہیں تو اسے لامحالہ یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ ان سے ملاقات کی جائے تاکہ بادشاہ کی خیریت معلوم ہو۔

یہ دونوں تو چاہتے ہی یہ تھے کہ کسی طرح شہزادے کا قرب حاصل ہوجائے۔ اب پیاسے اور کنویں والا معاملہ تھا۔ کنواں خود پیاسوں کو بلا رہا تھا۔ وہ دونوں ملازموں کی طرح حاضر ہوگئے۔

''تم دونوں دہلی سے یہاں آئے ہو۔ کیا بتا سکتے ہو ایسے کیا حالات ہوئے ہیں کہ دہلی سے رابطہ ہی ختم ہوگیا ہے۔ راستے میں وہ چوکیاں تو دیکھی ہوں گی جن کے ذریعے سرکاری ڈاک یہاں تک پہنچتی تھی؟''

''ہم نے چوکیوں پر توغور نہیں کیا لیکن دہلی سے کئی سو میل دور پہنچنے کے بعد یہ خبر ضرور سنی تھی کہ.....'' یہاں تک کہنے کے بعد دونوں خاموش ہوگئے تھے۔

''کیا خبر سنی تھی، کیا ہوا..... تم بولتے کیوں نہیں؟ خاموش کیوں ہو؟''

''خبر یہ سنی تھی کہ آپ کے والد سلطان غیاث الدین تغلق کو چند امرا نے سازش کرکے قتل کرادیا ہے اور آپ کے چچازاد بھائی فیروز خاں کو تخت پر بٹھانے کی تیاریاں ہورہی ہیں۔ آپ کے علم میں ہے کہ شہزادہ فیروز کی ننھیال ہندو مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے ممکن ہے اس سازش میں کچھ ہندو راجا بھی شریک ہوں۔'' عبید شاعر نے تفصیل بتائی۔

''کیا تم یہ خبر پورے وثوق سے بیان کررہے ہو؟''

''ہم نے تصدیق تو نہیں کی۔ ہم نے سوچا بھی تھا کہ دہلی واپس جاکر اس کی تصدیق کریں لیکن ہمیں ہمت نہیں ہوئی اور ہم آپ کی پناہ میں آگئے۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے کس کام سے دہلی چھوڑی تھی؟''

یہ سوال سن کر عبید شاعر تو کچھ دیر کے لیے لڑکھڑا گیا۔ لیکن شیخ زادہ دمشقی نے حالات کو سنبھال لیا اور ایسا جواز پیش کیا کہ شہزادے کو قائل ہونا پڑا۔

''میں ایک رات اوراد و وظائف کے بعد حالتِ مراقبہ میں تھا کہ میں نے تخت شاہی کو خون میں تیرتے ہوئے دیکھا۔ عالمِ محویت سے باہر نکلتے ہی میں نے فیروز شاہ (الغ خان کا چچازاد بھائی) کی سرگرمیوں پر نظر ڈالی تو مجھے یقین ہوگیا کہ میرا خواب جھوٹا نہیں۔ شہزادہ فیروز امرا سے سازباز کررہا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ میں بھی اس کا آنا جانا بڑھ گیا ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے خواجہ نظام الدینؒ کی دعاؤں سے اس کی مراد پوری ہوجائے گی۔''

''حضرت نظام الدینؒ کو اس کے عزائم کا علم ہے؟''

''یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن وہ شہزادے سے خوش بہت ہیں۔''

''آگے سنا۔''

''مجھے یہ خواب دیکھ کر دہلی میں رہنے سے خوف محسوس ہونے لگا۔ میں نے اپنا خواب عبید کو سنایا۔ وہ بھی خوف زدہ ہوگیا۔ ہم دونوں نے طے کیا کہ آپ کی سرکار میں حاضر ہوں اور آپ کو مطلع کردیں تاکہ آپ نقصان سے بچ جائیں۔''

ایک مہینے سے ڈاک نہیں آئی تھی لہٰذا الغ خان کو ان کی باتوں پر یقین آگیا کہ دہلی میں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

''میں اس مہم سے فارغ ہوتے ہی لشکر لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوجاؤں گا۔ اس وقت تک تمہیں یہ کرنا ہے کہ ان باتوں کا علم لشکر میں کسی کو نہ ہونے پائے ورنہ لشکر میں بددلی پھیل جائے گی۔''

''شہزادۂ مکرم! ایسی باتیں چھپنے والی نہیں ہوتیں۔ کوئی اور ذریعہ ان خبروں کو لشکر تک پہنچادے گا۔''

''اس وقت تک تو میں ورنگل فتح کرچکا ہوں گا۔''

ان دونوں نے شہزادے کو مشورہ دیا کہ وہ محاصرہ اٹھا کر دہلی چلے جائیں اور وہاں کے حالات دیکھ کر کوئی قدم اٹھائیں۔ شہزادہ محاصرہ اٹھانے پر تیار نہیں تھا۔ وہ دونوں کئی دن برابر اس کے پاس آتے رہے اور اسے محاصرہ اٹھانے پر مجبور کرتے رہے۔ وہ کیوں ایسا کررہے تھے، تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ کس کے کہنے پر کررہے تھے اس کے شواہد بھی نہیں ملتے۔ شاید وہ اپنی سازشی فطرت سے مجبور تھے۔

جب ان کے اصرار کے باوجود شہزادہ محاصرہ اٹھانے پر تیار نہیں ہوا تو انہوں نے سوچا کوئی ایسی چال چلنی چاہیے جس سے لشکر میں افراتفری پیدا ہوجائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے انہوں نے چار قدیم امرا کا انتخاب کیا۔ یہ چاروہ تھے جو غیاث الدین تغلق کی بادشاہت سے پہلے علاؤالدین خلجی کے دربار سے وابستہ رہ چکے تھے۔ ان میں سے ایک ملک تگین تھا، اس کا تعلق اودھ سے تھا۔ دوسرا ملک تمر تھا۔ تیسرا ملک گل افغان اور چوتھا ملک کافور مہردار۔

یہ چاروں اپنی اپنی فوج کے ساتھ شہزادے کی فوج میں شامل تھے۔ اگر یہ امرا کسی وقت شہزادے کا ساتھ چھوڑ دیتے تو شہزادے کے لیے جان بچانا مشکل ہوجاتا۔

سہولت یہ بھی تھی کہ ان چاروں کی وفاداری کو بہ آسانی مشکوک بنایا جاسکتا تھا۔

عبید شاعر اور شیخ زادہ دمشقی نے یہ کہہ کر ان چاروں کو خلوت میں جمع کیا کہ وہ انہیں ایک خاص خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔

یہ امرا جمع ہوگئے تو سب سے پہلے ملک تگین نے بولنا شروع کیا۔

''وہ کون سے خطرات ہیں جن سے آپ حضرات ہمیں آگاہ کرنا چاہتے ہیں؟''

''شاید آپ کے علم میں اب تک نہ ہو کہ غیاث الدین تغلق قتل کیا جاچکا۔ فیروز تغلق نے تخت پر قبضہ کرلیا ہے۔''

''کیا تم یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہے ہو؟''

''نہیں، ہم نے راستے میں خبریں سنی ہیں۔''

''یہ خبریں غلط بھی تو ہوسکتی ہیں۔''

''یہ خبریں غلط ہوسکتی ہیں لیکن ان کے ردعمل میں شہزادے نے جو باتیں کی ہیں وہ غلط نہیں اور ان باتوں کا تعلق آپ چاروں سے ہے۔''

''غالباً یہی وہ خطرہ ہے جس سے آپ ہمیں آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔'' ملک تگین نے نیم طنزیہ انداز میں کہا۔

''شہزادے کا خیال ہے کہ علائی امرا بھی اس سازش میں شریک ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ آپ چاروں اور دیو کے خلاف بے دلی سے لڑرہے ہیں۔ اسی لیے ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ شہزادے نے مجھے اعتماد میں لے کر اس عزم کا بھی اظہار کیا کہ وہ آپ چاروں کو قتل کرادے گا اور محاصرہ اٹھا کر اپنے بھائی فیروز سے لڑنے کے لیے جائے گا۔ آپ کو اسی لیے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا کہ آپ علاؤالدین خلجی کے دربار سے وابستہ رہ چکے ہیں اور تغلق خاندان کے وفادار نہیں۔ آپ اسے نقصان ہی پہنچاتے رہیں گے جس طرح اب نقصان پہنچا رہے ہیں۔ آپ لوگ اب اپنی فکر کریں۔ اس سے پہلے کہ الغ خان دہلی جائیں آپ لوگ دہلی پہنچ کر نئے بادشاہ سے ربط و تعلق پیدا کریں۔''

یہ باتیں کچھ ایسی دردمندی سے کہی گئی تھیں کہ ان امرا کو یقین آگیا البتہ ملک تمر کچھ تذبذب میں تھا۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔

''اگر یہ باتیں درست بھی ہیں تو آپ دونوں کو ہم سے کیا ہمدردی ہے جو بتانے چلے آئے؟''

''ہم دونوں مشہور زمانہ ولی حضرت نظام الدینؒ کے صحبت یافتہ رہ چکے ہیں۔ ان کی خانقاہ میں رہ کر ہم نے یہی سیکھا ہے کہ انسانی ہمدردی ہی اصل انسانیت ہے۔ اسی جذبے نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم آپ کو خطرے سے آگاہ کردیں۔''

ان دونوں کے چلے جانے کے بعد ان امرا نے آپس میں مشورہ کیا۔

''شہزادہ الغ خان ہماری طرف سے شک میں مبتلا ہوگیا ہے۔ ان بادشاہوں کے شیشۂ دل میں جب شک کا بال آجائے تو کبھی نکلتا نہیں۔ شہزادہ الغ خاں ہمیں قتل کرائے بغیر نہیں مانے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے منصوبے پر عمل کرے اپنے اپنے لشکر لے کر الگ ہوجاؤ۔''

''ہم یہاں سے نکل کر کہاں جائیں۔ ابھی دہلی کی طرف جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''ہمیں فی الحال چاہیے کہ اپنے اپنے علاقوں کی طرف چلے جائیں۔ وہاں بیٹھ کر حالات پر نظر رکھیں۔ جیسے حالات ہوں اسی کے مطابق عمل کریں۔''

''دوستو! ہم اس پر بھی سوچ لیں تو بہتر ہوگا کہ اگر الغ خاں اپنے بھائی کو شکست دینے میں کامیاب ہوگیا اور بادشاہ بن گیا تو ہمارا کیا ہوگا۔''

''ہم چاروں الغ خان کو بادشاہ نہیں بننے دیں گے۔ اگر دونوں بھائیوں میں لڑائی چھڑی تو ہم اپنے اپنے لشکر لے کر فیروز تغلق کی مدد کے لیے دہلی پہنچ جائیں گے۔''

یہ چاروں امیر رات کے اندھیرے میں اپنے اپنے لشکر لے کر الگ ہوگئے۔ ان کے الگ ہوتے ہی لشکر میں ایسی افراتفری پھیلی کہ عام سپاہیوں نے بھی بھاگ جانے ہی میں عافیت جانی۔

شہزادہ اس ناگہانی آفت سے گھبرا گیا۔ اب محاصرہ جاری رکھنے اور جنگ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شہزادے کے ساتھ ایک مختصر سی فوج رہ گئی تھی۔ اس فوج کو لے کر وہ دیوگڑھ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس علاقے پر غیاث الدین کی حکمرانی تھی۔

اس کے دیوگڑھ پہنچتے ہی دہلی سے ڈاک پہنچی۔ ان

مراسلات پر شاہی مہر ثبت تھی۔ بادشاہ کی صحت وسلامتی کی خبر ملتے ہی الغ خان پوری بات سمجھ گیا۔ یہ ایک سازش تھی جو اس کے خلاف کی گئی تھی۔ اب اسے ان سازشیوں کا قلع قمع کرنا تھا۔

شہزادہ الغ خان نے تمام حالات سلطان کی خدمت میں لکھ کر بھیج دیے۔

اس نے اپنی مختصر فوج سے کام لیا۔ ملک افغان اور ملک کافور گرفتار کر لیے گئے۔ عبید شاعر اور شیخ زادہ مشقی دہلی واپس نہیں جا سکتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ ان کی پناہ گاہ بن سکتی تھی لیکن حضرت نظام الدینؒ ان دونوں سے ناراض تھے۔ شاید اسی لیے یہ دونوں جگہ جگہ حضرت نظام الدینؒ کا نام لیتے پھر رہے تھے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ اس سازش میں حضرت نظام الدینؒ بھی شریک ہیں۔ اس کی سزا تو انہیں ملنی ہی تھی۔ وہ پناہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتے پھر رہے تھے کہ گرفتار کر لیے گئے۔

ملک تگین کو مرہٹواڑی کے ہندوؤں نے قتل کر دیا اور اس کی کھال الغ خان کے پاس بھیج دی۔ ملک تمر تلنگانہ پہنچا اور مع اپنے ہمراہیوں کے قتل کر دیا گیا۔

دہلی سے سلطان کا فرمان موصول ہوا کہ تمام قیدیوں کو دہلی بھیج دیا جائے۔

ابھی یہ تینوں یعنی ملک افغان، عبید شاعر، ملک کافور اور ان کے چند ساتھی دہلی پہنچے نہیں تھے کہ ان کے خاندان کے افراد زنجیروں سے جکڑ دیے گئے۔

تمام حالات کی چھان بین کی گئی تو صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ شہزادہ فیروز حضرت نظام الدینؒ کی خدمت میں مسلسل حاضری دیتا رہا ہے۔ اس کے سوا کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ اس نے فیروز شاہ کو حکم دیا کہ وہ آئندہ ولی کی خانقاہ میں قدم نہیں رکھے گا۔ شاہی خاندان کے دیگر افراد پر بھی پابندی عائد کر دی کہ کوئی شخص شیخ نظام الدینؒ سے میل ملاپ نہ رکھے۔

اعلان کیا گیا کہ قصر شاہی کے سامنے قیدیوں کو عبرت ناک سزا دی جائے گی۔ اعلان سنتے ہی پورا شہر امڈ آیا۔ سب کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں کہ دیکھیے بادشاہ نے ان کے لیے کیا سزا تجویز کی ہے۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ نقارے بجنے لگے۔ نقاروں کی گونج کے ساتھ ہی سلطان غیاث الدین تغلق جھروکے میں آ گیا۔ اس کے وزرا بھی اس کے ساتھ تھے۔ سلطان کے بیٹھتے ہی قیدیوں کو میدان میں لایا گیا جن کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ملک تمر، عبید شاعر، شیخ زادہ و مشقی آگے تھے اور ان کے پیچھے ان کے اہل خاندان تھے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ قصر شاہی کے سامنے ان سب کو زمین پر اوندھا لٹا دیا گیا۔ اس کے بعد کئی ہاتھی نمودار ہوئے جو ان بدنصیبوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ زمین قیدیوں کے خون سے سرخ ہو گئی۔ اس دردناک منظر کو دیکھ کر پورا میدان چیخوں سے گونج اٹھا۔

''میں ان بدبختوں کو یہ سزا دینے پر مجبور ہو گیا تھا کیونکہ ان لوگوں نے وہ کام کیا تھا کہ اگر یہ کامیاب ہو جاتے تو پورے ملک میں افراتفری پھیل چکی ہوتی۔ انہوں نے میرے قتل کی جھوٹی خبر اڑائی۔ جھوٹی خبر اڑانے والوں کی یہی سزا ہونی چاہیے۔''

سلطان غیاث الدین نے اپنے وزرا سے کہا اور اپنی نشست چھوڑ دی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے وزرا بھی قصر کی بالائی منزل سے نیچے اتر آئے۔

اگلے چار مہینوں میں الغ خان نے اپنی منتشر افواج کو جمع کیا۔ نئی بھرتیاں بھی کیں اور ایک لشکر عظیم لے کر دیوگڑھ سے ورنگل پر حملہ آور ہونے کے لیے نکلا۔ پہلے بیدر کا قلعہ فتح کیا جو تلنگانہ کی سرحد اور راجا ورنگل کے زیر حکومت تھا۔ راستے کے دیگر قلعے بھی فتح کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ان قلعوں کی حفاظت کے لیے معتمد امرا اور سرداروں کو چھوڑتا ہوا ورنگل پہنچ گیا۔ اس مرتبہ وہ اس جوش سے لڑا کہ بہت کم مدت میں ورنگل کا قلعہ فتح کر لیا۔ جوش انتقام میں بہت سے ہندوؤں کو تہ تیغ کیا اور رائے اور دیو حاکم ورنگل کو اس کے بیٹے اور بیوی سمیت گرفتار کر لیا۔ کوہ پیکر ہاتھی اور لاتعداد خزانہ بھی اس کے ہاتھ لگا۔

فتح نامہ دہلی پہنچا تو چراغاں کی روشنی سے پورا شہر جگمگا اٹھا۔ کئی دن تک خوشیاں منائی جاتی رہیں۔

الغ خان نے ورنگل کا نام سلطان پور رکھا اور راجا ورنگل کو بہ حالت اسیری دہلی کی طرف بھیج دیا۔ خود سیر و سیاحت کرتا ہوا جاج نگر پہنچا اور وہاں کے راجا سے بھی بہ طور ہدیہ چالیس ہاتھی وصول کر کے باپ کی خدمت میں روانہ کر دیے۔

لکھنو اور سنار گاؤں کے چند امرا دہلی پہنچے۔ انہیں وہاں کے حاکموں سے شکایات تھیں۔ یہ امرا سلطان غیاث الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے جور و ستم اور مسلمانوں کی بے بسی کی کیفیت اسے سنائی۔ سلطان ان کی گزارشات سے بہت متاثر ہوا۔ مسلمانوں کی حالت زار کا سن کر تو وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے ان امرا سے وعدہ کیا کہ وہ اس دور دراز کی مہم پر ضرور روانہ ہوگا اور مسلمانوں کو مظالم سے نجات دلائے گا۔

سلطان نے الغ خان کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ

نہایت تیز رفتاری کے ساتھ جیسا بیٹھا ہے اسی طرح اٹھ کر چلا آئے۔ الغ خان فوراً دہلی پہنچا اور باپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ سلطان نے الغ خان کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود لکھنوتی جانے کا ارادہ اس پر ظاہر کیا۔

''الغ خان! تجھے عبید اور شیخ زادہ دمشقی یاد ہے؟''

''سلطان معظم! میرا حافظہ انہیں کیسے فراموش کرسکتا ہے۔''

''پھر تجھے یہ بھی یاد ہوگا کہ ان دونوں کا تعلق شیخ کی خانقاہ سے تھا۔''

''انہوں نے یہی بتایا تھا بلکہ میں نے انہیں خانقاہ میں دیکھا بھی تھا۔''

''میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ انہیں شیخ کی حمایت حاصل نہیں تھی لیکن کسی فتنے سے بچنے کے لیے میں نے شیخ نظامؒ پر ہاتھ نہیں ڈالا۔''

''آپ نے اچھا کیا۔''

''میں تجھے یہ بتا دینا چاہتا ہوں میرے بیٹے کہ میں بنگالہ کی طرف جارہا ہوں۔ میری عدم موجودگی میں تو ان خانقاہ نشینوں سے ہوشیار رہنا۔ ان خانقاہ نشینوں نے عوام کو ورغلا کر اپنی طرف کرلیا ہے اور یہ جسارت اکثر کرتے رہتے ہیں کہ بادشاہوں کے تختے الٹ کر اپنی مرضی کے لوگ سامنے لائیں۔ میں تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ ان خانقاہوں میں قدم نہ رکھنا۔ خاص طور پر نظام الدین ولیؒ سے ہوشیار رہنا۔ میں ان کی قسمت کا فیصلہ بنگال سے واپس آنے کے بعد سناؤں گا فی الحال اس قصے کو یہیں دبا رہنے دو۔''

اس نصیحت کے بعد سلطان غیاث الدین لشکر کے ساتھ لکھنوتی روانہ ہوگیا۔

❁❁❁

دہلی کی گلیوں میں خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔ ہر آنکھ دوسری آنکھ سے پوچھ رہی تھی کہ دیکھو اب کیا دیکھنے کو ملے۔ لوگ سرگوشیوں میں باتیں کررہے تھے۔ ایسا خوف تو کسی غنیم کی آمد پر بھی محسوس نہیں کیا گیا تھا۔

اس خوف کا باعث وہ پیغام بنا تھا جو سلطان غیاث الدین نے بنگال سے بھیجا تھا۔ پیغام لانے والے نے حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں حاضری دی تھی اور چند سطری پیغام آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

''میں بنگالہ سے دہلی پہنچوں تو آپ کو دہلی میں نہ دیکھوں۔ اب دہلی میں آپ رہیں گے یا میں رہوں گا۔''

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اس خط کو پڑھ کر ایک طرف رکھ دیا اور فرمایا ''ہنوز دلی دوراست یعنی ابھی دلی دور ہے۔''

یہ پیغام حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں بھیجا گیا تھا لیکن دوسروں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ اس کے ساتھ ہی آپ کا جواب بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔

''ہنوز دلی دوراست''

اس پیغام سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ بادشاہ دہلی آنے کے بعد سلطان المشائخ کو قتل کرا دے گا یا پھر مجبور کرے گا کہ وہ دہلی چھوڑ کر چلے جائیں۔ حضرت کے جواب کے بھی چرچے ہورہے تھے۔ آپؒ کے جواب سے معلوم ہو رہا تھا کہ آپ بادشاہ کو دہلی نہیں آنے دیں گے یا اسے دہلی آنا نصیب نہیں ہوگا۔

اس پیغام کی شہرت ہوتے ہی لوگوں نے خانقاہ نظامی کا رخ کرنا شروع کردیا تھا تاکہ حقیقت معلوم ہو۔ شیخ کے مرید تصدیق کررہے تھے کہ ایسا پیغام آیا ہے اور حضرت نے یہ جواب دیا ہے۔

پیغام بھیجنے والا اور پیغام وصول کرنے والا دونوں ہی اپنی اپنی مملکت کے بادشاہ تھے۔ غیاث الدین دنیاوی سلطنت کا بادشاہ تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ روحانی سلطنت کے سلطان تھے۔ روحانی سلطنت کے حکمران کے اثرات سلطان غیاث الدین سے کہیں زیادہ تھے۔ بادشاہ کے اردگرد موجود امرا اور فوجی سردار تک نظام المشائخ کے عقیدت مند تھے۔ عام لوگوں کی عقیدت کا تو کوئی حد وحساب ہی نہیں تھا۔

یہ تاثر عام ہوگیا تھا کہ بادشاہ دہلی میں قدم رکھتے ہی نظام الدین اولیا کو قتل کرادے گا۔ بے بسی یہ تھی کہ کوئی شخص بادشاہ کو اس کے ارادے سے باز رکھنے پر قادر نہیں تھا۔ چند نفوس ایسے بھی تھے جو بالکل مطمئن اور شاداں وفرحاں نظر آرہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ جب حضرت نے فرمادیا کہ دلی ابھی دور ہے تو سلطان، دلی سے دور ہی رہے گا اور حضرت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

یہ تمام خبریں الغ خان کو بھی مل رہی تھیں جو اس وقت دہلی میں غیاث الدین تغلق کی نیابت کررہا تھا۔ الغ خان بھی اب سے کچھ دنوں پہلے تک خانقاہ میں حاضر ہوتا رہا تھا لیکن باپ کی نصیحت کے بعد اس نے وہاں جانا چھوڑ دیا تھا مگر جب دہلی میں ہلچل مچی اور اس پیغام کا شہرہ ہوا تو وہ ایک دن خانقاہ پہنچ گیا۔

''حضرت! میرے کانوں تک کچھ باتیں پہنچ رہی ہیں۔ میں دریافت کرنے آیا ہوں کہ ان میں کتنی حقیقت ہے۔''

''تیرا اشارہ غالباً اسی پیغام کی جانب ہے جو تیرے باپ نے میرے پاس بھیجا ہے۔''

''جی بندہ پرور، میں اسی پیغام کے الفاظ سننا چاہتا ہوں۔''

نظام الدین اولیاؒ نے بادشاہ کی تحریر اس کے سامنے رکھ دی۔ ''ہم فقیروں سے اسے اتنا ملال نہ جانے کیوں ہے کہ وہ ہمیں دہلی سے نکال دینا چاہتا ہے۔''

''ابا حضور کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ وہ دہلی تشریف لے آئیں تو میں ان کا دل آپ کی طرف سے صاف کردوں گا۔''

''تو کیوں اتنا فکرمند ہوتا ہے۔ بادشاہت تو تیرے نام کردی گئی ہے۔''

''سلطان معظم کی موجودگی میں؟''

''تقدیر میں کیا ہے تجھے کیا معلوم۔ بنگال سے دہلی بہت دور ہے۔ انتظار کر اور دیکھتا جا۔''

الغ خان محل میں واپس آیا تو ''ہنوز دلی دوراست'' کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ان الفاظ کا مجھے کیا مطلب لینا چاہیے۔ کیا شیخ کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ زندہ سلامت دہلی تک نہیں پہنچ سکے گا؟ اگر یہ مطلب ہے تو مجھے چاہیے کہ میں شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کروں اور ممکن ہو تو وہیں اس کے قیام کا بندوبست کردوں اور یہ کوشش کروں کہ بادشاہ اور سلطان المشائخ کے درمیان صلح کا کوئی راستہ نکل آئے۔

الغ خاں کا دماغ ایک موجد کا دماغ تھا۔ نئی نئی باتیں سوچا کرتا تھا اور پھر ان پر عمل کرانے کے لیے بضد ہوجاتا تھا۔ اس موقع پر بھی ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے مہندس کو بلوایا اور اس پر اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

''سلطان معظم لشکر سے الگ ہوکر تیزی کے ساتھ دارالخلافہ کی طرف آرہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں دہلی سے تین چار کوس کے فاصلے پر افغان پور کے قریب ایک چھوٹا سا کوشک تیار کیا جائے کہ سلطان رات کو وہاں قیام کریں اور دوسرے روز صبح کو شاہی شان وشوکت کے ساتھ شہر میں داخل ہوں۔''

''سلطان کو افغان پور تک پہنچنے میں کتنے دن لگیں گے؟'' مہندس نے پوچھا۔

''انہیں کتنے بھی دن لگیں۔ یہ محل تین دن میں تیار ہوجانا چاہیے۔''

مہندس نے مزدور لگا دیے اور کوشک کی تعمیر شروع ہوگئی۔ تیسرے دن الغ خان اس نوتعمیر کوشک کے معائنے کے لیے گیا۔ زمین کی سطح سے کچھ بلند حصے پر پوری عمارت کھڑی نظر آرہی تھی۔ الغ خان بڑی دیر تک اس عمارت کے مختلف حصوں کو دیکھتا رہا۔ اسے یہ بات بری طرح کھٹک رہی تھی کہ پوری عمارت لکڑی کے تختوں کی مدد سے تیار کی گئی تھی۔

''کیا تجھے اس عمارت کے لیے پتھروں سے کام نہیں لینا چاہیے تھا؟''

''شہزادہ حضور، میں مہندس ہوں۔ کس موقع پر کیا چیز بہتر ہے مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ لکڑی کے تختوں کو میں نے علم ہندسہ کے اعتبار سے اس طرح آپس میں جوڑا ہے کہ اگر اس پر ہاتھی بھی کودیں تو ان تختوں کو جنبش نہ ہو۔''

شہزادے نے زیادہ بحث مناسب نہیں سمجھی۔ وہ بحث کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے سامنے اپنے دور کا عظیم مہندس کھڑا تھا۔

دہلی میں جشن تھا۔ دف اور طبل بجائے جارہے تھے کہ عصر کی نماز کے وقت بادشاہ کی آمد کا بگل بجا۔ کوشک سے کچھ فاصلے پر اس کے لشکر نے قیام کیا اور بادشاہ اپنے امرا، شہزادہ محمود اور شیخ زکریا ملتانی کے پوتے شیخ رکن الدین کے ہمراہ کوشک کی طرف بڑھا۔ شہزادہ الغ خان نے کوشک کے دروازے پر ان سب کا استقبال کیا اور انہیں لے کر اندر گیا۔

بادشاہ اس کوشک کو دیکھ کر خوش ہوا۔ الغ خان کے عزم وہمت کی تعریف کرتا رہا۔ مہندس کو بھی داد دی کہ اس نے اتنی قلیل مدت میں تعمیر مکمل کی۔

بادشاہ نے الغ خان سے نئی عمارت کے بنوانے کا سبب پوچھا اور جب بیٹے کی خواہش معلوم ہوئی تو اس کا دل رکھنے کے لیے اسی محل میں مقیم ہوگیا۔

دوسرے روز الغ خان مع اپنے ارکان دولت کے بادشاہ کی قدم بوسی کے لیے آیا اور ضیافت کے لیے دسترخوان سجا دیا گیا۔

کھانے سے فراغت کے بعد حاضرین یہ سمجھ کر باہر آگئے کہ بادشاہ اسی وقت دارالخلافہ جائے گا۔ الغ خاں بھی گھوڑوں، ہاتھیوں اور دوسرے لوازم شاہی کی ترتیب کے لیے باہر چلا آیا۔ اسی وقت بنگال سے آئے ہوئے ہاتھیوں کی نمائش، دوڑ کی شکل میں شروع کردی گئی کہ بادشاہ جب کوشک سے باہر آئے گا تو یہ ہاتھی اس کے سامنے ملاحظہ کے لیے پیش کیے جائیں گے۔

ان ہاتھیوں کی بھاگ دوڑ اور دھمک سے زمین ہل گئی یا نیچے دب گئی اور عمارت کی چھت زمین پر آگئی۔ بادشاہ اور

شور مچا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کدال اور بیلچے منگوائے گئے اور ملبا ہٹایا جانے لگا۔ ملبا ہٹا تو معلوم ہوا تاخیر ہو چکی۔ بادشاہ اور شہزادہ محمود دونوں شہید ہو چکے تھے۔

خوشی کے شادیانوں نے ماتمی دھنوں کی صورت اختیار کر لی۔

شہزادہ محمود کی وفات کے بعد الغ خاں کے سوا کوئی تخت کا وارث نہیں تھا۔ الغ خاں، ابوالمجاہد محمد شاہ تغلق کے لقب سے تخت نشیں ہوا۔

مورخوں کے لیے سلطان غیاث الدین کی موت کا واقعہ عقدہ لاینحل بنا رہا ہے۔ بعض لوگوں نے الغ خاں کو قصور وار ٹھہرایا ہے کہ اس نے بادشاہ کی جان لینے کی غرض سے اتنی کم مدت میں محل تعمیر کرایا اور قصداً باپ کی جان لی۔ ایک مورخ حاجی محمد قندھاری نے بیان کیا ہے کہ آسمان سے بجلی گری اور چھت کو توڑتی ہوئی بادشاہ کے سر پر آ گری۔ یہ بھی کہا جاتا ہے مہندس جس نے محل کی تعمیر کی وہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کا مرید تھا۔ اس نے اپنے مرشد کی جان بچانے کے لیے ایسا کمزور محل تعمیر کیا کہ بادشاہ دہلی تک نہ پہنچ سکے۔ عام لوگ بادشاہ کی موت کو اس فقرے کا نتیجہ سمجھتے رہے جو حضرت نظام الدین اولیاؒ سے منسوب تھا یعنی ہنوز دلی دوراست (ابھی دلی دور ہے)

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی دور بینی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ بادشاہ دہلی نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس فقرے کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ سازشیں تیار ہو گئی ہوں۔

جب سلطان محمد تغلق دروازہ بدایوں میں داخل ہوا اور دولت خانے میں آیا تو امراؤں کا برہاتھیوں پر سوار ہو کر سونے اور چاندی کے تنکوں سے بھرے ہوئے طشت اپنے سامنے رکھے ہوئے مٹھیاں بھر بھر کر کوچوں اور بازاروں میں پھینک رہے تھے۔ لوگوں نے سونے چاندی کے تنکوں سے اپنی پگڑیاں اور مٹھیاں بھر لیں۔ لوگ چلا چلا کر سلطان محمد کو دعائیں دے رہے تھے۔

⊕⊕⊕

سلطان محمد عجائب مخلوقات سے تھا۔ اس کے مزاج میں اجتماع ضدین پایا جاتا تھا۔ کبھی چاہتا تھا سکندر کی طرح ساتوں اقلیم فتح کر لے۔ کبھی یہ ارادہ کرتا کہ جن دانس اس کی اطاعت سے باہر نہ رہیں۔ کبھی یہ آرزو کرتا کہ سلطنت اور نبوت کو آپس میں ملا دے، ملکی و شرعی احکام کو اپنے اختیار سے جاری کرے۔ دوسری طرف یہ حال تھا کہ صرف روزہ نماز ہی کا پابند نہیں تھا بلکہ اوراد و وظائف بھی بڑی پابندی سے ادا کرتا تھا۔ ناجائز افعال، مے نوشی اور ان تمام چیزوں سے جن سے گناہ کا ارتکاب ہوتا، پرہیز کرتا تھا۔ اس کے مورخ ضیا الدین برنی نے اس کے متضاد کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا۔

''نشہ آور اشیا میں سے کوئی بھی چیز اس نے کبھی نہیں چکھی۔ زنا کے قریب بھی نہیں پھٹکا۔ کسی طرح کا جوا نہیں کھیلتا تھا۔ فسق و فجور کی مروجہ شکلوں سے احتراز و اجتناب کرتا تھا۔

ان خوبیوں کے باوجود مسلمانوں اور عمدہ عقیدہ رکھنے والے مومنوں کا خون سزا دینے کے سلسلے میں پانی کی نہر کی طرح اپنے محل کے سامنے بہاتا تھا۔''

بادشاہوں سے منسوب سیر و شکار کے قصے تو سنے ہیں لیکن سلطان محمد تغلق انسانوں کا شکار کرتا تھا۔ ظلم و ستم میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ کوئی ہفتہ ایسا نہ جاتا کہ جس میں مشائخ و سادات، صوفی، قلندر، اہل قلم اور سپاہی اس کی سیاسی حکمت عملی کا شکار نہ ہوتے ہوں۔

اس کی فیاضی اور بخشش حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ اتنا دیتا کہ لینے والا حیرت میں رہ جاتا۔ کتنے ہی محتاج اس کی بخشش کے سبب امرائے وقت میں شمار ہونے لگے تھے۔

ان فیاضیوں کے برعکس جب اس کے مظالم پر نظر جاتی تو وہ درندہ نظر آتا تھا جس کے محل کے نیچے انسانی لاشیں پڑی رہتی تھیں۔ وہ اسے رعب سلطانی کا ذریعہ سمجھتا تھا لیکن ظلم تو ظلم ہے۔ لوگ اس کی طرف سے متنفر ہوتے جا رہے تھے۔

اس کی طبیعت میں بے انتہا ضد تھی۔ جو خیال ایک مرتبہ اس کے دل میں آ جاتا وہ اسی پر عمل کرتا۔ مشیروں کی مجال نہیں تھی کہ اس کی رائے سے اختلاف کرتے۔ حالت یہ ہو گئی کہ اس کے حکام عاجز آ گئے۔ اگر عوام کی نفرت کا خیال کر کے ان کے اجرا میں کچھ توقف اور سستی کرتے تو طرح طرح کی سزائیں بھگتنی پڑتی تھیں اور اگر جاری کرتے تو مخلوق برباد ہوئی جاتی تھی۔ وہ بضد تھا کہ اس کے احکامات پر عمل کیا جائے۔

اس کے ان مظالم کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر مضبوط علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ خزانہ خالی ہو گیا۔ اطراف کے علاقوں سے خراج آنا بند ہو گیا۔ اس نے دوستوں کو دشمن بنا لیا۔

اقتدار پسند لوگ للچائی آنکھوں سے دہلی کی طرف دیکھنے لگے۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ دہلی کے عوام، امرا اور عہدے دار بادشاہ سے نالاں ہیں۔ وہ درویشوں اور صوفیوں کا قائل نہیں لہٰذا یہ طبقہ بھی اس کے خلاف ہو چکا ہے۔ اس وقت اگر کوئی طالع آزما نکلے اور علم بغاوت بلند

کرے تو یقیناً کامیابی ہوگی۔

ان طالع آزماؤں میں محمد تغلق کا چچا زاد بھائی بہاؤالدین گرشاسپ بھی تھا۔

گرشاسپ دکن میں ولایت ساغر کا جاگیردار تھا۔ اسے یہ گمان تھا کہ وہ شاہی خاندان سے ہے۔ لوگ اس کا ضرور ساتھ دیں گے۔ صوفی اور مشائخ اس کی پشت پر تھے۔ یہ وہ دور تھا جب صوفیہ اور مشائخ کا عوام پر بے انتہا اثر تھا۔ بادشاہتوں کا دارومدار بڑی حد تک ان مشائخ پر تھا۔ ہر تحریک کا آغاز خانقاہوں سے ہوتا تھا۔

گرشاسپ نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے قلعۂ ساغر کو بہت مضبوط کر لیا اور لشکر کی تنظیم میں حد درجہ سرگرمی دکھانے لگا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی بڑے مقصد کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ محمد تغلق کے مخبران تیاریوں کی اطلاع حضور شاہی میں پہنچا رہے تھے لیکن محمد تغلق کو اس کی طرف سے کسی بغاوت کا اندیشہ نہیں تھا۔ وہ ان خبروں کو نظر انداز کرتا رہا۔ محمد تغلق کی غفلت نے گرشاسپ کے حوصلوں کو ہوا دی۔ اس نے علم بغاوت بلند کیا اور دکن کے دیگر امرا کو ہم خیال بنا کر ملک کے بہت سے حصوں پر قبضہ کر لیا۔ جو امرا اس کی حکمت عملی پر نہ چلے انہیں وہاں سے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ یہ امرا دہلی میں جمع ہوئے اور شکایات محمد تغلق تک پہنچائیں۔

محمد تغلق کی آنکھیں کھلیں تو دکن میں حالات تباہی کے دہانے تک پہنچ چکے تھے۔ محمد تغلق نے اس بغاوت کو سختی سے کچل دینے کے احکام جاری کیے۔ گجرات کے سپہ سالار خواجہ جہاں کو خط لکھا کہ وہ گرشاسپ کے خلاف لشکر کشی کرے۔ دارالسلطنت کے نامی امرا کو بھی گجرات کی طرف روانہ کیا۔

خواجہ جہاں نے لشکر آراستہ کیا اور گرشاسپ کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے سرگرم ہو گیا۔ گرشاسپ بھی اپنی فوج کے ساتھ مقابلے پر آ گیا۔ لڑائی شروع ہوئی تو گرشاسپ کا ایک فوجی سردار خضر بہرام، خواجہ جہاں سے آن ملا۔ گرشاسپ نے مقابلہ کیا لیکن خضر بہرام کی غداری نے اس کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور اپنی جاگیر ساغر کے قلعے میں پناہ لے لی۔

خواجہ جہاں اس کا پیچھا کرتا ہوا پہنچا تو اس نے اپنے بیوی بچوں کو ساغر میں چھوڑا اور ایک ہندو راجا کے پاس کرناٹک چلا گیا۔ یہ راجا اس کا طرف دار تھا۔ یہاں گرشاسپ کی خواجہ جہاں سے دو جنگیں ہوئیں جن میں خواجہ جہاں کو شکست ہوئی لیکن تیسری مرتبہ وہ غالب آ گیا۔ یہاں کا راجا گرفتار ہوا لیکن گرشاسپ فرار ہو کر بے جاپور کے راجا بلال دیو کے پاس پہنچ گیا۔ راجا کو معلوم تھا کہ شاہی افواج اس کا پیچھا کر رہی ہیں لہٰذا وہ ڈر گیا اور اس نے گرشاسپ کو پکڑ کر خواجہ جہاں کے پاس بھیج دیا۔

خواجہ جہاں نے گرشاسپ کو قیدی بنا کر بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔

محمد تغلق کے عہدِ حکومت کی یہ پہلی بغاوت تھی اور وہ بھی اس کے ایک رشتہ دار کی جانب سے۔ اس لیے وہ نہایت طیش میں تھا۔ کسی رعایت کی اس کی جانب سے توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس نے گرشاسپ کو اس حال میں اپنے سامنے طلب کیا کہ اس کے گلے میں طوق اور پیروں میں بیڑیاں تھیں۔

''میں نے تجھے ساغر کی صوبے داری تفویض کی۔ تجھے دیگر امرا کے مقابلے میں زیادہ عزت و مرتبہ دیا۔ تو نے میرے احسانات کا یہ بدلہ دیا کہ میرا ہی باغی بن گیا۔ کیا تو یہ سمجھتا تھا کہ میری جگہ لے لے گا۔ تیری وجہ سے کتنی جانیں ضائع ہوئیں۔ کتنے مقابلے کرنے پڑے۔ کیا تو اپنی صفائی میں کچھ کہہ سکتا تھا۔''

گرشاسپ کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ بس اتنا کہہ سکا۔ ''میں لوگوں کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔''

''کون ہیں یہ لوگ؟''

''ایسے حضرات جو برگزیدہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے سیکڑوں ارادت مند ہیں اور وہ سب میرا ساتھ دینے کا عہد کر رہے تھے۔ ان برگزیدہ ہستیوں نے مجھے بادشاہت کی نوید سنائی تھی۔''

''وہ بھی تیری طرح ہمارے مجرم ہیں۔ تو ہمیں بتا کہ ان معزز ہستیوں کے نام کیا ہیں۔''

گرشاسپ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ نام بتائے یا نہیں۔ پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ ان نام نہاد علما اور مشائخ کے نام اسے بتا دینے چاہئیں جنہوں نے پیش گوئیاں کی تھیں کہ بادشاہت اسی کا مقدر بن چکی ہے۔ وہ بادشاہ بننے کے بجائے قیدی کی حیثیت سے بادشاہ کے سامنے کھڑا ہے۔ کچھ دیر میں قتل کے احکام بھی صادر ہو سکتے ہیں۔ اس نے جھکی ہوئی گردن اٹھائی اور ان دنیا دار علما و مشائخ کے نام بتا دیے جنہوں نے اسے ورغلایا تھا۔

شاہی قاضی مفتی کمال الدین قریب ہی تشریف فرما تھے۔ وہ ایک ایک نام لکھتے رہے۔ یہ وہ فہرست تھی جنہیں

اس سازش میں شریک مجرموں کی حیثیت سے طلب کرنا مقصود تھا۔

''باغی گرشاسپ نے جو نام بتائے ہیں انہیں گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کیا جائے اور گرشاسپ کو اس وقت تک قید میں رکھا جائے جب تک یہ حضرات میرے سامنے پیش نہ ہو جائیں۔'' محمد تغلق نے حکم دیا۔

گرشاسپ کے بیان کردہ دنیادار علما اور جعلی مشائخ کو گرفتار کر لیا گیا۔ گرشاسپ نے ان کی شناخت بھی کر لی۔ اس کے بعد انہیں محمد تغلق کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس وقت دربار میں مفتی کمال الدین بھی موجود تھے اور مشہور مورخ ضیاالدین برنی بھی حاضر تھا۔

بادشاہ ان علما و مشائخ سے سوالات کرتا رہا اور یہ حضرات سخت خوف کے عالم میں جوابات دیتے رہے۔ ان کا جرم ثابت ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ بادشاہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے دربار میں جو قاضی اور مفتی تھے ان کے چہرے متغیر ہونے لگے ہیں۔ مورخ ضیاالدین برنی کے چہرے پر بھی ناگواری کے اثرات تھے۔ شاید اس لیے کہ یہ سب لوگ اس خیال سے خوف زدہ تھے کہ بادشاہ ایسے پابند شرع حضرات کو محض اس لیے سزا دینے پر تلا ہوا ہے کہ انہوں نے گرشاسپ کو بادشاہ کے خلاف ورغلایا تھا۔

بادشاہ نے اپنے مقربین کے خیالات کو بھانپ لیا۔ اس نے مورخ ضیاالدین برنی کو مخاطب کیا۔ اپنا اور ان مشائخ کا موازنہ کیا۔

''تم بتاؤ کیا میں پابند شرع نہیں ہوں۔ پانچوں وقت کی نماز نہیں پڑھتا؟ مجھے کبھی کسی نے نشے کی حالت میں دیکھا؟''

سب نے گواہی دی کہ بادشاہ پابند شرع ہے۔

بادشاہ نے پھر سب کو مخاطب کیا۔ ''اب میں تم سب سے یہ سوال کرتا ہوں کہ مجھے زنا یا کسی ایسے ہی حرام فعل میں مبتلا دیکھا یا سنا ہے؟''

سب ہی نے اقرار کیا کہ بادشاہ سچ کہتا ہے۔ یہ کہنے کی مجال کسی کو بھی نہیں تھی کہ یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن وہ سزائیں دیتے وقت شرع کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔

(مورخ برنی نے اپنی اس کمزوری کا اپنی تاریخ میں خود اعتراف کیا ہے وہ لکھتا ہے ''ہم سلطان کے مقربوں میں تھے لیکن خلاف شرع سزائیں دینے کے سلسلے میں ہم لوگ سلطان کے سامنے حق بات نہیں کہتے تھے اور اسی میں اپنی سہولت سمجھتے تھے کہ اس کے سامنے سچ بات نہ کہیں)

''جب میرا اپنا کردار صالح ہے تو مجھے حق پہنچتا ہے کہ ان علما کو سزا دوں جو میرے خلاف ہونے والی بغاوت میں در پردہ شامل تھے۔ انہوں نے پابند شرع بادشاہ کے خلاف بغاوت کی ہے۔ ان کی سزا، سزائے موت ہے تاکہ مفسدوں کو عبرت ہو۔ آئندہ کوئی ایسی جرأت نہ کر سکے۔''

ان سب کے قتل کا فرمان جاری کر دیا گیا۔

حکم ملنے کی دیر تھی کہ ان سب کو نہایت سفاکی سے قتل کر دیا گیا۔ لاشوں کی بے حرمتی کا کوئی اخلاقی اور شرعی جواز نہیں تھا لیکن ان لاشوں کو بادشاہ کے حکم کے مطابق محل کے سامنے پڑا رہنے دیا تاکہ آنے جانے والے اپنی ٹھوکروں سے انہیں پامال کریں اور عبرت حاصل کریں، بادشاہ کا خوف ان کے دلوں پر طاری ہو۔

بہاء الدین گرشاسپ کا انجام ان سے بھی برا ہوا۔ بادشاہ کے حکم پر اسے زمین پر اوندھا لٹایا گیا اور اس کی کھال کھینچی گئی اور اس کھال میں بھوسا بھروا کر تمام شہر میں گھمایا گیا۔ منادی کرنے والا یہ بھی کہتا جاتا تھا کہ حکومت کے باغیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

بھس بھری کھال کو اس طرح گھمانے سے لوگوں کے دلوں میں نفرت نہیں بلکہ گرشاسپ کی طرف سے ہمدردی پیدا ہوئی جو بادشاہ کے لیے آئندہ کئی مصائب لے کر آئی۔ لوگ اس تماشے کو دیکھتے اور دل ہی دل میں بادشاہ کو برا بھلا کہتے تھے۔

جن مشائخ کو بادشاہ نے قتل کرایا تھا ان کے سیکڑوں نہیں ہزاروں ارادت مند تھے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ حضرات غلطی پر تھے یا درست تھے۔ ان سے جو سوال و جواب ہوئے تھے اس کے وہ عینی سامع بھی نہیں تھے۔ وہ تو بس یہ دیکھ رہے تھے کہ ظالم بادشاہ صرف ظالم نہیں بلکہ بے دین بھی ہے کہ ایسی متبرک ہستیوں کو اس نے قتل کرا دیا اور لاشوں کی بے حرمتی کی۔ انہیں افسوس بھی تھا اور غصہ بھی لیکن بادشاہ کی طاقت کے سامنے سب بے بس تھے۔ یہ غصہ اندر ہی اندر پک رہا تھا۔

بادشاہ کو تو یہ چاہیے تھا کہ جن لوگوں کو اس نے قتل کرایا تھا ان کے جرائم کو آشکار کرتا۔ اس کے برخلاف اس نے سزا کا راستہ اختیار کیا۔ جہاں سے کوئی آواز بلند ہوئی اس نے خون کی ندیاں بہا دیں۔ کتنے ہی گوشہ نشیں بزرگوں کو تہ تیغ کر دیا۔ یہ قتل محض اس جرم کی پاداش میں کیے گئے کہ اس کی اطلاعات کے مطابق لوگ اس کے خلاف صوفیوں اور ولیوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے۔

اس نے کئی روحانی بزرگوں کو زبردستی اپنے دربار سے وابستہ کرنا چاہا تاکہ عام لوگوں سے ان کا رشتہ منقطع ہو جائے لیکن اس کوشش میں بھی اسے برائے نام کامیابی ہوئی۔ لوگوں نے اس کوشش کو بھی بادشاہ کے مظالم کی فہرست میں شامل کیا۔

اس نے اقتدار میں آتے ہی شاہان سابق کے قواعد وضوابط منسوخ کر دیے۔ ہر روز نیا قانون اور نیا حکم جاری کرتا تھا۔ صوبوں کے والیوں اور اعمال کے نام فرمان جاری ہوتے رہتے تھے تاکہ اس کے احکام جاری ہوں۔ یہ قوانین گزشتہ قوانین اور عقل کے خلاف ہوتے تھے اس لیے عوام انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور حکام ان کے جاری کرنے سے عاجز ہو گئے تھے۔ ان کے اجرا میں کچھ توقف اور سستی کرتے تو طرح طرح کی سزائیں بھگتنی پڑتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شورشیں بڑھنے لگیں۔

ایک قدم اس نے یہ اٹھالیا کہ دوآبہ کی تمام ولایت کے خراج کو دس گنا کر دیا۔ اس زیادتی سے عوام میں بغاوت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ لوگوں نے کاشت کاری سے ہاتھ اٹھالیا۔ کاشت کاری نہیں ہوئی تو دو تین سال تک برابر قحط پڑتا رہا۔ ہزاروں گھر برباد ہو گئے اور فوجی لشکر کا شیرازہ بکھر گیا۔

خزانہ خالی ہوا تو اس نے سونے اور چاندی کے سکوں کی جگہ تانبے اور پیتل کے سکے جاری کرنے کے احکام صادر کر دیے۔ خزانہ سونے چاندی کے سکوں سے معمور ہو گیا اور ملک میں تانبے کے سکے جاری ہو گئے۔ جعل سازی کرنے والوں کو عجیب سہولت مل گئی۔ یہاں کے ہندو بے حساب تانبا اور پیتل دارالضرب میں لانے لگے اور ان سے لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں سکے ڈھلوا کر ان سے سامان اور ہتھیار خریدنے لگے اور پھر اس مال کو دوسرے ملکوں میں سونے کے سکوں کے عوض خریدنے لگے۔ سناروں نے شاہی سکے کی ہو بہو نقل کی اور اپنے گھروں میں سکے ڈھالنے لگے۔ تانبے کے سکوں کی اتنی کثرت ہو گئی کہ ان کی وقعت جاتی رہی۔ خرید و فروخت کا انتظام بگڑ گیا۔

اس بدانتظامی کو روکنے کے لیے بادشاہ کو حکم نافذ کرنا پڑا کہ تانبے کے سکے خزانے میں جمع کر دیے جائیں اور ان کے عوض سونے چاندی کے سکے لے لیے جائیں۔ بس پھر کیا تھا لوگ بوریوں میں بھر بھر کر تانبے کے سکے لانے لگے اور سونے کے سکے لے جانے لگے۔ خزانہ سونے کے سکوں سے خالی ہو گیا۔ تانبے اور پیتل کے سکے لڑھکتے پھرتے تھے۔

خزانے کی تباہی کا اثر انتظام سلطنت پر پڑنا لازمی تھا۔

ملکی بدانتظامی پر جیسے تیسے قابو پایا گیا تو دل میں ایک خیال یہ سمایا کہ ایران و عراق کو فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کر لے۔ اس خیال کی پیدائش کا سبب ایران و خراسان کے وہ اراکین دولت تھے جو اپنے وطن سے بے زار ہو کر ہندوستان آئے اور دربار تغلق سے وابستہ ہو گئے۔ ان میں کچھ شہزادے بھی تھے جن سے محمد تغلق کی جلوت و خلوت میں ملاقاتیں رہتی تھیں۔

یہ شہزادے دیار غیر میں تھے اور بادشاہ کے رحم و کرم پر تھے۔ بادشاہ کے سامنے خوشامدانہ گفتگو نہ کرتے تو اور کیا کرتے۔ انہوں نے بادشاہ کی فیاضی اور بہادری کے قصیدے پڑھنے شروع کر دیے۔ رفتہ رفتہ اسے یقین دلا دیا کہ ایران و توران کو سر کرنا نہایت آسان ہے۔ بادشاہ ذرا سی کوشش کرے تو یہ ممالک اس کی مٹھی میں ہوں گے۔ محمد تغلق نے ان افراد و شاہزادگان کو انعام و اکرام سے نوازنا شروع کر دیا کہ وہ اس سے بددل نہ ہوں اور ان کے مشوروں سے وہ تسخیر ممالک کے لیے کوششیں کرتا رہے۔

اس مقصد کے لیے اس نے بے انتہا فوج جمع کی۔ تین لاکھ ستر ہزار فوج شاہی خزانے سے تنخواہ پاتی تھی۔ ان کے لیے بڑی تعداد میں ہتھیاروں کا بندوبست بھی کیا گیا۔ پہلے ہی سال دہلی کا خزانہ ختم ہو گیا۔ سپاہیوں کا حساب چکانا مشکل ہو گیا۔ لشکری منتشر ہو گئے۔

یہ منصوبہ بھی دھرا رہ گیا۔

سلطان تغلق کی اختراع پسندی نے اسے ایک اور راہ پر چلا دیا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ ماوراالنہر اور خراسان پر حملوں سے قبل کوہ ہمالچل کو جو چین اور ہندوستان کے درمیان واقع اور حائل ہے اس کی حدود میں آنا چاہیے تاکہ گھوڑوں کی درآمد اور لشکر کے سفر کا راستہ آسان ہو جائے۔ اس نے اپنے بھانجے خسرو ملک کی سرکردگی میں ایک لاکھ تجربہ کار سوار اور اراکین دولت کو اس مہم پر روانہ کیا۔

محمد تغلق نے اپنے بھانجے کو ہدایت کی تھی کہ پہلے ہمالچل کو تسخیر کرے، قلعے بنوائے، اس کی حفاظت کے لیے فوجیوں کا تعین کرے بعد ازاں چین کی حدود میں داخل ہو کر اس کی سرحد پر ایک قلعہ بنوائے اور وہیں رہے۔ وہاں پہنچ کر تمام تفصیلات سے بادشاہ کو آگاہ کرے اور بادشاہ کے عریضے کا انتظار کرے۔ عریضے کے جواب سے پہلے کوئی قدم نہ اٹھائے۔ جب دہلی سے کمک پہنچ جائے تو شہر میں قدم رکھنے اور ممالک چین کو اپنے قبضے میں لینے کی کوششیں کرے۔

یہ مہم اتنی خطرناک تھی کہ خسرو ملک دم سادھے اس کی ہدایات کو سن رہا تھا۔ اس وقت جو اراکین دولت موجود تھے وہ بھی دم بخود تھے۔ آخر ایک امیر نے ہمت کی۔

''سلطان معظم! ہم میں سے کسی کو بھی یہ جرأت نہیں ہوسکتی کہ ہم آپ کے حکم سے سرمو تجاوز کریں اور ہم لڑائی سے بھاگنے والے بھی نہیں لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس مہم میں کامیابی کے امکانات نہیں۔ آج تک کسی بادشاہ نے چین پر قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی۔''

محمد تغلق نے اس امیر کی طرف دشمن کی نظر سے دیکھا۔

''آپ لوگوں کا کیا مطلب ہے۔ جو کام کسی نے نہیں کیا وہ میں بھی نہ کروں۔ میں کسی بحث میں پڑے بغیر حکم دیتا ہوں کہ لشکر روانہ کیا جائے۔''

مزید بحث کرنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ خسرو ملک اور اس کے ساتھیوں نے کمر کس لی۔ ایک لاکھ سواروں پر مشتمل لشکر ایک عجیب وغریب مہم پر جارہا تھا۔ خوف کے سائے ساتھ چل رہے تھے لیکن یہ امید بھی تھی کہ شاید کامیابی مل جائے۔

یہ لشکر دہلی سے چل کر کوہ ہما چل تک پہنچ گیا۔

خسرو ملک نے بادشاہ کی ہدایت پر عمل کیا۔ بعض مقامات پر قلعے بنوائے اور کچھ لشکر وہاں چھوڑ کر آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ چین کی سرحد پر پہنچ گیا۔ اس کے سامنے چین کی عظمت، جاہ وجلال، شہر کے قلعوں کی اونچائی، راستوں کی تنگی اس کے ارادوں کو توڑنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ رسد رسانی کی مشکلوں کا تصور کر کے خوف سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

اراکین دولت پہلے ہی بددلی کا شکار تھے خود خسرو ملک بھی بہ امر مجبوری اس مہم پر آیا تھا لہٰذا ان کے حوصلوں میں وہ طاقت نہیں تھی کہ ان پہاڑوں سے ٹکرایا جائے۔ تمام اراکین نے خسرو ملک کو مشورہ دیا کہ وہ لڑائی سے ہاتھ اٹھالے اور واپسی کا راستہ اختیار کرے۔ خسرو ملک صرف بادشاہ سے خائف تھا ورنہ چاہتا وہ بھی تھا کہ واپس چلا جائے۔ امرا نے ذرا زور ڈالا تو وہ بھی تیار ہوگیا۔

مصیبت راستہ روکے کھڑی تھی۔ واپسی شروع ہوئی تھی کہ بارش شروع ہوگئی۔ یہ لوگ جن راستوں سے سرحد تک پہنچے تھے وہ بارش کی وجہ سے مٹ گئے۔ ان کی نشاندہی مشکل تھی۔ سرگرداں اور پریشان حال سپاہی راستے ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ پہاڑی لوگوں کو بھی موقع ہاتھ آیا۔ یہ لوگ واپسی کے راستوں کی گھاٹیوں میں آگئے اور قتل وغارت گری شروع کر دی۔ ایک ہی دفعہ میں سارا لشکر ان پہاڑیوں میں تلف ہوگیا۔ اتنے بڑے لشکر میں سے صرف دس سوار زندہ بچ چکے جو کسی نہ کسی طرح دہلی پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ ان دس کو بھی محمد تغلق نے بزدلی کا طعنہ دے کر قتل کرادیا۔

وہ ایسے بے تکے منصوبے بناتا تھا کہ دوسروں میں انہیں عملی شکل دینے کی طاقت نہ ہوتی تھی اور منصوبے ادھورے رہ جاتے تھے۔

پے در پے ناکامیوں نے اس کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا کہ سارا ہندوستان اس کی شہنشاہیت سے منحرف ہوگیا ہے۔ خانقاہ نشیں بھی اس کے مخالف ہیں اور اس کے صوبہ دار اور عمال حکومت بھی اس کے منصوبوں کو پورا نہیں ہونے دیتے۔ اس کے سدباب کے لیے ایک انوکھا خیال اس کے دل میں آیا اور وہ یہ کہ دارالخلافہ دہلی سے کہیں اور منتقل کر دیا جائے۔ اس کے لیے کوئی ایسا علاقہ منتخب کیا جائے جو ان ملکوں کے نزدیک ہو جن پر بادشاہ کا قبضہ ہے تاکہ اچھے برے حالات کی خبر فوراً مل سکے۔

ایک وجہ یہ بھی تھی دہلی اور اس کے قرب وجوار میں دینی بزرگوں کی کثرت تھی۔ اس کے وزرا اور عہدے داران بزرگوں سے میل ملاپ رکھتے تھے۔ وہ اپنے وزرا کو ان صوفیوں سے بھی بچانا چاہتا تھا۔ دارالخلافہ دہلی سے دور ہوگا تو ان صوفیہ کے اثرات بھی سلطنت پر کم سے کم پڑیں گے۔ ماضی قریب میں وہ اپنے والد اور نظام الدین اولیاؒ کے درمیان ہونے والے نزاع کو ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ اب نہ اس کے والد اس دنیا میں تھے نہ نظام الدین اولیاؒ رہے تھے لیکن ان کے خلیفہ حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی موجود تھے۔ محمد تغلق کو یہ خبریں بھی ملتی رہتی تھیں کہ شہزادہ فیروز تغلق کا ان بزرگ کے پاس آنا جانا ہے اور بھی بہت سے وزرا' امرا تھے جو ان بزرگوں کے پاس جاتے تھے اور اپنے حق میں دعائیں کراتے تھے۔ عام لوگ بھی بادشاہ سے زیادہ ان بزرگوں کے عقیدت مند تھے۔ دارالسلطنت کی منتقلی سے یہ سب دروازے بند ہوسکتے تھے۔

محمد تغلق جب اپنے خیال کو اپنے ذہن میں اچھی طرح پختہ کر چکا تو اپنے خیال کو اپنے عہدہ داروں پر ظاہر کیا۔ ان عہدہ داروں کو یہ تجویز عجیب ضرور لگی لیکن مخالفت کی ہمت کس کو تھی۔ ایک دو نے دبے لفظوں میں اظہار کیا بھی تو جواب یہ ملا کہ ان سے صرف یہ پوچھا گیا ہے کہ مقام تجویز کریں۔

اس دوٹوک جواب کے بعد اس کے سوا کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ نئے دارالحکومت کے لیے نام

تجویز کریں۔ ان اراکین نے نئے دارالحکومت کے لیے راجستھان کے اجمین کا نام پیش کیا۔

بادشاہ نے اجمین کا نام سنتے ہی اسے مسترد کر دیا۔

''اجمین کا محل وقوع ایسا ہے کہ بہت جلد یہاں بھی وہی خرابیاں پیدا ہوجائیں گی جن کا سامنا مجھے دہلی میں رہ کر کرنا پڑ رہا ہے۔''

امرا دیکھ رہے تھے کہ بادشاہ کا رجحان دیوگڑھ کی طرف ہے لہٰذا انہوں نے اس کی خوشنودی کے لیے مشورہ دیا کہ مرکز سلطنت دیوگڑھ کو بنایا جائے۔ بادشاہ کو ان امرا کا مشورہ پسند آیا۔ اس کی پسندیدگی کے ساتھ ہی گویا یہ طے ہوگیا کہ اب دہلی دارالحکومت نہیں رہے گا۔

امرا اور درباری وطن سے بے وطن ہونے کو ہرگز تیار نہیں تھے لیکن بادشاہ کے حکم کے آگے مجبور تھے لہٰذا سب کے سب بے دلی کا شکار تھے۔

بادشاہ نے ضروری تیاریاں شروع کر دیں۔ احکامات جاری کیے کہ دہلی سے دیوگڑھ تک ہر منزل پر سرائے تعمیر کرائی جائیں۔

جب سرائے اور منزلیں تعمیر ہوگئیں تو اس نے ایک ایسا حکم جاری کر دیا جس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی تھی نہ آئندہ ملنے کی امید تھی۔ اس نے حکم دیا کہ تمام شہری عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے اور جوان سب دیوگڑھ منتقل ہوجائیں۔ جو غریب ہوں اور جن کے پاس سفر خرچ نہ ہوں انہیں شاہی خزانے سے روپیہ دیا جائے۔

دیوگڑھ کا نام دولت آباد رکھا اور عظیم الشان عمارتیں بنوانا شروع کیں۔ خوب صورت باغ لگنا شروع ہوگئے۔ اس کے برعکس وہ دہلی جو رشک بغداد تھا، ویران اور سنسان ہوگیا۔ ابن بطوطہ کے بقول دہلی میں گیدڑوں اور کتوں کے سوا کوئی نظر نہ آتا تھا۔

یہ بیان مبالغہ آمیز بھی ہو تو بھی یہ ضرور معلوم ہوجاتا ہے کہ دہلی کی رونق دولت آباد منتقل ہونے لگی تھی۔ صرف دارالخلافہ منتقل نہیں ہوا بلکہ بادشاہ نے تو آبادی کو منتقل ہونے کا حکم دے دیا تھا۔ ایک شہر اٹھ کر دوسرے شہر میں پہنچ گیا۔

دارالحکومت دہلی کو جو ایک سو ستر سال کی مدت میں آباد ہو کر جامع شہر کی حیثیت کو پہنچا تھا اور بغداد و مصر کا ہم پلہ بن گیا تھا، مع ان تمام قصبوں اور سرایوں کے جو اس کے قرب وجوار میں چار پانچ کوس کے اندر واقع تھے، ویران کر دیا گیا۔ یہاں کے رہنے والوں کو کثیر تعداد میں مع اہل وعیال، خاندانوں اور غلاموں اور کنیزوں کے روانہ کر دیا۔

وہ لوگ جو برسوں سے آبا واجداد کے مکانوں میں رہ رہے تھے، اپنے مکانات چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ انہیں زبردستی یہاں سے نکالا گیا۔ صدمے اور سفر کی مشقت سے ان میں سے بہت سے دولت آباد پہنچنے سے پہلے ہی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جو پہنچ گئے وہ اس وقت تک مٹی بن کر جیتے رہے جب تک دہلی کو دوبارہ دارالسلطنت نہ بنالیا گیا اور وہ واپس اپنے شہر میں آئے لیکن یہ مدت بعد ہوا۔

محمد تغلق کے احکامات کی پوری طرح بجا آوری ہو رہی تھی۔ اس کے امرا اپنے بال بچوں کے لیے دولت آباد میں نئے مکانات بنوا رہے تھے لیکن ملتان کے حاکم ایبہ خاں نے بادشاہ کی اس تجویز کی مخالفت کی اور اس پر تیار نہیں ہوا کہ اپنے اہل وعیال کو دولت آباد بھیجے۔

سلطان غیاث الدین تغلق نے ایبہ خان کو بھائی بنایا تھا۔ دونوں میں اتنی موانست تھی کہ خلجی خاندان کے زوال کے بعد جب ایک موقع ایسا آیا تھا کہ غیاث الدین تغلق اور ایبہ خان نے مل کر خلجی خاندان کو حکمرانی سے محروم کر دیا تھا تو غیاث الدین نے ایبہ خان کو پیشکش کی تھی کہ وہ بادشاہ بن جائے لیکن ایبہ خان نے گوارا نہیں کیا تھا کہ وہ بادشاہ بنے۔ اس نے غیاث الدین کو تخت پر بٹھایا اور خود ملتان کی حاکمیت پر اکتفا کیا۔ محمد تغلق بھی اسے عم محترم (چچا) کہتا رہا تھا لیکن اب وہ سن رہا تھا کہ ایبہ خان نے سرکشی اختیار کی ہے اور اپنے بال بچوں کو دولت آباد بھیجنے پر تیار نہیں ہے۔

ایبہ خاں محمد تغلق کے نئے نئے اقدامات سے پہلے ہی بدظن تھا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ سلطان نے دہلی کی مرکزی حیثیت ختم کر کے دکن کے دیوگڑھ کو دولت آباد کا نام دیا ہے تو وہ اس وقت کو یاد کرنے لگا جب اس نے خود بادشاہ بننے کے بجائے غیاث الدین کو موقع دے دیا تھا۔

ایبہ خاں بادشاہ تو نہیں بن سکا تھا لیکن اتنا تو کر سکتا تھا کہ محمد تغلق کو بادشاہ تسلیم نہ کرے اور اس کے احکامات کو ٹھکرا دے۔ یہی وہ کر بھی رہا تھا۔

سلطان محمد تغلق نے علی نام کے ایک مغل کو ملتان بھیجنے اور ایبہ خان سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاہی فرمان تحریری طور پر بھی اس کے سپرد کیا اور زبانی ہدایات بھی دیں کہ وہ ایبہ خان کو بتائے کہ اسے اپنے خاندان کے ساتھ سلطان تغلق سے ملاقات کرنی چاہیے اور اپنے خاندان کو دولت آباد منتقل کرنے میں دیر نہ لگائے۔

''سلطان محترم! مجھے اس فرمان کی تکمیل کے لیے کتنی سختی کی اجازت ہے؟''

''میں ایبہ خان کو اپنا چچا کہتا ہوں۔ میں تمہیں وہاں سختی کے لیے نہیں بھیج رہا ہوں۔ تمہیں پیغام پہنچانا ہے اور زبانی سمجھانا ہے۔ ایبہ خان کو یہ باور کرانا ہے کہ ابھی تو تم سمجھا رہے ہو لیکن بعد میں سختی بھی کی جاسکتی ہے۔''

پیغام رسانی کا یہ کام کسی پیشہ ور قاصد سے بھی لیا جاسکتا تھا لیکن محمد تغلق نے علی مغل کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ وہ مزاجاً تلخ تھا۔ نرم گفتاری کے ساتھ ساتھ اسے یہ سلیقہ بھی آتا تھا کہ شاہی فرامین پر زبردستی عمل کرالے۔

علی مغل ملتان پہنچا اور ایبہ خان سے ملاقات کی تو علی مغل کو محسوس ہوا کہ ایبہ خان کے رویے میں سرد مہری ہے۔ اس نے ملاقات تو کی لیکن کسی گفتگو سے گریز کرتے ہوئے جلد ہی اٹھ گیا اور اپنے محل کے مہمان خانے میں علی مغل کو ٹھہرا دیا۔

اب وہ انتظار میں تھا کہ کب ایبہ خان اسے طلب کرے۔ دن پر دن گزرتے گئے۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ علی مغل محسوس کر رہا تھا کہ ایبہ خان جان بوجھ کر اسے طلب نہیں کر رہا ہے اور مصروفیت کا بہانہ کر رہا ہے۔

محل کی قید سے اکتا کر وہ باہر نکلا تاکہ گھوم پھر کر لوگوں کے تاثرات معلوم کرے۔ جب وہ بازاروں میں گھوما، لوگوں سے ملا تو اسے احساس ہوا کہ ملتان میں سلطان تغلق کے خلاف باغیانہ جذبات پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ اسے بے دین سمجھتے ہیں۔

ملتان ولیوں اور صوفیوں کا شہر تھا۔ یہ خبریں یہاں برابر پہنچتی رہی تھیں کہ محمد تغلق نے علما اور مشائخ کو قتل کرایا ہے۔ اس لیے لوگوں کے جذبات بھڑکے ہوئے تھے۔ ایک مہم تھی جو تغلق کے خلاف چل رہی تھی اور اسے سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ کئی لوگوں نے اسے بتایا کہ قاضی شہر کے بھی یہی خیالات ہیں اور اس نے ایبہ خان کو بھی اپنا ہم خیال بنالیا ہے۔

علی مغل جان چکا تھا کہ ایبہ خان اس سے ملاقات کیوں نہیں کر رہا ہے۔ تغلق کے خلاف چلنے والی تحریک کا وہ بھی حصہ ہے اس لیے وہ اپنے لوگوں کو مجھ سے ناراضی کا تاثر دے رہا ہے۔

علی مغل ایک روز مہمان خانے سے نکل کر اس راستے میں کھڑا تھا جہاں سے ایبہ خان کو گزرنا تھا۔ کچھ دیر بعد ایبہ خان ادھر سے گزرا تو علی مغل اس کے راستے میں آگیا۔

''میں نے آپ کو سلطان کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اب تک تو آپ کو دولت آباد روانہ ہوجانا تھا لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ تو آپ، آپ کے اہل خانہ بھی دولت آباد نہیں گئے۔ اس کے برعکس آپ نے مجھے بھی روکا ہوا ہے۔''

''یہاں رک کر تجھے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ لوگوں کے جذبات کیا ہیں۔ میں یہاں کا صوبے دار ہوں۔ لوگوں کے جذبات کے برخلاف محمد تغلق کے احکام کی پیروی نہیں کرسکتا۔''

''مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں آپ کو سمجھاؤں۔ اگر آپ نے دولت آباد پہنچنے میں تاخیر کی تو یہ آپ کے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔''

''تم ایک معمولی قاصد ہوکر مجھے دھمکانے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''میں دھمکا نہیں رہا ہوں، سمجھا رہا ہوں۔''

''تو جس کا پیغامبر بن کر آیا ہے وہ بے دین ہے۔ اس پر تو مشائخ کے قتل کا مقدمہ چلنا چاہیے۔ میں نے اپنا مقدمہ قاضی کی عدالت میں بھیج دیا ہے۔ قاضی مجھے بتائے گا کہ بے دین بادشاہ کی اطاعت مجھ پر فرض ہے یا نہیں۔ اس کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کروں گا۔''

''سبحان اللہ! اب صوبے دار اپنے فیصلے قاضی کے مشورے سے کرنے لگے ہیں۔''

علی مغل مایوس ہوکر راستے سے ہٹ گیا۔ غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا کہ بادشاہ کا داماد اسے نظر آگیا جو اپنے مکان سے نکل کر دیوان خانے کی طرف جارہا تھا۔ علی مغل اس کے نزدیک گیا اور سارا غصہ اس پر اتار دیا۔

''تم نے ابھی تک اپنے بچوں کو دولت آباد کیوں نہیں بھیجا۔ کیوں نمک حرامی پر تلے ہوئے ہو کہ بادشاہ کا حکم نہیں مانتے۔''

ایبہ کے داماد کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے آگ بگولا ہوکر کہا۔ ''مغل بچے، تو گالیوں پر کیوں اتر آیا ہے۔''

''اس لیے کہ تم لوگ گالیوں کے لائق ہو۔ تم اور تمہارا نمک حرام سسر گھروں میں آرام سے بیٹھے ہو اور بادشاہ کے فرمان کی تمہیں پروا نہیں۔''

''زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ گدی سے زبان کھینچ لوں گا۔''

''اس سے پہلے میں تیرا دماغ درست کردوں گا۔'' علی مغل نے کہا اور ایبہ کے داماد کے بال پکڑ لیے۔ اس نے بھی علی کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

دونوں میں لڑائی ہونے لگی۔ اس نے علی کو زمین پر پٹخ دیا اور ایک ملتانی سلاخدار نے جو قریب کھڑا تھا علی کا سر تن سے جدا کردیا۔

یہ خبر جیسے ہی ایبہ خان تک پہنچی وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ اب محمد تغلق اپنی پوری طاقت کے ساتھ ملتان پر حملہ آور ہوگا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ مقابلے کی تیاری کی جائے۔ اس مقصد کے لیے اسے ملتان کے صوفیہ اور عوام کو بھی اپنے ساتھ ملانا تھا۔ قاضی شہر نے لوگوں کو ورغلانا شروع کردیا۔

''یاد رکھو، اگر محمد تغلق غالب آگیا تو وہ ملتان میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا کیونکہ تم لوگ صوفیہ اور مشائخ کے ماننے والے ہو جبکہ بادشاہ بے دین ہوچکا ہے۔ کتنے ہی مشائخ اس نے قتل کرادیے۔ کیا اب بھی تم اس کا ساتھ دو گے؟''

قاضی شہر شیخ رکن الدین ملتانی کی خانقاہ میں بھی گیا اور ان سے مدد مانگی۔ آپ نے ان بکھیڑوں میں پڑنے سے انکار کردیا۔

''یہ دو بادشاہوں کا جھگڑا ہے۔ ہم فقیروں کو اس میں مت گھسیٹو۔''

''کیا آپ نہیں سمجھتے کہ بادشاہ بے دین ہوگیا ہے اور اس کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔''

''اس کی بے دینی کا کوئی ثبوت تمہارے پاس ہے؟''

''یہ ثبوت کیا کم ہے کہ اس نے صوفیہ اور علما کو قتل کرایا ہے۔''

''یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ وہ مشائخ کس پائے کے تھے۔ کتنے ہی صوفیہ دنیاداری اور رسوم پرستی میں مبتلا ہیں۔ ممکن ہے انہوں نے بادشاہ کے خلاف سازش کی ہو۔''

''ملتان پر قبضہ کرنے کے بعد اگر اس نے یہاں بھی قتل کا بازار گرم کیا؟ یاد رکھیے شیخ صاحب، آپ کی خانقاہ بھی محفوظ نہیں رہے گی۔''

''ہم خود اس کے پاس چل کر جائیں گے اور اسے مجبور کریں گے کہ وہ ملتان میں لوٹ مار نہ کرے۔''

''وہ فقرا کی سفارش سننے کا عادی نہیں۔''

''اللہ مالک ہے۔ جو ہوگا اس وقت دیکھا جائے گا۔''

قاضی شہر ان کی طرف سے مایوس ہوکر لوٹ آیا۔

بغاوت کی خبر گرم ہوئی تو سلطان تغلق دولت آباد میں تھا۔ وہ وہاں سے دہلی آیا اور لشکر جمع کر کے ملتان پہنچ گیا۔ حاکم ملتان بہرام ایبہ بھی ایک بڑا لشکر لے کر میدان میں آگیا۔ سلطان نے ایک بلند مقام پر کھڑے ہوکر جائزہ لیا۔ ایبہ خان کا لشکر تعداد میں اس سے زیادہ تھا۔ اس نے اس تعداد کو دیکھ کر ایک خاص حکمت عملی تیار کرلی جس پر ایک خاص وقت عمل کرنا تھا۔ ایک بلند ٹیلے پر چتر شاہی نصب کیا اور اپنی فوج کو حملہ آور ہونے کا حکم دے دیا۔ جنگ شروع ہوتے ہی دونوں طرف کے سپاہی قتل ہونے لگے۔ ایبہ خان کے لیے یہ جنگ آخری جنگ تھی۔ شکست کا مطلب یہ تھا کہ وہ عرش سے فرش پر آجاتا۔ اس لیے وہ اور اس کے سپاہی جانوں کی پروا کیے بغیر لڑ رہے تھے۔ بہرام ایبہ اہل ملتان اور اپنی فوج کو یہ باور کرا چکا تھا کہ محمد تغلق مرتد ہوچکا ہے۔ اس لیے یہ جنگ کفر و اسلام کی جنگ بن گئی تھی۔ اس کے سپاہیوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

بہرام ایبہ کی نظریں چتر شاہی پر لگی ہوئی تھیں۔ جہاں سلطان اپنی فوجوں کی نگرانی کے لیے موجود تھا۔ ایبہ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح چتر شاہی تک پہنچ جائے لیکن سلطان کے فوجی اسے آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔

ایک مرتبہ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو چتر شاہی خالی پڑا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ سلطان کہیں بھی نہیں تھا۔ کیا سلطان فرار ہوگیا؟

سلطان تغلق نے ایک چال چلی تھی۔ وہ اپنی فوج کے چند ہزار سپاہی لے کر الگ ہوگیا تھا۔

بہرام ایبہ نے چتر شاہی کو خالی دیکھا تو تیزی سے وہاں پہنچ گیا اور چیخ چیخ کر اعلان کرنے لگا کہ بادشاہ فرار ہوگیا ہے۔

شاہی فوجوں نے یہ اعلان سنا تو ان کے حوصلے پست ہوگئے۔ اس کے برخلاف ملتانی لشکر نے یہ سوچ کر تلواریں رکھ دیں کہ اب تو فتح ہوہی چکی۔

اسی وقت سلطان تغلق اپنی فوج کے ساتھ چتر شاہی میں نمودار ہوا۔ بہرام ایبہ بری طرح بوکھلا گیا۔ سلطان کے سپاہیوں نے اس پر قابو پالیا اور اسے گرا کر سر کاٹ لیا اس کے سر کو نیزے پر بلند کیا گیا تو ملتانی لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ بھاگنے میں کامیاب ہوگئے لیکن بیشتر مارے گئے۔

ایبہ خان کے محل پر قبضہ کرلیا گیا۔ یہاں محمد تغلق نے عدالت لگائی۔ ایبہ خان کا داماد جس نے علی مغل کو قتل کرایا تھا، فرار ہوگیا تھا۔ وہ تو نہیں مل سکا لیکن قاضی شہر کو گرفتار کر کے محمد تغلق کے سامنے پیش کردیا گیا۔ سلطان تغلق کے مخبر بتا چکے تھے کہ اہل شہر اور ایبہ خان کو بادشاہ کے خلاف بدظن کرنے میں قاضی کا ہاتھ ہے۔ اس لیے اصل مجرم وہی قرار پایا تھا۔

''تو نے میری بے دینی کا فتویٰ جاری کیا تھا۔ اب بتا تجھے کیا سزا دی جائے۔ تیرے نزدیک اسلام کی تعریف کیا ہے جس پر میں نہیں چلا اور تیرے نزدیک بے دین ٹھہرا۔''

قاضی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بادشاہ کے بار بار پوچھنے کے باوجود وہ کچھ نہیں بولا۔

بادشاہ نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”میں نے آج تک کسی متقی پرہیزگار کو قتل نہیں کرایا۔ جو لوگ میرے ہاتھ سے قتل ہوئے وہ دنیادار صوفی تھے جو لوگوں کو گمراہ کررہے تھے۔ تو ان کی سرپرستی کررہا تھا۔ اب نہ تو بچے گا اور نہ وہ لوگ جو تیری آواز پر لبیک کہہ رہے تھے۔ میں ملتان کو لاشوں کا ڈھیر بنادوں گا۔ یہاں ان تمام نام نہاد مشائخ کو قتل کراؤں گا جو تیرے ہم خیال تھے۔ بداعمال فقیروں کی کوئی خانقاہ باقی نہیں رہنے دوں گا۔ تو اپنی آنکھوں سے یہ مناظر دیکھے گا۔ اس کے بعد تیرا کٹا ہوا سر ملتان کے بیرونی دروازے پر لٹکا دیا جائے گا۔“

قاضی کے پاس اب بھی بولنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

اسی وقت کسی نے اطلاع دی کہ شیخ رکن الدین بارگاہ سلطانی میں حاضری کے طلب گار ہیں۔ بادشاہ نے بہ خوشی اجازت دے دی۔

شیخ رکن الدین، بہاالدین زکریا ملتانی کے پوتے تھے۔ ملتان ان کا وطن تھا اور محمد تغلق اس شہر کو قبرستان بنانے کا عہد کررہا تھا لہٰذا وہ خلق خدا کی سفارش کے لیے سلطان کے پاس آئے تھے۔

شیخ رکن الدین داخل ہوئے تو اس حال میں کہ اپنا عمامہ ہاتھ میں پکڑے، ننگے سر، ننگے پاؤں، سلطان کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔

”اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ میں تم سے اہل ملتان کی جان بخشی کی استدعا کرنے آیا ہوں۔ میرے آنے کی لاج رکھ لو۔ یہ نادان تھے جو تمہارے خلاف بغاوت پر اتر آئے۔ انہیں معاف کردو۔ خلق خدا کا خون بہانے سے گریز کرو۔ دنیا کو دکھادو کہ تم اہل اللہ کے دشمن نہیں ہو۔“

محمد تغلق کے مخبر بتا چکے تھے کہ شیخ رکن الدین کا اس بغاوت میں کوئی ہاتھ نہیں رہا بلکہ انہوں نے قاضی کی مخالفت کی تھی اور پھر وہ اس وقت اس حلیے میں آئے تھے کہ ان کا عمامہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ تغلق کو غیرت آئی۔ اس نے شیخ رکن الدین کا عمامہ ان کے ہاتھ سے لے کر ان کے سر پر رکھا اور نہایت عزت سے اپنے پاس بٹھایا۔

”میں عہد کرچکا تھا کہ ملتان کو قبرستان بنادوں گا لیکن آپ کا قدم درمیان میں آگیا۔ میں اپنا ارادہ فسخ کرتا ہوں۔ اب دنیا یہ دیکھ لے کہ میں مشائخ کا دشمن نہیں۔ صرف ان لوگوں کا دشمن ہوں جو فقیری کے پردے میں فریب کاری کررہے ہیں۔“

قاضی کو آس بندھ گئی تھی کہ اہل ملتان کے ساتھ شاید اس کی بھی جاں بخشی ہوگئی ہے لیکن محمد تغلق نے اس کی غلط فہمی دور کردی۔ وہ شیخ رکن الدین سے پوچھ رہے تھے۔

”حضرت، کیا آپ نے قاضی کی سفارش بھی کی ہے؟“

شیخ رکن الدین خاموش رہے اور سلطان کے بار بار پوچھنے کے باوجود بھی کچھ نہ بولے۔ سلطان کی حجت پوری ہوگئی تھی، اس نے حکم دیا کہ۔ ”قاضی کی کھال کھینچی جائے اور اس میں بھوسا بھروا کر پورے شہر میں اس کی تشہیر کی جائے۔“

اس فتنے پر قابو پانے کے بعد سلطان دہلی واپس آگیا۔ دولت آباد نیا نیا آباد ہوا تھا۔ وہ دہلی میں رہ کر دولت آباد کو آباد کرنے کے انتظامات کرتا رہا۔ اپنی والدہ مخدومہ جہاں کو امرا، افواج اور حرم ومحلات کے ہمراہ دولت آباد بھیج دیا۔ اب دہلی میں کیا رکھا تھا۔ چاروں طرف جنگلی جانوروں کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

سلطان مسلسل دو سال تک دہلی میں رہا۔ اس کے امرا اس کے ساتھ تھے حالانکہ ان سب کے اہل وعیال دولت آباد جاچکے تھے۔

وہ ابھی دہلی میں مقیم تھا کہ دوآبہ کے علاقے کے ہندوؤں نے محصولات کی زیادتی سے تنگ آکر اپنے خرمنوں کو آگ لگادی اور مویشیوں کو لے کر جنگل کی طرف نکل گئے۔ یہ ایسی سرکشی تھی جو سلطان کو ایک آنکھ پسند نہ آئی۔ اس نے ضلع داروں کو حکم دیا کہ اس علاقے میں لوٹ مار کرو جو جہاں ملے اسے قتل کرڈالو۔ شاہی عمال تو موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ حکم ملتے ہی ٹوٹ پڑے اور قتل وغارت گری کا ایسا طوفان مچایا کہ یہ زرخیز علاقہ ویران اور غیر آباد ہوگیا۔

اس کے عمال خون بہا رہے تھے کہ وہ شکار کے لیے برن (موجودہ بلند شہر) میں گیا۔ اس نے حکم دیا کہ سارا علاقہ لوٹ لیا جائے۔ ہندوؤں کے سر کاٹ کر لائے گئے اور برن کے قلعے کے کنگروں پر ان کو لٹکا دیا گیا۔

بنگالہ کے علاقے لکھنوتی کو اس کے باپ غیاث الدین نے فتح کرلیا تھا۔ وہاں کا حاکم بہرام خاں کو مقرر کیا تھا۔ بہرام خاں کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ملک فخر الدین نے بغاوت کا راستہ اختیار کیا۔

سلطانی فوج اس وقت قنوج کے علاقے کی غارت گری میں مشغول تھی۔ ابھی سلطان اس علاقے کی غارت

گری اور قتل عام سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ مالابار سے بغاوت کی خبر آگئی۔

سلطان کی سخت گیری کی وجہ سے جگہ جگہ بغاوت کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ اتنے امراض پیدا ہوگئے تھے کہ ایک کا علاج کرتا تو دوسرا مرض پیدا ہوجاتا تھا۔ وہ ایک طرف بھاگتا تو دوسرا علاقہ ہاتھ سے نکل جاتا تھا۔ اس نے لکھنوتی کی بغاوت کو پس پشت ڈالا اور لشکر عظیم لے کر مالابار کی طرف دوڑ پڑا۔ تلنگانہ ہوتے ہوئے مالابار کا سفر کیا اور پہلے ورنگل پہنچا۔

ورنگل میں قدم رکھنے سے پہلے ہی یہاں کوئی بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کئی امرا اور فوجی بیمار پڑ گئے۔ بہت سے ہلاک ہوگئے۔ وہ خود بھی بیمار پڑ گیا۔

وہ مالابار کی طرف چلا تھا لیکن ارادۂ سفر ترک کیا اور دولت آباد آگیا۔ یہاں اپنا علاج کراتا رہا پھر اس نے اچھے ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ پالکی میں سوار ہوا اور دہلی کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

دولت آباد سے روانہ ہوتے ہوئے عام منادی کرادی کہ دہلی کے باشندوں میں سے جو چاہے دولت آباد میں رہے اور جس کی مرضی ہو وہ بادشاہ کے ساتھ چلا جائے۔

اس نے دہلی کی آبادی کو دولت آباد منتقل کرنے کے لیے کتنی بغاوتیں مول لی تھیں، کتنے قتل کرائے تھے، کتنے گھر اجاڑے تھے۔ اب وہ خود ہی کہہ رہا تھا، جس کا جی چاہے رہے جس کا جی چاہے دہلی چلا جائے۔

ایک ضدی بادشاہ نے ایک شہر ویران کرکے دوسرا آباد کیا تھا اب کہہ رہا تھا اسے ویران کردو اور پہلا شہر پھر آباد کرلو۔

پورا شہر اٹھ کر بادشاہ کے ساتھ ہی روانہ ہوگیا۔

راستے میں پڑنے والے شہر ویران تھے۔ بارش بالکل نہیں ہوئی تھی۔ زمین کے ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی تھی۔ زمین پر گھاس اور چوکیوں پر پیادے ناپید تھے۔ ہر طرف بھوک تھی، پیاس تھی انتشار تھا۔ وہ یہ سب کرشمے دیکھتا ہوا دہلی تک آگیا۔ یہاں کا عالم اور بھی عبرت انگیز تھا۔ قحط کی ہمہ گیری نے دہلی کی ویرانی میں اور بھی اضافہ کردیا تھا۔ دولت آباد سے آنے والے کھائی سے نکلے تھے کنویں میں گر گئے۔ جو راستے کی تکلیفوں سے بچ گئے تھے، بھوک سے مرنے لگے۔ سترہ روپے کا ایک سیر غلہ! کس میں ہمت تھی جو خریدتا آدمی آدمی کو کھائے جاتا تھا۔ عام لوگ کہنے لگے تھے کہ یہ عذاب ہے جو بادشاہ کی بے دینی کے سبب مسلط ہوا ہے۔ زمین کی پیاس تو انسانی خون نے بجھادی، اب بارش کس لیے ہو۔

محمد تغلق نے چند دنوں کے لیے تلوار کو میان میں رکھا اور قحط سالی سے چھٹکارے کے لیے کمندیں پھینکنے لگا۔ کسانوں کو روپیہ دیا گیا کہ کنویں کھودیں اور ہل چلائیں۔ بارش ہوئی نہیں تھی۔ زمین کی تہ میں بھی پانی کہاں تھا۔ پھر یہ ہوا کہ لوگوں کو روپیہ ملا تو بہت سوں نے اپنی ضروریات پوری کیں۔ شاہی جلال ایک مرتبہ پھر حرکت میں آیا۔ تلوار نیام سے باہر آئی۔ رعایا کی کاہلی اور سستی کو بہانہ بنا کر ہزاروں جانیں ختم کردی گئیں۔ لوگوں نے بھی شکر بھیجا کہ بھوک سے مرنے کے بجائے تلوار سے قتل ہوگئے۔

قحط سالی نے سر نہیں جھکایا تھا کہ ملتان اس کے ہاتھ سے چلا گیا۔ شاہو افغان نامی ایک افغانی نے افغانوں کو جمع کیا اور ملتان کے نائب کو قتل کرکے ملتان پر قبضہ کرلیا۔

سلطان نے خشک سالی کی بدحالی کو طاق میں رکھا اور بیمار ماں مخدومہ جہاں کو خدا پر چھوڑ کر ملتان بچانے چل دیا۔ ابھی وہ راستے میں تھا کہ والدہ کی وفات کی خبر آگئی۔ امرا نے لاکھ چاہا کہ وہ لشکر کی کمان کسی اور کے سپرد کرکے دہلی لوٹ جائے۔ اسے والدہ کی وفات کا صدمہ بھی بہت تھا لیکن اس نے واپسی گوارا نہیں کی۔ ایک دن تعزیت کے لیے ٹھہرا اور پھر آگے روانہ ہوگیا۔ ابھی وہ ملتان سے کئی منزل دور تھا کہ افغان شاہو نے اطاعت گزاری کی درخواست پیش کی۔ اظہار ندامت کیا اور بغاوت سے ہاتھ کھینچ کر اپنے افغانوں کے ساتھ افغانستان چلا گیا۔ (اس سے مراد موجودہ افغانستان نہیں بلکہ گجرات اور کھمبایت میں افغانوں کی آبادی تھی اس لیے اس علاقے کو افغانستان کہا جاتا تھا)

سلطان نے ملتان جانے کا ارادہ ترک کیا اور دہلی واپس آگیا۔ اس وقت شہر میں قحط بہت بڑھ گیا تھا۔ سلطان نے زراعت کو فروغ دینے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ خشک سالی سے عاجز آئے ہوئے سلطان نے قتل وغارت گری کا وہ سماں باندھا کہ خدا کی پناہ۔ اس کے دل میں یہ وہم بیٹھ گیا تھا کہ لوگ جان بوجھ کر اس کے حکم کی خلاف ورزی کررہے ہیں لہٰذا جس کے بارے میں شکایت ملتی یا کوئی دشمنی میں بھی شکایت کردیتا تو وہ اسے اس کے خاندان سمیت قتل کروادیتا۔ اس نے بہت سے لوگوں کو مروادیا۔

جب اس نے دیکھا کہ شہر میں غلے اور چارے کی کمی سے کسی صورت چھٹکارا نہیں ملتا تو اس نے حکم دیا کہ شہر کے دروازے کھول دیے جائیں جس کا جہاں جی چاہے چلا جائے۔ بہت سے لوگ بنگالہ کی طرف چلے گئے۔ بادشاہ خود بھی شہر سے نکلا اور دریائے گنگا کے کنارے قیام کیا اور حکم دیا کہ لوگ وہاں چھپر ڈال کر رہنے لگیں۔ اس جگہ کا نام ”سرگ

وادی'' رکھ دیا۔

سرگ وادی میں اودھ سے غلہ آتا تھا اور کسی قدر ارزانی تھی۔

سلطان ان دنوں بہت مغلوب الغضب ہوگیا تھا۔ اس کی نازک مزاجی اتنی بڑھ گئی کہ اس سے نہایت قریب رہنے والے لوگ بھی خائف رہنے لگے کہ کس وقت سلطان کی طبع نازک میں تبدیلی آئے اور میری گردن اڑا دی جائے۔ سلطان قحط سالی سے پریشان تھا کہ اس کے علاقوں میں پے درپے چار بغاوتیں برپا ہوئیں۔ سلطان کے امیروں نے ان بغاوتوں کو فرو کر دیا لیکن وہ سوچتا ضرور تھا کہ لوگ اس سے منحرف کیوں ہوتے جارہے ہیں۔ ملک میں استحکام ختم ہوگیا ہے۔ ہر طرف بغاوتیں ہورہی ہیں۔

مذہبی حلقوں کی مخالفت ختم کرنے کی تدبیر اس نے یہ نکالی کہ کسی طرح خلیفۂ عباسی کے دربار سے پروانۂ حکمرانی حاصل کرلیا جائے تاکہ مذہبی حلقے کی مخالفت ختم ہو اور ملک میں امن قائم ہوجائے۔ بغاوتوں کا زور ٹوٹے۔ مصر میں آل عباس کا خلیفہ تخت خلافت پر جلوہ گر تھا۔ سلطان نے خلیفہ کی غائبانہ بیعت کرلی۔ خلیفہ کی خدمت میں اپنی غائبانہ بیعت کا حال تحریر کیا اور شہر میں حکم دے دیا کہ خلیفہ کی طرف سے جواب آنے تک جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی موقوف رکھی جائیں۔ سکے میں اپنے نام کے بجائے خلیفہ کا نام ثبت کرایا۔

دو تین ماہ ہوگئے تھے۔ سلطان کے قاصد دربار خلافت میں عرضیاں لے کر جاتے رہے۔ آخر ایک دن نوید ملی کہ خلیفہ کا ایلچی سلطان کے لیے اجازت نامہ لے کر دہلی کی حدود میں داخل ہوا ہے۔ سلطان نے امرا، علما اور مشائخ کو ساتھ لیا اور استقبال کے لیے نکلا اور پانچ چھ کوس جا کر ایلچی کا استقبال کیا۔

ایلچی خلیفہ کی جانب سے منشورِ حکومت اور خلعت اپنے ساتھ لایا تھا۔ سلطان نے جوتے اتار دیے اور منشور کو سر پر رکھ لیا۔ جلوس کی شکل میں دہلی تک آیا۔ راستے بھر سونا چاندی نچھاور ہوتا جارہا تھا۔

پہلا جمعہ آیا تو خلیفہ کا نام منبر پر پڑھا گیا اور سونے چاندی کے سکوں سے بھرے ہوئے طباق نچھاور کیے گئے۔ اس دن کے بعد سے جمعہ اور عیدین پڑھنے کی اجازت عطا کر دی۔ تمام شاہانِ دہلی کے نام جن میں اس کا باپ بھی شامل تھا خطبے سے نکلوا دیے جنہوں نے خلیفۂ بغداد کی اجازت کے بغیر حکومت کی تھی۔

ان کاموں سے نمٹنے کے بعد اس نے ایک عاجزانہ عریضہ اور ایک نفیس بے مثل موتی کہ اس جیسا دوسرا اس کے خزانے میں نہیں تھا، اظہارِ تشکر کے طور پر خلیفہ کی خدمت میں بھیجا۔

خلیفہ کا منشور لانے والوں کے سامنے وہ ایسی تواضع سے پیش آیا تھا کہ کوئی غلام بھی اپنے مالک کے سامنے نہ جھکتا ہوگا۔

اس دن کے بعد سے سلطان کا یہ حال تھا کہ بیٹھنے اٹھنے، حکم دینے اور فرمائش کرنے میں خلیفہ کے نام کے سوا اور کچھ اس کی زبان پر نہ آتا تھا۔

ایک طرف یہ حال تھا، دوسری جانب یہ ماجرا کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا کہ کسی مسلمان کا سر نہ کاٹا جاتا ہو۔ ایک محکمہ خاص اسی کام کے لیے بنایا گیا تھا اور ظالم ترین لوگوں کو اس محکمے کا انتظام سپرد کیا تھا۔ سزا دہی میں قتل کا سلسلہ اس حد تک دراز ہوا تھا کہ ملک میں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس سے بے زار نہ ہوگیا ہو۔ اس کے مورخ ضیا الدین برنی جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا، لکھتا ہے۔

''جان کے خوف سے جو جانے والی ہے، ہم اس سے ڈرتے تھے اور اسی میں اپنی سہولت سمجھتے تھے کہ اس کے سامنے سچ بات نہ کہیں اور خلاف شرع سزاؤں میں لالچ اور قرب ومنزلت حاصل کرنے کے لیے اس کے ساتھ ہوجاتے تھے۔''

رمضان کے دن تھے۔ سلطان محمد، سلطان پور میں مقیم تھا۔ اس وقت کسی نیک گھڑی میں غالباً اس کے ضمیر نے اسے ملامت کی تھی۔ اس نے ضیا الدین برنی کو طلب کیا۔ بوڑھا مورخ ڈرتے ڈرتے حاضر ہوا کہ دیکھو کیا حکم صادر ہوتا ہے۔ سلطان پر نظر پڑی تو اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں تھے۔

سلطان نے کسی تمہید کے بغیر کہنا شروع کیا۔ ''تو دیکھ رہا ہے کہ کس کثرت سے فتنے اٹھ رہے ہیں۔ اکثر لوگ جو میرے دشمن ہیں، یہ مشہور کرتے پھر رہے ہیں کہ یہ فتنے سلطان کے کثرت سے قتل کی سزائیں دینے سے ہیں۔ تیرا کیا خیال ہے؟''

برنی کی روح کانپ گئی کہ کیا جواب دے۔ اگر کہتا ہے، ہاں تو اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں سلطان اپنا دشمن کہہ رہا ہے۔ انکار کرتا ہے تو جھوٹ کا مرتکب ہوتا ہے کیونکہ حقیقت میں ایسا ہی تھا، فتنے اس کی سخت گیری کی وجہ سے اٹھ رہے تھے۔

سلطان نے اس کی مشکل آسان کردی۔ اسے خاموش دیکھ کر خود ہی کہنا شروع کیا۔ ''مجھے ایسے لوگوں کی پروا نہیں،

میں سزائے موت دینے سے ہاتھ نہیں کھینچوں گا۔''

برنی حیران تھا کہ سلطان نے کیا صرف یہی کہنے کے لیے اسے بلایا تھا۔

کچھ دیر کے توقف کے بعد سلطان نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''تو نے تو تاریخ کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ کیا تو نے کہیں دیکھا ہے کہ بادشاہوں نے کن کن جرائم پر سزائے موت دی ہے؟''

برنی نے کہا۔ ''میں نے ایک تاریخ میں پڑھا ہے کہ کوئی بادشاہ سزاؤں کے بغیر حکومت نہیں کرسکتا۔ اگر اس نے رعایت کی تو فسق وفجور کا بازار گرم ہوجائے گا۔ رعایا کے دلوں سے خوف نکل جائے گا۔''

''میں نے تجھ سے یہ نہیں پوچھا۔ میں نے تو یہ پوچھا ہے کہ کن کن مواقع پر سزا دی جاسکتی ہے۔''

برنی نے ایک واقعے سے اپنی بات کو مکمل کیا۔ ''جمشید کے ایک مقرب نے اس سے دریافت کیا، بادشاہوں کے لیے سزائے موت دینا کن کن جرموں میں مناسب ہے۔ جمشید نے جواب دیا کہ سات جرموں میں سزائے موت دینا برمحل ہے۔ جو ان سے بڑھے گا اور تجاوز کرے گا وہ پریشانی اور مصیبت میں پھنس جائے گا۔ اس ملک میں فتنے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ وہ سات جرم یہ ہیں۔

(1) ایک وہ جو دین حق سے پھر جائے۔

(2) وہ جو فرماں بردار لوگوں میں سے کسی کو قتل کردے۔

(3) تیسرے وہ کہ اس کی بیوی موجود ہو اور پھر بھی کسی دوسرے شخص کی بیوی سے زنا کرے۔

(4) چوتھے وہ جو بادشاہ کے خلاف بغاوت کا ارادہ کر رہا ہو اور اس کا ارادہ محقق ہوجائے۔

(5) وہ جو بغاوت کا سرغنہ ہو۔

(6) وہ جو بادشاہ کی رعایا ہونے کے باوجود اس کے دشمن کا ساتھ دے۔

(7) ساتواں وہ جو بادشاہ کی نافرمانی کرے اور یہ نافرمانی ایسی ہو جس سے بادشاہ کی حکومت کو نقصان پہنچے لیکن اس کے علاوہ اور کوئی نافرمانی نہیں۔

''تو نے جو وجوہات بتائیں وہ میں نے سن لیں۔ اب تو مجھے یہ بتا کہ ان میں سے کس کس کے بارے میں حدیثیں موجود ہیں اور کتنی بادشاہوں کے احکام پر مبنی ہیں۔'' سلطان نے دریافت کیا۔

برنی نے وضاحت کی۔ ''ان میں سے تین ایسی ہیں جن کے بارے میں احادیث موجود ہیں باقی چار سزائیں سلاطین اور حکومت کی بہتری سے تعلق رکھتی ہیں۔''

سلطان نے بڑے ذوق وشوق سے یہ وجوہات دریافت کی تھیں اور یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اب وہ بے جا قتل وغارت سے تائب ہوجائے گا لیکن سلطان تو مجموعہ ضدین تھا۔ اسی وقت منفی خصوصیات غالب آگئیں۔

''وہ سزائیں جن کا ذکر جمشید نے کیا ہے وہ قدیم زمانے کے لیے تھیں۔ میرے زمانے میں ایسے نافرمان لوگ پیدا ہوگئے ہیں کہ ان کے لیے تحقیق کی ضرورت نہیں۔ میں انہیں محض گمان کی بنیاد پر سزائے موت دیتا ہوں اور اس وقت تک دیتا رہوں گا جب تک یا تو میں ختم ہوجاؤں یا لوگ ٹھیک ہوجائیں۔''

''آپ پوری دنیا کو کیسے ٹھیک کرسکتے ہیں؟''

''دنیا کی آبادی کم تو کرسکتا ہوں۔ میں یہی کر رہا ہوں۔ تو دیکھ رہا ہے کہ دیوگیر، گجرات اور بھروچ میں کیسی آفت آئی ہوئی ہے۔ اگر میں یہاں کے تمام امیران کو ایک ہی دفعہ میں ختم کردوں تو ہر طرف امن ہوجائے۔ کیا پھر بھی تو یہ کہے گا کہ یہ فتنے کثرت سے سزائے موت دینے کا نتیجہ ہیں؟ لہٰذا سزائیں دیتا رہوں گا۔''

سلطان نے ایسا ہی کیا۔

وہ اپنے معاملات درست کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ دیوگیر جب اس کے ہاتھ سے نکلا تو وہ تقریباً مایوس ہوگیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ضیا الدین برنی کو اپنے تخت کے سامنے طلب کیا۔

''میری حکومت مریض ہوگئی ہے اور اس کا مرض کسی علاج سے دور نہیں ہوتا۔ ایک طرف کے معاملات ٹھیک کرتا ہوں تو دوسری طرف پریشانی کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اب تو مجھے بتا کہ قدیم زمانے کے بادشاہوں نے ایسے امراض حکومت کے متعلق کیا کہا ہے۔''

برنی نے عرض کیا۔ ''بعض سلاطین نے جب یہ دیکھا کہ رعایا کا اعتماد ان پر سے اٹھ گیا ہے اور تنفر پھیل گیا ہے تو ایسی صورت میں انہوں نے حکمرانی سے ہاتھ کھینچ کر مادشاہی کے فرائض اپنے بیٹوں میں سے سب سے لائق بیٹے کے سپرد کردیے ہیں اور خود گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے۔''

سلطان نے کہا۔ ''مجھے یہ مشورہ پہلے مل جاتا تو بات دوسری تھی۔ اب تو میں لوگوں سے ناراض ہوں۔ اب میرا طریقۂ علاج صرف تلوار ہے۔ میں سزائے موت دیتا ہوں اور تلوار مارتا ہوں۔ جتنی لوگ مخالفت زیادہ کریں گے، میں

سزائے موت اتنی ہی زیادہ دوں گا۔''

اس کی اس ضد نے ہندوستان کو خون میں نہلا دیا۔ اسے اپنے امیروں میں وہی امرا پسند تھے جو اسی کی طرح قتل و غارت گری کا بازار گرم کیے ہوئے تھے لہٰذا بڑے پیمانے پر تبدیلیاں کرتا رہتا تھا۔ جس امیر کے بارے میں معلوم ہوتا کہ وہ رعایت سے کام لے رہا ہے اسے معزول کر کے اپنا دشمن بنا لیتا اور اس کی جگہ کسی ظالم امیر کو مقرر کر دیتا۔ نتیجے میں رعایا برگشتہ ہو جاتی اور بغاوت اٹھ کھڑی ہوتی۔

قتلغ خان کو جو سلطان کا استاد بھی تھا، دیوگیر سے طلب کر لیا۔ دیوگیر کے باشندے قتلغ خاں کے چلے آنے سے کبیدہ خاطر تھے۔ یہاں کے باشندے قتلغ خاں سے بہت خوش تھے کیونکہ وہ ظالم نہیں تھا۔ وہاں کے خزانے کو دھارا گیر نامی شہر میں محفوظ کر دیا گیا۔

عزیز خمار کو مالوہ کا حاکم بنا کر بھیجا اور یہ نصیحت کی کہ تم جس کسی کو فتنہ انگیز دیکھو اس کو فوراً دقع (قتل) کر دینا۔

عزیز خمار جیسے ہی ولایت دھار میں پہنچا اس نے محض اندیشوں کو سامنے رکھتے ہوئے 80 سے زیادہ امرا کو قتل کرا دیا۔ یہ خبر جیسے ہی سلطان کو ملی اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ اسے ایسے ہی حاکموں کی ضرورت تھی۔ اس نے عزیز خمار کی طرف خاص خلعت روانہ کی۔

اسی طرح چند دوسرے لوگوں کو کہ جو ذلیل قسم کے آدمیوں میں سے تھے سلطان نے اپنے تقرب کا شرف بخشا اور ان کے مراتب اکثر امرا سے بلند کر دیے۔ ایک گویئے کو ولایت گجرات، ملتان اور بدایوں سپرد کر دیں۔ مالی کے لڑکے کو دیوان وزارت پر مقرر کر دیا اور فیروز حجام، مکا باورچی، لدھا مالی وغیرہ کو اپنی قربت سے ممتاز کیا۔ بڑے بڑے عہدے اور علاقے ان کے سپرد کر دیے۔

اس کے ان ارزل لٹیروں کی موجودگی نے ہر جگہ کے امیروں کو چراغ پا کر دیا۔ نئے نئے فتنے جنم لینے لگے۔ سلطان نے کم تر درجے کے لوگوں کو بڑے عہدے اس لیے دیے تھے کہ وہ ہمیشہ اس کے احسان مند رہیں گے اور اس سے منحرف نہیں ہوں گے لیکن وہ اتنی بات نہ جان سکا کہ ان معمولی لوگوں سے سلطنت کے کام انجام نہیں پا سکتے۔

ان فتنوں اور لوٹ مار کو روکنے کے لیے قتلغ خاں بادشاہ کے حضور پیش ہوا۔

عرض کیا۔ ''میں حضور کی بدولت اتنی فوج اور ہمت رکھتا ہوں کہ آپ مجھے اجازت دیں تو ان فتنوں کو اکیلا ختم کر سکتا ہوں۔''

''قتلغ خاں، کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ان فتنوں پر قابو نہیں پا سکتا؟'' سلطان نے برہم ہو کر کہا۔

''خاکم بدہن، میرا یہ مطلب نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ آپ کا جانا رعب شاہی کے خاتمے کا سبب بنے گا۔''

سلطان نے اس کی درخواست قبول نہیں کی اور فوج کو آراستہ کیا۔ اپنے چچازاد بھائی ملک فیروز کو اپنا نائب بنا کر دہلی میں چھوڑا اور خود دہلی سے کوچ کیا۔

جب سلطان کوہ آبھو پر جو کہ گجرات کی سرحد ہے، پہنچا تو اس نے ایک امیر کو نامزد کیا۔ باغی معمولی سے مقابلے کے بعد اس کے سامنے سے فرار ہو گئے اور دیوگیر کا راستہ لیا۔

سلطان آبھو سے بھروچ پہنچا اور نائب وزیر مملکت ملک قبول کو ان مفروروں کے تعاقب کے لیے بھیجا۔ ملک قبول دریائے نربدا کے کنارے پہنچا تھا کہ باغی نظر آ گئے۔ ملک قبول نے ان میں سے اکثر کو قتل کیا۔ بہت تھوڑے تھے جو فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔

سلطان کچھ عرصے تک بھروچ میں رہا اور بھروچ، کھنبایت اور گجرات کے تمام علاقوں کا مال جو لوگوں کے پاس تھا، حاصل کر کے خزانے میں داخل کیا۔ جو لوگ فتنہ پردازی میں مشغول تھے ان کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد ایک اور امیر کو دیوگیر روانہ کیا۔ یہاں جتنے باغی تھے ان سب کو قتل کرا دیا۔

اس کی تلوار دیوگیر میں چل رہی تھی۔ اس کے ایک غلام طغی نے سرکشی دکھائی اور بھروچ کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان خود اس وقت دیوگیر میں تھا۔ اس خبر کو سنتے ہی بھروچ آ گیا۔ سلطان کی آمد کی خبر سنتے ہی طغی کھنبایت بھاگ گیا۔ سلطان نے بھی نربدا عبور کیا اور کھنبایت پہنچ گیا طغی اس بار ساول کی طرف بھاگا۔ سلطان اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں بھی آ گیا۔ یہاں طغی کی فوج نے مقابلہ کیا۔ اس کے سپاہی شکست کھا کر قریب کے جنگلوں میں چھپ گئے۔ طغی تو بھاگ گیا لیکن اس کے لشکر کے تقریباً پانچ سو جنگجو زندہ گرفتار ہوئے مگر زندہ رہ نہ سکے۔ سب کے سب قتل کر دیے گئے۔

بہت بعد میں معلوم ہوا طغی ٹھٹھہ کی طرف بھاگ گیا ہے۔

سلطان طغی کا پیچھا کرتے ہوئے ٹھٹھہ بھی چلا جاتا لیکن ایک روز فتنے نے اس کا دامن پکڑ لیا۔ وہ باغی جو دیوگیر میں شکست کھا چکے تھے ایک جگہ جمع ہو گئے۔ ان کی سرداری حسن کانگو کر رہا تھا۔ ان باغیوں نے سلطان کے مقرر کردہ عاملوں کو قتل کیا اور حسن کانگو سلطان علاؤالدین کا خطاب اختیار کر کے تخت نشیں ہو گیا۔

سلطان نے اس فتنے سے نمٹنے کے لیے ملک فیروز، احمد ایاز اور دوسرے امیروں کو ان کے لشکر سمیت دہلی سے طلب کرلیا۔

لشکر آ گئے تھے لیکن یہ خبریں بھی برابر پہنچ رہی تھیں کہ حسن کانگو نے بے شمار فوج جمع کرلی ہے۔ اب اس سے مقابلہ آسان نہیں۔ اس نے ان لشکروں کو دیوگیر کی طرف بھیجنا موقوف کردیا اور یہ طے کیا کہ گجرات کے انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد وہ خود حسن کانگو سے مقابلے کے لیے روانہ ہوگا۔

گجرات میں اسے دو سال متواتر قیام کرنا پڑ گیا۔ لشکر کی تنظیم نو کرتا رہا۔ پھر اس نے موجودہ جوناگڑھ کا قلعہ مع مضافات قبضے میں لے لیا۔ اس نواح کے سارے مقدم اور راجا مطیع ہوگئے۔

وہ تین برساتیں گجرات میں گزار چکا تھا۔ تیسری برسات ہوئی تو وہ کاٹھیاواڑ کے علاقے موضع گونڈل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں سے اسے باغی طنی کو قتل کرنے کے لیے جانا تھا جو ٹھٹھہ کی طرف بھاگ گیا تھا۔ یہاں اسے اطلاع ملی کہ دہلی میں ملک کبیر کا انتقال ہوگیا۔ دہلی میں اس وقت تک ملک فیروز ہی موجود تھا لیکن سلطان کو اس پر پورا بھروسا نہیں تھا۔ وہ نصیرالدین چراغ دہلوی سے بیعت تھا۔ نصیرالدین چراغ دہلوی سے سلطان کے تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔ دیگر مشائخ بھی سلطان سے خوش نہیں تھے۔ اسے یہ خبریں ملتی رہتی تھیں کہ ملک فیروز کو تخت نشیں کرنے کے لیے سازشیں کی جارہی ہیں۔ نصیرالدین چراغ دہلوی ملک فیروز کے حق میں ہیں۔ سلطان کو خدشہ ہوا کہ ملک کبیر کے انتقال کے بعد ملک فیروز تخت پر نہ بیٹھ جائے۔ اس نے لشکر سے احمد ایاز اور ملک مقبول، نائب وزیر ممالک کو دارالحکومت دہلی کے معاملات درست کرنے کے لیے دہلی بھیجا اور دہلی سے بعض امرا اور مشائخ وعلما کو گونڈل طلب کیا۔ ان میں ملک فیروز اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی بھی تھے۔ سلطان چاہتا تھا کہ یہ دونوں اس کے ہمراہ رہیں تاکہ بغاوت کا خطرہ ٹل جائے۔ یہ دونوں اس کی نظروں کے سامنے رہیں۔

دہلی سے جو امرا آئے ان کے ساتھ ان کے لشکر بھی تھے۔ اس طرح سلطان کے پاس بہت بڑی جمعیت ہوگئی اور لشکر بھی مستعد ہوگیا۔ ملتان، اچھ اور سیوستان سے کشتیاں بھی آ گئیں۔

سلطان بخار میں مبتلا تھا۔ اس لیے سفر کچھ دن کے لیے روک دیا گیا۔

ملک کبیر کے انتقال کے بعد قتلغ کے لیے میدان صاف ہوگیا تھا۔ یہ موقع تھا جب ملک فیروز کو تخت نشیں کیا جاسکتا تھا دہلی کے امرا، مشائخ اور مولوی سب محمد تغلق سے نالاں اور ملک فیروز کے حق میں تھے۔ نصیرالدین چراغ دہلوی، ملک فیروز کو بادشاہت کی خوش خبری دے چکے تھے لیکن ملک فیروز طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں بغاوت کے الزام میں قتل نہ کرادیا جائے۔

قتلغ خاں نے موقع دیکھا تو شیخ نصیرالدین کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

''یا شیخ! اس وقت سلطان ہزاروں میل دور ہے۔ ملک کبیر کے انتقال کے باعث دہلی کا نظام بگڑا ہوا ہے۔ اگر اس وقت ملک فیروز کو تخت نشیں کردیا جاتا ہے تو علما اور مشائخ سب ہمارا ساتھ دیں گے۔''

''بادشاہتیں صرف علما اور مشائخ کے کہہ دینے سے نہیں ملا کرتیں۔ سلطان کے امرا اور لشکر اب بھی سلطان کا ساتھ دے گا۔'' شیخ نصیرالدین نے فرمایا۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میرا ذاتی لشکر سب انتظام سنبھال لے گا۔''

شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے۔ پھر آپ نے گردن اوپر اٹھائی اور فرمایا۔

''ابھی وقت نہیں آیا۔ پردۂ غیب میں ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ ملک فیروز کے قدم ابھی تخت سے کچھ فاصلے پر ہیں۔ انتظار کرو۔''

اتنا بڑا فیصلہ اور اس پر عمل درآمد قتلغ خاں کے اکیلے کے بس میں نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ آیا اور کوئی اور تدبیر سوچنے لگا۔

وہ کچھ اور سوچتا لیکن اس سے پہلے احمد ایاز اور ملک مقبول دہلی میں داخل ہوئے۔ ان کے آنے کے بعد یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ قتلغ خاں کوئی قدم اٹھاتا۔ اس کے بعد تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان امرا کو سلطان نے اپنے پاس طلب کرلیا جن پر قتلغ خاں اثر انداز ہوسکتا تھا۔ ان امرا کے چلے جانے کے بعد قتلغ خاں کسی سے مدد نہیں لے سکتا تھا۔

قتلغ خاں بیمار پڑ گیا اور اس کی حالت روز بہ روز تشویش ناک ہوتی چلی گئی۔ ملک فیروز کی تخت نشینی کا معاملہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

سلطان ابھی تک کاٹھیاواڑ میں تھا۔ اسے یہ خبریں برابر پہنچ رہی تھیں کہ ملک فیروز کو تخت نشیں کرانے کی کوششیں کی

جارہی ہیں۔ وہ ایسے تمام لوگوں کو دہلی سے دور کردینا چاہتا تھا جو اس کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔ اس نے ملک فیروز اور شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی کو بھی اپنے حضور طلب کرلیا۔

جب سلطان پہلی مرتبہ دہلی سے جارہا تھا اس وقت بھی اس نے شیخ نصیرالدین کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا تھا لیکن اس وقت آپ نے انکار کردیا تھا مگر اب انکار ممکن نہیں تھا کیونکہ ملک فیروز کو بھی ان کے ساتھ ہی طلب کیا گیا تھا۔ اگر آپ نہ جاتے تو ملک فیروز کو اکیلے جانا پڑتا اور آپ اس موقعے پر اس کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

رخصت ہونے سے پہلے یہ دونوں قتلغ خاں کی عیادت کے لیے گئے۔ قتلغ خاں آخری سانسیں لے رہا تھا لیکن اس عالم میں بھی اسے یہ افسوس تھا کہ وہ محمد تغلق کی جگہ ملک فیروز کو بادشاہ نہ بنا سکا۔

''میری خواہش تھی کہ مشائخ کے دشمن محمد تغلق کی جگہ ملک فیروز کو حکومت سونپ دی جائے کیونکہ یہ شہزادہ مشائخ کا بے حد احترام کرتا ہے لیکن میری بیماری نے مجھے مجبور کردیا۔''

''آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ آسمانی فیصلوں کو کوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔ ملک فیروز کی قسمت میں بادشاہت لکھی جاچکی ہے۔''

''کاش! میں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا۔''

شاہی محافظ آ گئے تھے جن کے ہمراہ ان دونوں کو کاٹھیاواڑ جانا تھا اور پھر بادشاہ کے ہمراہ سندھ کی طرف۔ دونوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ انہیں قیدی بنا کر لے جایا جارہا ہے یا بادشاہ محض اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ ملک فیروز نے تو اپنے اندیشے کا یہاں تک اظہار کردیا تھا کہ شاید بادشاہ اسے قتل کرادے گا البتہ شیخ نصیرالدین نہایت مطمئن تھے۔ وہ ملک فیروز کو آمادہ کرتے چلے جارہے تھے کہ جب بادشاہ بننے کا وقت آئے تو وہ کوئی عذر نہ کرے۔

ایک جگہ پہنچ کر ملک فیروز نے حضرت شیخ سے دریافت کیا۔ ''کیا آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ بادشاہ میری ولی عہدی کا اعلان کرے گا؟''

''وہ اب سے دو سال پہلے تیری ولی عہدی کا عندیہ دے چکا ہے۔ اس کا گواہ مورخ ضیاالدین برنی ہے۔ میں نے خود اس سے معلوم کیا تھا۔''

''میرے لیے تو یہ کہا جاتا رہا ہے کہ میری ننھیال ہندو مذہب سے تعلق رکھتی ہے اس لیے میری بادشاہت کی مخالفت کی جائے گی۔''

''ایسا ہونا ممکن تھا لیکن محمد تغلق کی سزاؤں نے سب کو

انداز بیاں اور

☆ مرد اپنی پوری زندگی میں پانچ سال تک فیڈر کے ساتھ سوتا ہے۔

☆ 5 سال سے 10 سال تک کھلونوں کے ساتھ۔

☆ 10 سے 15 سال کی عمر تک کتابوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

☆ 15 سے 20 سال کی عمر تک خوابوں کے ساتھ۔

☆ 20 سے 30 سال کی عمر میں بیوی کے ساتھ۔

☆ 30 سے 40 سال کی عمر میں جو مل جائے اس کے ساتھ۔

☆ 40 سے 50 سال کی عمر میں دوا کے ساتھ۔

☆ 60 سے 70 سال کی عمر میں بند کھڑکیوں کے ساتھ سوتا ہے۔

ڈاکٹر یونس بٹ کی کتاب سے انتخاب

مرسلہ: حسنین عباس بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

اس سے برگشتہ کردیا ہے۔ طبقۂ مشائخ بھی اس سے خوش نہیں اس لیے مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم ایک ایسے قیدی ہو جسے بادشاہ بنانے کے لیے لے جایا جارہا ہے۔''

سلطان محمد تغلق گونڈل سے چل پڑا اور دریا کے کنارے آ گیا۔ لشکر اور ہاتھیوں کے ساتھ دریا کو عبور کرکے دوسرے کنارے پر پہنچا۔

یہاں پہنچ کر اس کی طاقت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ چغتائی مغلوں کے پانچ ہزار منگول التون بہادر نامی سردار کی ماتحتی میں سلطان کی خدمت میں پہنچ گئے۔ یہ کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ سلطان نے اس کمک کو کیوں طلب کیا ہے جبکہ اس کے پاس ایک عظیم لشکر پہلے سے موجود تھا۔

سلطان تغلق اس لشکر کے آجانے کے بعد ٹھٹھہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب ٹھٹھہ تیس کوس رہ گیا تو عاشورہ (محرم) کا دن تھا۔ اس دن اس نے روزہ رکھا اور تمام کام ترک کردیے۔ دوپہر تک ضروری احکام بھی جاری کرتا رہا لیکن دوپہر کے بعد خاموشی طاری ہوگئی۔ روزے کی وجہ سے لوگ اس سے بات کرتے ہوئے بھی ڈر رہے تھے۔

شاہی باورچی خانے میں سلطان کے افطار کے لیے خورونوش کے سامان کی تیاری کی جارہی تھی۔ اس سامان میں ایک خاص قسم کی مچھلی بھی تھی جو سلطان کو بہت پسند تھی۔

افطار سے کچھ پہلے اسے خبر ملی کہ دہلی سے شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی اور ملک فیروز لشکر میں پہنچ چکے ہیں۔

حکم برداروں نے اطلاع دینے کے بعد یہ بھی جاننا چاہا تھا کہ ان دونوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ افطار کا وقت قریب تھا اس لیے سلطان نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ صرف اتنا کہا کہ دونوں کا فیصلہ افطار کے بعد کروں گا۔

یہ اطلاع جب باہر آئی تو ملک فیروز کو یقین ہوگیا کہ سلطان ان سے خوش نہیں۔

''یا شیخ! سلطان نے میرے قتل کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''میں اس کا چچازاد بھائی ہوں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ افطار کے لیے مجھے اپنے خیمے میں بلاتا۔ اس کے برعکس اس نے یہ کہلوا دیا کہ وہ ہم دونوں کا فیصلہ افطار کے بعد کرے گا۔ اس کا فیصلہ لوگوں کو قتل کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔''

''بے شک! تم نے ٹھیک کہا لیکن آدمی سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے۔ سلطان نے جو بھی سوچا ہو، وہ ہوگا نہیں۔ مغرب کی نماز کی تیاری کرو۔ روزہ تو مجھے بھی افطار کرنا ہے۔''

ملک فیروز نے محافظوں سے اجازت طلب کی اور وضو کرنے کے لیے آگے بڑھنے لگا۔ حضرت شیخ چراغ دہلوی نے ایک مرتبہ پھر اسے مخاطب کیا۔ ''نماز کے بعد یہ دعا ضرور کرنا کہ خدا تمہیں استقامت دے اور ہاں خدا سے یہ عہد بھی کرنا کہ بادشاہ بننے کے بعد خلق خدا پر ظلم نہیں کرو گے اور مشائخ کی خدمت کرتے رہو گے۔''

ملک فیروز نے اس نصیحت کو غور سے سنا اور یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ سلطان نہ جانے کیا فیصلہ کرے، شیخ ابھی تک بادشاہت کی بشارت دے رہے ہیں۔

باجماعت نماز کی ادائیگی کے لیے صفیں تیار تھیں۔ سلطان کا انتظار تھا لیکن وہ ابھی تک خیمے سے باہر نہیں آیا تھا۔ وقت نکلے جارہا تھا۔ اسی وقت کسی نے آکر بتایا کہ سلطان کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ کھڑے ہونے کی طاقت بھی باقی نہیں رہی۔

نماز زیادہ ضروری تھی۔ سلطان کے خیمے میں چند حکیموں کے سوا کوئی نہیں رہا۔ سب لوگ نماز میں مشغول ہوگئے۔

نماز سے فراغت کے بعد لوگوں کو سلطان کی فکر ہوئی۔ معلوم ہوا افطار میں سلطان نے مچھلی کھائی تھی۔ اس کے بعد اس کی حالت بگڑ گئی۔ ملک فیروز اور چند علما خیمے کے اندر گئے۔ سلطان نیم غنودگی کے عالم میں تھا۔ قریب کھڑے ہوئے حکیموں کے چہروں پر تشویش کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔

یہ خبر لشکر میں پھیلی تو طرح طرح کی چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ علما اور مشائخ محمد تغلق کے خلاف ہوگئے تھے لہٰذا اسے ایک سازش کے تحت زہر دے دیا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ زہر اس مچھلی میں ہو جو سلطان نے بڑے شوق سے کھائی تھی۔

ملک فیروز سلطان کے سرہانے بیٹھ گیا۔ شاہی حکیم نئی نئی دوائیں تجویز کررہے تھے لیکن محمد تغلق پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔

رات بہت ہوگئی تھی سلطان تغلق بے ہوشی کے عالم میں آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ملک فیروز کچھ دیر پہلے کے واقعات پر غور کررہا تھا۔ محمد تغلق نے کس یقین کے ساتھ کہا تھا کہ وہ ان دونوں (یعنی ملک فیروز اور شیخ نصیرالدین چراغ) کا فیصلہ افطار کے بعد کرے گا۔ مرشد شیخ نصیر الدین نے فرمایا تھا۔ ''سلطان نے جو کچھ سوچا ہے وہ ہوگا نہیں۔''

واقعی ایسا ہورہا ہے۔ افطار کے بعد سلطان کو اتنی فرصت ہی نہ مل سکی کہ وہ فیصلہ کرتا۔ فیروز نے سوچا، سلطان کا فیصلہ میرے قتل کے سوا کیا ہوسکتا تھا لیکن اب سلطان یہ فیصلہ نہیں سنا سکتا۔ اب سلطان کسی علاج سے صحت یاب نہیں ہوسکتا۔ اس نے جو سوچا ہے وہ نہیں ہوسکتا۔ اب کا تب تقدیر کا فیصلہ یہ ہے کہ سلطان میرے ہاتھ میں ہے۔ میں چاہوں تو وقت سے پہلے اسے مار دوں لیکن نہیں، سلطان صرف بادشاہ نہیں میرا خون بھی ہے۔ اس کی تیمارداری کرنا میرا فرض ہے۔ ممکن ہے وہ صحت یاب ہوکر اپنا فیصلہ تبدیل کردے۔

لشکر میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ ان کی عورتیں اور بچے دہلی سے ہزار کوس کے فاصلے پر صحرا میں قیام کیے ہوئے تھے۔ انہیں یہ فکر لاحق تھی کہ اگر سلطان نے وفات پائی تو ان کی ہلاکت اور بربادی یقینی ہے۔ لشکر کے لوگ مال اور عورتوں کے لالچ میں آپس میں لڑ پڑیں گے۔

بھاگنے کے لیے راستے کا علم بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود بہت سے لوگ بھاگنے بھی لگے تھے۔

ملک فیروز، محمد تغلق کی تیمارداری میں دن رات ایک کررہا تھا۔ محمد تغلق کبھی کبھی آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھ لیتا تھا لیکن بولنے کا یارا نہیں تھا یا شرمندگی اسے بولنے نہیں دیتی تھی۔

لشکر میں ہر روز کہلوا دیا جاتا تھا کہ سلطان تیزی سے صحت یاب ہورہا ہے۔

علما اور مشائخ ملک فیروز سے اصرار کررہے تھے کہ وہ اپنی تخت نشینی کا اعلان کردے لیکن بادشاہ کی زندگی میں تخت نشینی کا اعلان بغاوت کے مترادف تھا۔ وہ انکار کرتا رہا۔

21 محرم 751ھ کو سلطان محمد تغلق نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں کھولیں۔ فیروز تغلق کی طرف دیکھا اور اسے نام لے کر پکارا۔ پھر یہ اشعار اس کی زبان پر جاری ہوئے۔

بسیار دریں جہاں چمیدیم
بسیار نعیم جو ناز دیدیم
اسپان بلند بر نشستیم
ترکان گراں بہا خریدیم
کردیم بسے نشاط و آخر
چوں قامت ماہ نو خمیدیم

(اس دنیا میں ہم بہت گل گشت کرتے رہے۔ ہم نے بہت سی نعمتوں اور نازوں سے لطف اٹھایا۔ بڑے بڑے اونچے گھوڑوں پر بیٹھے اور بڑے بڑے قیمتی ترک غلام خریدے۔ ہم نے بہت مزے اڑائے لیکن آخر کار نئے چاند کی طرح ہم جھک کر رہ گئے)

اس کے بعد سلطان نے اپنی وصیت کا ذکر کیا۔

''میں نے تین آدمیوں کو اپنی ولی عہدی کے لیے منتخب کیا تھا۔ ایک ملک مقبول جو اب اس دنیا میں نہیں رہا دوسرا احمد ایاز۔ وہ اب ستر سال سے اوپر کا ہوگیا۔ گھوڑے تک پر نہیں بیٹھ سکتا۔ تیسرے تم ہو۔ سب کو بلا لاؤ تاکہ میں تمہارا نام تحریر کرادوں۔''

ملک فیروز خیمے سے باہر آیا کہ امرا کو جمع کرسکے۔ خیمے میں واپس آیا تو سلطان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرچکی تھی۔

علما، مشائخ اور امرائے نامدار جمع ہوئے تو سلطان جاچکا تھا۔

سلطان کی وفات کی خبر چھپائی جانی تھی لیکن آہ وزاری کا ایسا شور مچا کہ کوئی یہ دیکھ ہی نہیں سکا کہ کون باہر نکلا اور کس نے یہ خبر لشکر تک پہنچادی۔ لشکر سے شور کی آوازیں بلند ہوئیں۔

وہ رات لشکر میں قیامت کی رات تھی۔ ہر شخص کو اپنے لٹ جانے کا خوف تھا۔ انہیں تواتر سے یہ خبریں مل رہی تھیں کہ مغلوں کے جو پانچ ہزار سوار التون بہادر کے ہمراہ آئے تھے وہ لشکر میں لوٹ مار کی تدبیریں کررہے ہیں۔ وہ مال غنیمت کے لالچ میں آئے تھے اور یہاں کسی سے جنگ نہ ہوسکی۔ وہ چاہتے تھے خزانہ لوٹ لیں اور عورتوں کو اٹھا کر لے جائیں۔ بادشاہ کی وفات ہوچکی تھی۔ نیا بادشاہ مقرر نہیں ہوا تھا۔ وہ اب کسی کے حکم کے پابند نہیں تھے۔

لشکر کے سپاہیوں پر رات بھر خوف طاری رہا۔ ہتھیار سنبھالے آگے پیچھے دوڑتے رہے۔ آپس میں بھی لوگ ایک دوسرے سے خوف زدہ تھے۔ رات کے سناٹے میں کسی عورت یا بچے کی چیخ بلند ہوجاتی تھی جو دور لگے امرا کے خیموں تک پہنچتی تھی۔

تخت نشینی کا مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا تھا کہ لشکر کی حالت بد سے بدتر ہونے لگی۔ ملک فیروز نے تمام امرا کو جمع کیا اور مشورہ چاہا کہ لشکر کے خطرات کس طرح دور کیے جائیں۔ سب کی رائے یہی تھی کہ مغلوں کی فوج کو اسلامی لشکر سے دور ہٹا دیا جائے۔

ان امرا کی موجودگی ہی میں ملک فیروز نے مغلوں کے سردار التون بہادر کو طلب کیا۔

''جیسا کہ آپ کو معلوم ہے سلطان محمد تغلق نے وفات پائی ہے۔ سلطان نے اپنی مدد کے لیے آپ کو بلایا تھا۔ اب نہ وہ سلطان رہا نہ وہ ممکنہ جنگ جس میں آپ کو شریک ہونا تھا لہٰذا اب آپ کو اجازت ہے کہ جلد از جلد اپنے وطن کو روانہ ہوجائیں۔ لشکر سلطانی اب دہلی کی طرف واپس ہوگا۔ آپ لشکر کی روانگی سے قبل اپنے لوگوں کو لے کر لشکر سلطانی سے دور ہوجائیں تاکہ کوئی بدنظمی نہ ہو۔''

ملک فیروز نے التون بہادر اور اس کے امیروں کو خلعت وانعامات سے نوازا۔

مغلوں کا سردار اپنی فوج کو لے کر چل دیا۔

محمد تغلق کا ایک غلام نوروز کرگن اس گفتگو کو سن کر رہا تھا۔ اس کے دل میں بے ایمانی آگئی۔ وہ اپنے خاندان کے افراد کے ہمراہ مغلوں کے پاس چلا گیا جو شاہی لشکر سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گئے تھے اور اپنے وطن جانے کی تیاری کررہے تھے۔ اس نے اپنے متوسلین کو تو لشکر میں چھوڑا اور خود مغلوں کے سردار التون بہادر کے خیمے میں پہنچ گیا۔

''التون بہادر، تم میرے آقا سلطان محمد کے پاس آئے تھے تو کیا تمہیں یہ توقع نہیں تھی کہ بہت سا مال غنیمت

تمہارے ہاتھ آئے گا؟''

''یہی توقع ہمیں یہاں کھینچ لائی تھی لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ سلطان وفات پا گیا۔'' التون نے کہا۔

''تو کیا دور دراز کا سفر طے کر کے یونہی خالی ہاتھ چلے جاؤ گے؟''

''ملک فیروز نے ہمیں انعام واکرام سے نوازا ہے۔ ہم اس کے شکر گزار ہیں۔''

''تمہیں معمولی سی رقم دے کر خود پورے خزانے پر قابض ہے۔''

''یہ اس کا حق ہے۔ وہ سلطان کا جانشین ہے۔''

''یہ خزانہ تمہیں بھی مل سکتا ہے۔ اگر مجھے تمہاری طرف سے انعام کی توقع ہو تو میں تمہیں راہ سجھاؤں۔''

''وہ کس طرح؟''

''بادشاہ کی اچانک موت سے شاہی لشکر پریشان ہے۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہیں۔ ابھی تک کوئی تخت پر نہیں بیٹھا ہے اس لیے بدنظمی ہی بدنظمی ہے۔ میری اطلاع کے مطابق کل لشکر روانہ ہوگا۔ اس بے ترتیب لشکر پر اگر حملہ کر دیا جائے تو خزانہ اور لشکر میں شامل عورتوں پر بہ آسانی قبضہ کیا جا سکتا ہے۔''

مغل تو پہلے ہی یہ ارادہ کر رہے تھے لیکن ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ نوروز ان کے ساتھ مل گیا اور ترغیب دی تو ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔

اگلے دن شاہی لشکر سیوستان کی جانب روانہ ہوا۔ لشکر کا ہر گروہ کسی سردار کی رہنمائی کے بغیر بے ترتیبی سے چل رہا تھا۔ گھر پہنچنے کی جلدی نے سب کو حواس باختہ کیا ہوا تھا۔

یہ غافل لشکر ابھی بہ مشکل دو کوس چلا ہوگا کہ مغل سامنے آ گئے اور ٹھٹھہ کے مفسد پیچھے سے۔ مغلوں اور مفسدوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ بہت سی عورتیں اٹھا لی گئیں۔ مال واسباب میں سے جو جس کے ہاتھ لگا لوٹ لیا۔

لشکریوں نے اس دن کو بڑے خوف وہراس سے گزارا اور دوسرے دن نہایت احتیاط سے فوج کو ترتیب دے کر سفر شروع کیا۔ جیسے تیسے دریا کے کنارے پہنچے لیکن اس طرح کہ آنکھیں آسمان کو تک رہی تھیں۔

اب یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر لشکر کے لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تو اونٹوں پر لدا شاہی خزانہ غیر محفوظ ہو جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ لشکر کے لوگ خود خزانہ لوٹ لیتے۔

علما اور مشائخ سر جوڑے بیٹھے تھے۔ سب کی رائے یہ تھی کہ ملک فیروز کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا جائے۔ جب مغلوں کو معلوم ہوگا کہ نیا بادشاہ منتخب ہو گیا ہے تو وہ لوٹ مار سے باز آ جائیں گے۔ لشکر بھی کسی کا حکم ماننے کا پابند ہوگا۔ یہاں کئی ایسے معتبر راوی موجود تھے جو بتا رہے تھے کہ سلطان نے اپنے چچا کے بیٹے ملک فیروز کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ مورخ ضیاالدین برنی کو بلایا گیا۔ اس نے بھی گواہی دی۔

طے یہ ہوا کہ ایک وفد ملک فیروز کے پاس جائے اور اسے بادشاہت کے لیے مجبور کرے۔

مخدوم زادہ عباسی، شیخ الشیوخ مصری، شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی اور دوسرے علما ومشائخ، امرا وملوک اور معتبر لوگ اور ہر طبقے کے سردار شاہی درگاہ میں گئے۔ ملک فیروز ان اکابرین کو دیکھ کر اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''حضرات! اس بندۂ ناچیز کو طلب کر لیا ہوتا۔''

''بات ایسی ہی تھی کہ ہمیں آنا پڑا۔''

''مجھ سے جو خدمت ممکن ہوئی کروں گا۔''

تمام لوگوں نے ملک فیروز کے مرشد شیخ نصیر کی طرف دیکھا۔ اشارہ یہ تھا کہ وہ گفتگو کا آغاز کریں۔ ملک فیروز ان کی بات نہیں ٹال سکے گا۔

''بے شک! آسمانی فیصلوں کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔'' شیخ نے کہا۔ ''آسمانوں پر فیصلہ ہو چکا کہ سلطان محمد تغلق کا چچازاد، ولی عہد اور وصی ملک فیروز، رجب سالار کا بیٹا تخت شاہی پر جلوہ افروز ہو۔''

''یا مرشد! میں نے تو دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ حجاز وزیارت حرمین شریفین کے لیے نکلوں گا۔''

''اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے لیکن اب تقاضائے وقت یہ ہے کہ بے کسوں کی فریاد رسی کر اور تخت سلطنت پر بیٹھ جا۔'' تمام امرا وملوک نے بہ یک آواز کہا۔ ''سلطان کے کوئی بیٹا نہیں۔ لشکر گاہ میں اور نہ دارالحکومت دہلی میں کوئی شخص ایسا ہے جو بادشاہی کے لائق ہو۔ اگر تو آج تخت پر نہیں بیٹھے گا تو کل کو یہ مغل اور ٹھٹھہ کے لوگ ہم میں سے کسی ایک کو بھی سلامت نہیں چھوڑیں گے۔''

فیروز تغلق، علما ومشائخ کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ان کے حکم کو ٹال نہ سکا۔ 24 ویں محرم 752ھ بمطابق 1351ء کو تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔

سلطان فیروز نے لشکر کو باقاعدہ ترتیب دیا اور دوسرے ہی روز سفر شروع کر دیا۔ اب لشکر میں ایک نیا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ مغل سوار لوٹ مار کے لیے آتے تو مارے جاتے یا گرفتار ہو جاتے۔ رفتہ رفتہ ان کی مزاحمت ختم ہو گئی اور وہ اپنے وطن کی طرف لوٹ گئے۔

ٹھٹھہ کے مفسدوں نے بھی پیچھا کرنا چھوڑ دیا۔ لشکر بہ آسانی سیوستان پہنچ گیا جہاں سلطان نے چند روز قیام کیا۔

سیوستان سے روانہ ہونے کے بعد وہ بھکر پہنچا۔ یہاں کے لوگوں پر نوازشیں کیں، مزارات کی زیارت کی۔ اچھ سے آگے بڑھا تھا کہ اسے احمد ایاز کے علم بغاوت بلند کرنے کی خبر ملی۔ سلطان محمد تغلق نے احمد ایاز کو اپنا نائب بنا کر دہلی میں چھوڑا تھا۔ یہ وہی احمد ایاز تھا جس نے وہ محل تیار کیا تھا جس کے نیچے دب کر غیاث الدین تغلق ہلاک ہوا تھا۔

احمد ایاز نے جب سنا کہ محمد تغلق کا ٹھٹھہ کے قریب انتقال ہو گیا ہے تو اس نے تخت پر قبضہ کر لیا اور لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے ایک چھ سات سال کے لڑکے کو لوگوں کے سامنے پیش کر کے یہ کہہ دیا کہ یہ سلطان محمد تغلق کا بیٹا ہے جبکہ سلطان محمد تغلق کا کوئی بیٹا تھا ہی نہیں۔

احمد ایاز کی بغاوت کا سن کر بعض امرا فکرمند ہو گئے تھے لیکن سلطان فیروز، احمد ایاز کے اس اقدام پر ہنسنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے امرا کو سمجھا رہا تھا۔

''احمد ایاز کا پیشہ فن تعمیر ہے وہ میدان جنگ کا مرد نہیں۔ اس نے کبھی کمان ہاتھ میں نہیں پکڑی، کبھی بدمزاج گھوڑے پر سوار نہیں ہوا۔ مجھے اس شخص کے خلاف لشکر اور تیاری کی کیا ضرورت۔ نہ اس میں اتنا دم خم ہے کہ مقابلے پر آئے۔ میں جیسے ہی شہر کے قریب پہنچوں گا وہ دوسرے دروازے سے نکل جائے گا۔ مجھے تو افسوس یہ ہے کہ اس نے اس بڑھاپے میں ایسی خیانت کا کام کیا۔''

سلطان فیروز منتقم مزاج نہیں تھا۔ وہ اب بھی اپنے امرا سے کہہ چکا تھا کہ بڑھاپے میں آدمی کا دماغ چل جاتا ہے۔ احمد ایاز بھی سٹھیا گیا ہے۔ وہ اگر مجھ سے معافی کا طلب گار ہوگا تو میں اسے ضرور معاف کر دوں گا۔

وہ دیبال پور پہنچ چکا تھا۔ اب وہ دہلی کے قریب تھا اس لیے خبریں بڑی تیزی سے آ رہی تھیں۔ خبریں پہنچ رہی تھیں کہ اس نے رذیلوں اور غلاموں کو اپنے اعوان وانصار میں شامل کر لیا ہے۔ قصبات کے گنواروں کو بلا لیا ہے اور ان پر مشتمل لشکر تیار کر لیا ہے۔ خزانے کی رقم بڑی بے دردی سے خرچ کر رہا ہے۔ شہر کے لوگ ڈر کے مارے احمد ایاز کا دم بھرتے ہیں لیکن دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے ہیں کہ کب سلطان فیروز دہلی پہنچتا ہے اور کب انہیں اس عذاب سے نجات ملتی ہے۔

سلطان فیروز حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے مزار کی زیارت کے لیے اجودھن گیا۔ وہ ٹھٹھہ سے یہاں تک برابر یہ تاثر دیتا چلا آ رہا تھا کہ سلطان محمد تغلق کے برعکس وہ بزرگان دین کا احترام کرتا ہے۔ موجودہ علما ومشائخ کو اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس نے اپنے مرشد سے یہی وعدہ کیا تھا کہ بادشاہ بننے کے بعد وہ مشائخ کا احترام کرتا رہے گا۔

سلطان فیروز منزل بہ منزل آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ جب اس کا فتح مند لشکر فتح آباد کے قریب پہنچا تو ملک مقبول جو دہلی کا وزیر المالک تھا اپنے خاندان سمیت درگاہ سلطانی میں حاضر ہو گیا۔ سلطان نے اسے خلعتِ فاخرہ سے نوازا۔

ملک مقبول کے چلے آنے کے بعد سلطان فیروز کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔

ملک مقبول کے چلے آنے کے بعد احمد ایاز پر سخت گھبراہٹ طاری ہوئی۔ سلطان فیروز ہانسی تک پہنچ گیا تھا کہ احمد ایاز نے سید جلال ترمذی، مولانا نجم الدین اور داؤد خانہ وغیرہ کو اپنا ایلچی بنا کر بادشاہ کی خدمت بھیجا۔

احمد ایاز نے پیغام بھیجا تھا۔ ''حکومت کو آج بھی سلطان محمد تغلق کے خاندان سے تعلق ہے کیونکہ اس کا چھ سالہ بیٹا تخت پر بیٹھا ہے۔ اگر آپ حکمرانی چھوڑ کر سلطنت، محمد تغلق کے ولی عہد کے ہاتھ میں دے دیں اور خود صرف نائب کی حیثیت سے فرائض انجام دیں تو میں راہ سے ہٹ جانے کو تیار ہوں۔ میں تو صرف خاندان تغلق کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہا ہوں۔''

سلطان فیروز شاہ اس پیغام کو پڑھ کر فکرمند ہو گیا۔ اس نے تمام اراکین سلطنت کو جمع کیا اور ان سے پوچھا۔

''آپ لوگ ہمیشہ مرحوم بادشاہ کے قریب رہے ہیں۔ میرے علم میں تو نہیں۔ آپ لوگ بتائیں کہ بادشاہ نے اپنا کوئی بیٹا چھوڑا ہے؟''

تمام امرا نے یک زبان ہو کر نفی میں جواب دیا۔

''بادشاہ کے کوئی بیٹا نہیں۔ اگر کوئی بیٹا ہوتا تو بادشاہ آپ کے نام کی وصیت نہ کرتا یا پھر یہ دعویٰ بادشاہ کی بہن کی طرف سے آتا۔ یہ احمد ایاز دعویٰ کرنے والا کون ہوتا ہے۔''

ان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد سلطان نے علما کو طلب کیا تاکہ ان سے بھی مشورہ کرے اور پوچھے کہ شرع کی رو سے اسے اب کیا کرنا چاہیے؟

اس مجلس میں شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی، مولانا کمال الدین سمانہ اور مولانا شمس الدین جیسے مشہور علما ومشائخ موجود تھے۔

''آپ لوگ مجھے بتائیں کہ ولی عہدی کا یہ مسئلہ کس طرح طے ہو؟''

ان لوگوں نے بھی امرا کے اقوال کی تصدیق کی البتہ مولانا کمال الدین سمانہ نے اس بحث سے قطع نظر کہ سلطان محمد تغلق کے کوئی بیٹا تھا یا نہیں، اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ فرمایا۔

''وہ جس کے ہاتھوں کام کا آغاز ہوا وہی اس کام کو انجام دے تو بہت ٹھیک ہے۔''

سلطان فیروز کا اندیشہ دور ہوگیا۔ اگر تخت پر بیٹھنے والا بچہ واقعی سلطان تغلق کا بیٹا تھا تو بھی علما کا فتویٰ سلطان فیروز کو مل گیا۔ اس نے کام کا آغاز کیا ہے وہی اس کو انجام دے گا۔

اس فتوے کے بعد سلطان فیروز نے احمد ایاز کے قاصدوں کو گرفتار کرلیا۔

سلطان تغلق کا کوئی بیٹا تھا یا وہ لاولد تھا۔ یہ مسئلہ مورخوں کے نزدیک اب بھی اختلافی رہا ہے۔ مولف تاریخ فرشتہ نے علما کی گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ لاولد نہیں تھا بلکہ جسے تخت پر بٹھایا گیا تھا وہ واقعی سلطان محمد تغلق کا بیٹا تھا۔ تاریخ فیروز شاہی کے مولف ضیاالدین برنی نے اس لڑکے کو مجہول النسب لکھا ہے بلکہ یہ تک لکھا کہ یہ کسی کی حرام کی اولاد تھا۔

اب سلطان کو ہانسی سے دارالحکومت دہلی کی طرف روانہ ہونا تھا۔ اس نے لشکر آراستہ کیا اور روانہ ہوا۔ وہ ابھی راستے میں تھا کہ شیخ زادہ بسطامی، نتھو سودھل، حسام ادھنگ وغیرہ جو احمد ایاز کے اعوان وانصار ہوگئے تھے اپنے سروں کو ننگا کرکے اور پگڑیاں گلوں میں لپیٹ کر سلطان کے سامنے حاضر ہوگئے۔

یہ وہ لوگ تھے جن کے دم سے احمد ایاز کی حکومت چل رہی تھی۔ جب انہوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور لشکر جو قصبات کے گنواروں پر مشتمل تھا، منتشر ہوگیا تو احمد ایاز بے آسرا ہوگیا۔

سلطان فیروز دہلی کے قریب پہنچ گیا تھا اور اب احمد ایاز میں مقابلے کی تاب نہیں تھی۔ اس نے اشرف الملک خلجی اور ملک حسین مرزا کو اپنے گناہوں کو معاف کرانے کے لیے بادشاہ کے پاس بھیجا۔ سلطان نے اس کے جرم کو معاف کردیا لیکن اس شرط پر کہ وہ خود سلطان کے سامنے حاضر ہو اور اپنے گناہوں کی معافی طلب کرے۔ احمد ایاز کے لیے اب فرار کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

اس نے بھی پگڑی گردن میں لپیٹی اور اپنے منڈے ہوئے سر کو ننگا کرکے درگاہ سلطانی میں حاضر ہوگیا۔ ابھی مزید ذلت اس کے نصیب میں لکھی ہوئی تھی۔ کھلے دربار میں اس سے خاک بوسی کرائی گئی۔

اس نے خاک آلود چہرہ اوپر اٹھایا تو سلطان نے اسے ملامت کی۔

''تجھ سے یہ کیا حرکت سرزد ہوئی۔ نمک کا حق ادا نہ کیا اور اپنے ولی نعمتوں کو پیٹھ دکھائی۔''

احمد ایاز نے جواب دیا۔ ''جب تک میرا اقبال میرے ساتھ تھا میں ولی نعمتوں کے مزاج کے مطابق کام کرتا رہا۔ میرا نصیب مجھ سے پھر گیا تھا کہ مجھ سے ایسی حرکت سرزد ہوئی کہ بدنامی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اب میں معافی کا طلب گار ہوں۔''

سلطان فیروز نے اس سے تو کچھ نہیں کہا، ہانسی کے کوتوال کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ احمد ایاز کو کسی جگہ لے جا کر قید کردیا جائے۔

یہ بھی فرمایا۔ ''مجھے اس بوڑھے سے شرم آتی ہے۔ نہیں معلوم کسی مسکین مظلوم کی بددعا اس کے حق میں مقبول ہوگئی کہ اس نے دیدہ ودانستہ خود اپنی مرضی سے خود کو اس مصیبت میں مبتلا کرلیا۔''

سلطان نے اس کے ایک ساتھی ملک غیاث الدین کو جلاوطن کرکے سرہند بھیج دیا اور دوسرے شیخ زادہ بسطامی کو ہندوستان سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

چوں تیرہ شور مردرا روزگار
ہمہ آں کند کش نیا بدبہ کار

(جب آدمی کا زمانہ تاریک ہوجاتا ہے تو وہی کرتا ہے جو اس کے کام نہیں آتا)

یہ معمولی کانٹے ہٹانے کے بعد سلطان فیروز شاہ تغلق دہلی میں داخل ہوا اور اورنگ خسروی پر جلوہ افروز ہوا۔

سلطان کے دارالحکومت میں داخل ہونے کے پہلے ہی دن فتنہ ختم ہوگیا۔ کوئی ایک قتل کرائے بغیر، ایک قطرۂ خون بہائے بغیر، کسی خاندان کو تباہ کیے بغیر یہ بغاوت جڑ سے اکھڑ گئی۔ یہ اس کی حکومت کے لیے اچھا شگون سمجھا گیا۔

لوگ جب سلطان محمد تغلق کی قتل وغارت گری کا موازنہ سلطان فیروز سے کرتے تھے تو انہیں حیرت ہوتی تھی کہ موجودہ سلطان نے باغیوں کا بھی خون بہانا مناسب نہ سمجھا۔ ان باغیوں کے اہل خاندان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

ماخذات

تاریخ فیروز شاہی، ضیاالدین برنی۔ تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ۔ طبقات اکبری، خواجہ نظام الدین احمد۔ تاریخ مبارک شاہی، یحییٰ بن احمد سرھندی۔ آئینہ حقیقت نما، اکبر شاہ خاں



نئی دنیا

کاشف زبیر

تجسّس نے ہمیشہ دریافت کے مراحل طے کرتے ہوئے کائنات کو تسخیر کرنے کا عمل جاری رکھا ہے۔ شوق کے اس سفر میں جستجو اسے بھی آگے بڑھاتی رہی اور بالآخر اسے ایسی منزل پہ لا چھوڑا جس نے اس پر سوچ کے نئے در وا کردیے۔ کائنات کا یہ روپ دیکھ کر اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

پرخطر راستوں پر مشتمل موت کے جزیرے میں زندگی کی جولانیاں

موبی اس چھوٹی سی چٹان کے سب سے اوپری حصے پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کا بنا ہوا نیزہ اور اس سرد موسم میں اس کے جسم پر رینڈیئر اور برفانی ریچھ کی کھال سے بنا ہوا گرم ترین لباس تھا۔ اس چھوٹی سی چٹان کے سامنے دور تک برف کا ایک وسیع میدان پھیلا ہوا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے لوگوں کے ساتھ اس میدان میں سفر کرسکے گا اور کسی ایسی جگہ پہنچ سکے گا جہاں کوئی آبادی نہ ہو۔ موبی کا پورا نام موبی ای کی جا تھا اور وہ اپنے چھوٹے سے قبیلے کا سردار

تھا۔اس کا سردار باپ سیل مچھلی کے شکار کے دوران میں یخ بستہ سمندر میں گر گیا تھا اور اس سے پہلے کہ اسے پانی سے نکالا جاتا وہ منجمد ہو کر مر چکا تھا۔

موبی صرف بیس برس کی عمر میں اپنے قبیلے کا سردار بن گیا تھا۔اب وہ پینتیس برس کا تھا اور ان برسوں میں اس نے اپنے چھوٹے سے قبیلے کو قدرتی آفات اور دشمنوں سے کامیابی سے محفوظ رکھا تھا۔اس علاقے میں سوائے شکار کے اور کچھ نہیں تھا۔ واحد جانور جسے پالا جا سکتا تھا وہ رینڈیئر تھا۔لیکن مزید خوراک اور لباس کے لیے انہیں سیل اور برفانی ریچھ کا شکار بھی کرنا پڑتا تھا۔

کئی ہزار سال پہلے جب ان کے آبا و اجداد اس علاقے میں آئے ہوں گے تو اس وقت جگہ کی کمی نہیں تھی۔لیکن جگہ کم پڑنے لگی قبیلوں کی زمین کے حصول پر لڑائی ہونے لگی۔طاقتور قبیلے موقع پا کر کمزور قبیلوں کو جگہ سے بے دخل کر دیتے تھے۔لیکن کمزور ہونے کے باوجود قبیلے اپنی جگہ کی حفاظت کے لیے جان توڑ کوشش کرتے تھے اور اکثر بڑے قبیلے کو بھی اتنا جانی نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔اس لیے بڑی لڑائیاں کم ہی ہوتی تھیں۔

موبی کے قبیلے میں اس دور کے مطابق تمام کام مل جل کر کیے جاتے اور شکار میں برابر کا حصہ ہوتا تھا۔کھال سے لباس اور دوسری اشیاء بنتی تھیں جبکہ چربی سے آگ جلائی جاتی تھی۔حرارت حاصل کرنے کے لیے ان کے پاس برفانی ریچھ، سیل اور رینڈیئر کی گرم ترین کھالوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔سال کے چھ مہینے ان کے علاقے میں سوائے برف کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

موبی کا قبیلہ خشکی کے ساتھ ہی ایک سمندری کٹاؤ پر آباد تھا جہاں سال کے بارہ مہینے برف جمی رہتی تھی لیکن وہ یہاں صدیوں سے آباد تھے اس لیے انہیں کو معلوم تھا کہ زمین کہاں ہے اور سمندر کہاں؟ کٹاؤ کے چاروں طرف بلند چٹانیں تھیں جو کسی دشمن سے ان کی حفاظت کرتی تھیں۔اس جگہ آنے کے لیے ایک چھوٹا سا راستہ تھا جس کی حفاظت دو آدمی بھی کر سکتے تھے۔ان کے پاس لکڑی، ہڈی اور پتھر سے بنے اوزار اور ہتھیار تھے۔بنیادی طور پر وہ جنگجو نہیں تھے صرف اپنا دفاع کرتے تھے۔

آس پاس آباد کئی قبیلے موبی کے علاقے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔سمندر پاس ہونے کی وجہ سے انہیں یہاں شکار کی بہتات تھی۔دوسرے قبائل کی دلی خواہش تھی کہ کسی طرح یہ جگہ ان کے ہاتھ آجائے۔لیکن اس جگہ کی دفاعی پوزیشن ایسی تھی کہ یہاں حملہ کرنا نہایت دشوار تھا۔موبی اور اس کے ساتھی بھی بے خبر نہیں تھے۔موبی دشمنوں کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہتا تھا۔اس کا قبیلہ چھوٹا تھا۔افراد کی کل تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں تھی۔موبی کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کرنے والے مردوں کی تعداد پچاس سے زیادہ نہیں تھی۔ان کے مقابلے میں دوسرے قبیلوں میں لڑنے والے جوان مردوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

جب موبی سردار بنا تو کٹاؤ میں آنے والا راستہ کسی قدر چوڑا تھا۔اس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے پتھر تلاش کر کے اس راستے کو پتھروں سے بھر کر چھوٹا اور دشوار گزار کر دیا۔ڈھلان کے اندر والے حصے سے سب سے بلند پہاڑی تک ایک سیڑھی دار راستہ بنا کر سب سے اوپر ایک چوکی بنا دی تھی جہاں ہمہ وقت ایک آدمی آس پاس نظر رکھتا تھا کٹاؤ میں آنے والے راستے پر بھی ہمہ وقت دو پہریدار مستعد رہتے تھے۔موبی کے سردار بننے کے بعد ایک قبیلے نے شرارت کی تھی۔جو کٹاؤ سے چند میل دور جنوب میں آباد تھا۔اسے شکار کے لیے سمندر تک جانے کے لیے دوسرے قبیلوں کے علاقے سے گزرنا پڑتا تھا۔اس لیے انہوں نے سوچا کہ اگر وہ موبی کے قبیلے کی جگہ پر قبضہ کر لے تو ان کی مشکل آسان ہو جائے گی۔ایک رات انہوں نے خاموشی سے حملہ کیا اور جیسے ہی وہ کٹاؤ کے پاس پہنچے انہیں معلوم ہوا کہ موبی اور اس کے ساتھی دفاع کے لیے تیار تھے۔موبی کے پہریداروں نے تاریکی کے باوجود حملہ کرنے والوں کی حرکت پہلے ہی محسوس کر لی تھی جیسے ہی حملہ آوروں نے کٹاؤ میں داخل ہونے کی کوشش کی ان پر پتھروں کی بارش ہو گئی۔ابھی حملہ کرنے والے اس مصیبت سے نہیں سنبھلے تھے کہ موبی اور اس کے باقی ساتھیوں نے حملہ کر دیا۔اس غیر متوقع مدافعت سے گھبرا گئے اور اپنے چھ ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔موبی کے آدمیوں کا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔اس کے بعد کسی قبیلے کو ہمت نہیں ہوئی تھی کہ ان کے علاقے پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا۔

موبی جانتا تھا کہ جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی قبیلہ پھر حملہ کرنے کی کوشش کرے گا۔وہ اسی وجہ سے پریشان تھا۔یہ پریشانی اس کی بیوی امشی نے محسوس کر لی۔ایک رات جب وہ سونے کے لیے اپنے برف سے بنے مکان میں آیا تو امشی نے اس سے پوچھ لیا۔”میرے آقا تم کیوں پریشان ہو؟“

موبی نے اپنی حسین اور وفا شعار بیوی کی طرف دیکھا۔”مجھے ڈر ہے جلد کوئی نہ کوئی قبیلہ ہم پر چڑھ دوڑے گا

اور یہاں سب سے چھوٹا قبیلہ ہمارا ہی ہے۔“

”لیکن مجھے یقین ہے جتنے بہادر مرد اس قبیلے میں ہیں کسی اور قبیلے میں نہیں ہوں گے۔“

”مجھے بھی اپنے ساتھیوں کی بہادری پر شک نہیں ہے لیکن دشمن زیادہ ہوں تو ہم کب تک ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔“

”پھر ہم ایک محفوظ جگہ پر ہیں۔“ امشی نے اپنے محبوب شوہر کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش جاری رکھی۔”اگر دشمن زیادہ ہوں تو تب بھی ہم اسے روک سکتے ہیں۔“

امشی کی تسلی کے باوجود موبی پریشان رہا تھا۔جب وہ شام میں سورج کو افق پر غائب ہوتے دیکھتا تو اسے آسمان پر سرخ رنگ کی لہریں دکھائی دیتی تھیں اور وہ ڈر جاتا تھا۔اس کی یہ کیفیت اس کے نائب ہارا کی نے بھی محسوس کر لی۔

”آقا تم مجھے پریشان لگ رہے ہو؟“

”ہاں میں پریشان ہوں۔“ موبی نے تسلیم کر لیا۔ہارا کی صرف اس کا نائب ہی نہیں بلکہ بہترین دوست بھی تھا۔اس لیے موبی نے بلا جھجک اسے اپنی پریشانی کی وجہ بتا دی۔ہارا کی نے بھی اسے تقریباً امشی کے الفاظ میں تسلی دی۔

”میرے دوست اور آقا، ہم نے پچھلی بار حملہ آوروں کے ساتھ جو کیا تھا اسے دیکھتے ہوئے اب کوئی ہماری طرف آنے کا سوچے گا بھی نہیں۔“

”لیکن مجھے لگتا ہے کہ شور کوئی قبیلہ ہمارے خلاف سازش کر رہا ہے۔مجھے یقین ہے ان کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔“

طے پایا کہ شکار پر اب آدھے جوان مرد جائیں گے اور آدھے ہر وقت کٹاؤ میں موجود رہا کریں گے۔ورنہ اس سے پہلے سوائے پہریداروں کے تقریباً سارے ہی جوان مرد شکار پر جاتے تھے۔سرد موسم کی وجہ سے ان کی خوراک زیادہ تھی۔موبی نے پہریداروں کے ساتھ اپنے آدمیوں کے دس دس کے دو گشتی دستے بنا دیے تھے جو دن اور رات میں باری باری کٹاؤ کے آس پاس کے میدانوں میں گشت کرتے تھے۔اس کا مقصد شور کوئی اور ان جیسے بدنیت قبیلوں کو بتانا تھا کہ وہ غافل نہیں ہیں۔

اس کے بعد موبی کسی قدر مطمئن ہو گیا۔موسم سرما کی آمد قریب تھی اور شدید سردی آنے سے پہلے وہ اتنا گوشت چربی اور کھالیں جمع کر لیتے تھے جس سے سرما کے دوران میں گزارا ہو سکے۔افرادی قوت کم ہونے سے شکار کی رفتار بھی اتنی تیز نہیں رہی تھی پھر بھی اسے امید تھی کہ وہ سرما گزارنے کے لائق سامان جمع کر لیں گے۔آخری دنوں میں موبی نے حفاظت پر مامور افراد میں کمی کر کے ان کو بھی شکار پر بھیج دیا تھا۔اب کٹاؤ کی حفاظت پر بیس سے زیادہ افراد موجود نہیں تھے ہارا کی سربراہی میں ان میں خود موبی بھی شامل تھا۔

اس رات سب معمول کے مطابق تھا۔خود سونے کے لیے جانے سے پہلے موبی نے کٹاؤ کے داخلی حصے اور اوپر پہاڑی پر موجود پہریدار کو دیکھا، وہ سب مستعد تھے۔اس کے باوجود رات کو شور کوئی قبیلے کے حملہ آور کیسے کٹاؤ میں گھس آئے وہ نہیں جان سکا تھا۔وہ سو رہا تھا کہ باہر ہونے والے شور نے اسے بیدار کیا اور پھر وہ اپنے ہتھیار سنبھال کر باہر آیا۔داخلی حصے سے شور کرتے حملہ آور داخل ہو کر مکانوں میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ اس کے قبیلے کے لوگ مدافعت کر رہے تھے۔موبی اپنا لکڑی کا نیزہ اور ہڈی سے بنی ہوئی کلہاڑی لے کر حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑا۔اس نے پہلے ہی حملے میں دو افراد کو مار گرایا۔اس کی آمد سے اس کے آدمیوں کا حوصلہ بڑھا تھا۔

موبی نے اندازہ لگایا کہ حملہ آوروں کی تعداد ساٹھ سے زیادہ تھی۔جبکہ اس کے ساتھ لڑنے والے مشکل سے تیس تھے۔ان میں تقریباً سارے ہی جوان آدمی تھے۔چند بوڑھے بھی تھے۔جب کہ حملہ آور سارے ہی جوان اور جنگجو تھے اور ان کا مقابلہ کرنا مشکل لگ رہا تھا۔اب تک انہوں نے کئی افراد کو مار ڈالا تھا۔مرنے والوں میں بوڑھے اور بچے نظر آرہے تھے۔موبی کو ان کی فکر نہیں تھی وہ تو باقی افراد کو بچانا چاہتا تھا۔

اچانک اس نے چلا چلا کر عورتوں سے کہنا شروع کر دیا کہ وہ اپنے بچوں کو لے کر ساحل کی طرف بھاگ جائیں۔اس کی آواز سن کر عورتیں اپنے چھوٹے بچوں کو لے کر مکانوں سے نکلیں اور ساحل کی طرف بھاگنے لگیں۔انہیں بھاگتے دیکھ کر حملہ آوروں کی توجہ ان کی طرف ہوئی۔اس کا فائدہ اٹھا کر موبی اور اس کے ساتھی ایک جگہ جمع ہو کر حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے۔ان کے جوش و خروش کے سامنے حملہ آور اچانک ہی وہاں سے بھاگ نکلے۔دیکھتے ہی دیکھتے کٹاؤ ان سے خالی ہو گیا۔

موبی کے آدمی ان کے پیچھے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے انہیں روک دیا۔اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ کٹاؤ کے داخلی دروازے کی حفاظت کریں۔پھر وہ چربی کی مشعلوں میں نقصان کا اندازہ کرنے لگا۔اس کا دل رکنے لگا کہ صرف مکانوں سے باہر کوئی پچاس لاشیں پڑی تھیں اور ان میں کئی اس کے جنگجو ساتھیوں کی تھیں۔لیکن بیشتر مرنے والے بوڑھے اور بچے تھے۔حملہ آوروں نے انہیں بے دریغ قتل کیا

تھا۔اس کے قبیلے کی نصف آبادی مر چکی تھی جو بچے تھے ان میں بھی کئی زخمی تھے۔اب موبی کے پاس دس آدمی بھی نہیں بچے تھے جو حملہ آوروں سے لڑ سکتے اس لیے وہ چاہتا تھا کہ اس کے شکار پر گئے آدمی واپس آجائیں۔کچھ دیر بعد انکشاف ہوا کہ حملہ آوروں نے درجن سے بھی زیادہ جوان عورتوں اور لڑکیوں کو پہلے ہی الگ کرلیا تھا اور جاتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے، یہ مرنے والوں سے بھی بڑا نقصان تھا۔اس کی بقا کی ضامن یہی عورتیں تھیں جو بچے پیدا کرسکتیں۔صبح سے پہلے شکار پر جانے والے واپس آگئے اور ان کے لیے بھی یہ سب نہایت اندوہناک تھا۔اپنے پیاروں کی لاشوں کو دیکھ کر وہ جوش انتقام سے بے تاب ہو گئے تھے۔وہ شاید شور کوئی قبیلے کی طرف دوڑ جاتے لیکن موبی نے بہ مشکل انہیں باز رکھتے ہوئے کہا۔

''اگر تم لوگ اس طرف گئے اور مارے گئے تو پھر اس قبیلے کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ہم فنا ہوجائیں گے۔''

''تب ہم کیا کریں؟'' ہارا کی چلّا کر بولا۔

موبی مشعلوں کی روشنی میں اپنے ساتھیوں کے چہرے دیکھتا رہا اور پھر اس نے کہا۔''ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔وہ کل پھر حملہ کریں گے اور اس بار ہم انہیں نہیں روک سکیں گے۔اس لیے یہاں سے جانا ضروری ہے۔''

''ہم چلے جائیں لیکن کہاں؟'' امشی نے کہا۔

''یہ میں نہیں جانتا تھا لیکن ہمیں یہاں سے جانا ہو گا۔خوراک اور اپنا سارا سامان تیار کرلو۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔یہ سنتے ہی اس کے ساتھی حرکت میں آگئے تھے۔انہوں نے سلیج گاڑیوں میں رینڈیئر جوتے اور ان پر سامان بار کیا۔مرنے والوں کی لاشیں برف میں دفن کردی گئیں۔ویسے سمندر ہی ان کو خوراک اور دوسری چیزیں مہیا کرتا تھا اس لیے وہ خود کو سمندر کی امانت سمجھتے تھے اور مرنے کے بعد یہ امانت سمندر کو لوٹا دی جاتی تھی۔اب اتنے مردوں کو سمندر تک لے جانا ممکن نہیں تھا اس لیے انہیں یہیں کٹاؤ میں برف کھود کر دفن کیا جانے لگا۔صبح تک وہ ان سارے کاموں سے فارغ ہوگئے تھے اور اب روانگی کے لیے سردار کے حکم کے منتظر تھے۔

موبی سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے لوگوں کو لے کر کس طرف جائے۔شمال میں سمندر تھا اور اس سے آگے کہیں کوئی زمین تھی تو وہ اس سے ناواقف تھے۔مشرق اور جنوب میں دوسرے قبیلے آباد تھے۔موبی نے ہارا کی کی طرف دیکھا۔''ہمیں مغرب کی طرف جانا ہوگا کیونکہ شمال میں سمندر ہے اور مشرق وجنوب میں دشمن ہیں۔''

''ٹھیک ہے ہم مغرب کی طرف جائیں گے۔'' ہارا کی نے بلا توقف کہا۔ان میں سردار کے حکم سے سرتابی کی کسی میں مجال نہیں تھی۔صبح ہوتے ہی روانہ ہوگئے۔ان میں سے کئی زخمی تھے انہیں سلیج میں ڈال لیا اور باقی افراد پیدل چل رہے تھے۔خود موبی بھی پیدل تھا اگرچہ اس کے بازو میں بھی لڑائی کے دوران میں زخم آیا تھا۔امشی نے اس کے بازو پر ایک پرانی کھال لپیٹ دی تھی۔وہ کپڑے سے واقف ہی نہیں تھے۔ذرا دیر بعد وہ کٹاؤ والی جگہ سے دور نکل گئے تھے۔ان کے پاس خوراک کا محدود ذخیرہ تھا کیونکہ سلیج میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ ساری خوراک لے جاسکتے۔موبی سمیت ان میں سے کسی کو علم نہیں تھا کہ ان کی منزل کہاں ہے۔

وہ چوبیس گھنٹے تک سفر کرتے رہے تھے۔خوش قسمتی سے ان کے پاس آگ محفوظ رہی تھی ورنہ اگر کسی وجہ سے کوئی قبیلہ آگ سے محروم ہوجاتا تو دوسرے قبیلے والے بہت بڑی قیمت کے عوض آگ دیتے تھے اور یہ قیمت دو جوان کنواری لڑکیاں ہوتی تھیں۔چوبیس گھنٹے بعد جب انہیں اطمینان ہوا کہ وہ دشمن کی پہنچ سے دور نکل آئے ہیں تب انہوں نے رکنے اور آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔

تھکن کے باوجود موبی کو نیند نہیں آرہی تھی۔امشی بھی جاگ رہی تھی البتہ اس کے دونوں بچے سو گئے تھے۔امشی نے کہا۔''میرے آقا کیا سوچ رہے ہیں؟''

''میں سوچ رہا ہوں کہ شور کوئی حملہ آور کٹاؤ میں داخل کیسے ہوئے جبکہ پہریدار موجود تھے۔انہوں نے سب کو خبردار کیوں نہیں کیا؟''

پہریداروں کے پاس سیل کی کھوکھلی ہڈی سے بنی ایسی سیٹی تھی جس کی آواز ایک میل تک آسانی سے سنی جاسکتی تھی لیکن ان میں سے کسی نے سیٹی بجا کر انہیں خبردار نہیں کیا تھا۔موبی کے سوال پر امشی بھی چونک گئی۔''ہاں آپ نے ان سے پوچھا میرے آقا؟''

موبی نے گہری سانس لی۔''وہ بتانے کے لیے زندہ نہیں رہے تھے، دونوں پہریدار اپنی جگہوں پر مردہ پائے گئے اور عجیب بات ہے، اوپر چوکی کا نگران بھی اپنی چوکی میں مردہ پڑا تھا۔اسے کس نے مارا اور جب اس نے حملہ آوروں کو دیکھ لیا تو اس نے سیٹی کیوں نہیں بجائی؟''

امشی اتنی ذہین نہیں تھی کہ اس قسم کے معاملات پر سوچ سکتی موبی سردار اور دوسرے معاملات دیکھنے اور باقی لوگوں کی حفاظت کے خیال سے تفتیش نہیں کرسکا تھا کہ پہریداروں نے اپنا فرض کیوں انجام نہیں دیا اور خاموشی

سے اپنی جگہوں پر کیوں مارے گئے تھے؟ مگر اب وہ سوچ رہا تھا، یہ بہت اہم سوال تھا۔صرف پہریداروں کی غفلت سے اتنا نقصان ہوا تھا۔اگر وہ بروقت خبردار کردیتے تو موبی کا نصف قبیلہ یوں ختم نہ ہوتا اور شاید انہیں اپنی جگہ بھی چھوڑ کر نہیں نکلنا پڑتا۔صبح موبی باہر آیا، ہارا کی اور دوسرے لوگ روانگی کی تیاری کررہے تھے۔موبی نے انہیں صرف ایک رات کے لیے رکنے کی اجازت دی تھی۔افسوسناک خبر یہ تھی کہ کل رات ان کے دو شدید زخمی ہونے والے ساتھی بھی ختم ہو گئے تھے۔یہ بھی جنگجو جوان تھے۔موبی کے لیے یہ بہت بڑا نقصان تھا، اس کی نصف سپاہ موت کے گھاٹ اتر چکی تھی اور اب اس کے پاس مشکل سے دو درجن جوان تھے اگر راستے میں کوئی ان پر حملہ کردیتا تو وہ مزاحمت نہیں کرسکتے تھے۔

اس دن بھی وہ مغرب کی طرف سفر کرتے رہے۔ان کے سامنے دور تک برف سے ڈھکا ہوا ہموار میدان تھا جس میں کہیں کہیں برف کے ٹیلے سر اٹھائے کھڑے تھے۔پھر آنے والے دنوں میں بھی اس منظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔اس دوران میں سرما سخت ہوتا جارہا تھا۔آنے والے ایک ہفتے میں ان کے مزید سات افراد فنا کے گھاٹ اتر گئے تھے۔ان میں پانچ بوڑھے اور دو بچے شامل تھے۔وہ سردی برداشت نہیں کرسکے تھے۔موبی سرد موسم کی شدتوں سے بخوبی واقف تھا۔اور انہیں اس وقت سے پہلے کوئی ایسی جگہ تلاش کرنی ہوگی جہاں وہ باقاعدہ گھر بنا کر رہ سکیں ورنہ ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچتا۔اس سارے علاقے میں سرما کے دوران میں شدید برفانی طوفان آتے تھے اور درجہ حرارت بہت نیچے چلا جاتا تھا۔اپنی بستی میں وہ سردی کے پانچ مہینے گھروں میں رہ کر اور سو کر گزارتے تھے باہر نکلنے کی ہمت کوئی نہیں کرتا تھا۔وہ پانچ مہینے شروع ہونے میں کچھ وقت تھا۔

سفر کے دوسرے ہفتے میں موسم مزید اتنا خراب ہوگیا تھا کہ دو دن تک ایک طوفان نے ان کا راستہ روکے رکھا۔اس طوفان اور سردی نے مزید چار ضعیف لوگوں کی جان لے لی۔اب ان کی تعداد پچاس سے زیادہ نہیں تھی۔ان میں پچیس جوان مرد، بارہ عورتیں اور ایک درجن سے زیادہ مختلف عمروں کے بچے تھے۔جن سے سردی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔سفر کے پندرھویں دن تین بچے اچانک ہی بیمار ہوئے اور چند گھنٹوں میں زندگی کی بازی ہار گئے۔ان کی اموات نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ہارا کی نے موبی سے کہا۔''آقا ہمیں اب سمت بدل لینی چاہیے ہمیں جنوب کی طرف جانا چاہیے، جہاں امید ہے کہ اچھا موسم ملے گا۔''

موبی نے انکار کیا۔''جنوب کی طرف ہمیں اچھے موسم سے زیادہ دشمن ملیں گے۔ہم جس کی سرزمین میں داخل ہوں گے وہ ہمارا دشمن بن جائے گا۔ہمیں مغرب کی ہی طرف جانا ہوگا وہیں ہمیں کوئی ایسی سرزمین ملے گی جو کسی کی نہیں ہوگی، صرف ہماری ہوگی۔''

''مغرب کی طرف آج تک کوئی نہیں گیا ہے۔'' ہارا کی بولا۔

''اسی لیے تو میں اس طرف جارہا ہوں۔'' موبی نے اس کی طرف دیکھا۔''ہماری عافیت اسی میں ہے کہ اس طرف بڑھتے رہیں۔''

''ہمارے بچے مر رہے ہیں۔'' ہارا کی اس بار کسی قدر تلخی سے بولا۔

''میرے بھی بچے ہیں اور ممکن ہے وہ بھی مرجائیں۔'' موبی نے آہستہ سے کہا۔''لیکن میں وہی کروں گا جو قبیلے کے لیے بہتر ہوگا۔''

''ہمیں جنوب کی طرف جانا چاہیے۔'' ہارا کی نے کہا۔''یہ صرف میرا نہیں دوسرے لوگوں کا بھی خیال ہے۔''

''مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔'' اس بار موبی کا لہجہ سخت ہوگیا۔''اگر کوئی جانا چاہتا ہے تو چلا جائے لیکن قبیلہ اسی طرف سفر کرے گا۔''

ہارا کی اس کے پاس سے ہٹ گیا۔وہ اس روز بھی اسی سمت میں سفر کرتے رہے مگر موبی نے محسوس کیا کہ دوسرے بہت سارے لوگ اب مغرب کی طرف جانے پر متفق نہیں تھے، وہ جنوب کی طرف جانا چاہتے تھے۔وہ موسم کی سختی سے گھبرا رہے تھے جب کہ موبی کے خیال میں جنوب میں ان کا واسطہ انسانوں سے پڑے گا اور یہ اچھی بات نہیں ہوگی۔انسان کبھی اپنی حد میں مداخلت پسند نہیں کرتا ہے اس لیے لڑائی ہوگی اور ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ کسی سے لڑ سکتے۔ان کے پاس خوراک ختم ہوتی جارہی تھی اور اب بس چند ہفتوں کی خوراک باقی رہ گئی تھی۔راستے میں کہیں شکار نہیں ملا تھا ویسے بھی وہ اجنبی جگہوں پر شکار نہیں کھیلتے تھے۔وہ صرف جانی پہچانی جگہوں پر شکار کرتے تھے جہاں کے خطرات کے بارے میں وہ پوری طرح جانتے ہوں۔

آنے والے چند دن ان کے لیے مزید سختی لے کر آئے، دو بچے اور ایک جوان سردی کی نذر ہوگئے۔باقیوں کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔سردی ناقابل برداشت حد تک آ پہنچی تھی اور اس سردی کے دوران وہ اپنے گھروں میں محدود ہوکر رہ جاتے تھے لیکن یہاں وہ کھلے آسمان تلے سفر کرنے پر

مجبور تھے۔ ایک طرف ان کے افراد ایک ایک کر کے سردی کا شکار ہو رہے تھے دوسری طرف موبی نے محسوس کیا کہ اس کے لوگ اب مغرب کی طرف سفر کرنا نہیں چاہتے اور ہارا کی کے خیالات وہ سن ہی چکا تھا۔

ایک شام وہ رکے تو ہارا کی اور قبیلے کے دوسرے مرد موبی کے پاس آئے۔ ہارا کی ان کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''سردار، یہ تم سے درخواست کرنے آئے ہیں۔''

''کیسی درخواست؟''

''اب ہم مغرب کی طرف سفر جاری نہیں رکھنا چاہتے۔'' ایک آدمی نے کہا۔

''اس طرح ہم سب سردی سے مر جائیں گے۔'' دوسرا بولا اور پھر سب ہی بولنے لگے۔ موبی بولنے کے بجائے ان کے خاموش ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ ان سب کی آوازیں خاموش ہو گئیں تو موبی کھڑا ہو گیا۔

''میرے ساتھیو ہمیں مغرب کی طرف ہی جانا ہے۔ اس طرف سختی ہے اور سردی بھی ہے لیکن جنوب میں یقینی موت ہو گی۔''

''یہاں بھی تو ہم مر رہے ہیں۔''

''ہاں، پر بچے ہوئے بھی ہیں۔ جنوب میں بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔''

''ہم اب مزید یہ سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔'' ہارا کی ضدی لہجے میں بولا۔ باقی اس کے حامی نظر آ رہے تھے۔ موبی نے باری باری ان سب کی طرف دیکھا اور بولا۔

''ٹھیک ہے جو مغرب کی طرف سفر نہیں کرنا چاہتا وہ جنوب کی طرف چلا جائے۔''

موبی نے محسوس کیا کہ قبیلے کے جوان لوگ اس سفر کے خلاف ہو گئے تھے اور وہ ان سے نہیں لڑ سکتا تھا یہ اس کے دست و بازو تھے۔ کوئی خود سے نہیں لڑ سکتا۔ اس لیے موبی نے بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگلے دن آدھے سے زیادہ افراد مغرب کے بجائے جنوب کی طرف سفر کرنے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے اپنی سلیجیں اور سامان بھی الگ کر لیا تھا۔ موبی کے ساتھ مشکل سے ایک درجن لوگ رہ گئے تھے۔ ان میں دو بچے اور دو جوان عورتیں بھی شامل تھیں جن کا اب کوئی اور نہیں تھا۔ چار موبی اور اس کے بیوی بچے تھے اور ایک اس کا وفادار ساتھی اس کی بیوی اور تین بچے تھے۔ کاتکی اس کا ساتھ چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ جنوب کی طرف جانے والے تقریباً تمام ہی جوان مرد اور عورتیں تھیں۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد موبی نے کاتکی سے کہا۔

''آگے سفر بہت مشکل ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ہم مر جائیں لیکن بچ گئے تو کسی ایسی جگہ تک ضرور پہنچ جائیں گے جہاں پھر ہمیں کسی کا خوف نہیں ہو گا۔''

''میں سمجھتا ہوں سردار۔'' کاتکی نے کہا۔ ''میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا چاہے زندگی ہو یا موت۔''

ان کے پاس اب دو سلیج اور تھوڑی سے خوراک تھی سلیج کھینچنے کے لیے چار رینڈیئر تھے لیکن ان کی اپنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ بڑی مشکل سے سلیج کھینچ رہے تھے۔ چھوٹے بچوں کو اضافی کھالوں میں لپیٹ کر سلیج میں بٹھایا گیا تھا اور ذرا بڑے ان کے ساتھ ہی پیدل چل رہے تھے۔ انہیں سفر کرتے ہوئے تین ہفتے ہو چکے تھے اور موسم اب مستقل سرمئی رہنے لگا تھا۔ اکثر گہرے بادل چھائے رہتے تھے اور دھوپ بہت کم دکھائی دیتی تھی۔ چوتھے ہفتے انہوں نے محسوس کیا کہ وہ سمندر کی طرف جا رہے تھے کیونکہ یہاں برف میں ایک مسلسل ہموار ڈھلان آ گئی تھی۔ ان کا اندازہ درست نکلا جب ایک شام انہیں تا حد نگاہ پھیلا سمندر دکھائی دیا۔ اس کے کنارے برف جمی تھی لیکن سمندر کا پانی ابھی جما نہیں تھا۔ جب گرما عروج پر ہوتا تو کٹاؤ کے ساتھ سمندر پر جمی برف بھی پگھل جاتی۔ یہاں تک پہنچ کر ان کا مغرب کی طرف سفر تھم گیا تھا۔ کاتکی نے پوچھا۔

''سردار، اب ہم کس طرف جائیں؟''

اب دو سمتیں رہ گئی تھیں ایک جنوب اور دوسری شمال۔ جنوب کی طرف جانے میں وہی مسئلہ تھا، انہیں انسانوں سے واسطہ پڑتا اور ان کی بقا خطرے میں پڑ جاتی۔ ویسے بھی لوگ ہی کتنے تھے۔ اب ان کے کسی سے لڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دوسری طرف شمال تھا۔ اگر وہ شمال کی طرف بڑھتے تو انہیں پہلے سے زیادہ شدید موسم سے واسطہ پڑتا۔ جبکہ یہاں کا موسم بھی کم اذیت ناک نہیں رہا تھا۔ گرم ترین ملبوسات میں بھی وہ ٹھٹھرتے رہے تھے۔ بڑوں سے زیادہ بچوں کی حالت خراب تھی۔ موبی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ کاتکی اور عورتیں منتظر تھیں کہ موبی کوئی فیصلہ کرے۔ اس نے کہا۔

''ابھی شام ہو رہی ہے ہم یہیں رکتے ہیں اور آرام کرتے ہیں۔''

''وہ سب ہی آرام کی ضرورت محسوس کر رہے تھے کیونکہ بائیس دن سے مسلسل سفر میں تھے۔ موبی اور کاتکی نے برف کھود کر گڑھا بنایا اور اس میں اپنے خیمے لگائے۔ پھر وہ سب ان میں گھس کر اور گرم کھالوں میں لپٹ کر سو گئے۔ ان

کے پاس آگ نہیں رہی تھی اور وہ سیل کا کچا گوشت چبا کر کھانے پر مجبور تھے۔ یہ زندہ رہنے کی قیمت تھی جو وہ ادا کر رہے تھے۔ اس دن وہ ایسی بے ہوشی کی نیند سوئے کہ سوائے چھوٹے بچوں کے اور کسی کو ہوش نہیں رہا تھا ان کی مائیں ان کو کھلا پلا کر دوبارہ سلا دیتی تھیں۔ موبی کی آنکھ دو دن بعد کھلی تھی۔ وہ اٹھا اور جب باہر آنے کی کوشش کی تو اسے پتا چلا کہ خیمہ تو برف میں تقریباً دفن ہو گیا ہے۔ صرف اس کا اوپری حصہ برف سے آزاد تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اسے کھول کر باہر آیا تو حیران رہ گیا۔

اب سامنے ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر نہیں تھا بلکہ اس پر برف جم گئی تھی۔ اس نے کاتکی کو آواز دے کر بلایا اور جما ہوا سمندر دکھایا۔ وہ دونوں احتیاط کے ساتھ سمندر کے اوپر گئے۔ اس کی برف اتنی موٹی اور سخت ہو گئی تھی کہ اس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ یہ گزشتہ دو دن سے جاری برفانی طوفان کا کمال تھا جس نے نہ صرف درجۂ حرارت گرا دیا تھا بلکہ سمندر کو بھی جما دیا تھا۔ موبی نے کاتکی کی طرف دیکھا۔ ''کیا خیال ہے، ہم اس سمندر پر سفر نہیں کر سکتے؟''

کاتکی خوف زدہ ہو گیا۔ ''اگر برف پگھل گئی تو؟''

''اب برف مزید سخت ہو گی پگھلے گی نہیں۔'' موبی نے کہا۔ ''اس جمے ہوئے سمندر پر ہم مغرب کی طرف سفر کر سکیں گے۔''

''لیکن یہ تو سمندر ہے۔''

''ہاں، پر ہو سکتا ہے آگے کہیں خشکی ہو۔ کاتکی، مجھے یقین ہے اس سے پہلے کوئی انسان اس طرف نہیں آیا ہے۔ اگر ہم نے آگے کہیں خشکی دریافت کر لی تو ہم دشمنوں کے خطرے سے محفوظ ہو جائیں گے۔''

کاتکی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''سردار، کیا تم اس طرف سفر کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں میں کوشش ضرور کرنا چاہتا ہوں۔'' موبی نے کہا اور واپس اپنے خیمے کی طرف آیا۔ امشی جاگ گئی تھی۔ اس نے موبی کو دیکھ کر کہا۔

''میرے آقا، کیا ابھی ہمیں سفر کرنا ہے؟''

موبی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ دونوں بچے کھال میں لپٹے سو رہے تھے۔ موبی نے ان کی طرف دیکھا۔ ''ہاں ہمیں ابھی اور سفر کرنا ہے لیکن یہ سفر جمے سمندر پر ہو گا۔ ممکن ہے ہم سمندر پار کر کے کسی زمین پر جا اتریں اور.....''

''اور کیا میرے آقا؟''

موبی نے گہری سانس لی۔ ''یہ بھی ممکن ہے ہم سمندر میں گر جائیں یا اس پر بھوکے بھٹک بھٹک کر مر جائیں۔''

امشی خوف زدہ ہو گئی تھی لیکن پھر اس نے ہمت کر کے کہا۔ ''میرے آقا تم جو فیصلہ کرو گے مجھے اپنے ساتھ پاؤ گے۔''

موبی نے محبت سے اپنی بیوی کو دیکھا۔ ''مجھے یقین ہے اگر سب میرا ساتھ چھوڑ دیں، تب بھی تم میرا ساتھ دو گی۔''

امشی نے اس کے شانے پر سر رکھ دیا۔ ''میرے آقا میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔''

''کاتکی بھی میرے ساتھ ہے لیکن ان عورتوں سے معلوم کرنا ضروری ہے۔'' موبی نے کہا۔

''میرے آقا ان عورتوں کے لیے میری ایک تجویز ہے۔'' امشی نے کہا۔

''وہ کیا؟''

''تم اور کاتکی ان میں سے ایک ایک عورت کو اپنی بیوی بنا لو اب ان کا کوئی مرد نہیں ہے اور یہ تم دونوں کی ذمے داری ہیں۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں لیکن پہلے ہم کسی جگہ تو پہنچیں۔''

''نہیں، یہ کام ابھی کر لو۔'' امشی نے اصرار کیا۔ ''آگے کا کچھ پتا نہیں ہے۔''

موبی نے کاتکی اور پھر دونوں عورتوں سے بات کی۔ جب ان عورتوں کو پتا چلا تو انہوں نے موبی کو چنا لیکن وہ چاہتا تھا کہ ایک کاتکی کی بیوی بنے اس لیے قرعہ ڈالا گیا۔ سوس نامی عورت موبی کے حصے میں آئی اور کوئی، کاتکی کی بیوی بنی۔ اسی طرح لاوارث رہ جانے والے بچے بھی موبی اور کاتکی نے ایک ایک اپنے خاندان میں شامل کر لیے تھے۔ اب دونوں کا خاندان دو بیویوں اور تین بچوں پر مشتمل تھا۔ اس دن بھی وہ سمندر کے کنارے رکے رہے اور وہ بہت خوش تھے، انہوں نے اپنے بچے ہوئے گوشت سے دعوت کی اور سب نے جی بھر کر کھایا۔ وہ کچا گوشت کھانے کے عادی تھے اس لیے اس سے بھی مزہ لیتے تھے۔ پھر رات کا اندھیرا ہوتے ہی موبی اور کاتکی اپنی اپنی بیویوں کو لے کر اپنے خیموں میں چلے گئے۔

اگلے دن موبی نے سمندر کی سطح کا معائنہ کیا اور اس نے محسوس کیا کہ برف کی تہ خاصی موٹی ہو چکی ہے اور اس پر بلا خطر سفر کیا جا سکتا ہے۔ اس نے کاتکی سے مشورہ کیا اور اس نے بھی اتفاق کیا۔ کاتکی شکاری تھا اور وہ برف کی تہ میں سوراخ کر کے سیل کا شکار کرتا تھا۔ وہ بڑی مہارت سے ویسا

گول سوراخ کرتا تھا جیسے سمندر میں شکار کے لیے جانے والی سیل بناتی تھیں اور وہ اسے اپنا سوراخ سمجھ کر کاتکی کے جال میں پھنس جاتی تھیں۔ کاتکی نے کہا۔

''ہم پیدل چلنے کے بجائے سلیج پر سفر کر سکتے ہیں کیونکہ اس طرح ہم تیزی سے سفر کر سکیں گے۔''

لیکن موبی کے ذہن میں ایک تجویز اور تھی، اس نے کاتکی سے کہا۔ ''یہاں عورتوں اور بچوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر ہم انہیں یہیں چھوڑ کر آگے جائیں۔ اگر ہمیں کوئی زمین نہیں ملی تو واپس آ سکتے ہیں۔''

کاتکی نے اس سے اتفاق کیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو سردار ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔''

اگلی صبح انہوں نے ایک سلیج سے اپنے چاروں رینڈیئر باندھے۔ عورتوں نے ساحل کے ساتھ برف کھود کر انہیں خاصی گھاس کھلائی تھی اس لیے اب وہ اتنے ناتواں بھی نہیں رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں کو خیموں تک محدود رہنے کا حکم دے کر وہ منجمد سمندر پر مغرب کی سمت روانہ ہوئے۔ ایک سلیج ہونے کی وجہ سے ان کی رفتار تیز تھی اور یہ رفتار مزید بڑھ سکتی تھی لیکن موبی اور کاتکی خود محتاط تھے۔ اس کا امکان تھا کہ کہیں سمندر کی تہ کمزور ہو اور وہ بے خبری میں اس پر جا پڑیں۔ آسمان پر گہرے بادل تھے اور کسی قدر دھند بھی چھائی ہوئی تھی اس لیے سامنے حد نگاہ محدود تھی۔ کاتکی ہر تھوڑی دیر بعد سلیج روک کر برف کا معائنہ کرتا تھا کہ وہ کہیں ہلکی تو نہیں ہو رہی ہے۔ مگر برف ابھی تک ٹھوس اور موٹی تھی۔

چند گھنٹوں کے سفر کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں برف کسی قدر اٹھی ہوئی تھی۔ شمال سے جنوب کی طرف یہ کسی راستے کی طرح ابھری ہوئی تھی۔ موبی اور کاتکی نے پہلے کبھی سمندر پر اس طرح کی منجمد برف نہیں دیکھی تھی۔ وہ سلیج سے اتر آئے اور محتاط قدموں سے اس ابھری ہوئی برف کے پاس آئے۔ اس کی موٹائی کم تھی اور یہ کسی قدر شفاف بھی تھی۔ انہوں نے غور کیا تو ایسا لگا جیسے برف کی چادر تلے کوئی چیز حرکت کر رہی ہو۔ مگر یہ حرکت واضح نہیں تھی۔ موبی نے کاتکی کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا ہے؟''

کاتکی برف پر لیٹ گیا اور اس نے کان لگا دیے پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ''سردار برف کے نیچے دریا بہہ رہا ہے۔''

''دریا سمندر میں؟''

''میں نے اپنے باپ سے سنا ہے کہ سمندر میں بھی دریا چلتے ہیں ان کے آس پاس کا پانی رکا ہوتا ہے اور دریا والے حصے میں پانی بہہ رہا ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی دریا ہے، اسی کے زور کی وجہ سے برف اوپر اٹھ گئی ہے۔''

''کیا اس پر سفر کیا جا سکتا ہے؟''

کاتکی نے موبی کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور پھر جہاں برف کا ابھار شروع ہو رہا تھا اس نے وہاں اپنی کلہاڑی کھینچ کر ماری فوراً ہی برف میں ایک دراڑ نمودار ہوئی اور سرعت سے پھیلنے لگی۔ موبی اور کاتکی تیزی سے پیچھے آ گئے۔ انہوں نے سلیج بھی پیچھے ہٹا لی تھی۔ دراڑ اب دائیں بائیں بھی پھیل رہی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے برف کا ایک بڑا ٹکڑا الگ ہو کر سمندر میں جا گرا۔ ایک مہیب گونج پیدا ہوئی اور سمندر کا پانی اچھل کر برف پر آیا اور دوبارہ جمنے لگا۔ آدھے گھنٹے کے اندر دراڑ دوبارہ جم چکی تھی اور اس کی برف تلے دریا اسی طرح بہتا رہا۔ اس دوران میں سورج اوپر آنے سے دھندکم ہو رہی تھی۔

تب موبی نے سامنے دیکھا۔ دور افق پر آسمان سے نیچے برف پوش پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے چلا کر کاتکی سے کہا۔ ''وہ دیکھو زمین ہے۔''

کاتکی بھی خوشی سے اچھل پڑا تھا، لیکن پھر اسے خیال آیا۔ ''سردار، اس دریا کو کیسے پار کریں گے؟''

''میرا خیال ہے اگر اس پر احتیاط سے سفر کریں تو اس کی برف نہیں ٹوٹے گی۔'' موبی نے کہا۔

کاتکی ہچکچایا۔ ''لیکن ٹوٹ بھی تو سکتی ہے۔''

موبی سوچنے لگا پھر اس نے اپنا سارا سامان اتار کر سلیج پر رکھا۔ ''ابھی پتا چل جاتا ہے۔''

''سردار تم کیا کرنے جا رہے ہو؟'' کاتکی پریشان ہو گیا۔

''میں اس دریا کو پار کر کے آتا ہوں۔''

''نہیں، اس میں خطرہ ہو سکتا ہے سردار، تم یہیں رکو میں جاتا ہوں۔''

مگر موبی نے اسے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ''نہیں یہ مجھے ہی دیکھنا ہے۔''

''نیزہ برف پر مت رکھنا۔'' کاتکی نے اسے خبردار کیا۔ ''ورنہ اس سے برف ٹوٹ جائے گی۔''

موبی نے نیزہ بھی چھوڑ دیا۔ وہ اس جگہ سے ہٹ کر آگے بڑھا جہاں سے کچھ دیر پہلے برف ٹوٹ چکی تھی کیونکہ اس جگہ سے برف بہت ہلکی تھی اور ٹوٹ سکتی تھی۔ موبی کے پاؤں میں کھال کی کئی تہوں سے بنے بڑے جوتے تھے۔ وہ انہیں برف پر گھسیٹ گھسیٹ کر اٹھا رہا تھا۔ سمندر میں بہنے والا یہ دریا چھوٹا نہیں تھا اس کی چوڑائی شاید میل بھر سے زیادہ تھی، درمیان سے برف بہت اٹھ گئی تھی۔ نیچے سے بہنے

والا تیز دھارا برف کو کاٹ رہا تھا اور اسے اوپر اٹھا رہا تھا۔ اسی وجہ سے یہاں برف ہلکی تھی۔ ڈھلان کے اوپری حصے تک پہنچ کر وہ برف پر بیٹھ گیا اور پھر پھسلتا ہوا دوسری طرف جانے لگا۔ اس طرح سفر آسان تھا اور برف پر بھی بوجھ کم پڑ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد وہ ڈھلان سے اتر کر دوسری طرف جا پہنچا۔ اب نیچے ٹھوس برف تھی اور یہاں سے دوسری طرف نظر آنے والی پہاڑیاں نمایاں اور قریب نظر آرہی تھیں۔

موبی نے تجربہ کرلیا تھا، اس دریا کو آسانی سے عبور کیا جا سکتا تھا۔ اس نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اندھیرا ہونے سے پہلے واپس پہنچ کر اگلی صبح عورتوں اور بچوں کو لے کر اس طرف سفر کریں گے۔ ان پہاڑوں کو دیکھ کر ہی اس کے اندر سے کسی نے کہا تھا کہ یہاں آج تک کسی انسان نے قدم نہیں رکھا۔ یہ جگہ ان کے لیے محفوظ ہوگی۔ وہ واپس پہنچا تو کاتکی اسے دیکھ کر خوش ہوگیا۔ اس نے کہا۔

''کیا ہم اس دریا کو پار کرسکتے ہیں؟''

''بہت آسانی سے لیکن ہمیں سارا سامان یہیں چھوڑنا ہوگا۔ سلیج بھی اور دوسرا بھاری سامان بھی۔''

''جانور.....؟''

''ان کو کاٹ کر ان کا گوشت کھال میں بھر کر برف پر کھینچ کر لے جائیں گے۔'' موبی نے حل تجویز کیا۔ ''دوسری طرف بھی ہمیں خوراک کی ضرورت ہوگی۔''

انہوں نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ لیکن وہ شام سے پہلے واپس نہیں پہنچ سکے تھے۔ وہ ساحل تک آئے تو موبی نے کاتکی کو اشارے سے روک دیا۔ انہوں نے سلیج بھی روک دی تھی پھر موبی نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے کسی مرد کے بولنے کی آواز آئی ہے۔''

''یہاں کوئی مرد کہاں؟''

آؤ دیکھتے ہیں۔'' موبی نے کہا اور سلیج وہیں چھوڑ کر وہ برف پر رینگتے ہوئے اپنے خیموں کی طرف بڑھے۔ یہ خیمے ایک پیالے نما جگہ تھے۔ جب انہوں نے جھانک کر دیکھا تو عورتوں اور بچوں کو کچھ مردوں کے گھیرے میں دیکھا۔ وہ برف پر سہمے بیٹھے تھے۔ موبی نے غور سے انہیں دیکھا اور نیم تاریکی میں بھی پہچان لیا۔

''یہ ہارا کی اور اس کے ساتھ جانے والے ہیں۔''

وہ واقعی ہارا کی اور اس کے ساتھ جنوب کی طرف جانے والے مرد تھے مگر وہ تو اچھے خاصے لوگ تھے اب صرف پانچ مرد نظر آرہے تھے۔ ان کی حالت بھی بتا رہی تھی کہ وہ کسی بڑی مشکل سے گزر کر آئے ہیں۔ اچانک ہارا کی آگے آیا اور اس نے امشی کو بازو سے پکڑ کر زبردستی اٹھایا۔ وہ چیخ رہی تھی اور مزاحمت کر رہی تھی۔ ہارا کی اس کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ باقی مرد کھڑے خاموشی سے دیکھ رہے تھے یعنی وہ اس کے ساتھ تھے۔ موبی کا خون رگوں میں لاوا بن گیا، اس کے حلق سے غراہٹ نکلی اور وہ اوپر سے گویا اڑ کر ہارا کی پر جا گرا۔ اس نے نیزے سے ضرب لگانے کی کوشش کی لیکن اس کی غراہٹ سے ہوشیار ہارا کی بچ گیا۔ البتہ وہ دھکے سے نیچے جا گرا۔ موبی نے امشی کو اٹھا کر اپنے پیچھے کرلیا۔ ہارا کی اٹھا لیکن موبی نے اسے للکارا۔

''رک جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔''

''ہم نہیں، تم مارے جاؤ گے۔'' ہارا کی زہریلے لہجے میں بولا۔ ''یہ میرے ساتھی ہیں۔''

''باقی لوگ کہاں ہیں؟'' موبی نے نیزہ سامنے کرلیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔

''وہ سب مارے گئے۔ راستے میں کچھ لوگوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔ صرف ہم پانچ بچ کر آئے ہیں۔''

''ان سب کی موت کے ذمے دار تم ہو۔''

''صرف ان کی موت کے نہیں۔'' کاتکی بولا۔ ''مجھے یقین ہے شور کوئیوں کے ساتھ بھی ہارا کی تھا اور اس کی مدد سے انہوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔''

موبی نے چونک کر ہارا کی کی طرف دیکھا۔ ''کیا یہ سچ ہے؟''

وہ مسکرایا۔ ''ہاں سچ ہے کیونکہ شور کوئی سردار نے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری موت کے بعد سرداری مجھے ملے گی اور تمہاری بیوی بھی میرے قبضے میں ہوگی لیکن تم بچ گئے اور ہمیں وہاں سے نکال لے گئے ورنہ اگلی رات وہ دوبارہ حملہ کرتے۔''

''تم غدار.....!'' موبی نے دانت پیسے اور باقی چار مردوں کی طرف دیکھا۔ ''تم بھی اس کے ساتھ شامل ہو؟''

''ہاں یہ میرے ساتھ ہیں۔ اب ہمیں عورتوں کی ضرورت ہے۔ دیکھ کیا رہے ہو ان دونوں کو مار ڈالو اس کے بعد سب ہمارا ہوگا۔ یہ چار عورتیں ہیں جو ہمارے لیے کافی ہوں گی۔''

موبی اور کاتکی عورتوں اور بچوں کے سامنے دفاعی پوزیشن میں آگئے تھے۔ ہارا کی اور اس کے چاروں ساتھی اپنے ہتھیار سنبھالے ان پر حملہ کرنے کی فکر میں تھے۔ وہ موبی اور کاتکی سے ڈر رہے تھے کیونکہ دونوں ہی بہترین جنگجو تھے۔ موبی نے اچانک کہا۔ ''تم کیوں اس کی باتوں میں آگئے؟ یہ غدار ہے اور اس نے پورا قبیلہ ختم کرادیا ہے۔''

وہ چاروں رک گئے، ان کے چہروں پر تذبذب کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ موبی نے پھر کہا۔ ''تمہارے گھروں اور قبیلے کی بربادی کا ذمے دار یہی شخص ہے۔''

''یہ بکواس کرتا ہے۔ اسے مار دو پھر یہ عورتیں تمہاری ہوں گی۔''

''جھوٹ۔'' موبی غرایا۔ ''جب تک میرا نیزا اور کلہاڑی ایک ایک آدمی کا خون نہیں چاٹ لیں گے کوئی مجھ پر قابو نہیں پاسکے گا۔ آؤ تم میں سے کون مرنا چاہتا ہے۔''

ہارا کی کے آدمی اسے دیکھ رہے تھے پھر ان میں سے دو پیچھے ہٹ گئے اور بولے۔ ''اس لڑائی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، ہارا کی خود لڑے۔''

موبی، ہارا کی کی طرف مڑا۔ ''دوسروں کو مروانے کے بجائے خود کیوں مقابلہ نہیں کرتے؟''

''ہاں ہاں تم لڑو۔'' باقی دو بھی پیچھے ہٹ گئے۔ ''سردار ہماری تم سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔''

ہارا کی ابھی تک سینہ تانے مسکرا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے کچھ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور اس کے ساتھی ہی سب کچھ کر گزریں گے مگر جب اس کے ساتھی پیچھے ہٹ گئے تو اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور سینہ ڈھلک گیا۔ ہارا کی بھی بہترین لڑاکا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ موبی کا مقابلہ نہیں کرسکے گا۔ یک دم وہ مڑا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے جاتے ہی اس کے ساتھی بھی اس کے پیچھے بھاگے تھے۔ کاتکی نے سکون کا سانس لیا ورنہ وہ جانتا تھا کہ دو آدمی پانچ آدمیوں کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ دوسری طرف موبی سوچ رہا تھا کہ یہ ہارا کی تھا جس نے غداری کی اور جانے کس طرح پہریداروں کو خاموشی سے قتل کرادیا جس کے بعد شور کوئی جنگجو کٹاؤ میں گھس آئے۔ موبی کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ ہارا کی اس کا اور قبیلے کا اتنا بڑا دشمن نکلے گا وہ تو اسے اپنا سب سے مخلص ساتھی سمجھتا تھا۔

''کاتکی ہمیں عورتوں اور بچوں کو لے کر ابھی جانا ہوگا۔''

''وہ بھاگ گئے ہیں۔'' کاتکی متفق نہیں تھا۔ ''ہمیں صبح جانا چاہیے۔''

''نہیں، ہارا کی کے ساتھی ڈر کر بھاگے ہیں لیکن اگر اس نے انہیں اکسایا تو وہ دوبارہ حملہ کرنے آئیں گے۔ ان کے لیے عورتیں سب سے اہم ہیں، وہ اکیلے رہ گئے ہیں۔ اس لیے عورت حاصل کرنے کے لیے جان بھی لڑا سکتے ہیں۔''

بات کاتکی کی سمجھ میں آگئی تھی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو سردار ہمیں فوری یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

انہوں نے خیمے اکھاڑے اور ان کو سلیج پر بار کیا، چھوٹے بچوں کو بٹھایا اور بڑے بچے ماؤں سمیت پیدل چلنے لگے۔ موبی اور کاتکی بھی پیدل تھے۔ مگر اس بار ان کی رفتار سست تھی۔ سمندر پر آتے آتے تاریکی مکمل طور پر چھا گئی تھی۔ موبی کے خیال میں اچھا ہی ہوا تھا کیونکہ اگر ہارا کی اور اس کے ساتھی ان کے تعاقب میں آتے تو ذرا سی روشنی میں ان کے دیکھ لیے جانے کا امکان موجود تھا۔ اب اس تاریکی میں وہ آسانی سے انہیں تلاش نہیں کرسکتے تھے۔ سمندر کی سطح ہموار تھی اور رات کے وقت برف سخت ہوجاتی ہے، اس کے ٹوٹنے کا امکان بہت کم تھا۔ کسی کے ٹھوکر کھانے کا خدشہ کم تھا۔ کاتکی پریشان تھا اس نے موبی سے پوچھا۔

''سردار تمہیں یقین ہے وہ ہمارے پیچھے آئیں گے؟''

''پورا یقین ہے شاید وہ اس وقت ہمارے پیچھے ہی ہوں۔ یہ تاریکی ہمارے لیے اچھی ہے، وہ ہمیں دیکھ نہیں سکیں گے۔ عورتوں اور بچوں کو سمجھا دو کہ کوئی آواز نہ نکالے یہاں ہلکی سی آواز بھی دور تک سنائی دے گی اور وہ آواز سے ہمارا پیچھا کرسکتے ہیں۔''

موبی اور کاتکی نے عورتوں اور بچوں کو سمجھا دیا تھا کہ انہیں خاموش رہنا ہے ورنہ دشمن ان کی آواز سن کر پیچھے آسکتا ہے۔ وہ سہم کر خاموش ہوگئے تھے۔ اب ان کی رفتار سست تھی کیونکہ بچوں کا ساتھ تھا اور سلیج پر سامان اور چھوٹے بچے تھے۔ سلیج بھی معمولی رفتار سے چل رہی تھیں۔ موبی سوچ رہا تھا کہ اگر ہارا کی اور اس کے ساتھیوں نے ان کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کرلیا تو ان کے لیے تعاقب کرنا زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔ ہارا کی اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ مغرب کی طرف جارہے تھے تب ہی وہ اپنے چار آدمیوں کو ساتھ لے کر ان کے پیچھے یہاں تک آنے میں کامیاب رہا تھا۔ اگر وہ اسی طرح پیچھے پڑا رہتا تو یہ سمندر عبور کرنا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ فی الحال یہ تاریکی پردہ تھی لیکن اگلی صبح کی روشنی میں وہ انہیں کو بہ آسانی تلاش کرسکتے تھے۔

اب موبی پچھتا رہا تھا کہ اس نے اسی وقت موقع سے فائدہ اٹھا کر ہارا کی کا خاتمہ کیوں نہیں کردیا تھا جب سب اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اس وقت کوئی مداخلت کرتا۔ ہارا کی کا فتنہ ختم ہوجاتا تو باقی چار افراد کو قابو کرنا اتنا مشکل نہ ہوتا۔ مگر نہیں، عورتوں کی وجہ سے مستقل جھگڑا رہتا کیونکہ باقی دو عورتیں بھی ان کی بیویاں بن گئی تھیں اور ان میں اپنی عورت سے دست بردار ہونے کی نسبت مرجانا زیادہ آسان سمجھا جاتا تھا۔ ابھی ان کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ سفر کرتے رہیں اور جلد از جلد یہ سمندر عبور کرکے

دوسری طرف خشکی میں موجود پہاڑوں تک پہنچ جائیں وہاں وہ پناہ بھی حاصل کر سکتے تھے اور انہیں خوراک بھی مل جاتی۔ ممکن ہے کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے جہاں تعاقب کرنے والوں سے محفوظ رہ سکتے۔

مگر منجمد سمندر پر رات کے وقت سفر آسان نہیں تھا۔ برف کی سطح بالکل سخت ہو گئی تھی اور اس پر برف کے سنگریزے بن گئے تھے جو چلنے پر ٹوٹ کر ان کے پیروں تلے سرکتے تھے اور ان کی چال بگڑ جاتی تھی۔ بڑوں نے خود کو سنبھال رکھا تھا لیکن بچے بار بار گر رہے تھے۔ ایک بار ایک بڑی لڑکی گری تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اس کے پاؤں میں سخت چوٹ آئی تھی۔ موبی نے تاریکی میں ٹٹول کر دیکھا بچی کا ٹخنا مڑ گیا تھا اور اس پر سوجن آ گئی تھی اس کے لیے چلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ مجبوراً اسے بھی سلیج پر بٹھانا پڑا اگرچہ اس میں جگہ نہیں تھی۔ امشی نے اپنے بچے کو اٹھا کر اپنے کرتے کے اندر باندھ لیا تاکہ وہ سردی سے محفوظ رہے۔ انہوں نے دوبارہ سفر کا آغاز کیا۔

"کہیں انہوں نے اس کی بچی کی چیخ نہ سن لی ہو۔" کاتکی نے موبی سے کہا، خود اس کے ذہن میں بھی یہی بات تھی۔

"ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے۔ اب سب سنبھل کر چلیں، کوئی تیزی سے قدم نہ اٹھائے۔"

سنگریزوں والی سطح پر چلنا آسان نہیں تھا لیکن ہارا کی اور اس کے آدمی ان کے پیچھے تھے تو ان کے لیے بھی چلنا آسان نہیں تھا۔ مگر موبی جانتا تھا ان کی رفتار پھر بھی تیز ہو گی وہ سارے جوان آدمی تھے، ان کے ساتھ عورتیں، بچے اور سلیج وغیرہ کا بوجھ نہیں تھا اس لیے ان کے لیے سفر کرنا موبی... اور کاتکی کی نسبت آسان تھا۔ یہی سوچ کر موبی ہر ممکن احتیاط کر رہا تھا کہ اگر ہارا کی اور اس کے ساتھی ان کے آس پاس تھے تو وہ ان کی آواز سن کر ان کی موجودگی کے بارے میں جان جاتے۔ سب سے اہم مرحلہ دریا عبور کرنے کا تھا۔ اس وقت دریا پر سمندر کی سطح سخت ہوتی اور وہ اسے سامان سمیت عبور کر سکتے تھے۔ دن میں یہ برف نرم پڑ جاتی اور اس پر سے سامان سمیت گزرنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ موبی اور کاتکی دونوں کل صبح سے سفر کر رہے تھے اور اب تک تھک چکے تھے۔ کچھ دیر بعد کاتکی نے موبی سے کہا۔

"ہمیں اب تک دریا تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

"نہیں میرا خیال ہے دریا ابھی دور ہے کیونکہ دن میں ہم نے سلیج پر بہت تیز سفر کیا تھا اور ابھی ہم پیدل ہیں اور رفتار بھی سست ہے۔ شاید ہم صبح کے قریب دریا تک پہنچ سکیں اور میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہم کسی قدر روشنی میں دریا عبور کریں۔ تاریکی میں بغیر دیکھے دریا کی برف پر چلنا خطرناک ہو گا۔ ہم عورتوں اور بچوں کے ساتھ یہ کام تاریکی میں نہیں کر سکتے۔"

کاتکی وفادار اور بہادر تھا لیکن اس کی سوچ موبی کی طرح تیز نہیں تھی بس وہ سامنے کی باتیں سوچتا تھا۔ موبی کی سوچ نے اسے سردار بنایا تھا۔ وہ عام لوگوں کی نسبت کہیں آگے کی سوچ سکتا تھا۔ وہ رکے بغیر آہستہ رفتار سے لیکن خاموشی سے سفر کر رہے تھے۔ لیکن وقت موبی کے اندازے سے کہیں زیادہ تیزی سے گزرا تھا صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی تھی اور ابھی تک دریا نہیں آیا تھا۔ موبی پریشان ہو گیا۔ اسے دس بارہ قدم کی دوری تک سب دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دوسروں کو بھی اتنی دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد روشنی مزید بہتر ہو جاتی تو وہ دور سے بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ رفتار تیز کر لیں۔ وہ اب جلد دریا تک پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن اس کی یہ خواہش اس وقت تک پوری نہیں ہوئی جب تک روشنی پوری طرح نمودار نہیں ہو گئی۔ اچانک ہی آسمان بھی صاف ہو گیا... اور سورج پوری طرح چمکنے لگا۔

وہ ابھی دریا سے دور تھے۔ موبی کو ایک خیال اور پریشان کرنے لگا تھا، اتنی تیز دھوپ سے دریا پر جمی ہلکی برف پگھل سکتی تھی یا اتنی ہلکی ہو سکتی تھی کہ وہ اس پر سے گزر کر دوسری طرف نہیں جا سکتے تھے۔ اس نے کاتکی سے کہا۔ "سنو ہمیں سب چھوڑ کر سرعت سے دریا کے دوسری طرف جانا ہو گا۔ ورنہ ہو سکتا ہے اس دوران میں برف پگھل جائے اور ہم دریا پار نہ کر سکیں۔ پیچھے دشمن ہیں۔"

بات کاتکی کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے تیزی سے سلیجوں سے رینڈیئر کھولے۔ عورتوں نے چھوٹے بچوں کو اٹھایا جو خود سے نہیں دوڑ سکتے تھے اور وہ سارا سامان چھوڑ کر آگے بڑھنے لگے۔ رینڈیئر بھی ان کے پیچھے آ رہے تھے لیکن موبی اور کاتکی ان کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ انہیں خوف تھا کہ کہیں رینڈیئرز کے کھروں سے برف کی سطح تڑخ نہ جائے۔ جیسا کہ کل ایک جگہ سے برف تڑختے ہی برف کا ایک بہت بڑا حصہ سمندر میں جا گرا تھا۔

دھوپ اب خاصی تیز ہو گئی تھی اور انہیں اپنے پیروں تلے برف پگھلتی محسوس ہو رہی تھی۔ کاتکی آگے دیکھ رہا تھا جبکہ موبی پیچھے نظر رکھے ہوئے تھا۔ کچھ دیر بعد کاتکی بولا۔ "وہ دیکھو سامنے دریا ہے۔"

موبی نے سامنے دیکھا، دریا کا ابھار نمایاں ہو رہا

تھا۔ ابھی تک اسے پیچھے ہارا کی اور اس کے ساتھیوں کا کوئی نشان نظر نہیں آیا تھا لیکن اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ کہیں آس پاس ہی ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔ جلد ہی وہ دریا تک پہنچ گئے اور یہ دیکھ کر موبی پریشان ہو گیا کہ دریا کی برف آج اتنی ہلکی تھی کہ اس کے نیچے بہتے پانی کی لہریں نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ زیر آب بہنے والا سمندری دھارا تھا جو سطح سے خاصی گہرائی میں چلتا ہے۔ اس کی چوڑائی کئی میل سے زیادہ ہوتی ہے لیکن سطح پر اس کی چوڑائی زیادہ نہیں رہ جاتی ہے۔ اس کے باوجود یہ خاصا چوڑا تھا۔ موبی اور کاتکی نے عورتوں اور بچوں کو سمجھایا کہ انہیں کیسے اس جمی برف پر سفر کرنا ہے۔ وہ پھیل گئے تاکہ کسی ایک جگہ برف پر زیادہ بوجھ نہ آئے۔ دو عورتوں نے ایک ایک بچہ اٹھا رکھا تھا اور دو کے ساتھ خود سے چلنے والے بچے تھے صرف دو بچے جن میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی اتنے بڑے تھے کہ انہیں الگ دریا پار کرنا تھا۔ موبی اور کاتکی نے ان سے کہا کہ وہ ان سے ذرا دور رہیں اگر وہ کسی مشکل میں پڑے تو وہ ان کی مدد کریں گے۔

وہ برف کی منجمد ڈھلان پر چڑھنے لگے۔ وہ پھیلے ہوئے تھے اس لیے برف پر ایک جگہ بوجھ نہیں پڑ رہا تھا مگر برف پگھل رہی تھی اور موبی محسوس کر رہا تھا کہ اگر انہوں نے کچھ دیر میں دریا پار نہیں کیا تو ان کے پیروں تلے موجود برف ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ اس کے باوجود وہ اس سے زیادہ تیز نہیں چل سکتے تھے کیونکہ پگھلتی برف پر ان کے پاؤں پھسل رہے تھے البتہ ایک بار وہ ڈھلان کے دوسری طرف پہنچ جاتے تو ان کے لیے پھسلتے ہوئے دریا کے دوسری طرف چلے جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ طے ہوا تھا کہ سب اوپر پہنچ کر ایک ساتھ پھسلنا شروع کریں گے تاکہ اگر کسی وجہ سے برف تڑخنا شروع ہو تو پیچھے رہ جانے والے مشکل میں نہ پڑ جائیں۔ سب سے پہلے امشی اوپر پہنچی اور اس کے بعد باقی عورتیں بھی پہنچ گئیں۔ وہ برف تلے بہتے پانی کو دیکھ کر خوف زدہ تھیں۔ اگر موبی اور کاتکی ان کے ساتھ نہ ہوتے تو شاید وہ کبھی اس دریا کو عبور کرنے کی جرأت نہ کرتیں۔ کچھ دیر میں موبی اور کاتکی بھی دونوں بچوں کو لے کر اوپر پہنچ گئے۔

"اب ہمیں دوسری طرف جانے میں آسانی رہے گی۔"

"سردار۔" کاتکی نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ آ گئے ہیں۔"

موبی مڑا تو اسے ہارا کی اور اس کے ساتھی اپنی طرف دوڑتے نظر آئے۔ اس کا اندازہ درست تھا، وہ بدستور ان کے تعاقب میں تھے۔ انہیں دیکھتے ہی موبی نے کاتکی اور عورتوں کو حکم دیا۔ "ڈھلان پر پھسلنا شروع کر دو، جلدی۔"

"لیکن تم" امشی نے کہنا چاہا۔

"جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔" موبی دہاڑا۔ "جلدی....."

مجبوراً امشی اور باقی افراد برف پر لیٹے اور پھر انہوں نے پھسلنا شروع کر دیا۔ شروع میں ان کی رفتار سست تھی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان کی رفتار اتنی بڑھ گئی کہ عورتیں اور بچے چیخیں مارنے لگے۔ موبی گھٹنے کے بل بیٹھا ان کو دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف ہارا کی اور اس کے ساتھی دوڑتے ہوئے دریا کی ڈھلان تک پہنچ گئے تھے۔ سمندر میں دریا بہتے دیکھ کر پہلے تو وہ ششدر و خوفزدہ ہوئے اور پھر عورتوں کا خیال ان پر حاوی آ گیا اور وہ تیزی سے ڈھلان پر چڑھنے لگے۔ موبی کا یہ اندازہ بھی درست نکلا ہارا کی انہیں دوبارہ بہکا دے گا اور وہ عورتوں کے لیے مستقل ان کا پیچھا کرتے رہیں گے۔ وہ یا تو کامیاب ہو جائیں گے یا مر جائیں گے ان کے لیے تیسری کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔

عورتیں، بچے اور کاتکی نیچے پہنچ گئے تھے اور اب وہ خطرے کی حد سے نکل گئے تھے۔ موبی کے رینڈیئر نیچے موجود تھے وہ ان کے ساتھ نہیں آئے تھے۔ موبی نے مخصوص سیٹی بجائی تو رینڈیئر چونکے اور پھر دریا کی ڈھلان پر دوڑ پڑے۔ وہ برف پر دوڑنے کے مشاق تھے اس لیے ان کی رفتار انسانوں سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ موبی نے دیکھ لیا تھا کہ ان کے دوڑنے سے برف تڑخنا شروع ہو گئی تھی اور یہ تڑختی برف نہ صرف رینڈیئرز کے پیچھے آ رہی تھی بلکہ ان کے دائیں بائیں بھی پھیل رہی تھی۔

ہارا کی اور اس کے ساتھی رینڈیئرز سے ذرا دور تھے اس لیے انہیں برف تڑخنے کا پتا نہیں چل سکا۔ انہیں اس وقت پتا چلا جب وہ خاصے اوپر آ چکے تھے۔ رینڈیئرز اب ذرا نیچے تھے۔ موبی نے ڈھلان کے دوسری طرف برف پر لیٹتے ہوئے پھسلنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے دوبارہ سیٹی بجائی تاکہ رینڈیئرز اسے غائب دیکھ کر رک نہ جائیں۔ اس کے کانوں میں اب برف تڑخنے کی مہیب آوازیں آنے لگی تھیں۔ اس کی رفتار رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی۔ نیچے امشی اور دوسرے لوگ کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ اس نے کاتکی کو حکم دیا تھا کہ وہ دوسری طرف اترتے ہی خشکی کی طرف روانہ ہو جائیں۔ مگر وہ اس کے لیے فکرمند تھے اس لیے آگے نہیں گئے۔ موبی کی رفتار بڑھی تو وہ گھومنے لگا اور اسی گھومنے کے دوران میں اس نے دیکھا برف اب اس طرف سے بھی تڑخنا شروع ہو گئی تھی۔ رینڈیئرز اوپری ڈھلان پر نمودار

ہوئے اور پھر تیزی سے نیچے آنے لگے۔ خطرے کے احساس نے ان کی رفتار کو کہیں زیادہ تیز کر دیا تھا۔ وہ عملاً برف کے ٹوٹے ٹکڑوں پر قدم رکھتے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ موبی جانتا تھا کہ وہ پانی میں بھی گر گئے تو پھر کچھ اثر نہیں ہوگا۔ ان کی موٹی کھال اور بال انہیں سردی سے بچاتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کے پاس سے گزر گئے۔ اب دریا کا آخری حصہ کچھ ہی دور تھا۔ یکا یک موبی کے نیچے برف ہلی اور اس کا ٹکڑا باقی برف سے الگ ہوا لیکن وہ اچھل کر اس سے ہوتا ہوا دوبارہ ہموار برف پر جا گرا۔ جب دریا کے کنارے آخری حصہ بھی ٹوٹ کر سمندر میں گرا تو یہ کاتکی تھا جس نے موبی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچ لیا تھا ورنہ وہ بھی سمندر میں جا گرتا۔ کاتکی اسے کھینچتے ہوئے کنارے سے دور لے گیا اور پھر امشی اور اس کے بچے آ کر اس سے چمٹ گئے۔ امشی رو رہی تھی۔

موبی کچھ دیر لیٹا رہا پھر چونک کر اٹھا۔ ''ہارا کی اور اس کے ساتھی کہاں ہیں؟''

کاتکی نے دور سمندر میں تیرتے چند رنگوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ رہے اور ان میں سے کوئی نہیں بچے گا۔''

کاتکی ٹھیک کہہ رہا تھا کیونکہ ان کے چاروں طرف برف کی بلندی تھی وہ پانی سے اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے اور ذرا دیر بعد سرد ترین پانی ان کی جان لے لیتا اور ایسا ہی ہوا بھی۔ کچھ دیر تک پانی پر ہاتھ پاؤں مارتے رہنے کے بعد ہارا کی اور اس کے ساتھی سمندر میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئے تھے۔ موبی اور کاتکی ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیے۔ وہ خوش تھے ان کی عورتیں اور بچے بھی خوش تھے اور وہ ایک دوسرے سے لپٹے جا رہے تھے۔ ان کے رینڈیئرز بھی بچ گئے تھے آگے یہی ان کی خوراک کے کام آتے۔ ان کی سلیج اور دوسرا سامان ضائع ہو گیا تھا لیکن ان کے ہتھیار ان کے پاس تھے۔

وہ ابھی تک سمندر پر تھے۔ موبی نے دور پہاڑوں کی طرف دیکھا اور کاتکی سے کہا۔ ''ہمیں ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرنا پڑے گا۔''

کاتکی اس کا مطلب سمجھ گیا۔ ''یعنی جنوب کی طرف؟''

''ہاں بہتر موسم اب جنوب میں ملے گا اور مجھے یقین ہے اس زمین پر آنے والے پہلے انسان ہم ہی ہیں۔''

کاتکی نے موبی کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''ہم اسے آباد کریں گے۔''

انہوں نے رینڈیئرز سنبھالے اور خشکی کی طرف روانہ ہو گئے۔ موبی نے پہلی بار خشکی پر قدم رکھا تو اس کا جسم سنسنا اٹھا ایسا لگا جیسے اس نئی دنیا نے اسے خوش آمدید کہا ہو۔ اس طرف بھی موسم اچھا نہیں تھا۔ چاروں طرف برف تھی اور دور سے نظر آنے والے پہاڑ بھی برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ لیکن زندہ بچنے اور دشوار گزار مرحلے عبور کرنے کے باعث ان کے حوصلے جوان تھے۔ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے۔ رات کو کسی ایسی جگہ پڑاؤ ڈال لیتے تھے جہاں وہ شمال سے آنے والی سرد ہواؤں سے محفوظ رہ سکیں۔ وہ ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہوئے رات گزار دیتے تھے۔ بچوں کو وہ درمیان میں رکھتے تھے کیونکہ وہ سردی سے زیادہ متاثر ہو سکتے تھے۔

اس سرزمین پر وارد ہونے کے اگلے دن انہوں نے ایک رینڈیئر کاٹا اور اس کے خون اور کچے گوشت سے اپنی بھوک مٹائی۔ وہ اس کا گوشت ایک ہفتے تک کھاتے رہے۔ اس دوران میں ان کا سفر دشوار گزار ساحلوں اور ان کے ساتھ پہاڑوں میں جاری رہا۔ دوسرے ہفتے انہوں نے دوسرا رینڈیئر بھی کاٹ کر کھانا شروع کر دیا۔ راستے میں ان کے لیے برف میں دبی گھاس مل جاتی تھی۔ اس سے ان کی توانائی برقرار رہتی تھی۔ چوتھے ہفتے جب وہ آخری رینڈیئر بھی کاٹ چکے اور اس کے گوشت سے پیٹ بھر رہے تھے کہ انہیں پہلی بار کوئی درخت دکھائی دیا۔ موبی سمیت ان میں سے کسی نے اس سے پہلے درخت نہیں دیکھا تھا۔ ان کے آباؤ اجداد ان کا ذکر کرتے تھے۔ وہ جنوب سے آئے تھے جہاں سبزے اور درختوں کی بہتات تھی۔ جنوب سے آنے والے دریا گرما میں اپنے ساتھ لکڑی بہا کر لاتے تھے اور وہ اسی لکڑی سے مختلف چیزیں بناتے تھے۔ لکڑی کس چیز سے نکلتی ہے وہ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ سرما کی وجہ سے درخت ٹنڈ منڈ ہو رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر موسم بھی بہتر لگنے لگا تھا۔ وہ چلتے رہے۔ راستے میں اب جابہ جا درخت مل رہے تھے۔ اس وقت وہ ایک ایسے پہاڑ پر چڑھ رہے تھے جس کی ڈھلان برف سے ڈھکی ہوئی تھی اور وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے دوسری طرف کیا ہے۔ بالآخر وہ پہاڑ کے اوپر پہنچ گئے اور جب موبی نے دوسری طرف دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس طرف تاحد نگاہ پھیلی زمین پر بے حد گھنا اور سبز جنگل تھا جس سے بھاپ کے بادل اٹھ رہے تھے۔ اس کی فضاؤں میں پرندے اڑ رہے تھے اور زمین پر مختلف اقسام کے جانور بھاگتے دوڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ موبی نے مڑ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''نئی دنیا میں خوش آمدید ساتھیو۔''

ہزاروں سال سے انسانوں کے وجود کو ترستی یہ دنیا اب غیر آباد نہیں رہی تھی۔



آدم خور لگڑ بھگا

نجمہ مودی

دنیا دو طرح کے انسانوں سے بھری پڑی ہے، ایک شکار ہونے والے ... دوسرے شکار کرنے والے ... اور زندگی کا حاصل مسلسل پیکار... ایسے میں پانسا کسی بھی وقت پلٹ سکتا ہے ... اس نے بھی بازی کچھ اس انداز سے اپنے حق میں پلٹی کہ تمام چالیں دھری کی دھری رہ گئیں ... اور یہ ثابت ہو گیا کہ کسی پر اعتبار کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لیا جائے کہ کہیں وہ ہمارے اعتماد کا خون تو نہیں کر دے گا۔

شکار اور شکاری کے مابین کھیلے جانے والا دلچسپ کھیل

لڑکپن سے بعض ڈائجسٹوں میں شکاریات کے قصے پڑھ پڑھ کر میری طبیعت نہایت شکار پسندانہ ہو گئی تھی اور مجھے بھی شکاری بننے کا شوق چرایا تھا۔ حالانکہ میرے ایک دوست نے مجھے سمجھایا تھا کہ ان ڈائجسٹوں کے قصوں کے مطابق جم کاربٹ، کینتھ اینڈرسن اور دیگر بیسیوں مشہور اور غیر مشہور شکاری اتنے شیروں کو ہلاک کر چکے ہیں جتنے شاید ہندوستان کے جنگلوں میں موجود بھی نہ تھے۔ اس لیے تم اب کون سے شیر کو شکار کرو گے؟

اس پر میں نے یہی کہا تھا کہ آخر قسمت آزمائی میں کیا ہرج ہے۔ اگر شیر نہ ملا تو میں کسی دوسرے درندے سے ہی کام چلا لوں گا۔ چنانچہ شکاری بننے کی غرض سے میں نے نشانہ بازی کی مشق شروع کر دی تھی۔

ایک روز میں..... اپنے گھر کے سامنے میدان میں نشانہ بازی کر رہا تھا۔ میرا ٹارگٹ ایک بڑا سا پتھر تھا۔ میرا نوکر قریب ہی کھڑا تھا۔ کافی دیر تک میں پتھر کو گولی مارنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسی دوران میرا نوکر جا کر اس پتھر پر بیٹھ گیا۔

''ابے احمق! یہ کیا کر رہے ہو؟ اس پتھر پر کیوں بیٹھ گئے ہو؟'' میں نے چیخ کر کہا۔

''جناب! یہی تو سب سے محفوظ جگہ ہے۔'' نوکر نے جواب دیا۔

میں نے اس نوکر کو فوراً ملازمت سے برخاست کر دیا۔ کم بخت ہمیشہ ہی میری نشانے بازی کے بارے میں طنز ومزاح کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میری مشق کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے اور ایک ہفتے کے بعد بالآخر میں ایک ایسی گولی چلانے میں کامیاب ہو گیا جو اس پتھر کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔

اس واقعے سے میری شہرت جلد ہی دور دور تک پھیل گئی اور مختلف جنگلوں کے قریب آباد بستیوں سے مجھے باقاعدہ چھپے ہوئے دعوت نامے موصول ہونے لگے جو کچھ اس قسم کے ہوتے تھے۔

مکرمی جناب ٹم ٹم جنگلوی صاحب!

ہمارے علاقے کے ایک بدکردار قسم کے لگڑ بھگے کو اتفاق سے مردم خوری کی عادت پڑ گئی ہے، اس کی وارداتیں دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہیں۔ حتیٰ کہ اب تو وہ ناشتے میں بھی انسانی جانیں نوش کرتا ہے۔ پہلے تو اس نے چند ایسے لوگوں کو لقمہ بنایا جن سے ہم خود جان چھڑانا چاہتے تھے چنانچہ ہم خاموش رہے مگر پچھلے دنوں اس نے چند ایسی لڑکیوں کو بھی نوالہ بنالیا جن پر ہم میں سے کئی نوجوانوں نے آنکھ رکھی ہوئی تھی۔

اب معاملہ برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ غضب خدا کا کہ اس حرام خور لگڑ بھگے کے وزن میں کم از کم سو پونڈز کا اضافہ ہو گیا ہے جسے کم کرنے کے لیے علاقے میں جاگنگ اور مختلف ورزشیں کرتا رہتا ہے اور ہم بے بسی سے اسے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔

بستی والوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ اس ناہنجار کو آپ کی گولی کا نشانہ بنوانے کے لیے باقاعدہ اہتمام کیا جائے اور اس سلسلے میں باقاعدہ ایک دس روزہ پروگرام ترتیب دیا جائے۔ اس سارے پروگرام کے روح رواں آپ ہوں گے۔ جلد از جلد ہمیں تاریخ سے مطلع فرمائیں کہ آپ کب تشریف لا سکتے ہیں تاکہ ہم باقاعدہ پروگرام کے پوسٹر چھپوا کر بستی میں آویزاں کرا سکیں۔

اہالیان ٹکر پورہ

اس قسم کے دعوت نامے اور بھی کئی بستیوں سے موصول ہوئے لیکن میں نے بہر حال ٹکر پورہ ہی کو اپنی پہلی مہم کے لیے منتخب کیا۔

اگلے ہفتے میں نے ایک ٹرک منگوا کر اس میں اپنا تمام اسلحہ یعنی پندرہ عدد دور مار رائفلیں، چھ عدد ڈبل بیرل بندوقیں، آٹھ شارٹ گنز اور اعشاریہ چار پانچ کے دو ریوالور، اپنا بستر، خیمہ، مچان کا سامان، ہانکا کرانے کے لیے اپنے ذاتی ٹین کنستر اور ڈھول لدوا دیے تھے۔

اس کے علاوہ میں نے احتیاطاً چار موٹے موٹے ڈنڈے بھی رکھ لیے تھے۔ ممکن تھا کہ مہم کے دوران میں اسلحہ جواب دے جاتا اور درندے کے ساتھ دست بہ دست یا یوں کہنا چاہیے کہ دست بہ پنجہ لڑائی کی نوبت آ جاتی۔

میں نے تو اس مہم کے لیے ایک توپ بھی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے لیے میری لائسنس کی درخواست مسترد ہو گئی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ بھگیوں کی توپ غائب کروائی جائے لیکن دیسی نکا میری فرمائش سن کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ اب یہ میرا ہی دل گردہ تھا کہ اس کے باوجود میں نے اپنا ارادہ ترک نہیں کیا تھا اور درندے کے شکار پر نکل کھڑا ہوا۔

میری بیوی نے نذر نیاز اور صدقہ وغیرہ اتروا کر اور میرے دونوں بازوؤں پر امام ضامن باندھ کر آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ مجھے الوداع کہا۔ بچوں نے احتیاطاً میرے ساتھ گروپ فوٹو بھی بنوا لیے کہ معلوم نہیں ابو اس مہم سے واپس بھی آئیں یا نہیں۔ ایسی مہمات سے تو بعض اوقات انسان مردہ حالت میں بھی واپس نہیں آتا۔

بہر حال تمام گھر والوں کی دعائیں لے کر اور اپنی وصیت انہیں زبانی طور پر سنا کر میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ ٹکر پورہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹکر پورہ کی ویلفیئر کمیٹی کو میں نے بذریعہ ٹیلی گرام اپنی آمد کے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔

سفر صرف تین گھنٹے کا تھا لیکن بے حد دشوار گزار تھا کیونکہ پچھلے دنوں تین چار منٹ بارش ہو گئی تھی، جس کے باعث روڈ ڈیپارٹمنٹ کی بنائی ہوئی سڑک پوری کی پوری پانی میں تحلیل ہو گئی تھی اور راستے کا پتا چلانا بے حد دشوار ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ ایک گھنٹا سفر کرنے کے بعد ہم واپس وہیں پہنچ گئے جہاں سے گزر چکے تھے۔ بہر حال جوں توں کر کے ہم ٹکر پورہ کی حدود میں داخل ہو ہی گئے۔ ویلفیئر کمیٹی کے ارکان گاؤں سے باہر ہی ہمیں ریسیو کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ توپیں گاؤں میں دستیاب نہیں تھیں اس لیے مجبوراً ہمیں اکیس ڈھولوں کی سلامی دی گئی۔

استقبالیہ رسوم پوری ہونے کے بعد ہمیں گاؤں کے دوسرے معززین سے متعارف کرانے کی غرض سے چوپال میں لے جایا گیا۔ وہاں سب لوگ حتیٰ کہ گاؤں کا چودھری بھی جو کہ عشرت چودھری سے کافی مختلف تھا، بے حد عزت واحترام سے پیش آیا۔ البتہ حاضرین میں، پچھلی صف میں

سے ایک نامعقول عورت نے خاصی بلند آواز میں اپنی ساتھی عورت سے کہا۔ ''ارے.....! ایسے ہوتے ہیں شکاری؟'' بدبخت کہیں کی۔

چوپال کے اندر ہی میرے اور میرے ڈرائیور کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس موقعے پر قریبی قصبے سے ایک فوٹو گرافر کو بھی بلوایا گیا تھا۔ وہ ایک نہایت باہمت فوٹو گرافر تھا اس کی بلند ہمتی کا ثبوت یہ تھا کہ وہ پینتیس ایم ایم کے کیمرے میں ایک سو بیس ایم ایم کا رول ڈالنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر گپ شپ کا دور چلا اور اسی دوران مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس محفل میں ایک ریٹائرڈ شکاری بھی موجود ہے، وہ اپنی زندگی کے خطرناک ترین شکار کا واقعہ سنا رہا تھا۔

''ایک مرتبہ میں ایک شیر کے شکار پر گیا۔ جب شیر سے میرا آمنا سامنا ہوا تو اچانک اس نے مجھ پر چھلانگ لگائی اور مجھے کھا گیا۔''

''کھا گیا.....؟'' تمام سامعین نے حیرت سے دہرایا۔ ''مگر آپ تو زندہ ہیں۔''

اس شکاری نے ایک سرد آہ بھر کے اپنے سراپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کوئی زندگی ہے؟''

گپ شپ کا دور ختم ہوا تو آرام کی غرض سے ہمیں ہماری قیام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔ یہ کچی اینٹوں سے تعمیر شدہ ایک عالی شان مکان تھا۔ اس میں ایک معمولی سی خامی تھی اور وہ یہ کہ اس کی چھت نہیں تھی۔ اس سلسلے میں میرا وہ تمبو کام آیا جو میں احتیاطاً ساتھ لے آیا تھا۔ مکان کی چار دیواری میں ہم نے تمبو لگا لیا۔

اگلے دن علی الصباح شکار پر جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں یعنی میں نے اپنے نئے شیونگ سیٹ سے شیو بنایا، صاف ستھرے کلف لگے کپڑے پہنے اور کلون لگایا۔ بالوں کو ہیئر کریم سے چمکایا۔ میرے ڈرائیور نے بھی پچھلی عید پر بنوائی ہوئی استری شدہ شلوار قمیص زیب تن کی، بالوں میں بڑے سلیقے سے کنگھی کی اور گلے میں ریشمی رومال ڈالا۔ اس کے علاوہ ہم نے اسلحے کے ٹرک کو بھی عمدگی سے آراستہ کیا۔ اس پر جھنڈیاں اور بینر وغیرہ آراستہ کیے جن پر نہایت ولولہ انگیز قسم کے نعرے درج تھے، مثلاً۔

''لگڑ بھگا۔ ہمارا قومی دشمن!''

''کرش دی لگڑ بھگا۔''

''ہم لگڑ بھگے سے انتقام لیں گے۔''

خدارا ◉ خدارا

شوگر کے مریض

ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبۂ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوا لیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0308-6627979

0547-521787

آپ ہم

شوگر

''اے لگڑ بھگے ہم تجھ کو نہیں چھوڑیں گے، وغیرہ وغیرہ۔''

ہانکا کرنے والی پارٹی بھی ہمارے ہمراہ تھی جو ٹرک کے آگے آگے ڈھول، کنستر وغیرہ بجاتی چل رہی تھی۔ ٹرک میں ڈرائیور کے ساتھ ہی مابدولت بہ نفس نفیس گلے میں پچاسوں ہار پہنے بیٹھے تھے۔ بغل میں دور مار رائفل دبی ہوئی تھی۔ غرضیکہ ایسا پُرجلال منظر تھا کہ لگڑ بھگا دیکھ لیتا تو بوکھلا کر خود ہی میری رائفل کے سامنے آجاتا۔

ہانکا کرتے کرتے ہم لوگوں نے جنگل کا وسیع حصہ عبور کرلیا لیکن لگڑ بھگا کہیں سے برآمد نہ ہوا۔ آخر ایک مقام ایسا آیا جہاں سے ٹرک نہیں گزر سکتا تھا، البتہ ہانکا کرنے والے قطار باندھ کے گزر سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے انہیں آگے روانہ کردیا کہ اگر لگڑ بھگا کہیں نظر آئے تو اسے گھیر گھار کر یہیں لے آئیں۔ میں اس کی تلاش میں کہاں مارا مارا پھروں گا۔

میں ٹرک سے اتر کر ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور بھی میرے پاس ہی آن بیٹھا۔ باتیں چھڑ گئیں اور اس نے مجھے بتایا کہ میرے پاس ملازمت کرنے سے پہلے وہ ڈائجسٹوں کی دنیا کے ہی نہیں بلکہ حقیقتاً کئی مشہور عالم شکاریوں کے پاس ملازم رہ چکا ہے۔ یعنی وہی اپنے جم کاربٹ، کینتھ اینڈرسن اور ہف ہنٹر وغیرہ۔ میرے ملازم نے بتایا کہ کئی مرتبہ اس نے خود اپنی جان خطرے میں ڈال کر ان مشہور زمانہ شکاریوں کی جان بچائی تھی۔

عین اس وقت جبکہ وہ اسی قسم کا کوئی واقعہ سنا رہا تھا، کسی نے عقب سے میرا کندھا تھپتھپایا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی اور میں تھر تھر کانپنے لگا۔ دراصل لگڑ بھگا میرے پیچھے کھڑا مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ پھر خیال آیا کہ اسی ڈرائیور کو جو کئی مرتبہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر جم کاربٹ اور..... کینتھ اینڈرسن وغیرہ کی جانیں بچا چکا تھا، حکم دوں کہ میری رائفل اٹھا کر مجھے پکڑا دے لیکن میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ اپالو تھرٹین کی رفتار سے بستی کی طرف دوڑ رہا تھا۔ مایوس ہوکر میں نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلیں اور موت کا انتظار کرنے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے لگڑ بھگے نے اپنے پنجے سے دوبارہ میرا کندھا تھپتھپایا اور مشفقانہ لہجے میں بولا۔

''میاں شکاری! ذرا آنکھیں تو کھولو۔ میں تم سے مذاکرات کرنے آیا ہوں۔''

میری کچھ ڈھارس بندھی اور میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ آلتی پالتی مار کر مزے سے گھاس پر بیٹھ گیا اور تھوڑی سی گھاس نوچ کر..... چبانے لگا۔ میری معلومات کے مطابق تو وہ آدم خور لگڑ بھگا تھا۔ اسے گھاس کھاتے دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ اپنی اس حرکت کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''آج کل میرے جسم پر پروٹین کی زیادتی ہوگئی ہے۔ کلوروفل بالکل ختم ہوگیا ہے جس کی وجہ سے دانت درد کرنے لگے ہیں چنانچہ کبھی کبھی میں تھوڑی سی گھاس کھا لیتا ہوں..... ہاں تو ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ تم مجھے شکار کرنے کے لیے آئے ہو؟''

میری شکاریانہ جرأت کسی حد تک بحال ہوگئی اور میں نے دل کڑا کر کے اپنے لہجے کو بارعب بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے صحیح سنا ہے۔''

''لیکن میرا قصور کیا ہے؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''تم اتنی انسانی جانوں کو لقمہ بنا چکے ہو، یہ جرم کیا کم ہے؟'' میں نے اپنے لہجے کے ارتعاش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''جن انسانوں کو میں نے کھایا ہے.....'' لگڑ بھگے نے فلسفیوں کی طرح کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ بڑے ہی گناہ گار قسم کے انسان تھے۔ زمین کے سینے پر بوجھ تھے۔ میں نے معاشرے کو ان کے شر سے نجات دلائی ہے۔''

''تم کون ہوتے ہو گناہوں کی سزا دینے والے؟ اور پھر ان دو تین لڑکیوں کا کیا گناہ تھا جنہیں مردوں کے ساتھ ساتھ تم نے ہلاک کردیا؟''

''ان میں سے ایک تو عنقریب ایک نہایت بدقماش شخص کے ساتھ گھر سے فرار ہونے والی تھی جس کے بعد شاید وہ موت سے بدتر زندگی گزارتی۔ ایک شادی شدہ تھی مگر اس نے اپنے شوہر کی زندگی جہنم بنا رکھی تھی اور اس کی وفادار بھی نہیں تھی اور تیسری بھی بڑی حرافہ تھی۔ اس کی بدولت کئی گھر اجڑ چکے تھے۔'' لگڑ بھگے نے بتایا۔

''بہت خوب۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''گویا تم صرف پیش بین ہی نہیں ہو بلکہ تم نے معاشرے کی تطہیر کا بھی ٹھیکا لے رکھا ہے۔''

''مجھ پر طنز کرنے کی کوشش مت کرو۔'' لگڑ بھگا خفگی سے بولا۔ ''میں اس معاملے میں بے حد حساس ہوں کیونکہ میں یہ سب کچھ اس لیے نہیں کررہا کہ میری تصویریں اخباروں میں چھپیں۔ میرے اعزاز میں تقریبات منعقد ہوں اور لوگ

میرے منہ پر میری تعریفیں کریں جبکہ تم مجھے شکار کرنے محض اس لیے آئے ہو کہ لوگوں پر تمہاری دھاک بیٹھے۔ اخباروں، رسالوں میں تمہارے انٹرویو چھپیں۔ بولو یہی بات ہے نا؟ جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرنا ورنہ میں تمہارا ابھی خون پی جاؤں گا۔'' اس نے اپنے نوکیلے دانتوں کی نمائش کی۔

میں کانپ اٹھا اور میں نے فوراً ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔''

''مجھے تمہاری جوانی پر ترس آتا ہے۔'' لگڑ بھگے نے نارمل ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا عمر ہوگی بھلا تمہاری؟''

''یہی کوئی بتیس سال کے قریب۔'' میں نے بتایا۔

''تو پھر تم نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے؟'' لگڑ بھگا منہ بنا کر بولا۔ ''ابھی تو تمہیں آٹا، رتی اور ماشے کے حساب سے بکتے دیکھنا ہے۔ دودھ، گھی کو عطر کے طور پر استعمال ہوتے دیکھنا ہے۔ ابھی سے موت کے منہ میں چھلانگ لگانے کیوں آگئے ہو؟''

''بس جی..... غلطی ہوگئی۔ شہرت حاصل کرنے کے لیے میں مرا جارہا ہوں۔'' میں نے ٹانگوں کی کپکپاہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''خیر..... میں تمہارا شوق پورا کرسکتا ہوں۔'' لگڑ بھگا کچھ سوچ کر بولا۔ ''میری تجویز غور سے سنو۔''

میں ہمہ تن گوش ہوگیا تو لگڑ بھگے نے میرے پیکٹ میں سے گولڈ لیف کی ایک سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کرو کہ کل اسی وقت اور اسی جگہ آجاؤ، اپنے ساتھ ان احمقوں کا جم غفیر لے کر مت آنا جو اس وقت ہانکا کرنے کے سلسلے میں دور کہیں دھکے کھا رہے ہیں۔ تم اپنے ساتھ صرف ایک فوٹو گرافر کو لے کر آجانا۔ یہاں پہنچ کر تم ایک ہوائی فائر کردینا اور پھر جھاڑیوں میں تلاش شروع کردینا اور شور مچا دینا کہ لگڑ بھگے کو یقیناً گولی لگی ہے۔ میں یہیں کسی جھاڑی میں آرام سے آنکھیں بند کرکے لیٹا ہوا تمہیں مل جاؤں گا۔ تم فوٹو گرافر کو یہی بتانا کہ میں تمہاری گولی سے مرا ہوں، تم جلدی سے میری لاش پر ٹانگ رکھ کر ایک تصویر کھنچوا لینا اور جلد از جلد واپس چلے جانا۔ شہر جا کر تم اس تصویر کو دنیا بھر کے اخباروں، رسالوں میں چھپواتے پھرنا۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ تمہارا شوق پورا ہوجائے گا اور میرا مشن جاری رہے گا۔ اگر تمہیں یہ تجویز منظور نہیں تو پھر مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔''

''مجھے بالکل منظور ہے لگڑ بھگا صاحب!'' میں نے گھگیا کر کہا۔

''بس تو پھر اب میں چلتا ہوں۔ تمہارے وہ ہانکا کرنے والے واپس آجائیں تو تم سب لوگ واپس چلے جانا۔ خوامخواہ ہلکان ہوتے پھر رہے ہو۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ مجھ جیسے ذہین درندے ہانکے وغیرہ جیسی فرسودہ حرکتوں سے متاثر ہوسکیں۔'' یہ کہہ کر لگڑ بھگا اطمینان سے ٹہلتا ہوا ایک طرف کو روانہ ہوگیا۔ ہانکا کرنے والے بے نیل و مرام واپس آئے تو ایک دوسرے کو تسلیاں دیتے ہوئے ہم گاؤں کی طرف چل دیے۔ شکر ہے کہ ڈرائیور قیام گاہ پر بھی موجود نہیں تھا بلکہ سامان لے کر رفو چکر ہوچکا تھا ورنہ اس کی زبانی بستی والوں کو معلوم ہوجاتا کہ میری لگڑ بھگے سے ملاقات ہوئی تھی۔

اگلے دن حسب پروگرام میں نے صرف فوٹو گرافر کو ساتھ لیا، بستی والوں کو تسلی دی کہ آج لگڑ بھگا یقینی طور پر جہنم رسید ہوجائے گا اور پھر میں جنگل کے اس حصے کی طرف روانہ ہوگیا جہاں گزشتہ روز لگڑ بھگے سے ملاقات ہوئی تھی وہاں پہنچ کر میں نے فوٹو گرافر کے سامنے پوری پوری شکاریوں والی ایکٹنگ کی، یعنی زمین پر پنجوں کے نشان ڈھونڈے، ناک اونچی کرکے ہوا میں سونگھا پھر یونہی ایک طرف کو گولی داغ دی۔

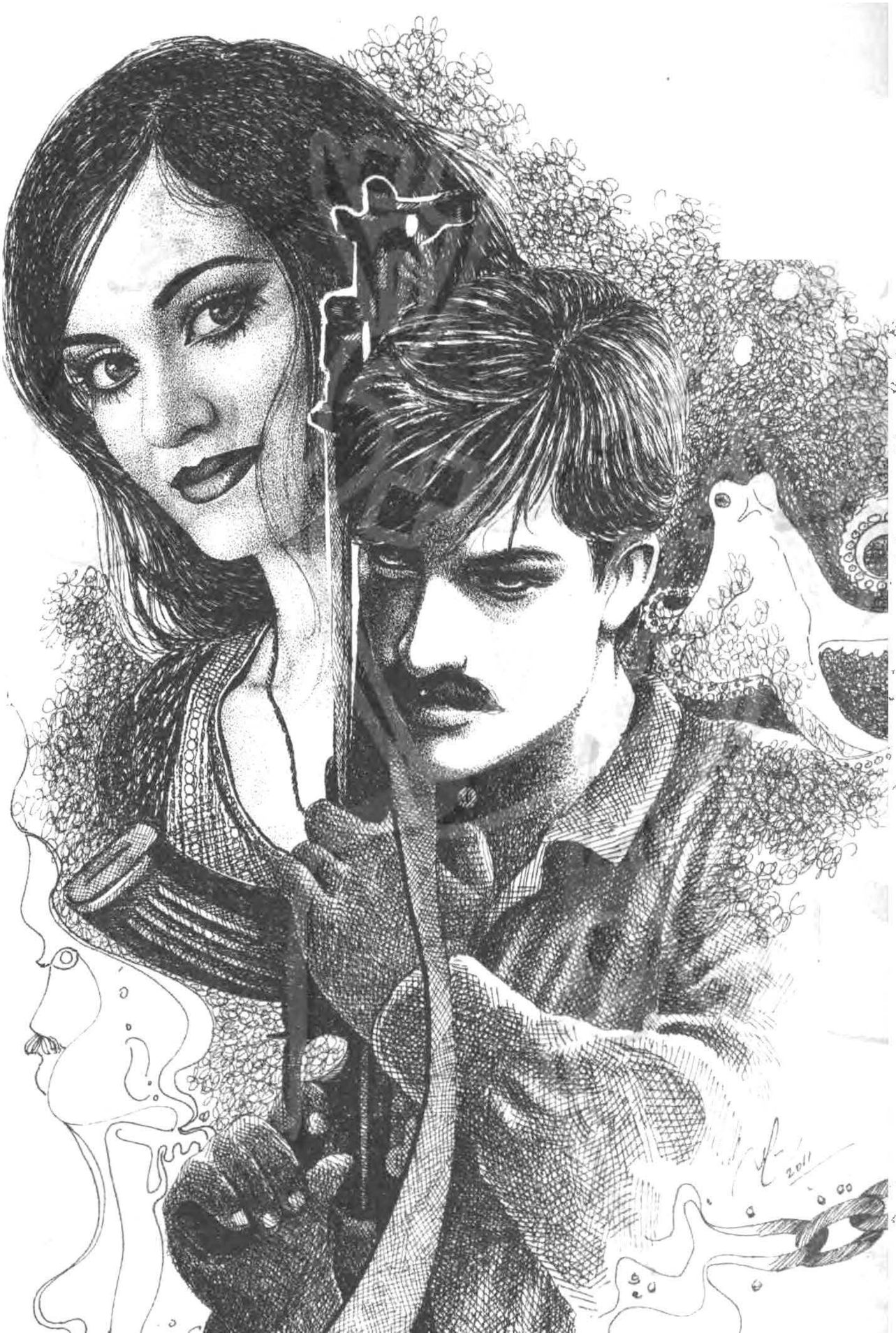
کافی دیر تک اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے بعد بالآخر لگڑ بھگا حسب وعدہ مجھے ایک جھاڑی میں لیٹا ہوا نظر آگیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے آنکھ ماری اور جلدی سے دوبارہ دم سادھ لیا۔

میں نے فاتحانہ نعرہ لگا کر فوٹو گرافر کو اپنی طرف متوجہ کیا اور لگڑ بھگے کے جسم پر پاؤں رکھ کر تصویر کھنچوانے کے لیے جلدی سے پوز بنالیا۔ میرے ایک ہاتھ میں رائفل تھی۔ جیسے ہی فوٹو گرافر نے تصویر بنائی ویسے ہی میں نے رائفل سیدھی کرکے دو گولیاں لگڑ بھگے کی کھوپڑی میں اتار دیں۔ پھر فوراً ہی چھلانگ لگا کر میں ایک طرف ہٹ گیا۔

لگڑ بھگا بہ مشکل دو تین سیکنڈ تڑپا ہوگا پھر سچ مچ ٹھنڈا ہوگیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان آنکھوں کی گہرائیوں سے گویا یہ شکوہ جھلک رہا تھا۔ ''آخر تم معاہدے کی خلاف ورزی کیے بغیر باز نہیں آئے۔ میں نے غلطی کی جو تم پر بھروسا کیا.....''

مجھے اس شکوے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ بھلا میں ایسا سنہری موقع کیونکر ہاتھ سے جانے دیتا؟ ایک آدم خور لگڑ بھگا آنکھیں بند کیے میرے پاؤں تلے پڑا تھا اور میں اسے زندہ چھوڑ دیتا؟

باقی رہی معاہدے والی بات۔ تو آخر میں ایک انسان تھا..... اشرف المخلوقات..... میں کوئی لگڑ بھگے کی طرح بے وقوف تھوڑا ہی تھا۔ زبانی کیا تحریری معاہدے بھی توڑ دینا ہمارا روز کا معمول ہے۔



اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

کشکول

انوار صدیقی

تیرھویں قسط

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ جھکنے نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو مذہبی تعلیم کے زیور سے آراستہ تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعائیں لیں، فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پر تاب بھوجن کو برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک نیبو ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر نیبو سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو جب ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر کبھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازمت پر رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیام فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جا

تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ دوسرے مخالفین کو بھی زیر کرنے کی خاطر سازشوں کے جال بنتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیر عتاب آجاتا ہے۔ وہ دل برداشتہ ہو کر خودکشی کا ارادہ کرتا ہے جب شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ شیخ حامد کے تعلقات مرکز تک تھے جس کی وجہ سے پولیس کے کچھ اعلیٰ آفیسران بھی اپنی روایتی مجبوری کے تحت اس کے راستے میں آنے کی غلطی نہیں کرتے تھے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج سے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیتا ہے۔ شیخ حامد کے غنڈے الماس کو بے آبرو کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخرید ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہو جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنا لیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرا لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے نیبو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر روحانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی "بلیک ٹائیگر" کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ "بلیک ٹائیگر" کی موت شیخ حامد کے لیے ایک جھٹکا ثابت ہوتی ہے۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذات خود تماشا دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔

دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق پڑوسی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد غلیظ راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ امداد سے ملاقات کے بعد جب جگا اپنے ایک مخصوص ٹھکانے پر واپس آتا ہے تو ایک شخص کو دیکھ کر چونکتا ہے جو اس کمرے تک آگیا تھا جہاں کسی دوسرے غیر متعلق شخص کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جگا اور اس نووارد کے درمیان معمولی جھڑپ ہوتی ہے پھر چند اہم انکشاف رونما ہوتے ہیں۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد نے کنول سے شادی کے بعد دونوں گواہوں اور نکاح خواں کے قتل کے احکامات جاری کر دیے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کر لی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحین کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اور نگزیب ملزمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔

اب آپ جدید واقعات ملاحظہ فرمائیے

شبنم کا ذہن اس وقت بھی ان لوگوں کے بارے میں الجھ رہا تھا جنہوں نے اسے اغوا کیا تھا۔

اڑتالیس گھنٹے گزر جانے کے باوجود ابھی تک اسے وہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ کھانے پینے کے سلسلے میں بھی اسے تنگ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی نگرانی کرنے والے خاموشی سے اسے کھانا اور ناشتا دیتے پھر خاموشی ہی سے برتن

اٹھا کر واپس چلے جاتے تھے۔ کنول کی تصویر شناخت کرانے کے بعد اس سے کسی قسم کی بازپرس بھی دوبارہ نہیں کی گئی تھی۔ سب سے زیادہ فکر اسے موبائل کی تھی جسے تفتیش کرنے والے کے بیان کے مطابق کسی خفیہ ڈیوائس کے ذریعے جلا دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ بگ باس کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ غلط ہاتھوں میں پھنس چکی ہے۔

وہ غلط ہاتھ کس کے تھے؟ یہ سوال اسے ذہنی طور پر اس وقت بھی الجھا رہا تھا۔ افضل خان کو ایک جرم کی پاداش میں جو طویل سزا بھگتنی پڑی تھی وہ بھی اس کے علم میں تھی، اس حقیقت کا بھی اسے علم تھا کہ میڈم کو اغوا کرنے کی پلاننگ میں افضل خان نے کوئی جھول نہیں رہنے دیا تھا لیکن پولیس کی ریڈ کے بعد اسی کو قربانی کا بکرا بھی بننا پڑا تھا۔ بگ باس اپنا دامن بچانے کی خاطر کسی بھی کارندے کو قربان گاہ پر چڑھانے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ تو کیا وہ بھی کسی ایسی ہی سچویشن کا شکار ہو گئی تھی؟

کنول کے بارے میں کیے جانے والے سوالات کی روشنی میں ابھی تک وہ یہی نتیجہ اخذ کر سکی تھی کہ بگ باس شاید ابھی تک اس کے ملازمت چھوڑ دینے کی غلطی کو حلق کے نیچے نہیں اتار سکا تھا۔ ممکن ہے وہ استعفیٰ دینے کے بعد کسی پلاننگ کے تحت کہیں روپوش ہو گئی ہو اور بگ باس کو اس بات کا شبہ ہو کہ بحیثیت خاتون ورکر ہونے کے شبنم بھی کسی طرح کنول کے استعفیٰ کے راز سے واقف ہو گی۔ یہ خیال وقت کے ساتھ ساتھ شبنم کے ذہن میں جڑ پکڑتا جا رہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور اغوا کرنے والے کوئی اور ہوتے تو اس کے ساتھ اس قدر شرافت کا سلوک بھی نہ کرتے۔ اس کا ذہن ہمہ وقت اس خیال کے تانے بانے سلجھانے میں الجھا رہتا۔ اب بھی وہ ان ہی زاویوں پر غور کر رہی تھی جب دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پہلے ایک شخص اس کے لیے کھانے کی ٹرے لیے اندر آیا اس کے بعد حسب معمول ایک گن مین بھی سامنے آگیا۔ وہ خاموشی سے دونوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتی رہی، کھانے کی ٹرے میز پر رکھنے والا اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے بعد چپ چاپ واپس لوٹ گیا، اس کے ساتھ ہی گن مین بھی جانے کے ارادہ سے گھوما تھا جب شبنم نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ اس نے پلٹ کر شبنم کو خشک نظروں سے دیکھا۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے.....؟" شبنم نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

"سوری میڈم! مجھے آپ کے ساتھ کسی قسم کے سوالات جوابات کی اجازت نہیں ہے۔" اس نے کھردرے لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے یہاں لانے والے کون لوگ ہیں؟" اس نے گن مین کو گھورا۔

"وہی..... جنہوں نے مجھے آپ کی نگرانی پر متعین کیا ہے۔"

"وہ کب آئیں گے؟"

"ان کی مرضی پر منحصر ہے۔" اس بار بھی سپاٹ لہجے میں جواب ملا۔ "میں ملازم ہوں، صرف اپنی ڈیوٹی کا پابند ہوں۔"

"کیا تم میرا کوئی پیغام بھی ان کو نہیں پہنچا سکتے؟"

"پیغام کیا ہے.....؟"

"میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ تمہارے لیے ایک ملازم کی حیثیت سے اتنا ہی جاننا کافی ہے۔" شبنم نے تلملا کر کہا۔ "ان کی کوئی کال آئے تو میرا پیغام ضرور دے دینا۔"

گن مین نے اسے تیز نظروں سے دیکھا پھر منہ پھیر کر باہر چلا گیا۔ شبنم اس کے جانے کے بعد کھانے میں مشغول ہو گئی، خود کو زندہ رکھنے کی خاطر کھانے کو زہر مار کرنا اس کی مجبوری بھی تھی۔ کھانے کے بعد وہ آرام کرنے کی خاطر بستر پر دراز ہو گئی۔ اس کی سوچوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا پھر ذہنی ورزش کرتے کرتے اس کی آنکھ بھی لگ گئی۔ دوبارہ اس کی آنکھ کسی آہٹ پر ہی کھلی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی تو وہی شخص اس کے سامنے موجود تھا جس نے اس سے کنول کی تصویر شناخت کرائی تھی۔

شبنم اپنے بے ترتیب لباس کو ٹھیک کرتی ہوئی اٹھی، دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالنے کے بعد اسے اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا اس وقت شام کے ساڑھے چار کا عمل تھا۔ اس نے آنے والے کو بہت غور سے دیکھا پھر خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ گفتگو کا آغاز کرنے سے پیشتر یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ اس کا تعلق کس پارٹی سے ہے۔

"تمہارا پیغام مجھے ملا تھا۔" آنے والے نے دو چار منٹ کی خاموشی سے بعد سپاٹ لہجے میں گفتگو کی ابتدا کی۔ "کیا تمہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف پیش آرہی ہے.....؟"

"مجھے کتنے دنوں تک یہاں رکھنا مقصود ہے؟"

"اس کا آسان جواب میں نے پہلی ملاقات میں دے دیا تھا۔" اس نے بہ دستور سرد لہجے میں کہا۔ "ہماری طرف سے کوئی رعایت تمہاری زبان کھولنے سے مشروط ہے۔ ہمیں کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔ تم اطمینان سے کوئی آخری فیصلہ کر سکتی ہو۔"

''بگ باس کو اگر اطلاع ہوگئی تو تمہارا انجام بھی تمہاری توقع کے خلاف ہوگا۔''

''ہم بھی اسی خراب انجام کے انتظار میں ہیں۔'' بے پروائی سے جواب ملا۔ ''ویسے اسے اطلاع ہوگئی ہے لیکن..... تم کہاں ہو؟ کس حال میں ہو؟ یہ جاننے کے لیے اس کے کھوجی کتے ہر طرف ابھی تک صرف بوسونگھتے پھر رہے ہیں۔''

''کیا تمہارا تعلق کسی سرکاری ایجنسی سے ہے؟''

''مطلب کی بات کرو..... تم نے کیوں اور کیا کہنے کے لیے ہمیں پیغام بھیجا تھا؟''

''کیا تم ہی حرف آخر ہو؟'' شبنم نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''تمہاری طرح میں بھی محتاط رہنا پسند کروں گی۔''

''میں سمجھا نہیں.....؟''

''تم سے بڑا کوئی آدمی، جس کا چہرہ میرے لیے اجنبی بھی نہ ہو۔ اس کے سامنے آنے کے بعد ہی میں کوئی آخری فیصلہ کرسکتی ہوں۔''

''اگر ہم تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیں تو.....؟''

''پھر شاید میری موت کے بعد فرشتے ہی میری زبان کھلوا سکیں گے۔'' وہ شانے اچکا کر بولی۔

''غلط گمان ہے تمہارا.....'' اس کو مخاطب کرنے والے نے بل کھا کر کہا۔ ''اوپر سے صرف ایک اشارے کی دیر ہے، اس کے بعد ہمیں بھی زبان کھلوانے کے ہزاروں نسخے معلوم ہیں۔''

''یہ تمہاری ذاتی سوچ ہے۔'' شبنم نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

''اور کچھ کہنا چاہو گی؟''

''کہنے کے لیے بہت کچھ ہے میرے پاس لیکن اس کی ایک ہی شرط ہے..... کوئی ایسا شخص جس کو میں جانتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے..... ہم تمہاری یہ بات اوپر تک پہنچا دیں گے لیکن ایک بات ابھی سے سن لو۔'' جواب میں بے حد سنجیدگی سے کہا گیا۔ ''اس کے سامنے آنے کے بعد بھی تم نے زبان نہ کھولی تو پھر تمہارے پاس زندگی کی بھیک مانگنے کا بھی کوئی جواز باقی نہیں بچے گا۔''

''مجھے منظور ہے.....'' شبنم نے ٹھوس انداز میں جواب دیا تو آنے والا اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھنے کے بعد الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

شبنم کا ذہن پھر مختلف سوالات کے جواب تلاش کرنے لگا۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ اگر آئندہ آنے والا ایجنسی کا کوئی قابل اعتماد آدمی ثابت ہوا تو وہ زبان کھولنے میں دیر نہیں کرے گی۔ وہ جس سچویشن میں تھی، اس میں اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اعصاب کو پرسکون رکھنے کی خاطر اس نے اٹھ کر مختصر کمرے میں چہل قدمی شروع کردی۔ بار بار اس کے ذہن میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب اسے اغوا کرنے والوں نے بڑی جرأت اور دلیری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن انہوں نے صرف اسے کیوں اغوا کیا؟ افضل خان کو کس لیے چھوڑ دیا گیا؟ کیا انہیں افضل خان سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا یا..... اسے بعد میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا؟ خاصی دیر تک مختلف وسوسے اس کے ذہن میں ابھرتے ڈوبتے رہے۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کی توقع کے خلاف ہی تھا۔ اسی وجہ سے اس نے محتاط روی کے تقاضوں کے پیش نظر کسی واقف کار کے سامنے زبان کھولنے کی شرط عائد کی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس وقت وہ کس کی دسترس میں تھی؟ تقریباً نصف شب گزرنے کے بعد جب نیند کا خمار اس کے پپوٹوں کو بوجھل کر رہا تھا اس وقت دروازے کے قفل کھلنے کی مانوس آواز نے اس کے ڈوبتے ذہن کو بیدار کر دیا۔ وہ لباس درست کرتے ہوئے اٹھ بیٹھی پھر دروازہ کھلنے کے بعد جو فرد اندر داخل ہوا اس کو ایک نظر دیکھتے ہی اس کے پورے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

آنے والا ایس پی اورنگ زیب کے سوا کوئی اور نہیں تھا جس کے بارے میں وہ بہت کچھ سن چکی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ بگ باس بھی اس کے تبادلے کی کوشش میں ناکام ہو چکا تھا۔ وہ نڈر اور بے خوف افسر تھا، نہ ہوتا تو بگ باس کے سامنے وہ بھی دوسرے افسروں کی طرح سرینڈر کرنے میں دیر نہ کرتا۔

شبنم دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی اٹھی۔ اورنگ زیب کی آنکھوں کی سرخی اس بات کی غمازی کرتی نظر آرہی تھی کہ اس وقت وہ اچھے موڈ میں نہیں ہے۔ ایک لمحے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

''مجھے بلا کر تم نے اپنی مشکلات میں کمی نہیں..... اور اضافہ کرلیا ہے۔'' اورنگ زیب نے ٹھوس لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''یہ آپ کا خیال ہے آفیسر، میرا نہیں۔'' شبنم نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''شاید آپ کے سامنے آجانے سے میری بہت ساری مشکلات حل ہو جائیں گی۔''

''کس لیے یاد کیا تھا؟''

''مجھے اس طرح یہاں لانے کا کیا مقصد تھا؟''

''تمہارے باس کو صرف اتنا یقین دلانا کہ تمہیں کسی ایجنسی نے نہیں بلکہ اس کے کسی چوٹ کھائے ہوئے دشمنوں نے اغوا کیا ہے۔''

''کیا اسے اس کا یقین آگیا ہوگا؟''

''نہ آیا ہو تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ میرے زبان کھول دینے کے بعد قانون میری ہر طرح حفاظت کرے گا؟'' شبنم نے اس بار سلجھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ اورنگ زیب نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، کچھ دیر وہ شبنم کو اپنے تجربوں اور مشاہدوں کی کسوٹی پر تولتا رہا پھر قدرے نرم لہجے میں بولا۔

''پہلے تمہیں ہمارے سوالوں کا جواب دینا ہوگا..... تیار ہو؟''

''ہاں..... میں کم از کم آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔''

''گڈ..... ویسے بائی دی وے، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم مجھ پر اندھا اعتماد کیوں کر رہی ہو؟ جبکہ ابھی تک تم نے کسی کو سیدھے منہ جواب نہیں دیا؟''

''یہ اس لیے ہے کہ میں آپ کے بارے میں بہت کچھ سن چکی ہوں۔''

''پھر یہ بھی ضرور جانتی ہوگی کہ تمہارا بگ باس اور اس کے شکاری کتے دن رات میری موت کے انتظار میں گھات لگائے بیٹھے ہیں۔''

''اس کا علم نہ ہوتا تو شاید میں زبان کھولنے پر آمادگی کا اقرار بھی نہ کرتی۔''

''بیٹھو.....'' جواب میں اورنگ زیب نے کمرے میں رکھی واحد کرسی کی سمت اشارہ کیا۔ شبنم ایک پل کو ہچکچائی پھر خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ ابھی میں تمہارے بگ باس کے علاقے سے ہی واپس آرہا ہوں۔'' اورنگ زیب نے اسے مختصراً حملہ آوروں اور شیخ حامد کے حفاظتی دستے کے افراد کے درمیان ہونے والی فائرنگ اور چاروں قیدیوں کی گرفتاری اور رہائی کے بارے میں بتایا پھر کچھ توقف سے دریافت کیا۔ ''تم اس بارے میں کیا کہو گی؟''

''میں بھی جن حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہوں اس کا ہر لمحہ ایک جوا ہی تھا۔'' شبنم نے سرد آہ بھر کر بڑے دل شکستہ لہجے میں کہا۔ ''جوے میں ہار اور جیت دونوں کا ففٹی ففٹی چانس ہوتا ہے۔ رسک تو لینا پڑتا ہے لیکن یہ بھی بے باکی سے بتا دوں کہ آپ کا ڈی آئی جی بگ باس کے ہاتھوں بکا ہوا ہے۔''

''کیا تم جانتی ہو کہ افضل خان کس قماش کا آدمی ہے اور اس کا ماضی کیا تھا؟'' اورنگ زیب نے ڈی آئی جی والی بات کو نظر انداز کر کے سوال کیا۔

''جی ہاں.....''

''پھر۔ تم اپنا فلیٹ چھوڑ کر اس کے اپارٹمنٹ میں کیوں شفٹ ہوئی تھیں؟''

''اسے بھی میری زندگی کا ایک جوا سمجھ لیں۔ ویسے اس میں بگ باس کے حکم کا دخل بھی تھا، میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔''

''کنول میری معلومات کے مطابق تم سے زیادہ خوبصورت اور حسین تھی، پھر وہ استعفیٰ دے کر کس طرح آزاد ہوگئی؟'' اورنگ زیب نے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ اس کی نظریں شبنم کا ایکس رے کرنے میں مصروف تھیں۔

''شاید اس لیے کہ کنول کی کوئی کمزوری باس کے ہاتھ نہیں آسکی تھی۔'' وہ روانی میں کہہ گئی۔ غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب اورنگ زیب نے سرسراتے لہجے میں کہا تھا۔

''آئی سی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری کوئی کمزوری ایسی ہے جو تمہیں بگ باس کے ہر حکم پر عمل کرنے پر مجبور کرسکتی ہے۔''

''ایسا ہی سمجھ لیں۔'' شبنم نے نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس نے میری لاعلمی میں کچھ مواد ضرور جمع کرلیا ہے لیکن میرا کردار اب بھی بے داغ ہے۔''

''تم نے افضل خان کو دوست بنا کر جو پروگرام مرتب کرنے کی کوشش کی تھی کیا اس کی خبر اسے بھی تھی؟''

''آپ نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ آپ کی ذہانت کی دلیل ہے۔'' شبنم نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے جو کچھ سوچا تھا ابھی تک اس کا علم کسی اور کو نہیں ہے۔ البتہ ایک ہستی ہے جس کو میں نے اشارتاً یہ عندیہ ضرور دیا تھا کہ میرے لیے دلدل سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے..... بغاوت۔''

''وہ ہستی کس کی ہے؟''

''سوری..... میں اس کا نام فی الحال نہیں لے سکتی ورنہ اس کے لیے بھی بہت ساری مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں۔''

شبنم نے دبی زبان میں کہا۔
اورنگ زیب کچھ دیر خاموش کھڑا شبنم کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر کچھ سوچ کر اس نے جیب سے موبائل نکال کر کسی کے نمبر پنچ کیے ساتھ ہی لائن کنیکٹ ہونے پر اسپیکر بھی آن کردیا۔
''ہیلو.....'' دوسری طرف سے ایک زنانی آواز ابھری، شبنم اسے سن کر چونکی تھی۔
''میں ایس پی اورنگ زیب بول رہا ہوں۔ کیا میڈم روبی سے بات کرسکتا ہوں؟''
''بول رہی ہوں.....'' دوسری جانب سے حیرت کا اظہار کیا گیا، اس وقت آپ نے کیسے کال کیا؟ سراج صاحب کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''
''مجھے اس وقت آپ سے ایک دوسرے موضوع پر کچھ اہم بات کرنی ہے۔''
''فرمایئے.....''
''کیا آپ شبنم نامی کسی خاتون سے واقف ہیں؟'' اورنگ زیب نے شبنم کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے دریافت کیا۔
''اچھی طرح جانتی ہوں لیکن میری معلومات کے مطابق کسی وجہ سے اسے بھی انڈر گراؤنڈ کردیا گیا ہے۔'' دوسری طرف سے معنی خیز انداز میں جواب ملا۔ ''بہ ظاہر اس کے اغوا کا ڈراما ضرور اسٹیج کیا گیا ہے لیکن اسی طرح افضل خان کے ساتھ بھی ایک لمبا کھیل کھیلا گیا تھا، مسٹر سراج کو بھی اس کی تفصیل معلوم ہے۔''
''اگر اغوا کی کارروائی ڈراما تھی تو افضل خان کو کیوں زخمی حالت میں چھوڑ دیا گیا؟''
''ممکن ہے اس میں بھی کوئی مصلحت ہو ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ افضل خان اب اس اپارٹمنٹ میں نہیں ہے۔ اپنا سامان سمیٹ کر وہ فوری طور پر اپارٹمنٹ سے شفٹ ہوکر کہیں اور چلا گیا ہے۔ اگر یہ سب کچھ پلاننگ سے نہ ہوتا تو پھر آپ اس کے صرف زخمی ہونے اور ہوش میں آنے کے فوراً بعد اپارٹمنٹ سے شفٹ ہوجانے کو کس خانے میں فٹ کریں گے؟''
''آپ نے جو نئی معلومات فراہم کی ہیں اس کے لیے شکر گزار ہوں لیکن اس وقت میں نے آپ کو کسی اور مقصد سے زحمت دی ہے۔''
''اگر میں آپ کے کسی کام آسکی تو مجھے خوشی ہوگی۔''
''کیا شبنم پر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟'' اورنگ زیب نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بے حد سنجیدگی سے دریافت کیا۔
''پہلا مرحلہ تو اسے تلاش کرنا یا بازیاب کرنا ہے۔''
''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے..... میں نے صرف اعتبار کرنے کے سلسلے میں آپ کی ذاتی رائے معلوم کی تھی۔''
''مجھے نہیں معلوم کہ آپ کس پس منظر میں یہ سوال کر رہے ہیں۔ بہرحال، میں اتنا جانتی ہوں کہ اگر آپ کا قانون اس کے ساتھ رعایت کرنے کے علاوہ اس کی مدد کرے تو وہ بے حد کارآمد ثابت ہوسکتی ہے، بشرطیکہ آپ اسے زندہ بازیاب کرسکیں۔''
''شکریہ.....'' اورنگ زیب نے مختصر جواب دینے کے بعد رابطہ منقطع کردیا پھر شبنم کو مخاطب کرکے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''میڈم نے آپ کو ہمارے تعاون کا مستحق قرار دیا ہے۔''
''کیا اب بھی میں اپنے آپ کو قیدی ہی سمجھوں؟'' شبنم نے سکون کا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں، آپ کی حیثیت اب بدل گئی ہے لیکن میں فیصلے کا اختیار بھی آپ کو ہی دے رہا ہوں۔'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''آپ اگر چاہیں تو جس طرح سے ہم آپ کو لائے ہیں اسی طرح خوب صورتی سے فرار ہونے کا موقع بھی فراہم کرسکتے ہیں، ہم سے دوستی نبھانی آپ کو مشکل میں بھی ڈال سکتی ہے اس لیے کہ میں نے اب اس پار یا اس پار کا فیصلہ کرلیا ہے۔''
''میں آپ کے ساتھ مل کر کام کرنے کو ترجیح دوں گی۔'' شبنم نے اورنگ زیب کو یقین دلایا۔ ''فرار کا ڈراما آپ کے بگ باس کو ہضم بھی نہیں ہوگا۔''
''کسی آخری نتیجے پر پہنچنے میں جلدی نہ کریں۔ اطمینان سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ میں کل کسی وقت دوبارہ آؤں گا پھر آپ سے اطمینان سے تفصیلی بات ہوگی۔'' اورنگ زیب نے دوستانہ انداز میں کہا پھر الٹے قدموں واپس جانے لگا تو شبنم نے اسے روک کر کہا۔
''کیا آپ میرے لیے کسی موبائل کا بندوبست کرسکتے ہیں جس کی سم ان رجسٹرڈ ہو۔''
''کل صبح آپ کی یہ فرمائش پوری ہوجائے گی لیکن..... میڈم کو جو غلط فہمی ہے اسے دور کرنے کی غلطی نہ کیجیے گا، اس وقت ہمیں پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔''
''میں اس کی اہمیت کو سمجھتی ہوں۔'' شبنم نے اقرار کیا

پھر اورنگ زیب کے جانے کے بعد اس نے سکون کا لمبا سانس لیا۔ اب وہ اس مختصر سے کمرے کو اپنے لیے سب سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ سمجھ رہی تھی۔

❀❀❀

پولیس موبائل کی پچھلی نشست پر لیاقت حسین کو تین مسلح سپاہیوں نے دبوچ رکھا تھا جبکہ چوتھا جو تین فیتوں والا حوالدار تھا اس نے چار افراد کے قاتل کو حراست میں لینے کے بعد مونچھوں کو تاؤ دینا شروع کردیا تھا۔ وین کے چلتے ہی اس کی زبان بھی مغلظات اگلنے لگی، وہ گالیاں بکتے وقت کبھی ٹھوکروں اور کبھی رائفل کے بٹ سے بھی لیاقت حسین کو مارنے میں مشغول تھا، باقی تین سپاہی بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہاتھ چلانے لگتے لیکن لیاقت حسین نے کوئی احتجاج نہیں کیا، البتہ ایک بار اس نے جی کڑا کرکے یہ ضرور پوچھا تھا۔
''تم لوگوں نے مجھے کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟ کہاں لے جارہے ہو؟''
''یہ تو عادی قاتل دکھائی دیتا ہے استاد۔'' ایک سپاہی نے لیاقت حسین کو نفرت سے ٹھوکر مارتے ہوئے حوالدار سے کہا۔ ''حرامی جرم کی نوعیت پوچھ رہا ہے۔''
''ہم تمہیں تمہاری بہادری کا انعام دینے کے لیے ساتھ لائے ہیں۔'' حوالدار نے لیاقت حسین کو ایک غلیظ گالی دیتے ہوئے رائفل کے بٹ سے مارا تو الماس چپ نہ رہ سکی۔
''کیا تم لوگوں کو احساس نہیں ہے کہ وین میں ایک خاتون بھی موجود ہے۔ تھانے پہنچنے تک سکون سے نہیں بیٹھ سکتے؟''
''آپ خاتون ہیں اسی لیے تو ابھی تک آپ کی مالش شروع نہیں کی۔'' حوالدار نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے الماس کو کمینی نظروں سے دیکھا۔ ''یہ کام تھانہ انچارج ضرور کرے گا تو پھر آپ کو بھی سکون.....''
''شٹ اپ.....'' الماس ضبط نہ کرسکی تو بپھر کر بولی۔ ''تھانے پہنچنے کے بعد تم سب کی پیٹیاں بھی اتر سکتی ہیں۔ بہتر ہے کہ اب خاموش رہو۔''
''ہماری پیٹی کے بجائے اپنے لباس کی خیر منائیں بی بی۔'' حوالدار نے تلملا کر جواب دیا۔ ''ایسی گیڈر بھبکیاں ہم پہلے بھی.....''
''منہ بند رکھو اپنا.....'' لیاقت حسین بپھر گیا۔ حوالدار کو قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اب اگر تمہاری گندی زبان سے ایک لفظ بھی..... بھی تت..... اب.....''
تینوں سپاہیوں کے علاوہ حوالدار بھی لیاقت حسین پر اچانک قہر بن کر ٹوٹا، وہ جملہ مکمل کرنے کے بجائے کراہنے لگا۔ الماس خون کا گھونٹ پی کر خاموش رہی۔ دس منٹ بعد موبائل تھانے کے احاطے میں داخل ہوکر رکی تو لیاقت حسین کو بہ دستور ٹھوکریں مار کر نیچے اتارا گیا، الماس ہونٹ چباتی نیچے اتری تو ایک مسلح سپاہی اس کے قریب پہنچ گیا۔ حوالدار اس وقت بھی سینہ تانے آگے آگے چلنے لگا۔ لیاقت حسین کا لباس تقریباً تار تار ہورہا تھا، اسے دھکے مار مار کر عمارت کے اندر لایا گیا، دو سپاہیوں نے اسے گدی پر ہاتھ مارتے ہوئے تھانہ انچارج کے کمرے میں دھکا دیا، ان کے ساتھ حوالدار بھی تھا لیکن جب الماس نے کمرے میں قدم رکھا تو وہ سب ہی ششدر رہ گئے، دو پھولوں والا سب انسپکٹر الماس کو دیکھ کر اس طرح بوکھلا کر اٹھا جیسے اسے موت کا فرشتہ نظر آگیا ہو۔
''م..... میڈم، آ..... آپ!'' اس نے الماس کو دیکھ کر ہکلاتے ہوئے کہا۔
الماس نے جواب دینے کے بجائے خاموشی سے کرسی پر بیٹھ کر پرس سے موبائل نکالا پھر اس نے مصلحتاً شوہر کے بجائے اورنگ زیب کو فون کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ سب انسپکٹر کے اشارے پر حوالدار اور اس کے تینوں ساتھی خاموشی سے سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گئے۔ لیاقت حسین الماس کے پیچھے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کی حالت غیر ہی ہورہی تھی۔ چہرے اور جسم کے دوسرے حصوں سے خون کی لکیریں بھی نمایاں طور پر نظر آرہی تھیں۔ سب انسپکٹر دوبارہ سیٹ کے قریب چلا گیا لیکن اس نے بیٹھنے کی جسارت نہیں کی تھی۔
''ہیلو.....'' موبائل پر دوسری جانب سے اورنگ زیب کی آواز سنائی دی۔ ''سراج تو خیریت سے ہے؟''
''میں اس وقت آپ سے اپنی خیریت کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔'' الماس نے سنجیدگی اور جھلاہٹ کے ملے جلے انداز میں جواب دیا۔ ''اس وقت گھر سے نہیں..... آپ کے علاقے کے ایک پولیس اسٹیشن سے بات کررہی ہوں۔''
''خیریت.....؟''
جواب میں الماس نے مختصر الفاظ میں اورنگ زیب کو اپنے اغوا کیے جانے اور لیاقت حسین کے ہاتھوں دشمنوں کے موت کے گھاٹ اترنے کی اطلاع دے کر کہا۔ ''آپ کتنی دیر میں آسکتے ہیں۔''
''زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں۔'' اورنگ زیب

نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
''میں نے ابھی سراج کو اطلاع نہیں دی۔ آپ بھی انہیں نہ بتائیں ورنہ وہ پریشان ہوں گے۔'' الماس نے تیزی سے کہا پھر دوسری طرف سے جواب سن کر موبائل آف کر کے ہونٹ چبانے لگی۔
''آئی ایم اکسٹریملی سوری میڈم۔'' سب انسپکٹر نے معذرت طلب کرنے والے انداز میں کہا۔ ''آپ اگر براہ راست بھی تھانے کو اطلاع دے دیتیں تو یہ زحمت نہ ہوتی۔''
الماس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے لیاقت حسین کی فکر تھی جس کے ہاتھوں سے چار آدمی قتل ہو چکے تھے۔ اسی جرم میں اسے زدوکوب بھی کیا گیا تھا۔ اس نے گھوم کر لیاقت حسین کو دیکھا پھر بڑی اپنایت سے بولی۔ ''تم پریشان نہ ہو، میں نے ایس پی صاحب کو اطلاع کر دی ہے، وہ آ کر سب ٹھیک کر دیں گے۔ تم پر قتل کا کوئی مقدمہ نہیں بن سکتا اس لیے کہ جو لوگ مارے گئے وہ یقیناً اشتہاری مجرم ہی ثابت ہوں گے۔''
''کس کا قتل ہو گیا؟'' لیاقت حسین نے بڑی معصومیت اور حیرت سے دریافت کیا۔ ''میں تو ابھی تک یہ سوچ رہا ہوں کہ پولیس والے ہمیں کس جرم میں یہاں تک گھسیٹ لائے۔ انہوں نے آپ کی شان میں بھی.....''
''ایسے موقعوں پر پولیس کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے لیکن تم کسی بات کا غم نہ کرو۔'' الماس نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔
لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کے چہرے پر طاری تاثرات اس بات کی ترجمانی کر رہے تھے کہ وہ ابھی تک صورت حال کی اصل نوعیت سے بالکل بے خبر رہا تھا۔
دس منٹ بعد اورنگ زیب تقریباً دوڑتا ہوا تھانے میں داخل ہوا تو پورے عملے میں کھلبلی مچ گئی۔ سب انسپکٹر کے کمرے میں پہنچ کر اس نے الماس کے بعد لیاقت حسین کو دیکھا تو اس کی پیشانی پر بے شمار سلوٹیں ابھرنے لگیں۔ اس نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے الماس کو مخاطب کیا۔
''میں آپ کو گھر جانے کا مشورہ دوں گا۔ میرا ڈرائیور آپ کو ڈراپ کر دے گا۔''
''اس کا کیا بنے گا؟'' الماس نے اٹھتے ہوئے انگریزی میں لیاقت حسین کے بارے میں دریافت کیا۔
''یہ میری ذمے داری ہے۔ آپ گھر پہنچیں، میں اسے اپنے ساتھ لے کر ہی آؤں گا۔'' اورنگ زیب نے کہا۔ ''کچھ رسمی کارروائی ضروری ہے لیکن مجھے بھی یقین ہے کہ مرنے والے پولیس کو پہلے سے مطلوب ہوں گے۔''
الماس جانے کے لیے تیار ہوئی تو لیاقت حسین نے اٹھ کر بڑی عاجزی سے کہا۔
''صاحب کو میرے بارے میں کچھ نہ بتایئے گا۔ وہ بلاوجہ پریشان ہوں گے۔''
''نہیں بتاؤں گی.....'' الماس نے لیاقت حسین کو تسلی دی پھر وہ اورنگ زیب کے ساتھ قدم اٹھاتی باہر آ کر اورنگ زیب کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ روانہ ہونے سے قبل اس نے اورنگ زیب کو بتا دیا کہ اس کی کار شاپنگ سینٹر ہی پر کھڑی ہو گی۔
''ڈونٹ وری..... میں اسے ابھی منگا لیتا ہوں۔''
الماس چلی گئی تو اورنگ زیب قدم اٹھاتا ایس ایچ او کے کمرے میں آ گیا۔ سب انسپکٹر ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑا تھا، اورنگ زیب نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر فون اٹھا کر کچھ متعلقہ محکموں کے لوگوں کو ضروری ہدایات دینے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے لیاقت حسین کی طرف دیکھا جو اس وقت سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔
''تم نے ایک بار پھر جواں مردی کا ثبوت دے کر مسز سراج کو دشمنوں سے بچا لیا۔''
''آپ کن دشمنوں کی بات کر رہے ہیں صاحب۔'' لیاقت حسین نے بہ دستور حیرت سے کہا۔ ''میں تو بیگم صاحب کے انتظار میں کھڑا تھا جب پولیس والوں نے نہ جانے کب اور کیوں ہم دونوں کو موبائل میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ بلاوجہ میری درگت بھی بنا دی..... یہ سب کیوں ہوا صاحب؟''
''کبھی کبھی ہم بھی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن اب میں آ گیا ہوں تو سب سے باز پرس بھی کر لوں گا۔'' اورنگ زیب نے لیاقت حسین کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر اسے تسلی دی پھر سب انسپکٹر کو دیکھ کر خشک لہجے میں بولا۔ ''آپ فوری طور پر اسے ساتھ لے جا کر مرہم پٹی کرائیں اور اس کے لباس کا بندوبست بھی کریں۔ بی، کوئک۔''
سب انسپکٹر نے لیاقت حسین کے ساتھ فوری طور پر وہاں سے ٹل جانے میں ہی خیریت سمجھی تھی۔ اورنگ زیب اس کے جانے کے بعد پھر کچھ لوگوں کو ضروری کال کرنے لگا۔ تین گھنٹے میں وہ اس وقت تک سکون سے نہیں بیٹھا جب تک اسے پولیس کے مختلف ذریعوں سے باقاعدہ رپورٹ نہیں مل گئی کہ چاروں مرنے والے پولیس کو تین سال سے مطلوب تھے۔ ان کی فائلیں بھی سرد خانوں سے نکلوائی گئی تھیں۔ ان حقائق کی روشنی میں اس نے اپنی موجودگی میں

ضروری دستاویز تیار کرائیں لیکن ان میں لیاقت حسین یا الماس کا ذکر درمیان میں نہیں آنے دیا، فائرنگ کے سلسلے میں اس نے یہی جواز بنایا تھا کہ پولیس نے بروقت موقع واردات پر پہنچ کر سچویشن کنٹرول کرنے کی کوشش کی تو مطلوبہ مجرموں نے فائر کھول دیا اور پولیس کی جوابی فائرنگ کے نتیجے میں چار مجرم کام آگئے، باقی فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے جن کی سرگرمی سے تلاش کا سلسلہ جاری ہے۔ اس تمام کارروائی سے فارغ ہوکر وہ لیاقت حسین کو ساتھ لے کر سراج کی طرف روانہ ہوگیا۔ سب انسپکٹر نے اسے مطلع کر دیا تھا کہ سراج کی گاڑی کو شاپنگ سینٹر سے اٹھا کر اس کے مکان پر پہنچا دیا گیا تھا۔ راستے میں اس نے کسی خیال سے لیاقت حسین سے دریافت کیا۔

''تمہارا پستول اس وقت کہاں ہے جو سراج صاحب نے دیا تھا؟''

''اس وقت بھی میری کمر کی بیلٹ میں موجود ہے صاحب۔'' لیاقت حسین نے سادگی سے جواب دیا۔ ''صبح ناشتے کے بعد سے رات کو سوتے وقت تک یہ میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔''

اورنگ زیب نے ایک لمحے کو سوچا کہ پستول نکلوا کر اس کے میگزین میں موجود گولیاں شمار کرلے لیکن پھر اس نے یہ کام سراج کے لیے چھوڑ دیا، وہ لیاقت حسین کی یادداشت کو بار بار کریدنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے پولیس کے عملے پر ضرور غصہ آرہا تھا جنہوں نے لیاقت حسین کو حراست میں لینے کے باوجود اس کی جامہ تلاشی ضروری نہیں سمجھی تھی۔ اس قسم کی خوش فہمیاں اکثر پولیس والوں کے لیے موت کا سبب بھی ثابت ہوتی تھیں۔

شیخ حامد اس وقت دفتر سے واپسی کے بعد لباس تبدیل کرنے میں مصروف تھا جب موبائل گنگنانے لگا۔ اس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر فون اسکرین پر ڈالی۔ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ اس کی طرف توجہ بھی نہ دیتا۔ گھر واپسی کے بعد اہم لوازمات کے ساتھ شام کی چائے لیے بغیر وہ کسی سے بات کرنے کا عادی نہیں تھا، یہ خاصی پرانی عادت تھی لیکن اس وقت کنول کے نمبر دیکھ کر اس نے فوری طور پر موبائل اٹھا کر آن کرتے ہوئے کان سے لگایا۔

''اس وقت کیسے فون کیا؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیا اب مجھے بھی بات کرنے کی خاطر آپ سے وقت لینا پڑے گا؟'' کنول نے شکوہ کیا۔

''کیسی بات کر رہی ہو جان من۔'' شیخ حامد نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دراصل میں نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا۔''

''آپ شاید شام کے ناشتے کی بات کر رہے ہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ تمہاری طرف بھی اس وقت شام ہی ہوگی؟'' اس نے کنول کو پیار سے چھیڑنے کی خاطر سوال کیا۔

''میں وقت کی نہیں ناشتے کی بات کر رہی ہوں۔'' کنول نے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ ''میں نے تو صبح سے ناشتا نہیں کیا اور اس وقت تک کچھ نہیں کھاؤں پیوں گی جب تک آپ نہیں آئیں گے۔''

''ایسا مت کرو ڈارلنگ۔'' شیخ حامد نے اسے ریشہ خطمی ہوجانے والے انداز میں منانے کی کوشش کی۔ ''ناشتا پانی سے منہ موڑ لوگی تو وہ خوب صورت اور حسین فیگر خراب ہوجائے گا جس نے مجھے تمہارا دیوانہ بنا دیا ہے۔''

''خالی خولی باتیں.....'' شکوہ کیا گیا۔ ''مجھ سے پوچھیں، میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ آپ دو روز سے غائب ہیں، میں ایک ایک پل کانٹوں پر لوٹ رہی ہوں اور اماں کی باتیں الگ سن رہی ہوں۔''

''کیا مطلب؟.....'' وہ چونکا۔ ''اماں کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں؟''

''انہوں نے میری ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر شادی کی اجازت دیدی تھی لیکن ماں، ماں ہوتی ہے۔'' کنول نے وضاحت کی۔ ''کیا انہیں احساس نہ ہوگا کہ آپ نے دو روز سے پلٹ کر صورت بھی نہیں دکھائی۔ وعدہ کرکے بھی نہیں آئے۔''

''میں نے تمہیں حالات کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ تمہارے بغیر میں بھی بے چین ہوں لیکن کچھ حرامزادے بلاوجہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ تم شبنم سے واقف ہو؟''

''ہاں.....صرف نام کی حد تک۔''

''اسے بھی کسی نے اغوا کرلیا ہے؟'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''کون لوگ ہوسکتے ہیں؟''

''تم فکر نہ کرو۔ میرے شکاری کتے ہر سمت ان کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ میرے دشمنوں کو پھاڑ کھانے میں دیر بھی نہیں لگائیں گے، تم صرف اپنی صحت اور تندرستی کا خیال رکھو میری جان.....''

''آپ خود کب آئیں گے؟''

''آج یا کل کسی وقت بھی ضرور آؤں گا لیکن ایک شرط

پر.....''

''وہ کیا.....؟''

''تم اپنی خوراک اور پھل فروٹ سے خفا نہیں ہوگی۔''

کنول سے بات ختم کرکے اس نے لاؤنج میں آکر ناشتا کیا پھر اس نے شام کے اخبارات کی طرف نظر ڈالنے کی کوشش کی تھی جب دوسرے موبائل کی مخصوص آواز ابھری۔ شیخ حامد نے پلٹ کر دیکھا، نمبر ٹو کی کال تھی، اس کے چہرے پر ایک دم ہی زلزلے جیسی کیفیت طاری ہوگئی۔

''جگا کہاں مرا ہوا ہے کرائے کا ٹٹو۔ کچھ اتا پتا چلا اس کا.....'' وہ موبائل آن کرتے ہی گرجنے لگا۔

''میرے آدمی اس کی.....''

''بکواس بند کرو۔ صبح تک کوئی سراغ نہ ملے تو خود اپنی خبر بھی نہ دینا۔ زہر کھا کر قصہ پاک کرلینا، مجھے نکموں کی نہیں، کارآمد لوگوں کی ضرورت ہے۔''

''میں نے زہریلا کیپسول اس وقت بھی ہتھیلی پر رکھا ہوا ہے باس۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی بار آپ نے کیا شرط رکھی تھی۔''

''لن ترانیاں نہیں.....کھل کر بات کرو.....کیا بکواس کرنا چاہتے ہو؟''

''میرے چار آدمیوں نے آج دوپہر مسز سراج..... الماس بیگم کو ساحلی علاقے کے قریب والے بڑے شاپنگ مرکز سے اغوا کرلیا تھا۔ اسے پلازا سے باہر بھی لے آئے تھے لیکن وین میں بٹھانے سے پیشتر ہی لیاقت حسین نے درمیان میں آکر بازی کا رخ پلٹ دیا۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو۔'' شیخ حامد حلق کے بل چیخا۔ ''کیا تمہارے جنگلی سور اس ایک پر قابو نہیں پا سکے؟''

''سمجھ میں نہیں آتا باس..... وہ انسان نہیں بلکہ کوئی عفریت ہی ہے جو چار آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر خود صرف ان لوگوں کے ہاتھوں معمولی زخمی ہوا۔''

''الماس کا کیا بنا.....؟''

''فائرنگ کے بعد وہاں بھگدڑ مچ گئی تھی، کسی نے پولیس کو بھی اطلاع کر دی ہوگی، موبائل الماس اور لیاقت حسین کو تھانے لے گئی۔ ہمارے مردہ آدمیوں کو بھی بعد میں اٹھوالیا۔''

''اس وقت وہ کہاں ہے؟'' شیخ حامد نے ہاتھ مسلتے ہوئے الماس کے بارے میں سوال کیا۔

''اس کے تھانے پہنچنے کے کچھ دیر بعد ایس پی اورنگ زیب میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے الماس کو اپنی گاڑی میں فوراً ہی گھر روانہ کر دیا پھر کاغذی خانہ پوری کرنے کے بعد وہ لیاقت حسین کو بھی اپنی گاڑی میں بٹھا کر ڈی ایس پی سراج کی رہائش گاہ کی طرف چلا گیا۔'' نمبر ٹو نے بات مکمل کرنے کے بعد سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے یاد ہے باس.....آپ نے کہا تھا کہ ناکامی کی صورت میں آپ کو شکل دکھانے کے بجائے خود بھی سیاہ فام حبشی کی طرح زہریلا کیپسول کھا کر اپنا قصہ پاک کرلوں۔''

''ایک منٹ.....'' شیخ حامد تیزی سے بولا۔ ''الماس کے اغوا کے سلسلے میں ایس پی کے تخم نے کیا لکھا ہے؟''

''یہ بھی اہم نکتہ ہے باس۔'' نمبر ٹو نے کہا۔ ''میں نے اطلاع نکلوائی ہے اس کے مطابق الماس یا لیاقت حسین کا نام کہیں نہیں آیا۔ شاپنگ مرکز پر ہونے والی فائرنگ کو ممکنہ ڈکیتی کا رنگ دے کر نمٹا دیا گیا ہے، جس میں پولیس نے اپنی کارکردگی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے بعد ہمارے چار آدمیوں کو بھی ڈاکو ظاہر کیا جو فائرنگ میں کام آگئے تھے۔''

''لیا.....قت..... حسین۔'' شیخ حامد نے بڑی حقارت سے لیاقت حسین کو دانت کرکرا کر تین حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ شاید چوتھا یا پانچواں موقع ہے جب اس تخم پلید نے میرا رستہ کاٹا ہے۔'' اس جملے کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ شیخ حامد کو یہ بھی یاد آگیا کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لودھی نے بھی اسے خوش کرنے کی خاطر ذاتی طور پر لیاقت حسین کو اٹھوالیا تھا، اس کے آدمیوں نے لیاقت حسین کو ایک خفیہ ٹھکانے پر لے جا کر زنجیروں میں جکڑ دیا تھا لیکن بعد میں خود لودھی نے بھی بڑی حیرت سے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ لیاقت حسین زنجیروں کو توڑے بغیر حیرت انگیز طریقے سے اس کی بندشوں سے نکل کر فرار ہوگیا تھا۔ نگرانی کرنے والے بھی ششدر رہ گئے تھے، جو دو آدمی اس کی زبان کھلوانے پر تعینات تھے وہ بعد میں مردہ پائے گئے تھے۔ لودھی کی بیان کردہ وہ ناقابل یقین کہانی اس وقت شیخ حامد کے ذہن میں کسی ٹیپ شدہ کہانی کی طرح گونج رہی تھی۔ وہ اس قسم کی پراسرار طلسماتی، مافوق الفطرت اور ماورائے عقل کہانیوں پر یقین نہیں رکھتا تھا لیکن لیاقت حسین کے بارے میں ملنے والی شہادتیں اور سنائی جانے والی تفصیلات اب اس کے دماغ میں ہلچل سی مچا رہی تھیں۔

''میرے لیے کوئی آخری حکم باس؟''

''فی الحال زہریلے کیپسول کو حفاظت سے اپنے پاس ہی رکھو۔'' شیخ حامد نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''لیاقت حسین کے

سلسلے میں تم کیا کر سکتے ہو؟ میرا مطلب ہے اس کے وجود کو اس طرح مٹا دو جیسے وہ کبھی ماں کے پیٹ سے باہر ہی نہیں آیا تھا۔"

"آپ نے پہلے کہا ہوتا تو الماس بیگم کو قابو کرنے سے پہلے ہم اسی کو....."

"شرمندگی مٹانے کی حماقت نہ کرو..... میں تمہیں دو روز کا موقع دے رہا ہوں۔"

"آپ نے سیٹھ رستم علی کے بارے میں کچھ ہدایتیں دی تھیں۔" بات جاری رکھی گئی۔ "میری تفصیلی معلومات کے مطابق آپ کے بنگلے پر ہونے والے حملے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے..... وہ ایک بزدل اور خوفزدہ بزنس مین ہے جو شیشے کے گھر میں بیٹھ کر کسی کی طرف پتھر مارنے یا اچھالنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہے۔"

"پھر..... اور کون اپنی موت کو دعوت دے رہا ہے.....؟" شیخ حامد نے جھلا کر دریافت کیا۔

"ہوسکتا ہے جگا کے سامنے آنے کے بعد کچھ ڈانڈے آپس میں مل جائیں۔"

"کیا مطلب.....؟"

"پہلے حملے میں..... جو لاشیں پولیس کے ہاتھ لگی تھیں، ان میں سے دو ولد الحراموں کا تعلق اسی کے گروہ سے معلوم ہوتا ہے۔"

"امکانات اور غور کا وقت اب میرے پاس نہیں ہے۔" اس بار شیخ حامد نے بے حد قہر آلود لہجے میں کہا۔ "جو بھی مشکوک آدمی تمہاری لسٹ پر آئے اسے بھون کر رکھ دو..... میری طرف سے کھلی اجازت ہے، نمبرون پر لیاقت حسین کا نام ضروری ہے۔"

شیخ حامد نے نمبر ٹو سے بات ختم کر کے چائے کے دو لمبے لمبے گھونٹ حلق سے نیچے اتارے پھر اس نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے ڈی آئی جی کرائمز آغا منظور کے نمبر ڈائل کیے۔ تیسری گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی۔

"اس وقت کیسے یاد کیا جناب....."

"کیوں؟..... کیا اب تم جیسے سفارشیوں کو بھی فون کرنے کی خاطر پہلے سے وقت لینا ضروری ہے؟" شیخ حامد نے بڑی رعونت سے کہا۔

"آپ غلط سمجھے شیخ صاحب۔" ڈی آئی جی نے اس کے لہجے کی تلخی محسوس کرتے ہوئے بات بنانے کی کوشش کی۔ "میں بس ایک دو منٹ میں اٹھنے والا تھا۔ آج آپ کو فون کرنے کا پروگرام بھی تھا۔"

"کوئی خاص خبر.....؟"

"آپ نے شبنم کو بازیاب کرنے کی جو ذمے داری سونپی تھی اسی کے سلسلے میں کچھ عرض کرنا تھا۔"

"کوئی سراغ ملا.....؟"

"ابھی تک نہیں لیکن میں مایوس بھی نہیں ہوں۔ میرے سادہ لباس والے دن رات مشتبہ افراد کے ٹھکانوں پر سن گن لینے میں مصروف ہیں۔ اگر وہ اسی شہر میں ہوئی تو میرے تجربے کار کھوجی اسے ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"اگر..... مگر سے کام نہیں چلے گا آئی جی۔" شیخ حامد نے اس کا نام بگاڑتے ہوئے اپنے غصے کا اظہار کیا۔ "مجھے کوشش نہیں..... نتیجہ چاہیے اور وہ بھی شبنم کی شکل میں....."

"میں جانتا ہوں....."

"سنا ہے تمہارے نئے ایس پی نے آج ساحلی علاقے کے شاپنگ سینٹر سے کچھ لاشیں بھی بٹوری ہیں۔" شیخ حامد نے الفاظ چباتے ہوئے پوچھا۔ "کیا قصہ تھا؟"

"اب تک مجھے جو معلومات ملی ہیں اس کے مطابق کچھ دہشت گردوں نے شاپنگ سینٹر پر بڑے پیمانے پر ڈاکا مارنے کا پروگرام بنایا تھا، وہ کسی حد تک کامیاب ہو گئے تھے لیکن بروقت ایک پولیس موبائل وہاں پہنچ گئی۔ پھر فائرنگ کے تبادلے میں چار ڈاکو کام آ گئے۔ پولیس ریکارڈ کے مطابق وہ پہلے سے مطلوب مجرم کی فہرست میں شامل تھے۔"

"حقیقت سنا رہے ہو یا یہ تمہارے نئے ایس پی کی من گھڑت کہانی ہے؟"

"میں..... میں سمجھا نہیں؟" ڈی آئی جی نے تعجب کا اظہار کیا۔ "آپ نے کیا سنا ہے؟"

"میں نے سنا ہے کہ جس وقت فائرنگ کا تبادلہ ہوا اس وقت شاپنگ سینٹر میں سراج کی الماس بیگم بھی موجود تھیں۔ دوسری اطلاع کے مطابق الماس بیگم اور ان کی کار چلانے والے ڈرائیور کو پولیس موبائل میں لوڈ کر کے تھانے بھی لے جایا گیا تھا۔ اس کے بعد تمہارے نئے ایس پی نے تھانے پہنچ کر اپنا رنگ جمانے کی کوشش شروع کی۔" شیخ حامد نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں بھی اسی شہر میں کاروبار کرتا ہوں آغا صاحب۔ اس لیے کاروباری سینٹروں کے اتار چڑھاؤ کی خبر رکھنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔"

"میں نے ایسی کوئی بات نہیں سنی لیکن اب آپ نے کہا ہے تو اس کی تفتیش بھی ضرور کروں گا۔"

"نہ کرو، جب بھی میرا کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس وقت دو باتیں کہنی تھیں..... شبنم کے اغوا کو نظر انداز مت کرنا اور..... یہ بھی نہ بھولنا کہ میں کاروباری میدان کے ایک

ایک چپے کی خبر رکھتا ہوں اور تمہارے ان افسروں کی بھی جو میری خاص لسٹ پر موجود ہیں۔" سلسلہ منقطع کرنے کے بعد وہ اٹھ کر لاؤنج میں ٹہلنے لگا۔ اس کے ذہن میں بیک وقت کئی مسائل الجھ رہے تھے۔ شبنم کی بازیابی میں ناکامی، الماس کا دوبارہ ہاتھ میں آ کر نکل جانا اور..... لیاقت حسین جس نے دونوں مرتبہ الماس کے اغوا کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ میڈم روبی کے سلسلے میں بھی اس کے آڑے آ چکا تھا۔

پے در پے رونما ہونے والے حالات کی روشنی میں اب وہ لیاقت حسین کی دخل اندازی کو محض اتفاق نہیں سمجھ سکتا تھا۔

❀❀❀

حسب وعدہ شبنم کو اگلی صبح ایک موبائل فون فراہم کر دیا گیا تھا۔ اورنگ زیب کی ملاقات کے بعد سے اس کی نگرانی کرنے والے اس کے ساتھ بہت مہذب انداز میں پیش آ رہے تھے۔ موبائل مل جانے کے بعد شبنم نے فوری طور پر میڈم روبی سے بات کرنا چاہی تھی لیکن پھر اس نے اورنگ زیب کی ہدایت پر ایسا نہیں کیا، اس نے واضح طور پر منع کیا تھا کہ میڈم کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہیے کہ شبنم کہاں اور کن ہاتھوں میں ہے۔ میڈم سے بات ہوتی تو وہ شبنم کو اس کی گمشدگی کے بارے میں ضرور کریدتی اس لیے بہتر تھا کہ اس سے فی الحال کوئی رابطہ نہ کیا جائے۔ میڈم کے بعد اس کے ذہن میں افضل خان کا تصور ابھرا، اس نے اورنگ زیب کو یہ بات کھل کر نہیں بتائی تھی کہ وہ افضل خان کے ساتھ نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونے سے پیشتر ہی ایک مشترکہ لائحہ عمل طے کر چکی تھی۔ اسی خیال کے پیش نظر وہ افضل خان کے بارے میں غور کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بگ باس کے ذہن میں شبنم کے اغوا کے بعد کچھ شبہات ضرور ابھرے ہوں گے، شبنم بگ باس کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو رہی تھی اس لیے وہ اسے یکسر نظر انداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس ضمن میں اس نے افضل خان سے بھی باز پرس ضرور کی ہوگی، ہوسکتا ہے اسے کوئی سزا بھی دی ہو۔ اغوا کے امکانات کے کچھ خدشات کے پیش نظر ممکن ہے افضل خان کو تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا ہو۔ خاصی دیر تک وہ مختلف زاویوں سے سوچتی رہی پھر اس نے ڈرتے ڈرتے افضل خان کے نمبر پنچ کیے۔ دوسری جانب سے چوتھی گھنٹی کے بعد کال ریسیو کی گئی۔ آواز افضل خان ہی کی تھی۔

"میں شبنم بول رہی ہوں۔ تم خیریت سے تو ہو؟"

"تم خود کہاں ہو؟" افضل خان نے شبنم کی آواز سن کر بے چینی کا اظہار کیا۔ "تمہیں اغوا کرنے والے کون تھے؟ کہاں رکھا گیا ہے تمہیں؟"

"مجھے ابھی تک اس کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکا۔" شبنم نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ "انہوں نے اپنی زبان پر تالے ڈال رکھے ہیں۔ فی الحال میرے ساتھ کوئی سختی بھی نہیں ہوئی۔"

"تمہارا موبائل نمبر کس طرح بدل گیا؟" افضل خان نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے معلوم کیا۔

"وہ..... اغوا کرنے والوں نے میری سم نکال لی ہے۔" شبنم نے بات بتانے کی کوشش کی۔ "میری درخواست پر نئے نمبر کی سم دی گئی ہے۔"

"اس وقت تمہارے پاس اور کون ہے؟" افضل خان کا لہجہ محتاط ہو گیا۔

"کوئی بھی نہیں..... میں صرف تمہاری خیریت معلوم کرنا چاہتی ہوں۔" شبنم نے کچھ کہنا چاہا لیکن دوسری جانب سے سلسلہ فوراً ہی منقطع کر دیا گیا۔ اس نے فوری طور پر دوبارہ نمبر ملانے کی غلطی نہیں کی۔ اس نے سوچا، ممکن ہے کچھ لوگ افضل خان کی نگرانی کر رہے ہوں جن کے خوف سے لائن کاٹ دی گئی ہو۔ اس شبہے کے ساتھ ہی اسے اپنی جلد بازی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ بگ باس افضل خان سے خوش نہیں تھا، اس کے اغوا کے بعد بگ باس کے کچھ کارندے افضل خان کی نگرانی پر ضرور تعینات ہوں گے۔ وہ ان ہی باتوں پر غور کر رہی تھی جب اس کا موبائل وائبریٹ کرنے لگا۔ اسکرین پر نیا نمبر دیکھ کر اس نے کال ریسیو نہ کرنے کا ارادہ کیا پھر یہ سوچ کر کہ شاید اورنگ زیب نے اسے کال کیا ہو اس نے کچھ تذبذب کے بعد موبائل آن کر لیا۔ مختصراً کہا۔

"ہیلو....."

"تم اس وقت خیریت سے تو ہو؟" اجنبی لہجے نے سوال کیا۔

"تم کون ہو.....؟" اس نے محتاط لہجے میں دریافت کیا۔

"دوست ہی سمجھو....." سپاٹ آواز میں جواب ملا۔ "تمہیں کہاں رکھا گیا ہے؟ صرف اتنا بتا دو ہم تمہیں ہر قیمت پر بازیاب کر لیں گے۔"

شبنم نے لائن کاٹ دی، اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، اس کا شبہ درست ثابت ہوا۔ جو لوگ افضل خان کی خفیہ نگرانی پر تعینات تھے انہیں شاید افضل خان کے موبائل

سے وہ آخری نمبر بھی ضرور مل گیا ہوگا جس پر بات کی گئی تھی اور اب وہ اس سے پتا دریافت کررہے تھے، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی غلطی کا ازالہ کس طرح کرے۔ موبائل پر دوبارہ وائبریشن ہوئی تو اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہوگئیں۔ وہی نمبر دوبارہ روشن اسکرین پر چمک رہا تھا۔ اس نے ہمت کرکے موبائل آن کرلیا۔

''کون پریشان کررہا ہے؟'' اس بار اس نے جھلا کر اپنے غصے کا اظہار کیا۔

''اب لائن ڈسکنکٹ نہ کرنا ورنہ افضل خان کی زندگی کی ضمانت بھی ختم ہوجائے گی۔'' دوسری جانب سے تنبیہی لہجے میں وارننگ دی گئی۔ ''سیدھی طرح بتادو کہ تم کہاں ہو.....''

''کوئی جواب نہ دینا مم.....میری.....'' دوسری جانب سے افضل خان کی مدھم آواز ابھری پھر شاید جو لوگ قریب کھڑے تھے انہوں نے اسے قابو کرلیا تھا، مدھم مدھم آوازیں بھی ابھریں پھر دوبارہ سخت لہجے میں کہا گیا۔ ''ہم تین تک گنیں گے پھر تم افضل خان کے حلق سے نکلنے والی موت کی آخری کراہ بھی سن لوگی۔''

شبنم نے جواب دینے کے بجائے لائن منقطع کرنے کے ساتھ ہی موبائل بھی آف کردیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے پر جاکر تین بار جلدی جلدی دستک دی تو پہرا دینے والا سامنے آگیا۔

''کیا کام ہے میڈم.....؟'' اس نے شبنم کی بوکھلاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''مجھے فوری طور پر اورنگ زیب صاحب کو ایک اہم پیغام دینا ہے۔ ان کا موبائل نمبر کیا ہے؟'' شبنم نے بڑی عجلت میں کہا۔ جواب میں دروازہ کھولنے والے نے اسے نمبر بتانے کے بجائے جیب سے اپنا موبائل نکال کر ایک دو بٹن دبا کر اسے شبنم کی طرف بڑھادیا۔

''کیا بات ہے؟ اس وقت کیسے فون کیا؟'' دوسری جانب سے اورنگ زیب کی مانوس آواز ابھری۔

''میں شبنم بول رہی ہوں۔'' شبنم نے تیزی سے کہا پھر ایک ہی سانس میں سب کچھ کہتی چلی گئی۔

''پریشان مت ہو.....لیکن اب دوبارہ سوچ سمجھ کر ہی کسی واقف کار کو فون کرنا۔''

''وہ.....وہ افضل خان کو.....''

''کچھ نہیں ہوگا.....'' اس کی بات کاٹ کر کہا گیا۔ ''وہ میرے ہی آدمی تھے۔''

''اوہ.....'' شبنم نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ دوسری جانب سے رابطہ ختم ہوگیا تھا اس لیے اس نے موبائل واپس کیا پھر کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گئی۔ اسے شدت سے احساس ہورہا تھا کہ اگر ایس پی اورنگ زیب نے افضل خان کی نگرانی کا خیال نہ رکھا ہوتا تو شاید وہ ایک ہم خیال ساتھی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوجاتی۔

❁❁❁

''کس کی کال تھی؟'' سراج نے اورنگ زیب کے چہرے کے تاثرات کو بدلتے دیکھ کر سوال کیا۔

''ایک سادہ لباس والے کا فون تھا۔'' اورنگ زیب نے کہا پھر کسی اور کا نمبر پنچ کرنے لگا۔ دوسری جانب سے رابطہ ہونے پر اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے وکی پینتھر سے بات کرنی ہے۔''

''بول رہا ہوں۔'' کچھ توقف سے جواب ملا۔

''تین آدمیوں کے بارے میں تم نے اب تک کچھ نہ کچھ تو معلوم کرلیا ہوگا؟''

''معاف کیجیے گا صاحب، میں آپ کی آواز نہیں پہچان سکا تھا لیکن آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔ ''تینوں میں صرف ایک میرا پرانا واقف کار تھا۔ اس کا نام راجو ہے، اسی کی وجہ سے میں بچ گیا لیکن اب وہ میری تلاش میں ہیں۔ اس نے مجھے اپنے ساتھیوں سے بھی دور رہنے کا اشارہ دیا ہے۔''

''تمہیں یہ بات کس نے بتائی.....؟''

''خود راجو نے کہا ہے صاحب۔ وہ بھی اب فرعون سے خوش نہیں ہے۔ آپ کے لیے ایک اہم اطلاع اور بھی ہے۔ کیا آپ لیاقت حسین نامی کسی بندے سے واقف ہیں؟''

''اطلاع کیا ہے.....؟'' اورنگ زیب نے کسمسا کر سوال کیا۔

''راجو کی اطلاع کے مطابق فرعون نے اس بندے کے لیے ''شوٹ ایٹ سائٹ'' کا حکم جاری کیا ہے۔''

''ایک کام کرسکتے ہو؟''

''آپ صرف حکم دیں صاحب۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔''

''راجو اور اس کے دونوں ساتھیوں کا گفٹ پیک بنا کر فرعون کے گھر کے قریب کہیں ڈال دو۔'' اورنگ زیب نے حقارت سے کہا۔

''کل تک کام ہوجائے گا صاحب.....ایک اجازت میں بھی چاہوں گا۔ کیا کسی فوری ضرورت پر میں آپ کے نمبر

پر کال کرسکتا ہوں؟''

''اوکے.....لیکن صرف ایمرجنسی کے موقعوں پر.....'' اورنگ زیب نے رابطہ منقطع کردیا پھر اس نے سراج کو وکی پینتھر کی تفصیل بتائی تو سراج نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''ہمیں ہر قیمت پر لیاقت حسین کو پروٹیکشن دینا ہوگی۔ ایک صورت تو یہ ممکن ہے کہ اسے فوری طور پر خفیہ طریقے سے فرحین کے پاس بھیج دیا جائے۔''

''ایک صورت اور بھی ہے.....'' اورنگ زیب معنی خیز انداز میں بولا۔ ''ہم آکٹوپس سے لیاقت حسین کے معاملے میں بارگیننگ بھی کرسکتے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں.....؟'' سراج نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

''تمہاری وقتی بیماری کی وجہ سے میں نے تمہیں کچھ باتیں نہیں بتائی تھیں۔'' اورنگ زیب نے اسے مختصراً کنول اور شبنم کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ''کنول اس وقت آکٹوپس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ سودا کرنے پر مجبور ہوہی جائے گا۔''

''مگر آپ کے لیے خطرات بڑھ جائیں گے۔''

''خطرات سے کھیلنا ہمارے فرائض منصبی میں بھی شامل ہے۔'' اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''آکٹوپس کو نیچا دکھانے کی خاطر میں اسے اس قدر بے بس اور لاچار کردوں گا کہ وہ خود اپنے آپ کو گولی مارنے پر مجبور ہوجائے گا۔''

''شبنم کے سلسلے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟'' سراج نے کسمسا کر سوال کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ بھی ہمارے کام آسکتی ہے۔''

''ہاں.....یہی بات تمہاری میڈم روبی نے بھی بڑے یقین سے کہی تھی۔ میں نے شبنم کو آزمانے کی خاطر اسے آزاد کرنے کی پیشکش بھی کی تھی لیکن وہ ہماری ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہے۔''

''کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم لیاقت حسین کو صرف گھر کی چہار دیواری تک محدود کردیں۔'' سراج نے پھر لیاقت حسین کا ذکر چھیڑا تو اورنگ زیب نے پہلو بدل کر بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''آپ کا کیا خیال ہے.....؟ جو نادیدہ قوتیں دوسروں کی خاطر لیاقت حسین کی مدد کررہی ہیں۔ کیا وہ خود لیاقت حسین کے کسی کام نہ آئیں گی؟''

''یہ پہلو ہے میرے ذہن میں لیکن کوئی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے سے رسک کم ہوجائے گا۔''

الماس کے آجانے سے اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جوس کی ٹرے لے آئی تھی۔

''کیا گفتگو ہورہی تھی جو میرے آتے ہی آپ دونوں گم صم ہوگئے؟'' الماس نے اورنگ زیب سے دریافت کیا۔

''میں سراج سے کہہ رہا تھا کہ خدانخواستہ اگر آپ کو کچھ ہوجاتا تو ہمیں اتنی خدمت کرنے والی بھابی شاید دوبارہ نہ ملتی۔''

''پھر.....'' الماس نے سراج کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ نے کیا جواب دیا؟''

''سراج کچھ نہ کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن آپ آگئیں اس لیے ان کے دل کا حال معلوم نہیں ہوسکا۔'' اورنگ زیب نے جوس کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

''افسر چاہے بھائی ہی ہو لیکن افسر ہی ہوتا ہے۔'' سراج نے شرارتاً کہا۔ ''مجھے بھی افسر کا کہنا تو بہرحال ماننا پڑا۔''

کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں پھر اورنگ زیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس وقت آکٹوپس کے خلاف ایک محاذ کو مضبوط کرنے کی خاطر اس وقت کسی سے ملنا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ میں بھی کل ڈیوٹی جوائن کرلوں۔'' سراج نے کہا۔ ''بستر پر پڑے پڑے تو ہاتھ پیر بھی نہیں کھلیں گے۔''

''تم الماس سے مشورہ کرلو۔ جیسا یہ مشورہ دیں ویسا ہی کرو۔'' اورنگ زیب نے اس بار دوستانہ انداز میں کہا پھر بڑی محبت سے الماس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

سراج نے الماس کو لیاقت حسین کو درپیش خطرے کے بارے میں بتایا پھر وہ سنجیدگی سے اس کے بارے میں حفاظتی تدابیر پر غور کرنے لگا۔

❁❁❁

لیاقت حسین اس وقت کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کے بعد اٹھا تھا، وہ اندر سراج کے پاس جانے کو سوچ رہا تھا جب اس کے موبائل پر گھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی تو فرحین کا نمبر دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ گاؤں جانے کے بعد سے وہ اس کی پہلی کال تھی۔ لیاقت حسین نے کئی بار اسے فون کرنے کا سوچا تھا لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ ترک کردیا تھا، فرحین اپنی عزیزہ کی موت کی خبر سن کر گئی تھی، اس موقع پر لیاقت حسین نے اسے خود سے کال کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

چنانچہ اس وقت جب فرحین نے اس سے رابطہ کیا تو وہ خوشی سے دیوانہ ہوگیا۔

''فرحین..... جان جگر!'' اس نے موبائل آن کرکے بڑے پیار سے کہا۔ ''سب خیریت تو ہے؟''

''اندر گھر میں اس وقت بھی پرسا دینے والی عورتیں بیٹھی ہیں۔ میں تجھ سے بات کرنے کی خاطر موقع نکال کر باہر کنوئیں کے قریب آگئی ہوں۔'' فرحین نے اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارے سراج صاحب کیسے ہیں؟''

''اب خطرے کی کوئی بات نہیں، ہوسکتا ہے کہ ایک دو دن میں ڈیوٹی بھی جوائن کرلیں۔ تو سنا، وہاں میرے بارے میں کسی نے پوچھا تو نہیں؟''

''کیسی باتیں کررہا ہے..... سب ہی بار بار تجھے یاد کرتے ہیں۔ اماں بھی روز تیری خیریت معلوم کرتی رہتی ہے..... البتہ بابا.....''

''کیا ہوا بابا کو.....؟'' لیاقت حسین باپ کے حوالے پر تڑپ اٹھا۔ ''اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''بھلا چنگا ہے لیکن کچھ پریشان پریشان رہتا ہے۔'' فرحین نے جواب دیا۔ ''میں نے اماں کو کئی بار ٹٹولنے کی کوشش کی مگر اس نے بات ٹال دی، کل رات تیری شاہ پری سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اب تو بڑی گوری چٹی ہوگئی ہے۔ شادی کے بعد بڑا رنگ روپ نکال رہی ہے۔''

''تو ابھی بابا کی بات کررہی تھی پھر یہ شاہ پری درمیان میں کہاں سے آگئی؟'' لیاقت حسین نے جھلا کر پوچھا۔ اسے شاہ پری سے کوئی بیر نہیں تھا لیکن اسی کی وجہ سے باپ کی حویلی چھوڑنی پڑی تھی اس لیے وہ اس کا ذکر سننا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

''شاہ پری کے نام پر مرچیں کیوں چبانے لگا؟'' فرحین نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''اب تو خیر سے وہ کچھ دنوں میں ماں بھی بننے والی ہے اور اسی نے تو مجھے تیرے بابا کی پریشانی کی وجہ بھی بتائی ہے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ اس کا نام کسی کو نہ معلوم ہو۔''

''کیا پریشانی ہے بابا کو.....؟'' لیاقت حسین نے تڑپ کر دریافت کیا۔

''شاہ پری بتا رہی تھی کہ شہر میں کسی بڑی کاروباری پارٹی سے پانچ چھ لاکھ کی رقم کے سلسلے میں کچھ بات خراب ہوگئی ہے۔'' فرحین نے بات جاری رکھی۔ ''تیرے بابا کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے لیکن.....''

''لیکن کیا.....؟ تو چپ کیوں ہوگئی.....؟'' لیاقت حسین نے فرحین کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ پانچ چھ لاکھ روپے کی خاطر کاروباری تعلقات متاثر ہونے کی بات پر وہ خود بھی چونکا تھا۔ اس کے ذہن میں سیٹھ عثمان کی وہ گفتگو گونجنے لگی جو اس نے اتفاقاً سن لی تھی، مارٹل کے آئٹم کی سپلائی کے سلسلے میں وہ بات ابھی تک اس کے دماغ میں محفوظ تھی۔ اس نے سراج سے بھی اس سلسلے میں مدد چاہی تھی لیکن بات مکمل نہیں ہوسکی تھی، اس وقت فرحین نے وہی ذکر چھیڑا تو اس کا بے چین ہوجانا قدرتی بات تھی۔

''مجھ سے ایک وعدہ کر لیاقت..... تو جذباتی نہیں ہوگا۔'' فرحین کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ''ہوسکتا ہے کہ میں غلط سوچ رہی ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ شاہ پری کو یہ بات بھی کسی طرح معلوم ہوگئی ہے کہ تو کہاں کام کررہا ہے۔ شاید اسی لیے اس نے وہ بات میرے کان میں ڈالی ہے۔ خاص طور پر یہ بھی کہا تھا کہ میں اس سلسلے میں کسی کے سامنے بھی سوچ سمجھ کر زبان کھولوں ورنہ بابا کی رازداری کا بھرم بھی ٹوٹ سکتا ہے۔'' فرحین نے دبی زبان میں بات جاری رکھی۔ ''میرا خیال ہے کہ تو معاملے کی تہ تک پہنچ گیا ہوگا۔ پر ایک بات کا دھیان رکھنا، اگر میرا نام بیچ میں آگیا تو اماں بھی مجھ سے ناراض ہوجائے گی۔ شاہ پری بھی شکوہ کرے گی، اس کی بات سے اندازہ ہورہا ہے کہ شاید کاروبار والی بات بابا اور ہمارے صاحب کے بیچ ہوئی ہوگی۔''

''میں سمجھ رہا ہوں، تو فکر نہ کر۔'' لیاقت حسین نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں کل کسی وقت تجھ سے بات کروں گا۔''

''اپنی بات نہیں کرے گا۔'' فرحین نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔ ''میرے بغیر تیرا گزارا کیسے ہورہا ہے؟''

''حساب کتاب جمع کررہا ہوں میری دلبر۔'' لیاقت حسین نے سرد آہ بھری۔ ''تو آئے گی تو سارا جمع خرچ برابر کردوں گا۔''

''بیگم صاحب اور صاحب کیسے ہیں۔ ان سے میرا سلام کہنا۔''

''میں ابھی تک سراج صاحب کی طرف ہوں۔ ادھر گیا تو تیرا اسلام بھی پہنچادوں گا۔''

دوسری طرف کوئی آگیا تھا اس لیے فرحین نے کل بات کا یاد دلا کر رابطہ منقطع کردیا۔ لیاقت حسین کے ذہن میں پانچ لاکھ کی رقم اور سیٹھ عثمان کی فون والی گفتگو گونجنے لگی۔ اسے اس بات پر بھی تعجب تھا کہ شاہ پری کو اس بات کا علم کس

طرح ہوا کہ شہر میں وہ کس کے پاس ملازم ہے؟ اس سلسلے میں اس کا شبہ گل خان کی گھر والی زرینہ کی طرف گیا جو کسی زمانے میں شاہ پری کے ساتھ ایک ہی مدرسے میں دینی تعلیم حاصل کرنے جاتی تھی۔ بہرحال، وہ گتھی حل ہوگئی تھی جو لیاقت کے ذہن میں الجھتی جارہی تھی۔

❧❧❧

وہ سرحدی علاقے کا کوئی سنسان و ویران پہاڑی سلسلہ تھا جہاں فلک بوس پہاڑیاں نہ جانے کب سے سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ اس وقت سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، اس کی تپش سے پہاڑوں پر کہیں کہیں جمی برف پگھل رہی تھی۔ دور دور تک کسی انسان کا سایہ تک نظر نہیں آرہا تھا جب سنگلاخ پہاڑ کے عمودی شگاف کے تنگ غار سے ایک ہیولا نکل کر سامنے آگیا۔ پہلی نظر میں وہ کوئی غلیظ اور جنگلی چوپایا ہی محسوس ہوا تھا لیکن غار سے کچھ دور آنے کے بعد جب وہ پیروں پر کھڑا ہوا تو اس کی شکل واضح ہوگئی۔

وہ ایک درمیانہ قد کا دبلا پتلا انسان تھا، جس کے جسم پر اس وقت میلی کچیلی لنگوٹی کے سوا کوئی لباس نہیں تھا، اس کے سر کے لمبے لمبے بال میل میں چکٹے ہوئے دونوں شانوں پر بکھرے نظر آرہے تھے۔ ڈاڑھی جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھی ہوئی تھی۔ گرد کی تہوں نے اس کی جلد کی اصلی رنگت بھی چھپا رکھی تھی لیکن اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں جن سے وہ قرب و جوار کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ اس کی ظاہری حالت دیکھنے کے بعد ایسا ہی لگتا تھا جیسے وہ ایک طویل عرصہ کے بعد کھلے آسمان کے نیچے غار سے نکل آیا ہو۔ چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد اس نے سر اٹھا کر آسمان کی سمت دیکھا، اس کی خون آلود نظریں پوری طرح کھلی تھیں۔ وہ تپتے سورج کو خاصی دیر ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر اس نے وحشیانہ آواز میں پوری قوت سے ''الکھ نرنجن'' کا نعرہ بلند کیا پھر ''جے بھیروی'' کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے، آنکھیں بند کرلیں۔ مدھم آواز میں کچھ بدبدانے لگا۔

اس کی جلد کی رنگت میل کچیل کے نیچے چھپ کر رہ گئی تھی لیکن اس وقت وہ خود کو بے حد تر و تازہ ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ تادیر وہ اسی انداز میں بدبداتا رہا پھر اس نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں، اس کی آنکھوں میں اب سرخی کے علاوہ ایسی چمک بھی نظر آرہی تھی جیسے اس نے کڑی آزمائشوں سے گزر کر کوئی بڑی کامیابی حاصل کرلی ہو۔ وہ ان چاروں طرف پھیلی سربلند پہاڑیوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس کی نظروں میں بڑی حقیر ہوں۔ اس کے

اس وقت اس بے ہنگم لنگوٹی باندھے شخص کو بڑی عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی رس چھلکاتی نظروں میں پیار ہی پیار بھرا تھا۔ اس کی گنگناتی آواز سن کر چٹان پر لیٹے ہوئے شخص نے آنکھیں کھول دیں۔

''تو..... کون ہے تو.....؟'' اس نے حقارت سے خوبرو اور نیم عریاں لڑکی کو سر سے پاؤں تک گھورا۔

''میں تمہاری داسی، تمہاری کیول، تمہاری پجارن ہوں مہاراج۔'' وہ ہاتھ باندھ کر بولی۔ ''دیوی کی آگیا یہی ہے کہ میں تمہارے چرنوں میں رہوں۔ تمہاری سیوا کروں، تم کو جیون میں کبھی نراش نہ کروں..... تمہارا من بہلاؤں۔''

''کس دیوی کی بات کر رہی ہے.....؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کے تیور اب بھی بدلے ہوئے تھے۔

''مہاراج.....'' پجارن نے ہاتھ باندھ کر معصومیت سے سوال کیا۔ ''کیا تمہارا شبھ نام پرتاب بھوش نہیں ہے؟''

''تیرا کیا نام ہے؟''

''داسی کو مدھو کہتے ہیں۔'' وہ لجا کر بولی تو اور سندر لگنے لگی۔

''کس دیوی نے تجھے..... مجھے دان کیا ہے؟'' پرتاب نے مدھو کو بڑے دھیان سے دیکھا۔

''کالی دیوی نے مہاراج.....''

''مدھو کے مطلب جانتی ہے؟'' کالی کا سن کر پرتاب نے مدھو کے چھلکتے جسم کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

''جانتی ہوں مہاراج.....'' مدھو کا روپ اس جواب کے ساتھ ہی اور نکھرا تھا۔ وہ کھسک کر پرتاب کے اور قریب آگئی۔

''میرے بارے میں کیا بتایا ہے مہان دیوی نے.....؟''

''تم نے دیوی کے کارن جو جاپ کیا تھا اس میں تم سپھل ہو گئے ہو۔ تمہاری شکتی اب اپدم پار ہو گئی ہے۔''

پرتاب نے اپنے میلے کچیلے ہاتھ بڑھا کر مدھو کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اس کے بالوں کو چومتے ہوئے بولا۔ ''جانتی ہے میں نے یہ جاپ کس کارن کیا تھا؟''

''دیوی کی کرپا ہے مہاراج۔'' مدھو نے پرتاب کے غلیظ سینے سے اپنے گال رگڑتے ہوئے کہا۔ ''ایک دشٹ ہے جو بار بار تمہارا راستہ کاٹ رہا تھا۔ اسی مورکھ نے تمہارے نیبو والے کالے منتر کا توڑ کیا تھا اور.....'' مدھو کچھ کہتے کہتے رک گئی تو پرتاب نے اس کے مخملی بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کا چہرہ اپنے سامنے کر لیا۔

اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''تو.....تو چپ کیوں ہو گئی؟ کہتے کہتے رک گئی؟''

''مم..... میں نہیں مہاراج۔'' وہ تلملا کر معصومیت سے بولی۔ ''دیوی نے کہا تھا کہ وہ مسلا بھی کسی شکتی کے بل پر تمہارے آڑے آگیا تھا۔''

''اب اس کی شکتی اس کے کسی کام نہیں آئے گی۔'' پرتاب سینہ ٹھونک کر بولا۔ ''مجھ سے نظریں چار کرے گا تو اس کی میّا مر جائے گی۔ جلا کر بھسم کر دوں گا اس نیچ ذات کو..... دیوی کی دان کی ہوئی شکتی بھی میری سہائتا کرے گی۔''

''بھوش میں کیا لکھا ہے؟ میں نہیں جانتی مہاراج پر نتو اتنا اوش سمجھتی ہوں کہ جسے دیوی کا آشیر باد پراپت ہو جائے وہ امر ہو جاتا ہے۔'' مدھو نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔ پھر دوبارہ پرتاب کی چھاتی پر سر رکھ کر کسمسانے لگی۔ اس کی خود سپردگی کا انداز بھی بڑا جنونی تھا۔ شاید دیوی کی آگیا کا پالن کرنے کی خاطر وہ مست ہو رہی تھی ورنہ بھول کر بھی اس گندے سے لتھڑے پرتاب کے قریب جانا بھی گوارا نہ کرتی۔

''کیا تو دیکھ سکتی ہے کہ اس سے وہ مسلا کہاں ہے؟'' پرتاب نے مدھو کے کومل گالوں کو چومتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں مہاراج..... میں کیول ایک پجارن ہوں۔'' مدھو نے مدھ برساتی نظروں سے پرتاب کو دیکھا۔ ''تم مجھے اپنے چرنوں میں سویکار کر لو۔ یہ بھی میرے لیے بڑے مان کی بات ہو گی..... دیوی کی بھی یہی آگیا ہے۔''

''تو کیا اس مسلے کو اپنی سندرتا کے جال میں پھانسنے کی خاطر کوئی روپ بھی نہیں بدل سکتی؟'' پرتاب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''روپ اوش بدل سکتی ہوں مہاراج۔ اپنے تن کی اگنی سے پگھلا بھی سکتی ہوں لیکن کوئی سراپ (سزا) نہیں دے سکتی۔''

''میرے لیے یہی کافی ہے۔'' پرتاب کے غلیظ ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی، خلاؤں میں جھانکتا ہوا بولا۔ ''میں نے یہی کہا تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کے پاؤں اوش رپٹ جائیں گے پھر جو شکتی اس کی پچھاڑی پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے وہ بھی روٹھ جائے گی۔ اس دن وجے (جیت) میری ہو گی۔''

''مہاراج.....'' مدھو نے پرتاب کے گلے میں بانہیں ڈال کر مچلتے ہوئے کہا۔ ''تم جاپ کے منتر پڑھتے پڑھتے تھک گئے ہو گے مہاراج..... کچھ دیر ستا لو، میں اپنے

شریر کی گرمی سے تمہیں تھپک تھپک کر سلا دوں گی۔ آنکھیں موند کر مدھو کی چھاتی پر سر رکھ کر کچھ دیر آرام کر لو۔ مجھے بھی اپنی سیوا کا موقع دو مہاراج..... تمہاری سیوا کرنے سے میری بھکتی بھی ہو جائے گی۔''

مدھو کی گرم گرم سانسیں، اس کے کومل شریر کی چھیڑ چھاڑ پرتاب کو لبھا رہی تھی۔ گرما رہی تھی..... وہ کچھ دیر اس کے ساتھ دھینگا مشتی کرتا رہا پھر تھک ہار کر دہکتے الاؤ میں گم ہوتا چلا گیا۔

❁❁❁

سیٹھ رستم علی اس وقت بہت خوش تھا۔ دو منٹ پیشتر اسے جس نئے ٹینڈر کی منظوری کی اطلاع ملی تھی وہ اس کی توقع کے خلاف ہی تھی، اسے اس بات کی حیرت بھی تھی کہ وہ ٹینڈر حامد ایسوسی ایٹس کے بجائے اس کی فرم کو کس طرح مل گیا جبکہ شیخ حامد نے اس کے مقابلے پر کم بولی لگائی تھی۔ ٹینڈر کی منظوری کے سلسلے میں دو فریقین کے درمیان دو پیسے کا فرق بھی مجموعی طور پر لاکھوں میں ہوتا ہے۔ یہ بات ٹینڈر پاس کرنے والی اتھارٹی کو بھی معلوم تھی کہ شیخ حامد نے پانچ سے کم کا ٹینڈر بھرا تھا اس لیے اصولی طور پر ٹینڈر اسی کے نام کھلنا چاہیے تھا۔ وہ دوسری بار اس منظوری کے حکم نامے کو پڑھ رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ رستم علی نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

''مجھے یقین ہے کہ اس وقت تم ٹینڈر اپنے نام منظور ہونے کی خوشی میں مگن ہو گے؟''

''کون بول رہا ہے.....؟'' رستم علی نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے.....؟'' اس کے سوال کو نظر انداز کر کے کہا گیا۔ ''کیا تم اس کام کو مکمل کر سکو گے؟''

''نہ کر سکا تو ضمانت کی جمع شدہ رقم بھی ڈوب جائے گی۔'' رستم علی نے کسمسا کر کہا۔ ''یہ بات تمام کاروباری پارٹیوں کے علم میں ہے۔''

''آدھا کام مکمل ہونے کے بعد اگر کوئی حادثہ قدرتی طور پر رونما ہو جائے تو منافع کے بجائے تمہیں خسارہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں بھی ابھی سے غور کر لینا۔''

''میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو اور فون کرنے کا کیا مقصد ہے لیکن اگر تم اندر کے کوئی آدمی ہو تو یہ بات تمہیں بھی معلوم ہو گی کہ ٹینڈر میں جو رقم میں نے بھری تھی وہ کسی دوسری پارٹی سے پانچ پیسے زیادہ تھی۔'' رستم علی نے وضاحت کر کے اپنی پوزیشن صاف کرنی چاہی۔

''ہم اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتے ہیں سیٹھ۔'' اس بار بھی خشک اور سرد لہجے میں جواب ملا۔ ''ٹینڈر پاس کرنا متعلقہ محکمے کے اختیار کی بات ہے جسے کوئی چیلنج نہیں کر سکتا..... عام طور سے اس رعایت کا اختیار استعمال نہیں کیا جاتا مگر..... متعلقہ افسر کی جیب خاص میں کوئی وزنی لفافہ پہنچ جائے تو پھر.....''

''فضول بات مت کرو۔'' رستم علی جھلا گیا۔ ''ہمارا تعلق جس کمیونٹی سے ہے وہ رشوت کا کاروبار کبھی نہیں کرتی۔''

''وقت کے ساتھ ساتھ ہوا بھی رخ بدل دیتی ہے۔ کسی بڑی رقم کی خاطر تو انسان.....''

''مطلب کی بات کرو.....'' رستم علی تلملا کر بولا۔ ''میں نہیں سمجھ سکا کہ تم کیا چاہتے ہو اور کون ہو.....؟''

''تمہیں دو باتیں یاد دلانا چاہتا ہوں.....'' دوسری جانب سے بولنے والا بھڑک اٹھا۔ ''پچھلی بار میں نے تمہارے جوان بیٹے اور خوب صورت بہو کا حوالہ دیا تھا تو تم نے کہا تھا کہ جب انسان مرنے اور مارنے کی ٹھان لے تو وہ اپنے ساتھ دوسرے کو بھی ختم کر دینے سے دریغ نہیں کرتا۔''

''تم شاید نشے میں ہو.....؟'' رستم علی تلملا اٹھا۔ ''تم نے غالباً نشے میں دھت ہو کر کچھ فرضی باتیں سوچ لی ہیں۔ جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ میں نے دارا اور روشنا کو کبھی درمیان میں لانے کی غلطی نہیں کی۔''

دوسری طرف سے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا گیا، رستم علی فون رکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دوسری طرف سے معنی خیز لہجے میں کہا گیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس روز تمہارے کمرے سے تمہارے بیٹے نے کال ریسیو کی ہو گی۔ اتفاق ہے کہ میں اس وقت دونوں آوازوں کے فرق کو نہیں محسوس کر سکا تھا۔ تم نے اپنی پوزیشن واضح کر دی سیٹھ۔ اب تمہارے جوان بیٹے ہی کو آخری فیصلہ کرنا پڑے گا..... بائی.....''

رستم علی جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ سلسلہ منقطع کر دیا گیا جس کے بعد رستم کا سکون بھی ٹینڈر ملنے کی خوشی کے ساتھ ہی ضائع ہو گیا۔ بات کی تہ تک پہنچنے کے بعد اس نے جھپٹ کر انٹر کام اٹھا لیا اور دارا کے نمبر پر انگلی جما دی۔

''یس ڈیڈ.....'' دوسری جانب سے دارا کی آواز ابھری۔

''میرے آفس میں آؤ..... اٹ از ارجنٹ.....'' رستم علی نے اپنی بات مکمل کر کے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر ابھرنے والے تفکرات لمحہ بہ لمحہ گہرے ہو رہے تھے۔ فون

کرنے والے کے آخری جملوں نے اس کا سکون غارت کر دیا تھا۔ دو منٹ بعد دارا کمرے میں داخل ہوا تو اس نے بھی باپ کی کیفیت کو محسوس کرلیا۔ میز پر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا بات ہے ڈیڈ۔ آپ کچھ پریشان نظر آرہے ہیں؟''

رستم علی نے خود کو سنبھالتے ہوئے بیٹے سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ نئی کالونی کی شاہراہ اور اس کے اندرونی راستوں کی تعمیر کا ٹینڈر ہماری فرم کو مل گیا ہے.....؟''

''اوہ نو.....'' دارا نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''اٹ از اے گریٹ نیوز فار می۔''

''میں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اتنے بڑے پروجیکٹ کے لیے ہمیں کچھ نیا اسٹاف بھی.....''

''یو ڈونٹ وری ڈیڈ.....'' دارا نے پرجوش انداز میں کہا۔ ''میں سارا انتظام کرلوں گا۔ جو ورکنگ پیپر تیار کیا گیا تھا اس کی روشنی میں اس پروجیکٹ کی کامیاب تکمیل کے بعد ہمیں کروڑوں کا منافع ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک اہم بات اور بھی ہے۔'' دارا نے پہلو بدل کر قدرے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہمیں یہ ٹینڈر حامد ایسوسی ایٹس کے مقابلے پر ملا ہے۔ اس لیے میں اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کرنے پر بے حد خوش ہوں۔''

''اسی چیلنج کی خوشی میں ایک آخری فیصلہ میں نے بھی کیا ہے۔'' سیٹھ رستم علی نے دارا کو سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم روشنا کو لے کر فوری طور پر لندن چلے جاؤ۔''

''لیکن.....''

''پوری بات سنے بغیر درمیان میں بولنا کاروباری اصول کے خلاف ہے۔'' رستم علی نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ''لندن آفس کے کچھ معاملات الجھ گئے ہیں۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کا وہاں ہونا ضروری ہے۔''

''آئی سی۔'' دارا نے کچھ توقف سے جواب دیا۔ ''ایک مشورہ میں بھی دوں گا۔''

''کہو.....''

''آپ کی طبیعت پچھلے دنوں خراب تھی۔ ماں کو بھی اسی کی پریشانی تھی، ایسی صورت میں اگر آپ ماں کو لے کر چلے جائیں تو یہ تبدیلی آپ دونوں کی صحت کے لیے زیادہ مفید ہوگی۔''

''تم میری فکر مت کرو۔ میں اب بالکل نارمل ہوں۔''

''سوری ڈیڈ.....'' دارا نے کسمسا کر قدرے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''کچھ معاملات ایسے ہیں کہ وقتی طور پر میں بھی دو چار مہینے تک باہر نہیں جاسکتا۔''

''کوئی خاص وجہ.....؟'' رستم علی نے بیٹے کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔

''کچھ ذاتی معاملات ہیں۔''

''ایسی کیا بات ہے جو تم مجھے نہیں بتا سکتے؟''

''مم..... میں، ان باتوں کو زبان پر نہیں لانا چاہتا۔''

''روشنا کا کوئی معاملہ ہے؟''

''نہیں.....''

''پھر..... اور کیا مجبوری ہے؟''

''سوری ڈیڈ.....'' دارا نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ''کچھ ایسی ہی بات ہے کہ میں آپ اور ماں کو چھوڑ کر باہر نہیں جاسکتا۔''

رستم علی نے دارا کا جواب سن کر خاموشی اختیار کرلی۔ کچھ دیر وہ دارا کے چہرے پر نظر جمائے بیٹھے رہے پھر سنبھل کر سنجیدگی سے کہا۔ ''کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں بھی تمہارے ساتھ ڈسکس نہیں کروں گا لیکن تمہارے نہ جانے کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ میں ٹینڈر کی آفر سے ایک ہفتے کے اندر اندر اس پر عمل کرنے سے معذوری کا اظہار کردوں جیسا کہ میرے اختیار میں ہے۔''

''لیکن آپ ایسا.....''

''ضروری نہیں کہ میں تمہاری کسی بات کا جواب دوں.....'' رستم علی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

''آئی۔سی.....'' دارا نے کسمسا کر زبان کھولنے کی کوشش کی۔ ''ڈیڈ۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری آفر کے مقابلے میں حامد ایسوسی ایٹس کی آفر پانچ پیسے کم تھی۔ اصولی طور پر ٹینڈر بھی اسی پارٹی کے حق میں کھلنا چاہیے تھا لیکن..... میں نے ذاتی کوشش کرکے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اب اگر ہم پیچھے ہٹے تو دوسری پارٹی اسے ہماری بزدلی ہی کہے گی۔''

بیٹے کا جواب سننے کے بعد رستم علی کے لیے آخری نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں تھا..... کچھ دیر قبل فون کرنے والے کا آخری جملہ رستم علی کے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر گونجتا رہا۔ دارا کے جواب نے یہ معما بھی حل کردیا تھا کہ دو روز قبل اسی نے کال کرنے والے سے بات کی ہوگی۔

''ڈیڈ.....'' دارا نے باپ کے ذہن میں ہونے والی

کشمکش کو محسوس کرتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ''اگر میری کسی بات سے آپ کو دکھ پہنچا ہو تو آئی ایم سوری لیکن میرا خیال ہے کہ ایک شخص کی خاموشی کسی دوسرے شخص کو بہت ساری غلط فہمیوں کا شکار کردیتی ہے اور.....''

اسی وقت انٹرکام کا بزر بولا تو سیٹھ رستم علی نے ریسیور اٹھا کر بیزاری سے کہا۔

''میں اس وقت مصروف ہوں، مجھے دوبارہ ڈسٹرب.....''

''سر.....'' آفس سیکریٹری نے رستم علی کا جملہ مکمل ہونے سے پیشتر تیزی سے کہا۔ ''ایس پی مسٹر اورنگ زیب میرے آفس میں موجود ہیں۔ وہ آپ سے فوری ملنا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے..... دو منٹ بعد انہیں میرے کمرے میں بھیج دینا.....'' سیٹھ رستم علی نے پرخیال انداز میں کہا پھر دارا کو مخاطب کرکے بولا۔ ''تم اپنے آفس میں جاؤ..... کوئی پولیس ایس پی کسی کام کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آیا ہے۔''

دارا نے باپ سے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر اپنا ارادہ ترک کرکے اٹھا اور خاموشی سے چلا گیا۔ دو منٹ بعد ہی ایس پی اورنگ زیب سادہ لباس میں رستم علی کے سامنے موجود تھا۔ رسمی جملوں کے بعد اورنگ زیب نے محتاط انداز میں اصل مقصد پر گفتگو شروع کی۔

''میں یہاں ایک خاص مقصد کے لیے آیا ہوں۔ یہ بھی بتادوں کہ فی الحال یہ دوستانہ اور قطعی نجی ملاقات ہے جو آپ کے تعاون نہ کرنے کے بعد سرکاری صورت بھی اختیار کرسکتی ہے۔''

''آفیسر، میں آپ کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنے پر آمادہ ہوں لیکن قبل از وقت کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔'' رستم علی نے اپنی حیثیت کے مدنظر کھل کر جواب دیا۔ ''اس لیے کہ کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو بہت زیادہ پرسنل ہوتی ہیں۔ شاید آپ بھی اپنی کسی پرسنل بات کو ظاہر کرنا پسند نہیں کریں گے۔''

''میں آپ سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔'' اورنگ زیب نے بدستور سنجیدگی سے بات جاری رکھی۔ ''میں جس مقصد کے پیش نظر اس وقت آپ کے پاس آیا ہوں وہ یقیناً آپ کا بالکل پرسنل معاملہ ہے لیکن اس کی نوعیت اس روز سے آفیشل صورت اختیار کرچکی ہے جس روز اسپتال سے واپسی کے وقت مجھ کو اور میرے ایک ساتھی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کو..... ایک دھماکے کے ذریعے ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔''

اورنگ زیب کو اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی۔ اسپتال کا نام درمیان میں آنے کے بعد رستم علی کے چہرے پر نظر آنے والا وقتی سکون بھی اندرونی ہلچل بن کر ظاہر ہونا شروع ہوگیا..... اورنگ زیب نے لوہا گرم دیکھ کر دوسری ضرب لگائی۔ ''مسٹر رستم علی۔ آپ اسپتال کے ٹرسٹی بھی ہیں۔ بڑے ڈاکٹر نے آپ کو غالباً ہمارے وہاں وزٹ کرنے کے بارے میں ضرور آگاہ کیا ہوگا۔ ہمیں آپ کی حیثیت اور شرافت کا خیال نہ ہوتا تو ہم آپ کی ملازمہ گلابو سے مل کر اس کا بیان بھی ریکارڈ کرسکتے تھے۔''

رستم علی گم صم بیٹھا اورنگ زیب کو کچھ دیر دیکھتا رہا پھر تھکے تھکے انداز میں بولا۔

''آپ کیا جاننا چاہتے ہیں آفیسر؟''

''گلابو پر گولی کس نے چلائی تھی؟ میں اس کا نام جاننا پسند کروں گا۔''

''اس کا نام خود مجھے بھی نہیں معلوم۔'' رستم علی نے کسمسا کر جواب دیا۔ ''وہ میرے لیے بھی اجنبی ہی تھا۔''

''میری ذاتی معلومات کی روشنی میں آپ نے اپنے تحفظ کے لیے گارڈز کا ایک دستہ بھی تعینات کر رکھا ہے۔ پھر مجرم کس طرح ان سب کو ڈاج دے کر آپ کی خواب گاہ تک پہنچ گیا اور..... ملازمہ گلابو اس وقت آپ کی خواب گاہ میں کیا کر رہی تھی؟''

رستم علی نے دبی زبان میں حادثے کی مختصر تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''گولی چلانے والا میرے ایک گارڈ کو بے ہوش کرکے اس کی وردی پہن کر بنگلے کے عقبی راستے سے داخل ہوا پھر..... اس نے میری خواب گاہ تک پہنچنے کی خاطر گلابو کو ڈرا دھمکا کر اپنے اشاروں پر چلنے کے لیے مجبور کردیا تھا..... میری وائف نے گلابو کی آواز سننے کے بعد ہی بیڈروم کا دروازہ کھولا تھا۔ اس وقت میں سو رہا تھا۔ میری مسز نے مجھے بعد میں آواز دے کر بیدار کیا تھا۔''

''آئی سی..... لیکن آنے والے نے جو یقیناً کسی خاص مقصد کے بغیر نہ آیا ہوگا، اس نے گلابو کو کیوں زخمی کیا؟''

''وہ..... وہ..... دراصل وہ خوف زدہ کرنے کا ایک نفسیاتی حربہ تھا۔''

''پھر.....'' اورنگ زیب نے رستم علی کی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں دریافت کیا۔ ''گارڈ کے لباس میں آنے والا یقیناً کوئی عادی اور پیشہ ور مجرم رہا ہوگا۔ وہ آپ سے کیا چاہتا تھا؟''

''وہ.....وہ.....وہ جس مقصد سے آیا تھا اس کے پورا ہونے کے بعد ہی اس نے مجھے اور میری وائف کو زندہ چھوڑ دیا تھا۔''

''آپ نے اس کی باقاعدہ رپورٹ ملحقہ تھانے میں کیوں نہیں کی؟''

''اپنی عزت.....شہرت اور بدنامی کے ڈر سے۔'' رستم علی نے کسی ہارے ہوئے جواری کے انداز میں مدھم آواز میں جواب دیا۔''اس رات جو کچھ ہوا اس کی اطلاع میرے بیٹے اور بہو کو بھی نہیں ہے.....میں نے جان بوجھ کر انہیں کچھ نہیں بتایا اس لیے کہ جوان خون جلدی اشتعال میں آجاتا ہے۔ بات پھیلتی یا طول اختیار کرتی تو مجرم جوابی کارروائی بھی کرسکتا تھا۔''

''میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔'' اورنگ زیب نے بہ دستور نرم انداز میں سوال کیا۔''مجرم یا مجرموں نے آپ سے کتنی رقم اینٹھ لی۔ میرا ذاتی اندازہ ایک کروڑ سے کم بھی نہیں ہے اور.....کیا آپ اتنی بڑی رقم نقدی کی صورت میں گھر میں رکھتے ہیں؟''

''پلیز مسٹر اورنگ زیب۔'' اس بار رستم علی نے ہاتھ جوڑ لیے۔''میں آپ سے ذاتی درخواست کروں گا کہ جو بات جہاں دفن ہوگئی ہے اسے وہیں تک دفن رہنے دیں۔ زیادہ نہ کریدیں۔ پلیز۔''

''مجھے شرمندہ نہ کریں رستم علی صاحب۔'' اورنگ زیب نے اسے تسلی دی۔''میں آپ سے پہلے ہی وعدہ کر چکا ہوں کہ تعاون کرنے کی صورت میں بات صرف میری ذات تک محدود رہے گی۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ بس ایک آخری سوال اشارے کی صورت میں اور کروں گا اس کے بعد آپ کا قیمتی وقت برباد نہیں کروں گا۔''

رستم نے جواب دینے کے بجائے حسرت بھری نظروں سے اورنگ زیب کو دیکھا۔ اورنگ زیب نے پہلو بدل کر ٹھوس لہجے میں کہا۔''اس شہر میں میرا ذاتی دشمن بھی صرف ایک ہے.....شیخ حامد، جسے میں آکٹوپس کے نام سے یاد کرتا ہوں۔ اسی نے سیٹھ عثمان جیسے شریف کاروباری انسان کو بھی اپنے معاملے میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ مجرم جو آپ کی خواب گاہ تک پہنچ گیا تھا.....کیا وہ اسی آکٹوپس کے اشارے پر نہیں چل رہا تھا؟''

سیٹھ رستم نے جواب میں نظریں جھکالیں تو اورنگ زیب نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ جانے کے ارادے سے اٹھ کر بڑی ٹھوس آواز میں بولا۔''اس پر میرے وہ نمبر بھی درج ہیں جس پر آپ کسی وقت بھی مجھ سے رابطہ کرسکتے ہیں۔ جاتے جاتے یہ بھی عرض کردوں کہ اب آپ کی حفاظت کی ذمے داری بھی ایک واقف کار کی حیثیت سے مجھ پر فرض ہوگی۔''

سیٹھ رستم نے جواب میں کچھ نہیں کہا، خاموشی سے اورنگ زیب کو رخصت کرنے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن اس کی نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ اورنگ زیب کی شخصیت سے نہ صرف متاثر ہوا تھا بلکہ اس کا احسان مند بھی تھا۔ اورنگ زیب نے رخصتی مصافحہ گرم جوشی سے کیا پھر کچھ سوچ کر دبی زبان میں بولا۔''آپ کو میرا ذاتی مشورہ ہے کہ ان معاملات سے دارا کو بالکل ہی الگ رکھیں تو مناسب ہوگا۔''

''بہت بہت شکریہ مسٹر اورنگ زیب لیکن اس وقت آپ نے مجھے خدمت کا کوئی موقع نہیں دیا۔ کم از کم چائے ہی.....''

''ڈیوٹی رہی.....کبھی موقع ملا تو ڈنر بھی آپ کے ساتھ ضرور کروں گا۔'' اورنگ زیب نے دوبارہ رستم علی کا ہاتھ گرم جوشی سے دبایا پھر پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

لیاقت حسین کے ذہن میں فرحین کی موبائل پر کی ہوئی باتیں اس وقت بھی ہلچل مچا رہی تھیں۔

کل تک وہ شاہ پری کے نام سے الجھتا تھا۔ اسی سے شادی نہ کرنے کے سبب اسے باپ کی شفقت اور اپنی حویلی سے محروم ہونا پڑا تھا لیکن آج اسی شاہ پری کی وجہ سے پانچ لاکھ کی رقم کا وہ معما حل ہوگیا تھا جس نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ فرحین نے کہا تھا''بابا کے پاس پیسوں کی کمی نہیں ہے لیکن اسے دوسرے کی غلطی کی وجہ سے اپنی کاروباری ساکھ خراب ہوجانے کا غم ضرور لاحق ہے۔'' لیاقت حسین باپ کی اس مشکل کو حل کرنے کا متمنی تھا۔ اس نے ابھی تک سیٹھ عثمان کو اپنے والد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اپنی اصلیت اور حیثیت کا اظہار کرکے وہ باپ کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سیٹھ عثمان بھی ملازمت دیتے وقت ضرور سوال کرتے کہ جب وہ اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے تو اسے ملازمت کی کیا ضرورت ہے؟ ویسے بھی وہ اپنا مستقبل بنانے کی خاطر خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا ارادہ لے کر گھر سے نکلا تھا لیکن اس وقت وہی ایک خاموشی اس کے لیے سوہان روح بن گئی تھی۔

لیاقت حسین کو یقین تھا کہ اپنی موجودہ حیثیت میں اگر

وہ سیٹھ عثمان کو حقیقت سے آگاہ کر دیتا تو اس کے باپ اور عثمان کے درمیان پیدا ہونے والی ایک غلط فہمی دور ہو سکتی تھی لیکن وہ اس کے سوا کوئی اور راستہ اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سراج کا وسیلہ بھی اس کے کام آ سکتا تھا۔ مگر اسے یہ بھی منظور نہیں تھا۔ وہ کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا تھا جس سے اس کے باپ اور سیٹھ عثمان کے درمیان پیدا ہونے والی وقتی بدمزگی بھی دور ہو جائے اور اس کی انا کو کوئی ٹھیس بھی نہ پہنچے۔

فرحین نے گفتگو کے دوران اس شبہے کا اظہار بھی کیا تھا کہ شاید شاہ پری کو کسی طرح اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ لیاقت حسین کہاں ملازمت کر رہا ہے لیکن اس نے کھل کر اقرار نہیں کیا تھا..... لیاقت حسین کے ذہن میں اس صورت حال کو حل کرنے کے مختلف طریقے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ جب اس کے ذہن میں ایک مانوس آواز ابھری جو کسی غیر کی نہیں اس کی اپنی ہی آواز تھی۔

''کب تک عقلی گھوڑے دوڑاتے رہو گے؟ صورت حال نے جو پیچیدہ صورت اختیار کر لی ہے اسے حل کرنا تمہارے لیے جوئے شیر لانے سے کم بھی نہیں ہے۔''

''میں نے کبھی مایوس ہونا نہیں سیکھا.....'' لیاقت حسین نے دل ہی دل میں اپنے ہمزاد سے کہا۔ ''انسان اگر ہمت سے کام لے۔ خدا پر بھروسا رکھے تو وہ ناممکن کو بھی ممکن بنا دیتا ہے۔''

''یہ بات ہے تو پھر پریشان کیوں ہو رہے ہو؟..... سب کچھ اسی پر چھوڑ دو۔ اب تک جو ہوتا رہا وہ بھی اسی خدا کو منظور تھا۔ آئندہ جو ہوگا وہ بھی اسی کی مرضی کے عین مطابق ہوگا۔''

''جانتا ہوں لیکن..... انسان کو اس کی مرضی کے پیش نظر سوچنے اور سمجھنے کا اختیار بھی ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے بھی مسئلے حل نہیں ہوتے۔''

''کل کیا ہوگا.....؟ کیا ہونے والا ہے یہ تم نہیں جانتے۔ میں بھی ایک حد تک تمہیں چونکا سکتا ہوں۔ زبان کھولنے کا اختیار میرے پاس بھی نہیں ہے۔''

''ہاں..... میں نے پڑھا ہے کہ ہمزاد انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ مر بھی جاتا ہے مگر..... میں عام کتابی باتوں پر ایمان نہیں رکھتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب من گھڑت باتیں اور فرسودہ کہانیاں ہوں۔ جو صورت حال میرے ساتھ پیش آتی رہی ہے میں اس سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔''

''پھر.....؟ تم اس وقت کس سے باتیں کر رہے ہو؟''

''میں اسے دل و دماغ کی جنگ اور کشمکش کا نام دوں گا۔''

''اور وہ باتیں جو حادثاتی طور پر تمہارے ساتھ پیش آ چکی ہیں لیکن بعد میں دوسروں کی تصدیق کے باوجود تمہیں یاد نہیں آتیں، ان کے بارے میں کیا کہو گے۔''

''میں اسے غیبی امداد کہوں گا۔ اس کا ذکر مقدس کتابوں میں بھی ہے اور جب اللہ کی مدد شامل حال ہو تو ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔''

''اس معاملے میں' میں کوئی وضاحت نہیں کروں گا بہرحال، دو باتوں کا خیال رکھنا۔ جو خطرات انسان کو درپیش ہوں اس کی حفاظت بھی خداوند کریم کے اختیار میں ہے۔ آنے والے دنوں میں تمہاری کوئی آزمائش بھی ہو سکتی ہے۔ ذہن اور آنکھوں کو کھلا رکھنا۔''

''تم کن باتوں کی نشاندہی کر رہے ہو؟'' لیاقت حسین نے دوبار اس جملے کو دل ہی دل میں دہرایا مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا پھر..... اندر سے سراج کا بلاوہ آ گیا۔ وہ ملازم کے ساتھ اندر چلا گیا۔ سراج کو ایزی چیئر پر بیٹھا دیکھ کر اسے خوشی ہوئی تھی۔

''بیٹھو لیاقت حسین۔'' سراج نے اسے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت مجھے تم سے ایک اہم اور ضروری بات کرنی ہے۔''

''آپ کی کوئی بات یا حکم میرے لیے غیر اہم نہیں ہوتا۔''

''ایس پی صاحب کو اطلاع ملی ہے کہ ہمارے کچھ مشترکہ دشمن تمہیں بھی نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں اس لیے تم بغیر میری اجازت کے کہیں جانے کی غلطی نہ کرنا۔''

''آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے صاحب.....؟'' لیاقت حسین نے دبی زبان میں پوچھا۔

''دشمن کبھی تنہا نہیں ہوتا.....'' سراج نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ''کبھی وہ خود پردے میں رہتا ہے اس کے پروردہ جرائم پیشہ اس کے اشاروں پر عمل کرتے ہیں اس لیے ہر حال میں احتیاط شرط ہے۔''

''میں خیال رکھوں گا.....'' لیاقت نے بات جاری رکھی ہے۔ ''خدا کا شکر ہے کہ اب آپ کی طبیعت بہتر ہے۔''

''ہاں..... کل سے میں ڈیوٹی بھی جوائن کر لوں گا۔''

سراج سے بات کرنے کے بعد لیاقت حسین دوبارہ باہر آ گیا۔ کچھ دیر قبل بھی اسے ذہن اور آنکھ کھلی رکھنے کا

مشورہ ملا تھا لیکن موت اور زندگی کے بارے میں اس کا اعتقاد تھا کہ خدا نے جو وقت تقدیر میں لکھ دیا ہے وہ اٹل ہوتا ہے۔ انسان کی تمام احتیاطی تدابیر دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

لیاقت حسین کمر سیدھی کرنے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ اس کے ذہن میں پھر فرحین کی فون پر فراہم کردہ اطلاع چکرانے لگی، وہ آنکھیں بند کر کے سیٹھ عثمان اور اپنے باپ کے درمیان پیدا ہونے والی گھٹن ختم کرانے کے بارے میں غور کرنے لگا۔ ذہن میں پریشان خیالوں کی یلغار شروع ہوئی تو اس کی آنکھ کچھ دیر کو لگ گئی۔ اس کا بوجھل ذہن نیند کے عالم میں بھی کام کرتا رہا پھر..... وہ ایک آخری نتیجہ اخذ کرنے کے بعد دوبارہ اٹھا..... اس نے طے کر لیا تھا کہ ذاتی طور پر سیٹھ عثمان سے مل کر وہ اپنے باپ کی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کرے گا۔ خواہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں۔

اپنے ارادے پر عمل کرنے کے آخری فیصلے کے بعد اس نے سراج کی طرف سے ملنے والی ہدایت کو بھی یکسر فراموش کر دیا۔ وہ قدم اٹھاتا سراج کی کوٹھی سے باہر نکلا۔ ایک ٹیکسی پکڑ کر سیٹھ عثمان کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ ان سے ملاقات کرنے میں بھی اسے انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔ اسے فوراً اندر طلب کر لیا گیا۔ سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم دونوں لاؤنج میں موجود تھے۔

''کیسے ہو لیاقت حسین!'' راحیلہ بیگم نے بڑے خلوص اور اپنایت سے پوچھا۔

''مالک کا کرم اور آپ لوگوں کی دعاؤں سے خیریت سے ہوں۔''

''اس وقت کیسے آنا ہوا.....؟'' سیٹھ عثمان نے سوال کیا۔ ''سراج کی طرف تو سب خیریت ہے؟''

''سب ٹھیک ہے صاحب..... سراج صاحب کل سے ڈیوٹی پر بھی جائیں گے۔'' لیاقت حسین نے جواب دیا پھر کچھ توقف سے بولا۔ ''صاحب، مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''کیا بات ہے؟''

''صاحب..... وہ..... دراصل میں نے ملازمت کے بعد سے اب تک آپ کو اپنے والد کے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن اب.....'' لیاقت حسین جھجکا تو راحیلہ خاتون نے مسکرا کر کہا۔

''آج تمہیں اس بات کا خیال کس طرح آ گیا؟ صاحب نے تو تم سے کئی بار پوچھا تھا۔''

''اب میں چاہتا ہوں کہ صاحب کا دل والد صاحب کی طرف سے صاف ہو جائے۔'' لیاقت حسین نے کہا پھر نظریں جھکا کر ایک ہی سانس میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو اس کے دل پر ایک بوجھ بنا ہوا تھا۔

''اوہ.....'' سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کو بہت غور سے دیکھا پھر کچھ تامل سے بولے۔ ''مجھے یہ جان کر خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی کہ تم سردار سرفراز خان کے بیٹے ہو۔ اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا تو میں تم کو یقیناً کسی بہتر اور مناسب ملازمت کی آفر کرتا۔ اب بھی وقت نہیں گزرا، میں تمہارے لیے.....''

''آپ نے جو احسان کیے ہیں صاحب، وہی بہت ہیں۔'' لیاقت حسین کی آواز رندھ گئی۔ ''آپ بس اتنا احسان کریں کہ والد صاحب کی جانب سے جو سامان پہنچنے میں دیر ہوئی اسے درگزر کر دیں اور..... ایک درخواست اور بھی کروں گا.....'' لیاقت حسین نے عاجزی کا اظہار کیا۔ ''والد صاحب کو یہ نہ معلوم ہونے دیں کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں..... انہیں میرے بارے میں جان کر زیادہ دکھ ہوگا۔''

''یہ سب کچھ سوچنا اب میرا کام ہے۔'' سیٹھ عثمان نے اٹھ کر لیاقت حسین کے دونوں شانوں پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اس بات کا یقین بھی کر لو کہ اب میرا دل تمہارے والد کی طرف سے شیشے کی طرح صاف ہو گیا ہے۔''

''شکریہ صاحب.....'' لیاقت حسین کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمکنے لگے۔

''ایک بات میری بھی سن لو.....'' راحیلہ بیگم نے شوہر کی دیکھا دیکھی بڑے پیار سے کہا۔ ''ہم سے بھی اب تک اگر کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو اسے.....''

''میں ہاتھ جوڑتا ہے بیگم صاحب..... اس سے آگے کچھ مت کہیے گا۔'' لیاقت حسین نے پھر عاجزی کا اظہار کیا۔

''ایک شرط پر.....'' سیٹھ عثمان نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر کہا۔ ''تمہیں پہلے کی طرح اب بھی ہماری کسی بات ماننے سے انکار نہیں ہوگا۔''

''آپ حکم دیں..... میں انکار کی گستاخی نہیں کروں گا۔''

لیاقت حسین کو خوشی تھی کہ وہ اپنے والد کی پوزیشن صاف کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سیٹھ عثمان نے اس سے ہر بات ماننے کا اقرار کرا لیا تھا لیکن کوئی بات نہیں بتائی تھی۔

راحیلہ بیگم کے بے حد اصرار پر اس روز لیاقت حسین کو سب کے ہمراہ ایک ہی میز پر بیٹھ کر ناشتا کرنا پڑا۔ ناشتے کے دوران وہ زیادہ تر خاموش ہی رہا پھر واپس جانے لگا تو سیٹھ عثمان نے سوال کیا۔

''تم کس گاڑی پر آئے تھے؟''

''میں ٹیکسی پر آیا تھا صاحب.....''

''بہرحال، اب تمہیں میرا ڈرائیور چھوڑ آئے گا۔'' راحیلہ بیگم نے شوہر کا مقصد سمجھ کر کہا تو لیاقت حسین انکار نہ کر سکا۔ خلاف توقع تو وہ اس وقت محتاط نظر آرہا تھا، گفتگو کے دوران بھی اس نے خود کو لیے دیے رکھا تھا۔ سیٹھ عثمان اسے باہر تک رخصت کرنے آئے تھے۔

راستے میں راحیلہ بیگم کے ڈرائیور نے اس کے ساتھ کھل کر گفتگو کرنی چاہی لیکن خلاف توقع لیاقت حسین صرف ہوں، ہاں میں جواب دیتا رہا۔ گاڑی اس وقت بڑے چوک سے گزر کر ایک قدرے ویران راستے کی طرف گھومی تھی جب لیاقت حسین نے راحیلہ بیگم کے ڈرائیور سے دبی زبان میں سوال کیا۔

''تمہارے پاس اسلحہ نام کی کوئی چیز ہے؟''

''نہیں لیاقت بھائی..... ہم ڈرائیوروں کا اسلحہ سے بھلا کیا کام۔''

''اگر کوئی آڑا وقت ناگہانی آجائے تو کیا کرو گے؟''

''اتنا بزدل اور ڈرپوک بھی نہیں ہوں۔'' اس نے لیاقت حسین کو سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''خالی ہاتھ سے بھی کم از کم دو تین کو تو پھڑکا سکتا ہوں لیکن آپ نے اس وقت یہ ذکر کیوں چھیڑ دیا؟''

''برا وقت دعوت نامہ دے کر نہیں آتا۔'' لیاقت حسین بہ دستور سنجیدگی سے بولا پھر عقبی شیشے پر نظر ڈال کر کہا۔ ''ہمارے پیچھے جو سفید کار اور وین آرہی ہیں ان سے محتاط رہنا۔''

''میں سمجھا نہیں.....'' اس نے لیاقت حسین کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

''گاڑی تیزی سے آگے بڑھا کر داہنی جانب بڑی عمارت کے پاس روک لو.....''

راحیلہ بیگم کا ڈرائیور مزید کوئی سوال کرنا چاہتا تھا جب یکے بعد دیگرے دو دھماکے ہوئے پھر اس نے اگر اسٹیئرنگ کنٹرول نہ کیا ہوتا تو وہ یقیناً کسی حادثے کا شکار ہو جاتا، کسی ماہر نشانہ باز نے سائلنسر لگے اسلحہ سے فائر کر کے گاڑی کے پچھلے دونوں ٹائر ناکارہ کر دیے تھے۔ لیاقت حسین پوری طرح محتاط تھا۔ وہ اپنا پستول نکالتا ہوا اپنی سمت کا دروازہ کھول کر بڑی احتیاط سے روڈ پر ایک ہاتھ کے بل گرا پھر خود کو حیرت انگیز طور پر رول کرتا ہوا سڑک کے کنارے نئی تعمیر ہونے والی تجارتی عمارت تک پہنچ گیا۔ پیچھے آنے والی کار اور وین کچھ اور قریب آکر روک دی گئیں۔ کئی گولیاں چلائی گئیں لیکن کار گر نہیں ہوئیں۔

عمارت کے قریب پہنچ کر لیاقت حسین نے ایک چوڑے پلر کی آڑ لے لی، اس نے سڑک کی دوسری جانب دیکھا، راحیلہ بیگم کا ڈرائیور کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

''تم ہماری نظروں میں ہو لیاقت حسین!'' کار کے اندر سے کسی ہینڈ کنٹرول مائیک کے ذریعے کہا گیا۔ ''ہم تمہیں مارنا چاہیں تو ایک دستی بم بھی استعمال کر سکتے ہیں جو تمہارے جسم کو دھجیوں میں تبدیل کر دے گا۔''

لیاقت حسین نے جواب دینے کے بجائے پھرتی سے پستول والا ہاتھ باہر نکال کر یکے بعد دیگر فائر کیے۔ اس کا نشانہ خطا نہیں ہوا۔ کار کے اگلے دونوں ٹائر بھی دھماکوں سے پھٹ گئے۔ وین کار کی پشت پر کھڑی تھی۔ دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں ملا۔ لیاقت حسین محفوظ پوزیشن لیے اس کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا، کار کا انجن شاید بند نہیں کیا گیا تھا۔ لیاقت حسین نے اسے ڈگمگاتے ہوئے قریبی عمارت کی طرف بڑھتے دیکھا۔ شاید اس میں جو مجرم موجود تھے وہ بھی کسی محفوظ پوزیشن کی تلاش میں تھے۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا، عمارت کے قریب جا کر کار روک دی گئی پھر اس کے دونوں دروازے پوری طرح کھول دیے گئے۔ لیاقت کی گرفت پستول پر مضبوط تھی اس کی انگلی ٹریگر پر جمی ہوئی اور نظریں کار پر مرکوز تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ کار کے اندر سے جو لوگ باہر نکل کر پوزیشن لینے کی کوشش کریں گے وہ انہیں ایک ایک کر کے جہنم رسید کر دے گا لیکن پھر جو کچھ ہوا وہ بھی غیر متوقع نہیں تھا۔ کار سے کسی کے باہر نکلنے سے پیشتر ہی وین اس کے سامنے لا کر روک دی گئی۔ لیاقت حسین نے وین پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ وہ بڑی تیزی سے پستول کے میگزین بدل رہا تھا لیکن اس عرصے میں کار والے نیچے اتر کر پوزیشن سنبھال چکے تھے۔ وین شاید بلٹ پروف تھی جو اس کی باڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن لیاقت حسین نے پہلی فرصت میں اس کے دو ٹائر بھی ناکارہ کر دیے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ فائرنگ کی پے در پے آوازوں سے علاقے کا سکون بھی برباد ہو گیا تھا۔ بے شمار لوگ دونوں جانب تجارتی اور رہائشی عمارتوں سے اس ہنگامے کی نوعیت

سمجھنے کی خاطر تاکا جھانکی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

لیاقت حسین نے کار کے سامنے وین آجانے سے پیشتر بڑی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی پوزیشن تبدیل کر لی تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان ہی اطمینان تھا۔ خوف یا پریشانی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ پانچ منٹ خاموشی رہی پھر لیاقت حسین کو دوسری جانب سے للکار کر کہا گیا۔

''تم چاروں طرف سے گھیر لیے گئے ہو لیاقت حسین۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تمہیں دیکھتے ہی گولی ماردی جائے لیکن ہم تمہیں زندہ گرفتار کر کے لے جائیں گے۔''

''اتنا دم خم ہے تو بزدلوں کی طرح آڑ میں کیوں چھپے ہو..... زنخوں کا لبادہ اتار کر مردوں کی طرح سامنے آجاؤ پھر آج یہ فیصلہ بھی ہو جائے گا کہ کون مرد ہے اور کون نامرد.....''

''پہلے تم اس کا ثبوت دو۔ پھر ہم بھی تمہاری بات ماننے سے انکار نہیں کریں گے۔'' دوسری آواز لیاقت حسین کے بائیں جانب والی عمارت سے سنائی دی۔ مطلب صاف ظاہر تھا، انہوں نے اب ایک نہیں کئی موچے بنا رکھے تھے۔ شاید وہ ہر قیمت پر اسے زندہ گرفتار کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ لیاقت حسین کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی پراسرار مسکراہٹ ابھری، وہ پستول نیچے کر کے سامنے آنے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن اسی لمحے ایک نئی صورت حال نے اسے پریشان کر دیا..... وہ راحیلہ بیگم کا ڈرائیور تھا جسے دشمن کے دو آدمی گھسیٹتے ہوئے سامنے لے آئے، ایک نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر جکڑ رکھے تھے، دوسرے کے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر جمی ہوئی تھی۔

''اب کیا ارادہ ہے لیاقت حسین؟'' ریوالور والے نے للکارا۔ ''کیا تم اپنے ساتھی کی لاش دیکھنا پسند کرو گے۔ ہم صرف تین تک گنیں گے پھر اس کا بھیجا کھوپڑی سے نکال کر تمہارے سامنے ڈال دیں گے۔''

لیاقت حسین کے چہرے پر اس وقت بھی ایک پراسرار اور انجانی مسکراہٹ ابھری لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پستول لیے سینہ تانے سامنے آگیا، وہ بالکل نارمل ہی نظر آرہا تھا، اس کے چہرے پر کسی بھی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس کے سامنے آتے ہی تین اطراف سے تین اور نقاب پوش خود کار جدید قسم کی رائفلیں لیے سامنے آگئے۔ ایک نے لیاقت حسین سے دو قدم کے فاصلے پر رک کر اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔

''ہمیں تمہاری مردانگی پسند آئی لیاقت حسین۔ تم نے اپنی زندگی بچانے کی خاطر ہمارے قربانی کے جانور کی زندگی

بٹوارہ

موٹے طور پر دیکھا جائے تو موٹاپا خود ایک موٹی بیماری ہے اور اسے دور کرنے کے لیے روزانہ کم از کم آدھا گھنٹا تیز تیز قدموں سے چہل قدمی کرنا ضروری ہے۔ ویسے یہ کام موٹاپا آنے سے پہلے کرنا چاہیے۔ کیوں کہ بغیر بوجھ کے آدھا گھنٹا چلنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ موٹاپے کے ساتھ آدھا گھنٹا چلنے کے لیے آپ کو پورا ایک گھنٹا درکار ہوگا اور اس پر تیز قدم چلنے سے فربہ اندام کمر کے لچک جانے کا بھی موٹا امکان ہے۔ یوں تو آج کل ایک خاص طبقے میں چہل قدمی کا چلن چلا ہے لیکن اس میں چہل قدمی کم اور 'چہل قدمی' زیادہ ہوتی ہے۔ اور جب دو خواتین مل کر چہل قدمی کرتی ہیں تو وہ چہل قدمی پہلے سہل قدمی..... پھر چغل قدمی بن جاتی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ انسان ہوتے ہوتے موٹا ہوتا تھا۔ لیکن اب..... ہوتے ہی موٹا ہوتا ہے۔ موٹاپے کا بوجھ اب بچوں پر بھی آن پڑنے لگا ہے۔ وہ اپنے 'بچپن کے دشمن' میاں موٹاپے کو پل پل اٹھائے پھرتے ہیں اور ہر پل اسے اتار پھینکنے کے لیے بے چین بھی رہتے ہیں۔ یوں تو موٹاپے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ موٹاپا کچھ بچوں کو وراثت میں بھی ملتا ہے۔ بعض والدین جائداد کا بٹوارہ کرنے سے پہلے بچوں میں موٹاپے کا بٹوارہ کر دیتے ہیں۔ بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ!

نادر خان سرگروہ کی کتاب ''باادب بامحاورہ ہوشیار'' سے اقتباس

بھی داؤ پر لگا دی۔"

"کیا مطلب؟....." لیاقت حسین کے اعصاب کشیدہ ہونے لگے۔ "کیا تم اپنا وعدہ پورا نہیں کرو گے؟"

"محبت اور جنگ کے کھیل میں سب کچھ جائز ہوتا ہے جان من....." اسے مخاطب کرنے والا مسکرایا۔ "ہم اتنے نادان بھی نہیں ہیں کہ تمہارے ساتھی کو چھوڑ کر اپنے خلاف کوئی مصیبت کھڑی کر لیں۔"

"لیاقت بھائی....." راحیلہ بیگم کے ڈرائیور نے مردہ سی آواز میں کہا۔ "مجھے مر جانے دیا ہوتا..... تم نکل جاتے۔"

"فکر مت کرو میرے دوست..... لیاقت اگر زندہ واپس لوٹا تو تم بھی اس کے ساتھ ہو گے ورنہ جو اوپر والے کو منظور ہو۔"

"ہم تمہیں سیاست دانوں کی تقریر کرنے کا موقع بھی دیں گے لیکن کسی بند کمرے کے اجلاس میں۔" دوسرے رائفل والے نے لیاقت حسین کی پشت پر رائفل کی نالی اس کی پسلیوں پر اڑاتے ہوئے کہا۔ "فی الحال اچھے بچوں کی طرح خاموشی سے ہمارے ساتھ چل کر وین میں بیٹھ جاؤ۔ اسی میں تمہاری زندگی کی ضمانت بھی ہے۔"

لیاقت حسین نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر اس نے آہستہ آہستہ قدم اٹھانے شروع کر دیے۔ وین کے دونوں ناکارہ وہیل تبدیل کیے جا رہے تھے۔ راحیلہ بیگم کا ڈرائیور بڑی اذیت میں نظر آ رہا تھا۔ لیاقت حسین کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ سڑک پر دونوں جانب اب دور دور کچھ تماش بین بھی جمع ہو گئے تھے۔ لیاقت حسین کا پستول ہاتھ سے جھپٹ لیے جانے کے بعد دو اور نقاب پوش بھی سامنے آ گئے، بہ ظاہر ان کی کل تعداد سات نظر آ رہی تھی۔ ممکن ہے کچھ ادھر ادھر روپوش بھی ہوں۔ البتہ وین اور کار کے ڈرائیور دور کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔

"اتنی جلدی تمہاری نانی مر گئی کیا جو ٹھمک ٹھمک کر چل رہے ہو۔" پشت پر موجود رائفل بردار نے لیاقت حسین کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو تم مردوں والی بات کر رہے تھے، اب حاملہ عورتوں کی رفتار سے قدم اٹھا رہے ہو۔"

لیاقت حسین کے بڑھتے ہوئے قدم ایک دم تھم گئے پھر یوں لگا جیسے اچانک بجلی سی کوند گئی ہو، لیاقت حسین نے قدم جما کر فضا میں سمر سالٹ کیا اور برق رفتاری سے پیچھے والے کی رائفل اس کے ہاتھ سے چھین کر اس کی پشت پر چلا گیا۔ یہ سارا کارنامہ اس نے فضا میں اچھلنے کے بعد ہی انجام دیا تھا جس کی توقع باقی چار رائفل برداروں کو بھی نہیں تھی۔

مارشل آرٹ کا ایسا ناقابل یقین مظاہرہ انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، پھر اس سے پیشتر کہ وہ سچویشن کو سمجھتے یا اور کوئی جوابی کارروائی کرتے، پانچ میں سے چار موت کی نیند سو گئے۔ سرسراتی ہوئی گولیوں نے ان کے جسم کو چھلنی کر دیا تھا پھر لیاقت حسین کی گرجدار آواز ابھری جو ایک ہاتھ سے رائفل کو پوری قوت سے تھامے ہوئے تھے، دوسرے ہاتھ کے حلقے میں اس نے پانچویں نقاب پوش کی گردن کو اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔

"اپنا اسلحہ زمین پر پھینک کر مردہ جانوروں کی طرح زمین پر لیٹ جاؤ ورنہ تمہارا انجام بھی خطرناک ہی ہوگا۔" لیاقت حسین نے ریوالور والوں سے کہا۔

"ہم تمہارے ساتھی کو گولی مار..... رر..... رر..... دے....." راحیلہ بیگم کے ڈرائیور کو کور کیے ہوئے نقاب پوش نے بازی پلٹنی چاہی لیکن لیاقت حسین کی رائفل سے دو فائر اور ہوئے اور ان دونوں کی پیشانی سے بھی خون کا فوارہ ابل پڑا۔ جملہ پورا کیے بغیر ہی وہ کسی درخت سے کٹی ہوئی شاخ کی طرح سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔ صورت حال کی نزاکت دیکھ کر وین کے سامنے موجود دونوں ڈرائیور اوندھے منہ سڑک پر لیٹ گئے، زندگی بچانے کا وہی سب سے محفوظ طریقہ بھی تھا۔

فضا میں موت کی چیخوں کے ساتھ بارود کی بو پھیلی تو ہر طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ جس شخص کو لیاقت حسین نے الٹے ہاتھ کے حلقے میں جکڑ رکھا تھا وہ بھی گڑگڑانے لگا۔

"مجھ..... مجھے نہ مارنا، مم..... مم..... میں تمہیں سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا۔"

جواب میں لیاقت حسین نے اسے جھٹک کر سڑک پر گرایا پھر اس کی سیدھی ٹانگ فضا میں لہرائی تو سڑک پر گرنے والے کے سامنے کے تین دانت بھی پلک جھپکتے میں غائب ہو گئے۔ اس کے منہ سے خون بھل بھل ابلنے لگا۔ کرب میں ڈوبی چیخ کی آوازیں بھی بلند ہونے لگیں۔

"لل..... لل..... لیاقت بھائی۔" راحیلہ بیگم کے ڈرائیور نے تیزی سے لیاقت حسین کے قریب آتے ہوئے پھولی پھولی سانسوں کے درمیان کہا۔ "اب یہاں سے جتنی جلدی ممکن ہو نکل چلو..... پولیس آ گئی تو تھانے کچہری کے چکر بھی شروع ہو جائیں گے۔"

"تم صاحب کی گاڑی یہیں چھوڑ کر واپس نکل جاؤ۔" لیاقت حسین نے ٹھوس اور سرد آواز میں کہا۔ "اپنی زبان نہ کھولنا ورنہ تم بھی پولیس اور عدالت کے رگڑے میں آ جاؤ گے..... جیسا تمہارے صاحب کہیں ویسا ہی کرنا۔"

"اور آپ....."

"وقت مت برباد کرو..... جاؤ۔" لیاقت حسین نے دوسری بار بھی تحکمانہ انداز اختیار کیا تو سہما ہوا ڈرائیور دزدیدہ نظروں سے سڑک پر بکھری ہوئی لاشوں پر نظر ڈالتا ہوا واپسی کے لیے تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

لیاقت حسین نے ایک طویل سانس لی پھر وہ جیب سے موبائل نکال کر سراج کے بجائے ایس پی اورنگ زیب کے نمبر ملانے لگا۔

افضل خان اس وقت ہوٹل کے کمرے کو اندر سے لاک کیے بیٹھا تھا جب شبنم کی کال موصول ہوئی۔ نئے نمبر دیکھ کر وہ جھجکا۔ کال ریسیو کرنے کے بعد وہ چونکا بھی تھا، شبنم نے اس کے دریافت کرنے پر ہی بتایا تھا کہ اسے اغوا کرنے والوں نے پرانی سم اپنے قبضے میں لے کر اسے نئی سم دے دی ہے۔ یہ بات افضل خان کو ہضم نہیں ہو سکی۔ وہ شبنم کو کرید کر اصل صورت حال معلوم کرنا چاہ رہا تھا جب دو آدمیوں نے اچانک اسے پیچھے سے دبوچ کر موبائل اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا تھا پھر ان میں سے ایک نے بات کرنے کی کوشش کی..... لیکن دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ اس نے دوبارہ آنے والے نمبروں کو ملا کر بات کرنے کی کوشش کی۔ یہ بھی وارننگ دی تھی کہ اگر زبان نہ کھولی تو وہ افضل خان کو دوسری دنیا میں پہنچا دیں گے۔ اس موقعے پر افضل خان نے جان پر کھیل کر بلند آواز میں شبنم کو زبان کھولنے سے منع کیا تھا۔ وہ جن حالات سے دوچار تھا ان میں اسے زندگی کی امید بھی بہت کم تھی۔ جن لوگوں نے اسلحے کے زور پر شبنم کو اغوا کیا تھا وہ اسے بھی ٹھکانے لگانے کی کوشش کر سکتے تھے۔ پہلے ایسا کیوں نہیں کیا گیا؟ اسے اس بات پر بھی حیرت رہی تھی۔ بگ باس نے فوری طور پر اپارٹمنٹ سے چلے جانے کا حکم کیوں دیا تھا؟ یہ بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ اس وقت بھی دو آدمیوں کا دروازہ کھول کر اچانک اندر آ جانا اس کے لیے حیرت انگیز ہی تھا۔ شاید ان کے پاس ماسٹر کی یا پھر ڈپلی کیٹ موجود ہو۔ وہ بہرحال شبنم کو زبان بند رکھنے کی ہدایت کر چکا تھا اس لیے کہ شبنم ہی نے اسے خودکشی سے روک کر ایک بار پھر قسمت آزمانے کا موقع فراہم کیا تھا۔

اچانک اندر آنے والے گٹھے ہوئے اور ٹھوس جسموں کے مالک تھے، ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کسی قسم کے بھی مقابلے سے فوری نمٹنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ افضل خان ان دونوں کو نگاہوں میں تول رہا تھا، جب قدرے دراز قد والے نے اسے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں مخاطب کیا۔

"تم اس وقت کس لڑکی سے بات کر رہے تھے.....؟"

"سوری....." افضل خان نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "میں اس سلسلے میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا۔"

"کیا یہ آخری فیصلہ ہے.....؟"

"ہاں..... کم از کم اس وقت تک جب تک تم اپنا تعارف نہیں کراؤ گے۔"

"تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟"

"تمہیں میری نگرانی پر تعینات کیا گیا ہے۔ کس نے کیا ہے؟ یہ تم بتاؤ گے۔" افضل خان نے شانے اچکا کر خود کو بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"ہم تمہاری زبان بھی کھلوا سکتے ہیں۔" دوسرے نے کرخت لہجے میں کہا۔

"یہ تمہارے اختیارات کی بات ہے۔"

"تمہیں اپارٹمنٹ سے ہوٹل شفٹ ہونے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟" پہلے نے سوال کیا۔

"جب تمہیں میری نقل و حرکت پر مامور کیا گیا ہے تو اس کا جواب بھی تمہیں معلوم ہوگا۔"

"ہمارے ذہن میں صرف ایک نام محفوظ ہے..... شیخ حامد۔" اس نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ "اب تمہارا کیا جواب ہوگا۔"

"یہ بات بیشتر لوگوں کے علم میں ہے کہ میں شیخ حامد ہی کے دفتر سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"ہوں نہیں..... تھا، کہو۔" دوسرے کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔

"جب تمہیں تفصیل معلوم ہے تو پھر وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔" افضل خان نے بہ دستور محتاط انداز میں جواب دیا۔

"کیا تمہیں علم ہے کہ تمہاری ساتھی لڑکی کو کن لوگوں نے اور کس مقصد سے اغوا کیا ہے؟"

"اس کا علم بھی تم دونوں کو بہتر ہوگا۔"

افضل خان کا جواب سن کر دوسرا آدمی آگے بڑھا تھا لیکن اس کے ساتھی نے اسے روک دیا۔ "اتنی جلد بازی نہ کرو..... میں اوپر سے معلوم کرتا ہوں کہ اس کی زبان کھلوانے کی خاطر کون سا نسخہ زیادہ کارآمد ہوگا۔" پھر اس نے موبائل نکال کر کسی کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے رابطہ

قائم ہونے کے بعد اس نے افضل خان کو حقارت سے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔ ''یہ شخص ہمارے سوالات کے شرافت سے جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہے۔ کیا سلوک کیا جائے.....؟ ہم نے کوشش کی تھی لیکن اس نے بلند آواز میں لڑکی کو زبان بند رکھنے کی تاکید کر دی تھی..... بہ ظاہر ایسا ہی معلوم ہو رہا ہے لیکن یقین سے نہیں کہا جا سکتا..... ٹھیک ہے، ہم اس کو تنبیہہ کر دیتے ہیں لیکن اس نے عمل نہ کیا تو؟..... اوکے۔'' فون کرنے والے نے موبائل آف کر کے افضل خان کو سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ ''فی الحال تمہاری جان بچ گئی ہے لیکن ہم بہت زیادہ ڈھیل دینے کے اصول کے بھی خلاف ہیں..... تمہیں ہمارے سلسلے میں اپنی زبان بند رکھنی ہوگی..... اوپر سے فوری طور پر یہی حکم ملا ہے۔''

''زبان بند رکھنے سے تمہاری کیا مراد ہے.....؟'' افضل خان نے ہونٹ کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

''ہم اس وقت جا رہے ہیں لیکن۔ تم سے بہت زیادہ دور بھی نہیں رہیں گے، ہمارے جانے کے بعد اگر کوئی اور آئے تو تم اس سے ہمارے بارے میں کچھ نہیں کہو گے۔''

''تم شاید میرے ساتھ چوہے اور بلی والا کھیل کھیل رہے ہو؟'' افضل خان مسکرایا۔ ''جب میں تمہارے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں تو.....''

''بکواس مت کرو.....'' دوسرے کے تیور پھر خراب ہونے لگے۔ ''جتنا کہا جا رہا ہے صرف اسی کو کان کھول کر سن لو۔''

اس بار افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں اسے کچھ دیر گھورنے کے بعد واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد افضل خان نے دوبارہ کمرے کو اندر سے لاک کیا۔ اس کا ذہن ان دونوں کے بارے میں کوئی آخری نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب اس کو موبائل پر سگنل ملا، کمرے سے جاتے وقت اس کا موبائل اسے واپس کر دیا گیا تھا جس پر اسے حیرت بھی ہوئی تھی۔ سگنل ملنے کے بعد اس نے موبائل پر روشن نمبروں کو غور سے دیکھا، وہ اس کے جانے پہچانے نہیں تھے۔ ''شاید اب اسے دوسری طرح آزمانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔'' یہ سوچ کر اس نے لائن کاٹ دی لیکن ایک منٹ بعد ہی دوبارہ کال کی گئی، اس بار بھی وہی نمبر اسکرین پر نظر آ رہے تھے۔ افضل خان نے کچھ لمحے سوچ کر موبائل آن کر کے کانوں سے لگا لیا۔

''ہیلو.....'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تم نے پہلی کال کیوں کاٹ دی تھی؟ کیا اس وقت بھی کوئی کمرے میں موجود تھا؟''

''تم کون بول رہے ہو.....؟'' اس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہارے لیے ڈبل بی کا ریفرنس ہی کافی ہوگا.....'' دوسری جانب سے مختصراً کہا گیا۔ ''میں اسی کا نمائندہ بول رہا ہوں۔''

''کیا جاننا چاہتے ہو.....؟''

''کچھ دیر قبل تمہارے کمرے میں جو دو آدمی آئے تھے وہ کون تھے.....؟''

''تمہاری طرح میں ان سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہوں..... ممکن ہے انہیں بھی میری نگرانی پر تعینات کیا گیا ہو۔'' افضل خان نے گول مول جواب دیا۔

''چند مخصوص حالات میں مجھے بلیک ٹائیگر کا حوالہ استعمال کرنے کی بھی اجازت ہے..... اب کیا کہو گے؟''

افضل خان، بلیک ٹائیگر کے حوالے پر چونکا۔ اس نے یکلخت سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''اب میں تم سے کھل کر بات کر سکتا ہوں۔ وہ دونوں کون تھے؟ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایجنسی کے سادہ لباس والے ہوں۔''

''ہمارے دشمنوں کی بھی کوئی چال ہو سکتی ہے..... تمہاری ان سے کیا بات ہوئی تھی؟''

''وہ شبنم کے بارے میں میری زبان کھلوانا چاہتے تھے لیکن میں نے زبان نہیں کھولی۔ وہ دوبارہ آنے کو کہہ گئے ہیں۔'' افضل خان نے دیدہ و دانستہ شبنم کی طرف سے کی جانی والی کال کا تذکرہ کیے بغیر تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''سرغنہ کی ہدایت کی روشنی میں وہ میرا موبائل واپس کر چلے گئے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ تاکید کی ہے کہ میں ان تذکرہ بھی کسی اور سے نہ کروں۔''

''اوہ..... ایسی صورت میں تم میری کال ختم ہوتے اس کال کے تمام کوائف ڈیلیٹ کر دینا.....'' سنجیدگی سے گیا۔ ''ان کو فی الحال ٹالنے کی کوشش کرو، میں ایک دو روز میں ان کا کھوج بھی نکال لوں گا۔''

پھر اس سے پیشتر کہ افضل خان کوئی اور بات کرتا کال منقطع کر دی گئی، اس نے ہدایت کے عین مطابق پہلی فرصت میں اس کال کے تمام کوائف ڈیلیٹ کرنے میں بھی خاصی عجلت کا مظاہرہ کیا تھا۔

اس پر اسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

قرضِ حسنہ

ایم اے راحت

بعض لوگ اپنی زندگی ایسے گزارتے ہیں
جیسے کسی کا قرض چکا رہے ہوں اور
کچھ اپنے اندر اتنی گھٹن رکھتے ہیں جیسے
گروی رکھ دیے گئے ہوں... صورتِ حال
کچھ بھی ہو لیکن زندگی نہ تو قرض
ہوتی ہے اور نہ ہی گروی رکھنے کی کوئی
چیز... بس یہی ایک بات تمام
عمر اس کی سمجھ میں نہ آسکی شاید اسی وجہ سے وہ زندگی کی ایک بڑی حقیقت کو محض ایک خوابِ گراں سمجھنے پر بضد رہا مگر ایام کی تلخی اسے برابر احساس دلاتی رہی کہ ''اے نادان! انسان تو محض مٹی کو پتلا ہے... بن کر بکھرنا... بکھر کر بن جانا... یہی اس کی فطرت میں شامل ہے۔''

زرخیز زمین کے ہاتھوں تباہ ہونے والے ایک بے وقوف انسان کا احوال

سفر کے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ تاحد نگاہ ریت کے اونچے نیچے ٹیلے ویران اور تپتا ہوا صحرا نظر آ رہا تھا۔ میری زبان پیاس سے خشک ہو رہی تھی لیکن مجھے سفر کرنا تھا، منزل مقصود پر پہنچنا تھا۔ پھر بہت دور چیلیں اڑتی نظر آئیں اور میری رفتار تیز ہوگئی۔ میں نے صحرا عبور کیا اور اس نخلستان میں پہنچ گیا۔

ناریل اور کھجور کے درختوں کی بہتات تھی اور ان کے درمیان بہت سے لوگ نظر آ رہے تھے۔ غالباً گھوڑوں کی خرید و فروخت کا کاروبار ہو رہا تھا۔ میری باچھیں خوشی سے کھل گئیں پھر واپس اپنی جگہ آ گئیں کیونکہ گھوڑا خریدنے کے



لیے میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ ایک ایجنٹ جو ایک پُراسرار مشن پر نکلا ہو، پیسے کہاں سے لاتا؟ اس کے پاس تو پستول، مشین گن اور ہینڈ گرنیڈ وغیرہ ہوتے ہیں جو میرے پاس بھی تھے مگر پیسے نہیں تھے۔ کاش! میں سیکریٹ ایجنٹ کے بجائے کمیشن ایجنٹ ہوتا، اس ویرانے... سفر کے لیے ایک گھوڑا تو خرید لیتا۔

گھوڑوں کی منڈی میں شاندار گھوڑے اچھل کود کر رہے تھے۔ میں نے مشکی رنگ کے ایک گھوڑے کو دیکھا، کیا اعلیٰ چیز تھی۔ ایک آدمی اس کی لگام پکڑے ہوئے تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔

''کتنے کا ہے.....؟'' میں نے سوال کیا اور وہ ہنس پڑا۔

''خریدو گے اسے.....؟''

''ہاں..... میرے حلق سے بھنچی بھنچی آواز نکلی۔

''اپنی نسل، اپنے خاندان کے بارے میں بتاؤ۔ یہ اعلیٰ نسل کا گھوڑا ہے۔ اعلیٰ نسل کے لوگ اسے خرید سکتے ہیں۔''

''تو کیا میں شکل سے نائی نظر آرہا ہوں؟''

''ان کی شان یہ ہے۔ اعلیٰ نسل کے لوگوں کو سواری دیتا ہے۔ اگر تم اس پر شان سے سواری کر سکے تو میں تمہیں یہ گھوڑا مفت دے دوں گا۔''

''زبان کی پابندی کرو گے؟''

''دوسری بار یہ بات کہی تو گولی مار دوں گا۔'' اس نے غرا کر کہا۔

میں نے گھوڑے کی طرف دیکھا، اس کے تیور بہت خراب تھے، آنکھیں سرخ تھیں۔ میں نے گدھے کا چیلنج قبول کر لیا اور اس نے گھوڑے کی راسیں مجھے تھما دیں۔ گھوڑا چوکنا ہو گیا اور میرے اوسان خطا ہونے لگے، میں نے آہستہ سے کہا۔

''اے معزز نسل کے گھوڑے! اگر واقعی تیری نسل اچھی ہے تو اس وقت میری عزت رکھ لے۔ بڑے لوگ..... میرا مطلب ہے بڑے گھوڑے ہمیشہ بلند ظرف ہوتے ہیں۔ میں تھک کر چور ہو گیا ہوں، پولیس میرے پیچھے ہے۔ اس وقت مجھے تیری ضرورت ہے۔''

گھوڑا مسکرایا اور اس نے مجھے آنکھ ماردی۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ پھر اس نے مجھے آسانی سے اپنی پشت پر سواری دے دی اور گدھے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ گھوڑا میری ملکیت بن گیا تھا۔ اس وقت پولیس کی گاڑی کا سائرن سنائی دیا اور میری خوفزدہ نظریں اس طرف اٹھ گئیں جدھر سے آواز آرہی تھی۔ وہی پولیس افسر وائرلیس پر کسی کو ہدایات دے رہا تھا جو اس صحرا میں پیچھا کر رہا تھا میر اس کی شاندار گاڑی قریب ہی کھڑی ہوئی تھی۔

میں نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور ہوا ہو گیا۔ پولیس افسر اپنے ساتھیوں کو ہدایات ہی دیتا رہ گیا تھا۔ گھوڑا پورے طرح پر میرا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ مجھے دشمنوں کے نرغے سے دور نکال لے گیا۔ ریگستان اور پہاڑی سلسلے تا حد نگاہ پھیلے ہوئے تھے۔ پھر میں ایک راستے سے گزر رہا تھا کہ اچانک فائرنگ شروع ہو گئی۔

گولیاں اس قدر قریب سے چلائی گئی تھیں کہ میں ان کی زد سے نہ بچ سکا لیکن یہاں بھی گھوڑے نے اپنے اعلیٰ نسل ہونے کا ثبوت دیا۔ فائرنگ کی آواز پر وہ بھڑکا اور پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا لیکن آہ..... رائفل سے نکلی ہوئیں تمام گولیاں اس کے پیٹ میں اتر گئیں اور وہ منہ کے بل نیچے آرہا۔ مجھ پر حملہ کرنے والے نے مجھے موقع دیے بغیر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے رائفل کو وحشیانہ انداز میں گھمایا۔ اگر میں نے پھرتی کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا تو رائفل کا بٹ میری کھوپڑی کے لاتعداد ٹکڑے کر دیتا۔ رائفل کے زور کی جھونک میں وہ جیسے ہی جھکا، میں نے اس کا وار خالی دے کر اس کی رائفل پر ہاتھ ڈال دیا اور ایک جھٹکے سے اسے چھین لیا۔ وہ ایک قدآور اور تنومند آدمی تھا۔ رائفل ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر اس نے پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لمبا چاقو نکال لیا۔ اس وقت صورتِ حال ایسی نہیں تھی کہ میں رائفل سیدھی کر کے اس پر فائر کر سکتا۔

چنانچہ چاقو سنبھال کر جیسے ہی وہ مجھ پر حملہ آور ہوا میں نے رائفل اس کے بازو پر ماری اور اس کا چاقو والا ہاتھ پکڑ کر پوری قوت سے اپنا گھٹنا اس کے پیٹ پر مارا۔ اس کے حلق سے ایک تیز آواز نکل گئی۔ اگر میں اس سے بھڑنے کی کوشش کرتا تو یقیناً مجھے نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس نے سنبھال کر اپنی داہنی ٹانگ لہرائی اور مجھ پر وار کیا لیکن میں نے پھرتی سے اس حملے کو بھی ناکام بنا دیا۔ آخر میں سیکریٹ ایجنٹ تھا۔ کوئی کمیشن ایجنٹ نہیں تھا۔

وہ زمین پر گرا لیکن پھر انتہائی پھرتی سے اٹھ کر سیدھا ہو گیا۔ میرے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پوری قوت سے اس کی ناک پر پڑی تو اس کی ناک کا بانسا ٹوٹ گیا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے پوری قوت سے ایک مکا اس کے جبڑے پر رسید کر دیا اور اب اس کی پھرتی ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ زمین پر گرا، میرے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں اسے موت کے گھاٹ اتار دوں، لہٰذا

میں نے اس کی گردن کے اوپر پاؤں رکھ کر زور سے پاؤں کو موڑا اور اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کا قوی ہیکل بدن دو تین بار فضا میں اچھلا اور اس کے بعد وہ سرد ہو گیا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ خطرہ صرف اس پولیس آفیسر سے تھا جو کم بخت مسلسل اپنی شاندار لینڈ کروزر میں میرا تعاقب کر رہا تھا۔ گھوڑا بے چارہ اپنی اعلیٰ نسلی ثبوت دے کر اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ چنانچہ ایک بار پھر میرے لیے وہی صحرا تھا، وہی ریگستان اور پہاڑ تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔

پھر نہ جانے کس خیال کے تحت میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ یہ شخص بھی تو پیدل یہاں تک نہیں پہنچا ہو گا۔

ممکن ہے اس کے پاس کوئی سواری وغیرہ ہو۔ جس پہاڑی ٹیلے کے عقب سے اس نے فائرنگ کی تھی، میں وہاں پہنچا تو میری آنکھیں فرطِ مسرت سے پھیل گئیں۔ ایک شاندار موٹر سائیکل وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ میرے بدن میں ایک بار پھر زندگی دوڑ گئی تھی۔ موٹر سائیکل کا فیول دیکھا تو اس کی ٹنکی بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ موٹر سائیکل ٹائروں والی تھی اور خاص طور سے ریگستانوں میں دوڑانے کے لیے بنائی گئی تھی۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہوئی کہ تھوڑا ہی سفر طے کرنے کے بعد مجھے ایک چوڑی سڑک ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی نظر آئی اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ سڑک مجھے کسی آبادی تک بہ آسانی پہنچا دے گی۔

میں نے موٹر سائیکل تیز رفتاری سے دوڑا کر سڑک پر ڈال دی اور اب میں کسی قدر پُرسکون ہو گیا تھا۔ لیکن صاحب ایک سیکریٹ ایجنٹ کو سکون کہاں۔ زیادہ دور نہیں چلا تھا کہ اس بدبخت پولیس آفیسر کی کار کا سائرن سنائی دیا اور میرے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ آدمی تھا یا جن! سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہر جگہ، کہاں سے کہاں پہنچ جاتا تھا۔

میں نے ایکسیلیٹر گھمایا اور موٹر سائیکل کو اسپیڈ دے دی۔ موٹر سائیکل کی رفتار بڑھ گئی لیکن اس کی رفتار بڑھتے ہی پولیس آفیسر نے بھی اپنی کار کی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ اعلیٰ درجے کی پولیس لینڈ کروزر تھی۔ چنانچہ آگے بڑھتی چلی آرہی تھی اور فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل کو لہرانا شروع کر دیا۔ اس پولیس آفیسر سے چھٹکارا پانا بے حد ضروری تھا۔ اگر اس کے ہاتھ لگ گیا تو پھر زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کوئی ایسی ترکیب جس سے اس منحوس شخص سے نجات حاصل کی جا سکے۔ میں نے ایک دستی بم نکالا اور..... اس کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اسے پیچھے اچھال دیا۔ میرے کان دھماکا سننے کے منتظر تھے لیکن دھماکا نہ ہوا۔ یہ کیا ہوا، شاید بم پھٹا نہیں تھا..... مگر اس کی وجہ؟

میری سمجھ میں کوئی وجہ نہیں آئی تھی۔ اب تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس پولیس آفیسر کی قسمت اچھی ہے۔ دیکھنا یہ تھا کہ اس زندگی اور موت کی بھاگ دوڑ میں کس کی تقدیر ساتھ دیتی ہے۔

پہاڑی راستے پر پھیلی ہوئی اس سڑک پر بے شمار پیچ و خم تھے۔ مجھے نہایت ہوشیاری سے موٹر سائیکل دوڑانی پڑ رہی تھی۔ ذرا سی غلطی جنت رسید کر سکتی تھی۔

دفعتاً اس شیطان نے فائرنگ شروع کر دی اور میرا خون خشک ہو گیا۔ فائرنگ مشین گن سے کی جا رہی تھی اور گولیاں میرے قرب و جوار سے سائیں سائیں کرتی نکل رہی تھیں۔ خوش قسمتی سے سڑک ڈھلان میں چلی گئی اور میں قدرتی طور پر ان گولیوں سے بچ گیا لیکن اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ لینڈ کروزر اسی رفتار سے چلی جا رہی تھی اور بس یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اب مجھ تک پہنچی۔ میں بار بار گردن گھما کر اسے دیکھ رہا تھا اور پھر ایک انتہائی خوفناک لمحہ آ گیا۔ سڑک ایک پہاڑی موڑ سے اچانک گھوم گئی تھی اور چونکہ میں اس وقت پیچھے دیکھ رہا تھا۔ اس لیے کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اچانک میں فضا میں پرواز کر گیا ہوں۔ موٹر سائیکل میرے نیچے سے نکل گئی۔

اور اس کے بعد..... اس کے بعد..... جو کچھ ہوا تھا، ناقابلِ یقین تھا۔ سڑک تو داہنی سمت گھوم گئی تھی اور بائیں سمت انتہائی گہرا کھڈ تھا۔ میں نے وحشت زدہ نگاہوں سے دیکھا کہ میری موٹر سائیکل نیچے اور نیچے چلی جا رہی ہے اور میں خلا کی بلندیوں سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ پھر دوسرا واقعہ ہوا۔ مستقل مزاج پولیس افسر بھی میری سیدھ میں ہی آرہا تھا۔ اس نے بھی موڑ نہیں کاٹا تھا اور اس کی لینڈ کروزر بھی موٹر سائیکل کے تعاقب میں چل پڑی۔ فضا میں اس کی چیخ لہراتی سنائی دی تھی اور پھر انتہائی گہرائیوں میں ایک دھماکا اور شعلوں کا طوفان.....

مگر میں کہاں ہوں؟

آہ! کیا شاندار سچویشن تھی۔ پہاڑی حصے میں ایک درخت لگا تھا اور میں اس درخت پر لٹکا ہوا تھا۔ اس درخت نے میری جان بچالی تھی۔ اس کی ایک نوکیلی شاخ میری قمیص پھاڑتی ہوئی اندر گھس گئی تھی اور میں قمیص کے بل پر جھول رہا تھا..... آہ..... یہ درخت، واہ..... یہ قمیص..... کیا مضبوط کپڑا ہے۔ میں نے شاید یہ قمیص لنڈا بازار سے خریدی تھی،

اتنی مضبوط اور کارآمد نکلے گی مجھے گمان بھی نہ تھا۔

بہرحال پولیس افسر سے جان بچ گئی مگر آہ..... میں اب کیا کروں؟ میں نے خود کو سنبھالا اور اوپر دیکھا تو جان میں جان آئی۔ درخت کی شاخیں اوپر تک جاتی تھیں اور میں تھوڑی سی محنت کر کے اس سڑک پر پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ میں کوشش کرنے لگا۔ میں نے شاخ کی مضبوطی کا اندازہ لگایا۔ آہستہ آہستہ کھسک کر کنارے پر آیا اور پھر الٹا لٹک کر خود کو اس شاخ سے باہر نکالا۔ پھر آہستہ آہستہ اوپر کی طرف کھسکنے لگا۔ کافی محنت کے بعد میں اوپر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ میرا بدن پسینے سے شرابور تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

بہرحال زندگی بچ گئی تھی۔ یہی کافی تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر وہاں سے آگے کا سفر شروع کر دیا۔ یہ سڑک بھی مجھے کسی صحیح جگہ پہنچا سکتی تھی۔ چنانچہ میں سڑک پر سیدھا بڑھنے لگا۔ زیادہ دور نہیں نکلا تھا کہ میرے کانوں میں ایک آواز آئی اور میرے قدم ٹھٹک گئے۔

میری ہراساں نگاہوں نے فضا کا ایک جائزہ لیا اور بہت دور..... مجھے ایک سیاہ نقطہ فضا میں تیرتا نظر آیا..... آہ..... یہ ہیلی کاپٹر تھا۔ سو فیصدی ہیلی کاپٹر تھا۔ یقیناً اس پولیس آفیسر نے تعاقب کرتے ہوئے وائرلیس پر میرے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔ اب میری تلاش اعلیٰ پیمانے پر شروع ہوگئی تھی..... اب میں کیا کروں؟ سڑک پر چلتا رہوں یا نشیب کے راستے اختیار کروں۔

ہیلی کاپٹر تیز رفتاری سے قریب آرہا تھا، پھر اس نے ایک لمبا چکر لگایا اور میرے سر پر سے گزرتا چلا گیا..... پتا نہیں پائلٹ نے مجھے دیکھا تھا یا نہیں۔ میں سر دنگا ہوں سے اسے دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ مجھے سخت تعجب تھا کہ اس نے مجھ پر فائرنگ کیوں نہ کی..... اس جگہ تو مجھے آسانی سے مارا جاسکتا تھا۔

ہیلی کاپٹر دور نکل گیا اور میری نگاہیں اس کا تعاقب کرتی رہیں تب دفعتاً میں نے ہیلی کاپٹر سے ایک ہواباز کو نیچے کودتے دیکھا۔ وہ پیراشوٹ باندھے ہوئے تھا اور آہستہ آہستہ زمین کی طرف آرہا تھا۔

"گویا دوبدو مقابلہ..... لیکن کیوں.....؟" وہ تو میری زندگی کے گاہک تھے۔ وہ تو مجھے ہلاک کر دینا چاہتے تھے۔ میں ایک جگہ رک کر ہواباز کو دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ پیراشوٹ زمین کی طرف پہنچ گیا اور ہواباز نے نیچے آکر اپنا ہوابازی کا لباس اتار دیا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ہوابازی کے سوٹ کے نیچے سے ایک زنانہ لباس برآمد ہوا تھا۔ پھر اس کے گیسو ہوا میں لہرائے۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ رنگ کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ چہرہ بے حد خوب صورت تھا۔ قد لمبا اور بدن سڈول تھا۔ وہ گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھ ہی رہی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی نئی چال ہے مگر یہ لڑکی..... وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ پھر میں نے اسے ایک جھیل کے کنارے رکتے ہوئے دیکھا۔ جھیل کے پاس درخت لگے ہوئے تھے جن پر پرندے شام کا گیت گا رہے تھے۔ وہ جھیل کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ میں آہستہ آہستہ فاصلہ کم کرتا جا رہا تھا کہ ایک بار پھر مجھے ٹھٹکنا پڑا۔ دفعتاً ہی فضا میں ایک دلکش نغمہ گونج اٹھا۔

"آجا رے میں تو کب سے کھڑی اس پار..... آجا رے پردیسی" میری آنکھیں شدت حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ یہ آواز اس کے منہ سے نکل رہی تھی۔ کوئی گہری چال، کوئی خوفناک سازش! لیکن نغمے کی کشش مجھے اس کے پاس لیے جا رہی تھی۔ میں اس کے سامنے پہنچا تو وہ گاتے گاتے رک گئی۔ اس نے آنکھوں سے چشمہ اتارا اور جذباتی لہجے میں بولی۔

"تم آگئے میرے محبوب۔" اس کی آواز بہت شیریں تھی۔

"کیا تم لتا منگیشکر ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں تمن جہانگیر!"

"بکواس کر رہی ہو۔ یہ آواز لتا منگیشکر جی کی ہے۔"

"میں جو کچھ بھی ہوں، تمہاری ہوں۔" اس نے کہا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں بتاؤں تم کون ہو۔ تم اس دور کی شکنتلہ دیوی ہو اور میری تاک میں ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ خوفزدہ ہوگئی لیکن اسی وقت کسی طرف سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا مجھے دھوکے سے گھیر لیا گیا تھا میں نے گولیوں سے بچنے کے لیے خود نیچے چھلانگ لگا دی۔

سر میں چوٹ لگی اور ہوش آگیا، یہ فائرنگ نہیں بلکہ فلیٹ کے دروازے کو زور زور سے بجایا جا رہا تھا۔ سارا ماحول نگاہوں سے اوجھل ہوگیا، ایک رسالہ میرے سامنے کھلا پڑا تھا اس کا سرورق سامنے تھا جس میں ایک وائرلیس کرتا ہوا پولیس افسر ایک سیاہ چشمے والی شکنتلہ دیوی اور ایک فوجی ہیلی کاپٹر سے کودتا ہوا چھاتہ بردار نظر آرہا تھا۔

یہ ساری کہانی اس ٹائٹل کو دیکھ کر سر پر سوار ہوگئی تھی۔ فائرنگ بہ دستور ہو رہی تھی۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو نیچے والے فلیٹ کا نوسالہ لڑکا کھڑا ہوا تھا۔

"اماں نے لہسن منگوایا ہے۔ دال میں بگھار لگانا ہے۔" اس نے کہا۔

"جاتا ہے یا نکالوں ہینڈ گرنیڈ۔" میں نے غرا کر کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ پڑوس کے کسی گھر میں گانے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔

"آجا رے میں تو کب سے کھڑی اس پار....."

میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ یہ خواب، یہ جاگتی آنکھوں کے خواب کب تک مجھے بھٹکاتے رہیں گے۔ یہ خواب..... یہ خواب..... جو میری زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور جب ان خوابوں سے نکلتا ہوں تو وہی زندگی، وہی دفتر، وہی روزمرہ کا معمول.....!

مگر یہ خواب گھر ہو یا دفتر میرا پیچھا نہیں چھوڑتے، اس دن ذہن پھر پریشان تھا۔ میری نگاہ شمسو پر پڑی۔ شمسو میرے پکارنے پر میرے پاس آگیا۔ لاغر چہرہ عسرت مایوسی کی تصویر، عمر چالیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ لیکن حلیے سے پچاس پچپن سے کم کا نہیں لگتا تھا۔ پچکے گال، دھندلائی ہوئی آنکھیں، دبلا پتلا بدن۔

زندگی کے مسائل نے اس کی چالیس سالہ عمر میں پندرہ سال اور چپکا دیے تھے..... تو بے چارہ شمسو، تنہا کمانے والا۔ چھوٹے چھوٹے بچے، حالات سے اکتائی ہوئی بیوی، شاید کچھ بزرگ بھی اور.....

"کیا حکم ہے صاحب جی؟" شمسو نے مجھے اپنے خاندان کی چھان بین نہیں کرنے دی اور میں چونک پڑا۔

"ہاں..... وہ ایک حالات سے اکتائی ہوئی بیوی..... مم..... میرا مطلب ہے ایک گلاس پانی۔" میں نے کہا اور شمسو گردن جھکا کر چلا گیا۔ میری نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ کچھ کرنا چاہیے اس کے لیے۔ مظلوم انسانیت اس طرح سسک کر دم توڑ دے یہ کیسے گوارہ کیا جاسکتا ہے۔ انسان، انسان کے لیے پیدا ہوا ہے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی بے بسی سے نگاہیں چرانا، تذلیل آدمیت ہے۔ نہیں شمسو تم انسانوں کی طرح جیو گے۔ میں تمہاری خدمت کے لیے تخلیق کیا گیا ہوں۔"

ریوالونگ چیئر کو میں نے کمر سے پیچھے جھکاتے ہوئے شمسو کے بارے میں چند فیصلے کیے اور ایک گہری سانس لے کر پائپ دانتوں میں دبا لیا۔ سونے کے لائٹر سے پائپ سلگا کر میں نے چند گہرے گہرے کش لیے۔

"بیٹھ جاؤ شمسو....."

"جی صاحب؟" شمسو نے حیرت سے کہا۔

"ہاں..... شمسو میں نے تمہیں بیٹھنے کے لیے کہا ہے۔ اور..... زمین پر نہیں اس کرسی پر بیٹھو....."

"نہیں صاحب جی! ہم یہ گستاخی نہیں کر سکتے۔" شمسو نے لجاجت سے کہا۔

"اوہ..... گستاخی!" میرے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "دنیا کے اس چلن سے مجھے نفرت ہے شمسو۔ دو ہاتھ، دو پاؤں اور دو آنکھوں والے تمام انسان یکساں ہیں۔ سماج اور معاشرے نے یہ تنگ نظر پیدا کی ہے۔ دولت کی یہ غلط تقسیم انسانوں کے درمیان تفریق بن گئی ہے۔ ورنہ ہر شخص کی تخلیق یکساں ہے۔" میں نے جذبات میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی صاحب جی!" شمسو کی سمجھ میں میری بات نہیں آئی تھی۔

"مجھے اپنا دکھ بتاؤ شمسو۔ مجھے بتاؤ زندگی کے وہ کون سے دکھ ہیں جو تمہیں گھن کی طرح کھا رہے ہیں۔"

"کھانسی ہے صاحب جی! پیٹ میں درد ہوتا رہتا ہے۔ حکیم صاحب بتا رہے تھے کہ پیٹ میں کیڑے ہوگئے ہیں۔" شمسو نے جواب دیا۔

"آہ..... شمسو! یہ مسائل کی کھانسی ہے، جسے تم صرف پیٹ کا درد کہہ رہے ہو، وہ تمہارے سارے وجود کا درد ہے۔ میں تمہیں اس درد سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔ بیٹھ جاؤ شمسو۔" میں نے انٹرکام کا بٹن دبا کر کیشئر کو طلب کیا۔ کیشئر میرے ایئر کنڈیشنڈ آفس میں داخل ہوا تو میں نے کہا۔

"پچیس لاکھ روپے شمسو کو دے دو۔"

"جی۔" کیشئر نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"پچیس لاکھ کا مطلب سمجھاؤں یا شمسو کا؟" میں نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔

"جی بہتر جناب عالی۔" کیشئر بولا۔ شمسو حیرت سے منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا، پھر اس نے کہا۔

"صاحب یہ پچیس لاکھ.....!"

"یہ تمہارے زخمی وجود سے دکھ کی چادر اتار پھینکیں گے۔ شمسو جاؤ، جیو اس دنیا میں انسانوں کی طرح جیو۔" میں نے محبت بھرے لہجے میں کہا اور شمسو کی آنکھیں پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔

میرے دل کو ایک عجیب طمانیت بھرا احساس ہو رہا تھا۔ فلم شرابی میں امیتابھ بچن بھی یہی رول ادا کرتا تھا۔ پورے دفتر کو اس نے مالا مال کر دیا تھا اور خاص طور سے تھولال کو..... کاش شمسو کی بھی مونچھیں ہوتیں تو میں کہتا۔

''مونچھیں ہوں تو بس شمسو جیسی۔'' میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کیا احمقانہ سوچ ہے بہرحال پچیس لاکھ میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے لیکن اس سے شمسو کے سوکھے چہرے پر رونق آسکتی تھی۔ اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوسکتی تھی میرے لیے۔ میں تصور کی آنکھ سے شمسو کے اہل خاندان کو دیکھ رہا تھا۔ دکھوں کی ماری اس کی بیوی، جسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے سامنے رکھی نوٹوں کی گڈیاں اس کی ہیں۔ نہ جانے کتنے مسائل کے حل چھپے ہوئے تھے ان کاغذ کی گڈیوں میں۔ واہ..... ان کاغذوں میں کیسی انوکھی قوت پوشیدہ ہے۔

اور آج کیا ہر دور میں دولت کی طاقت تمام طاقتوں پر حاوی رہی ہے۔ میں نے اپنی ریوالونگ چیئر کو پیچھے جھکایا اور سوچ کے دائرے مزید وسیع کرنے چاہے لیکن..... اپنے گرنے کی آواز میں نے خود بھی سنی اور اس کے ساتھ ہی معاشرتی کہانی ختم ہوگئی۔ دفتر کے کئی ساتھی مجھے اٹھانے دوڑ پڑے۔ مس روزی کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔ زہر لگتی تھی مجھے ان پینتالیس سالہ مس کی ہنسی۔

''کیا چکر آگیا؟'' رضوان نے ہمدردی سے پوچھا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟''

''ہاں..... یار ٹھیک ہوں، اس بھٹیار خانے میں ایک ڈھنگ کی کرسی بھی نہیں ہے۔ کتنی بار کہا ہے کہ اسے تبدیل کر دیا جائے۔ اس کی پچھلی دونوں ٹانگیں گھس گئی ہیں مگر.....'' میں نے خفت کھاتے ہوئے کہا۔

کرسی سیدھی کر کے مجھے دوبارہ اس پر بٹھا دیا گیا۔ شمسو نے مجھے جلدی سے پانی کا گلاس پیش کر دیا۔ میں نے ہمدردی کی نگاہوں سے شمسو کو دیکھا۔ میرا تو خیر کچھ نہیں بگڑا تھا۔ بے چارے شمسو کو پچیس لاکھ کا نقصان ہوگیا تھا۔ کاش وہی ہوتا جو میں نے سوچا تھا، کاش میں فلم شرابی کا امیتابھ ہوتا، مگر کیسے..... فرق تھا، میں اس فرم کے مالک کا بگڑا ہوا بیٹا نہیں بلکہ اس فرم میں ٹائپسٹ تھا اور جس ریوالونگ چیئر کو میں نے پیچھے جھکانے کی کوشش کی تھی۔ وہ یہاں نہیں بلکہ اندر مسٹر عمیز کے ایئر کنڈیشنڈ آفس میں تھی۔ مسٹر عمیز جو اس فرم کے مالک تھے۔

لاحول ولاقوۃ..... ! یہ کہانیاں میرے ذہن سے کیوں چپک گئی ہیں..... کیا کروں؟ کیسے پیچھا چھڑاؤں ان سے یقیناً یہ کوئی ذہنی بیماری ہے، میں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگا تھا۔ یہ خواب بڑے مربوط اور ہر عیب سے پاک ہوتے تھے۔ ان میں سے ہر خواب کو تحریر کر کے کہانی کا رنگ دیا جاسکتا تھا۔

میرا تعلق فیض آباد سے ہے اور میری سچی کہانی دوسری بہت سی کہانیوں سے مختلف نہیں ہے۔ وہی کہانیاں جو انسانی زندگی سے عبارت ہوتی ہیں۔ ماں باپ مرگئے تو تایا جی کے گھر آگیا۔ تایا جی نے تو اپنا خون سمجھ کر قبول کرلیا، مگر تائی جی نے اسے ہمیشہ خراب خون سمجھا اور اس سے ناک سکیڑتی رہی۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ تایا جی دیندار آدمی تھے اور دوسرے کے پیسے کو اپنے تصرف میں لانا حرام سمجھتے تھے چنانچہ میرے ماں، باپ کے چھوڑے ہوئے پیسے انہوں نے مجھ پر خرچ کیے اور یہ پیسا انٹرمیڈیٹ تک چل سکا۔

تایا جی نے ایک ایک پیسے کا حساب رکھا تھا۔ جس میں اس کاپی اور قلم کے پیسے بھی شامل تھے جس پر یہ حساب لکھا جاتا تھا اور جب یہ سارے پیسے ختم ہوگئے تو انہوں نے مجھ سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''اب شیراز بیٹے! تمہارے باپ اور میرے مرحوم بھائی کا چھوڑا ہوا ترکہ سب ختم ہوگیا ہے۔ سوائے اس کاپی کے جو پوری کی پوری بھر گئی۔ اس لیے بیٹے اب تم اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرو۔ میرے حالات تمہیں معلوم ہیں، آٹھ بچوں کا باپ ہوں، گھر کے حالات.....''

اور میں اس گھر کے حالات سے بہ خوبی واقف تھا۔ آٹھ بچوں کے ساتھ عمر کٹی تھی اور جیسے کٹی تھی میرا جی جانتا ہے۔ ان میں آٹھ کا اضافہ تو میرے سامنے ہی سامنے ہوا تھا۔ نہ جانے یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہونے والا تھا۔ جس بڑے سے ہال میں، میں بچپن میں سوتا چلا آیا تھا۔ پہلے میری جگہ اس کے سینئر میں تھی۔ پھر کچھ اور کھسکا، کچھ اور، پھر کچھ اور اب میں دروازے کی چوکھٹ کے پاس تھا۔ کون جانے کب یہ چوکھٹ پار کرنی پڑے اس لیے کچھ نہ کچھ سوچنا ہی تھا۔ تایا جی نے کہا۔

''تم بارہویں پاس کر چکے ہو، آگے پڑھنا ممکن نہیں ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں چودھری بشارت سے بات کی ہے۔''

''جی؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے تایا جی کو دیکھا۔ ایک لمحے میں میری آنکھوں میں سنہرے خواب جگمگا اٹھے تھے۔ چودھری صاحب کی بیٹی نورین بچپن میں میرے ساتھ کھیلی تھی اور بارہا میں نے جوانی میں بھی اس کے ساتھ کھیلنے کی آرزو کی تھی۔ گو یہ آرزو میرے سینے تک ہی محدود تھی۔ تایا جی کے الفاظ نے مجھے بھٹکا دیا۔

''ہاں۔ انہوں نے مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ کہہ

رہے تھے یتیم بچہ ہے۔ وہ پوری پوری کوشش کریں گے کہ تمہیں سرکاری اسکول میں پرائمری ٹیچر لگوا دیں۔ زندگی بن جائے گی۔ بیٹے عزت کی نوکری ہے اور.....''

''نہیں تایا جی! میں پڑھانے کے لیے نہیں پیدا ہوا۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔ ''تایا جی کے الفاظ نے سارے خواب چکنا چور کر دیے تھے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ شاید تایا جی نے چودھری صاحب سے نورین اور میرے بارے میں کوئی بات کی ہے۔''

''پھر بیٹے کچھ اور کرنے کا ارادہ ہے؟''

''ہاں..... تایا جی! میری وسعتیں لامحدود ہیں۔ اس بیکراں آسمان کے مانند میں اس کائنات میں اپنا ایک مقام بناؤں گا۔ میں کسمپرسی کی زندگی گزارنے کے لیے نہیں پیدا ہوا، میری منزل کچھ اور ہے۔''

''حوصلہ بڑی چیز ہوتی ہے، بیٹے! حوصلہ مند یقیناً کچھ کر دکھاتے ہیں لیکن کوئی نظریہ تو ہوگا تمہارا؟''

''میں بڑے شہر جاؤں گا اور مجھے معلوم ہے کہ بڑے شہر سونے کی کان ہیں وہاں میرے جیسے ذہین نوجوان کے لیے بہت کچھ ہے اور آپ دیکھ لیجیے گا تایا جی! جب میں شہر سے بائی روڈ اپنی چمچماتی کار میں آپ کے پاس فیض آباد آؤں گا تو آپ حیران رہ جائیں گے۔ میں یہ سب کچھ حاصل کر کے رہوں گا۔''

''تمہارے لہجے کی مضبوطی بتاتی ہے کہ واقعی تم جو کچھ کہہ رہے ہو کر دکھاؤ گے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، کب تک جانا چاہتے ہو شہر.....؟'' تایا جی نے پوچھا۔

''بس تایا جی! آپ کی دعاؤں کے ساتھ جلد از جلد۔''

میں نے بادل ناخواستہ کہا۔ اس سے پہلے تو ٹھیک سے شہر کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اگر تایا جی چودھری صاحب کی بیٹی نورین سے شادی کی بات کرتے تو پوری عمر شہر کا رخ نہ کرتا، لیکن اب بات دوسری ہوگئی تھی اور تایا جی نے بات پکڑ لی تھی۔ وہ ہر قیمت پر نویں بچے کے لیے جگہ خالی کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کچھ قرض حسنہ دے کر مجھے شہر والی ریل میں بٹھا دیا۔ بڑا دعویٰ کر کے چلا تھا۔ اب اس دعوے کو پورا کرنے کے بارے میں سوچتا تھا۔ شہر میں کوئی خاص واقف کاری بھی نہیں تھی۔ مشکلات منہ پھاڑے کھڑی تھیں لیکن میرا عزم کمزور نہیں پڑا تھا۔ دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کے قصے مجھے یاد تھے۔ آخر وہ بھی تو میری طرح دو ہاتھ اور دو پاؤں رکھتے تھے۔ میرے پاس بھی تو دماغ ہے۔

روشنیوں کے شہر میں میرے لیے بھی روشنی کی کمی نہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ



جولائی کی جھلسا دینے والی گرمیاں...
2012 کے شمارے کی سرگرمیاں...

جال در جال
زندگی کی رنگینی کو خیرباد کہہ کے سنگینی کو گلے لگا لینے والے جانبازوں کا ولولہ انگیز سفر....
سلیم فاروقی کا انداز تحریر

گرداب
ملک کے مفادات کو زیروزبر کر دینے والی کوششوں کو ناکام بنا دینے کا عزم اور عمل کی تیز رفتار داستان کے سنسنی خیز مناظر... اسما قادری کے قلم سے

بلیکار
نت نئے امتحانات سے دوچار تابش اور عمران کے کارنامے طاہر جاوید مغل کا سلسلہ

سرورق کی کہانیاں
ہمارے اردگرد رونما ہونے والے واقعات کا پُردرد احوال
احمد اقبال کے ہمراہ سرورق کا پہلا پڑاؤ

تیمور اور شامی کی سنگت میں مسکراہٹ بکھیر دینے والا سلسلہ
کاشف زبیر کے قلم سے ... سرورق کا دوسرا پڑاؤ

اس کے علاوہ
چینی نکتہ چینی میں آپ کی شامل آرا... تبصرے... محبتیں

ہوگی۔ میں اسی روشنی کی تلاش میں یہ سفر کر رہا تھا۔

بہت سے اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔ پھر وہ اسٹیشن بھی آ گیا جو میری منزل تھی، میں پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ بڑی افراتفری تھی، جیسے کوئی ہنگامہ ہو گیا ہو۔ لوگ ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ میں گھبرائے ہوئے انداز میں انہیں دیکھنے لگا پھر میں ایک شخص سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''کیا بات ہے بھائی جی! کوئی گڑبڑ ہو گئی کیا؟''

''کہاں..... کیا ہوا.....؟'' وہ شخص مجھ سے زیادہ گھبرا گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''یہ لوگ کہاں بھاگے جا رہے ہیں؟''

''او یار! یہ تو اپنے اپنے کام کر رہے ہیں۔ تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔'' اس شخص نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر چونک کر بولا۔

''او تو پنجاب سے آیا ہے؟''

''ہاں.....'' میں نے کہا۔

''کس شہر سے آیا ہے؟''

''فیض آباد سے۔''

''اوہ..... اچھا معاف کرنا۔ تیری شکل میرے ایک دوست سے ملتی ہے، ویسے تو ادھر کیسے آ گیا؟''

''نوکری کی تلاش میں۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہاں کدھر جانا ہے؟''

''ابھی نہیں جانتا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''اوئے کوئی ڈیرا نہیں ہے ادھر.....؟''

''نہیں۔''

''پھر کہاں پڑے گا؟''

''مارا جائے گا پاپے..... سیدھا سچا بندہ لگتا ہے۔ اس بڑے شہر میں کیا کرے گا۔ کسی نے بتایا نہیں تجھے۔ اوئے کسی کا پتا ہی لے آتا۔''

''کوئی تھا ہی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ اور وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا، پھر بولا۔

''آجا میرے ساتھ۔ آجا۔ کمائی تو زندگی بھر کی ہے۔ آجا بس میرے ساتھ۔'' میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس کا نام عباس تھا۔ وہ بھی ہمارے ہی شہر کا نکلا اور اس بڑے شہر میں ٹیکسی چلاتا تھا۔ عباس اس بڑے شہر میں میرا پہلا محسن تھا۔ وہ چند دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر ایک ناجائز پلاٹ پر جھگی بنا کر رہتا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے پانچ مہینے اس جھگی میں گزارے۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے میری ایسی مدد کی کہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ ان پانچ مہینوں میں، میں نے پچاس سال کا تجربہ حاصل کیا۔

میں نے ان کی جھگی کو دیکھ کر حقارت سے کہا تھا کہ یہ لوگ ذہنی طور پر پسماندہ ہیں اس لیے کچھ نہیں کر سکے۔ میں انہیں مختصر وقت میں وہ سب کچھ کر کے دکھاؤں گا جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے کوششیں شروع کر دیں۔ باہر کی دنیا میں نکل کر معلوم ہوا کہ میں ہی نہیں میری طرح لاکھوں لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں لیکن..... آخر کوئی راستہ بھی ہو۔ کوئی ذریعہ بھی ہو۔ یہاں تو کوئی چھوٹی موٹی نوکری بھی نہیں مل رہی تھی۔

پہلے مہینے میں بددل نہ ہوا۔ دوسرے مہینے دل پر کچھ اداسی آ گئی۔ تیسرے مہینے پریشان ہو گیا۔ اب صرف دوسروں کے رحم و کرم پر تھا۔ پائی پائے جو کچھ تھا سب ختم ہو چکا تھا۔ عباس نے مجھے گاڑی سکھانے کی پیشکش کی جسے میں نے ٹھکرا دیا۔ ''میں اور ڈرائیور۔''

چوتھے مہینے حوصلے دم توڑ گئے اور پانچویں مہینے بالآخر میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ اونچی اونچی کوٹھیاں آسمان سے اترتی ہیں، ان میں رہنے والے کسی اور سیارے کی مخلوق ہوتے ہیں جو چاچا بختیار جو ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے اور ایک دفتر میں چپڑاسی تھے۔ مجھے سمجھاتے رہتے، وہ کہتے تھے۔

''بیٹا شیراز! عمل کی دنیا خیالوں کی دنیا سے جدا ہوتی ہے۔ انسان خیالوں کی دنیا میں جی نہیں سکتا۔ ابتدا کرو اور خود کو اللہ پر چھوڑ دو۔ جو تقدیر میں ہو گا وہی ملے گا۔ زیادہ کے لیے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنا پاگل پن ہے۔''

پہلے میں ہنس پڑا اور میں نے انہیں بہت سے شعر سنا دیے۔ جن میں حوصلہ مندی کے جذبے تھے لیکن بعد میں فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ بھائی شاعر بھی بس خیالوں کی دنیا کے باشندے تھے وہ بھی حقیقت کی تہ تک نہیں اترے تھے۔

پانچ مہینے بہت ہوتے ہیں، اس کے بعد بھی خاموش رہنا بے غیرتی تھی۔ ان لوگوں پر کب تک بوجھ بنا رہتا۔ دو ہی صورتیں تھیں کہ یا تو واپس فیض آباد چلا جاؤں اور تایا جی سے کہہ کر ٹیچر بن جاؤں یا پھر اسی شہر میں نوکری کر لوں۔ اس دور میں تایا جی کو بھی خط نہیں لکھا تھا۔ میں تو ان سے چمچاتی گاڑی میں واپس آنے کا وعدہ کر کے آیا تھا۔ لیکن اب تک ان کے قرض حسنہ کی واپسی ہی ممکن نہیں ہوئی تھی بلکہ ان لوگوں کا بھی قرضہ حسنہ مجھ پر چڑھ گیا تھا۔ جن کے ساتھ میں رہتا تھا۔ پھر یہ بھی جانتا تھا کہ تایا جی کے ہاں نواں بچہ ضرور آ گیا ہو گا۔ جس کے بعد میری جگہ باقی نہ رہی ہو گی بس مذاق اڑانے کے علاوہ اور کچھ نہ ہو گا۔ اس لیے اسی شہر میں پڑے رہو۔ جو کچھ

تقدیر میں ہے اسے قبول کر لو۔'' چاچا بختیار نے کہا۔

''شیراز، میرے دفتر میں کلرک کی جگہ خالی ہوئی ہے۔ صاحب مجھ پر بہت مہربان ہیں کہو تو میں بات کروں؟''

''کر لو چاچا.....'' میں نے بے بسی سے کہا اور نتیجے میں مجھے کلرکی مل گئی۔ یہ بھی بڑی بات تھی ورنہ اتنی آسانی سے نوکری کہاں ملتی ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ کچھ تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ جس پلاٹ پر ہم رہتے تھے، اس کے مالک نے اسے تعمیر کرا لیا۔ چاچا بختیار کو در در گردہ ہوا تو وہ اپنے شہر واپس چلے گئے۔ عباس نے واپس اپنے شہر جا کر شادی کر لی اور وہاں ٹھیکیداری کرنے لگا۔ سب منتشر ہو گئے۔ میں نے فلیٹ کرائے پر لے لیا جس کا کرایہ بہت کم تھا۔ گزر ہو جاتی تھی مگر میں صرف گزر کے لیے تو اس بڑے شہر میں نہیں آیا تھا۔ میری پرواز تو بہت اونچی تھی لیکن رفتہ رفتہ میرے بازو تھکتے جا رہے تھے۔ بلندی پروازی کے لیے مضبوط پر کہیں سے نہ حاصل ہو سکے اور میری آرزوئیں حسرت بن گئیں۔ پھر یہ حسرتیں، خوابوں میں ڈھل گئیں۔ جاگتی آنکھوں کے خوابوں میں۔ ناآسودہ خوشیوں کو میں فلیٹ میں پڑی ہوئی چارپائی پر لیٹ کر سرہانے کی کھڑکی سے جھانکتے آسمان پر نگاہیں جما کر پوری کر لیتا تھا۔ بڑا سکون ملتا تھا۔

میرے خواب کہیں غیر مربوط نہ ہوتے اور میرا ذہن راستے کے تمام سوالات سمیٹتا آگے بڑھتا تھا۔ مشغلے کے طور پر کبھی فلم دیکھ لیتا۔ سینما ہال میں یا کسی شناسا کے گھر وی سی آر پر۔ اس طرح میں نے فلم شرابی دیکھی اور عالم تصور میں شمسو کو پچیس لاکھ دے ڈالے اور خود عمیر صاحب کے ایئر کنڈیشنڈ آفس میں جا بیٹھا تھا۔ بس اب یہ خواب ہی زندگی تھے، فلموں کے علاوہ میرا دوسرا مشغلہ ڈائجسٹ تھے۔ انہی ڈائجسٹوں کی مدد سے ہی میں نے اپنے خوابوں کو ربط دیا تھا۔ مناظر دیے تھے۔ دیس دیس کی سیر کرتا۔ کبھی ترکی، کبھی اندلس، کبھی لندن راستے ہنگاموں سے پر ہوتے۔ دولت کے انبار ہوتے۔ دولت کے ساتھ حسین لڑکیوں کا ساتھ ہوتا۔ بڑی آسودگی ملتی تھی ان داستانوں میں چاچا بختیار کی باتیں اب سامنے آ رہی تھیں۔ وہ اس دنیا کے بارے میں بے شک مجھ سے زیادہ تجربے کار تھے۔

شمسو نے ایک اور کرسی لا کر میرے قریب رکھی اور بولا۔ ''اٹھ جایئے صاحب، میں یہ دوسری کرسی رکھ دوں۔''

''اوہ..... شکریہ شمسو یہ کرسی واقعی خراب ہو گئی ہے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور شمسو نے کرسی تبدیل کر دی۔

''تمہارے کتنے بچے ہیں شمسو؟'' میں نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بچے.....؟'' شمسو نے حیرت سے پوچھا۔

''کتنے بچے ہیں تمہارے؟''

''کوئی نہیں صاحب، ہماری تو شادی ہی نہیں ہوئی۔''

''ایں.....'' میں چونک پڑا۔ ''کیوں؟''

''جی صاحب جی! شادی کی ہی نہیں۔''

''اوہ..... ماں باپ ہوں گے۔ چھوٹے بہن بھائی ہوں گے۔'' میں نے رحم کا جذبہ برقرار رکھا۔

''نہیں صاحب جی، ماں باپ تو یاد بھی نہیں ہیں۔ بہن بھائی تھے ہی نہیں، ہم اکیلے ہیں۔'' شمسو نے جواب دیا۔

''تب تمہاری حالت اتنی خراب کیوں ہے۔ چہرہ پیلا پڑا ہوا ہے، گال پچکے ہوئے ہیں۔ اپنی عمر سے کہیں زیادہ معلوم ہوتے ہو۔''

''اوہ..... شیراز تمہیں معلوم نہیں؟'' پیچھے سے رضوان کی آواز ابھری۔

WELCOME BOOK SHOP
SOLE DISTRIBUTOR of U.A.E
WELCOME BOOK SHOP
ASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
O.Box 27869 Karama,Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher , Exporter , Distributor
kinds of Magazines, General Books and Educational Books

"کیا.....؟"

"اپنا شمسو..... ہیرو ہے، ہیروئن کا عاشق، رات ہوتے ہی ہیروئن ہوتی ہے اور شمسو....." رضوان نے جواب دیا اور میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا نتھو لال بھی کہیں فراڈ تو نہیں تھا۔ شمسو کے بارے میں، میں نے کیا کیا، سوچا تھا۔ شکر ہے، میں اس فرم کا مالک نہیں تھا ورنہ کتنا کیا نقصان اٹھانا پڑتا۔ دنیا بہت عجیب ہوگئی ہے۔ جو پریشان ہے، اس کے راستے بند ہیں جو پریشان نہیں وہ اپنے لیے پریشانیاں تلاش کرتا ہے۔ شمسو عسرت زدہ نہیں بلکہ ہیروئن کا مریض ہے۔ میرا ہر خواب جھوٹا ہوتا ہے۔ مگر کیا کروں ان خوابوں میں میری آسودگی ہوتی ہے۔ جو نہیں ملتا وہ ان خوابوں میں مل جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں خواب کچھ نہیں دیتے۔ لیکن میں ان سے متفق نہیں ہوں۔ جو نہ ہوسکے اس کے لیے تصورات کی دنیا آباد کرلیں، یہ کائنات اتنی بری نہیں لگے گی۔

زندگی کے شب و روز رواں دواں تھے۔ فیڈرل کیپٹل کا فلیٹ، مسٹر عمیز کا آفس، پینتالیس سالہ روزی کی ہنسی جو میرے کانوں کو زہر لگتی تھی۔ یہ عورت عمر کو بھول گئی تھی اور اپنی دانست میں عمیز انٹر پرائز کے سارے اسٹاف کی آنکھوں کا نور تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ شاید شمسو بھی اس کے لیے ہیروئن چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ بہرحال یہی زندگی تھی اور میں اس زندگی میں کسی خوشگوار تبدیلی کا خواہش مند تھا۔

اس دن طبیعت کچھ زیادہ ہی مکدر تھی۔ گھر واپس آنے کے بجائے اندرون شہر مارکیٹ کی طرف نکل گیا۔ یہاں نذیر سے میری شناسائی ہوگئی تھی۔ نذیر ایک گارمنٹ اسٹور کا سیلز مین تھا۔ اس کا چھوٹا سا اسٹور ایئر کنڈیشنڈ تھا جس کے شیشوں سے بازار کی تمام رونقیں نظر آتی تھیں۔ دو لڑکے کام کرتے تھے اس کے ساتھ اور اسٹور کے مالک نے اسے انچارج بنا رکھا تھا۔

خوش اخلاق آدمی تھا۔ جب بھی میں اس کے پاس پہنچتا گھنٹوں بٹھاتا۔ اس وقت بھی مجھے دیکھ کر خوش ہوگیا۔ رسمی گفتگو ہو رہی تھی کہ کچھ گاہک آئے اور وہ ان میں مصروف ہوگیا۔ میں کاؤنٹر پر بیٹھ کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ سامنے فٹ پاتھ پر اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ شاندار لوگ، شاندار کاریں۔ اس انوکھی دنیا کے باشندے تھے۔

سیاہ رنگ کی ایک مرسیڈیز اسٹور کے سامنے آکر رکی اور پچھلی سیٹ سے چند لوگ نیچے اتر آئے۔ ان میں ایک دراز قد معمر خاتون بھی تھیں جو بھاری بدن کی مالک تھیں لیکن پروقار لگ رہی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر مرد اور ایک نوجوان لڑکی جس کے خدوخال اس خاتون سے ملتے جلتے تھے۔ ڈرائیور مرسیڈیز کو مناسب جگہ پارک کرنے لگا۔ وہ تینوں آگے بڑھنے لگا اور پھر ان تینوں کا رخ اسٹور کی طرف ہوگیا۔ لڑکی نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ اس کی نگاہیں دکان میں بھٹک رہی تھیں۔ پھر اس نے سرسری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں اور میرے ذہن میں سرسراہٹ ہونے لگی۔

میں نے اس معمر خاتون کو دیکھا۔ کیا عمدہ شخصیت ہے، کروڑ پتی سے کم نہ ہوں گی۔ عیش و عشرت کی زندگی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ اجنبی دنیا کے لوگ..... دفعتاً میرے کانوں میں ہلکی سی چیخ کی آواز ابھری اور میں چونک کر اس طرف دیکھنے لگا۔ معمر عورت کو اس کا ساتھی مرد بہ مشکل سنبھالے ہوئے تھا۔ ان کی طبیعت اچانک کچھ خراب ہوگئی تھی۔ اس شخص نے نذیر سے بھی مدد کی استدعا کی تھی اور نذیر نے مجھے بھی اشارہ کیا تھا۔ ہم نے مل کر معمر عورت کو مرسیڈیز تک پہنچایا۔ مرد نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ خریدنا ہے۔ اس کے لیے ہم لوگ پھر آئیں گے۔" نذیر نے خوش اخلاقی سے کہا کوئی بات نہیں۔

"میری پرانی کسٹمرز ہیں بیگم صاحبہ اور کروڑ پتی ہیں۔"

"دیکھنے ہی سے لگ رہا تھا۔" میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا اور پھر نجانے کب تک میں نذیر کے ساتھ رہا۔ سیاہ رنگ کی مرسڈیز میرے ذہن میں سفر کرتی رہی۔ جس میں میری تنہائیوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ نو ساڑھے نو بجے فلیٹ پر آگیا۔ وہی بیمار زندگی تھی کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا اور مکیش کی درد بھری آواز ابھرنے لگی۔ "زندہ ہوں اس طرح کے غم زندگی نہیں۔"

دروازے پر ہونے والی آہٹ نے مکیش سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ کون ہوسکتا ہے اس وقت؟ اٹھ کر دروازہ کھولا تو نذیر تھا اور اس کے ساتھ وہی شخص جو ان بیگم صاحبہ کے ساتھ نظر آیا تھا۔ میرے دل میں کچھ گھبراہٹ ہونے لگی۔ نذیر بھی اس شناسائی کے دوران پہلی بار میرے فلیٹ پر آیا تھا اور مجھے حیرت تھی کہ اسے میرا پتا کیسے معلوم ہوا؟

"سوری شیراز، تمہیں ڈسٹرب کیا لیکن مسٹر فراز کو تم سے کچھ کام پڑ گیا تھا۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ مجھے ان کے ساتھ آنا پڑا۔"

"خوش آمدید..... لیکن مسٹر فراز.....؟"

"شام کو بیگم شاہ کے ساتھ آئے تھے اور بیگم شاہ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ یہ لوگ میرے پرانے کرم فرما ہیں اور پھر انسانی ہمدردی بھی ضروری ہے۔"

"میرے لائق کوئی خدمت ہے تو میں حاضر ہوں۔" میں نے فراز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک عجیب سی کہانی سنانے آیا ہوں..... مسٹر شیراز..... لیکن کیا، کیا جائے۔ اس دنیا میں ایسی ہی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ بیگم شاہانہ شاہ میری بہن ہیں ان کے شوہر یعنی میرے بہنوئی شاہ عالم، بہت بڑا کاروبار کرتے تھے۔ بیگم شاہ کے دو بچے تھے۔ نادرہ شاہ عالم اور زین شاہ عالم زندگی میں غم نہ ہوں تو شاید وہ ادھوری کہلاتی ہے۔ میری بہن پر اس وقت غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جب شاہ عالم صاحب زین کے ساتھ سوئیڈن جا رہے تھے۔ فضائی حادثہ ہوا اور اعلان کے مطابق تمام مسافر ہلاک ہوگئے۔ انہی میں میرا بھانجا زین اور بہنوئی شاہ عالم صاحب بھی تھے۔ ہم نے لاشیں حاصل کرنے کی بے انتہا کوششیں کیں لیکن حادثہ ایک دشوار گزار پہاڑی راستے میں ہوا تھا اور لاشیں مسخ ہوگئی تھیں۔ جو لاشیں بہ مشکل تمام لائی جاسکیں وہ ناقابلِ شناخت تھیں۔ چنانچہ ہم مجبور ہوگئے۔ میری بہن تین ماہ تک سکتے کی کیفیت کا شکار رہی اور اس کے بعد ان کی حالت سنبھلی۔ تب بھی ان کی ذہنی حالت درست نہ ہوسکی۔ انہیں آج بھی یقین ہے کہ وہ دونوں زندہ ہیں اور کہیں بھٹک رہے ہیں۔ وہ ضرور واپس آجائیں گے۔ تمام معاملات میں وہ بالکل ٹھیک ہیں لیکن ان دونوں کی واپسی کے سلسلے میں بالکل سنجیدہ ہیں۔ براہ کرم یہ تصویر دیکھیں۔" فراز صاحب نے جیب سے ایک تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی اور میں بھونچکا رہ گیا۔

یہ میری تصویر تھی۔ میں ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس مسکرا رہا تھا۔

"اسے دیکھ کر تمہیں صورت حال کا کچھ اندازہ ہوگیا ہوگا۔ یہ زین ہے۔"

"زین.....!" میرے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

"ہاں، میرا بھانجا زین..... مرحوم..... آج آپ ہی کو دیکھ کر ان کی حالت خراب ہوگئی تھی اور وہ اس میں حق بجانب ہیں، آپ کی صورت ہو بہو زین سے ملتی ہے۔ میں نے تو غور بھی نہیں کیا تھا لیکن نادرہ نے میری راہنمائی کی۔ وہ خود بھی آپ کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔"

رکاوٹ

جنت میں جانے سے رکاوٹ کا باعث

سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔"

صحیح بخاری سے اقتباس

مرسلہ: محمد قیصر شہزاد، داجل، ضلع راجن پور

مجھے اسٹور میں داخل ہونے والی لڑکی یاد آئی جو واقعی مجھے دیکھ کر دنگ سی رہ گئی تھی۔

"مسٹر شیراز! ڈاکٹر پہلے ہی اس مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں۔ وہ میری بہن کو مریضہ قرار نہیں دیتے اور ان کا کہنا ہے جو کچھ ان کے ذہن میں ہے اسے کھولا نہیں جاسکتا۔ کوئی واقعہ کوئی حادثہ ہی ان کے ذہن کو ٹھیک کرسکتا ہے۔ کیا آپ اس سلسلے میں ہماری مدد کرسکتے ہیں؟"

"میں..... میں کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"آپ کو زین بننا ہوگا۔ آپ کو زین بن کر انہیں پرسکون کرنا ہوگا اور جب ان کے بے قرار دل کو سکون آجائے گا تو پھر کسی بھی طرح ہم انہیں حقیقت بتا دیں گے۔ اب شیراز صاحب، آپ کی اس کاوش کے لیے معاوضے کی پیش کش کمینگی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن آپ کا جو وقت صرف ہوگا اس کے لیے آپ کو..... آپ کو میں پچاس لاکھ روپے کی پیشکش کرتا ہوں۔"

مجھے بڑے زور سے چکر آگیا۔ کلیجا حلق میں آپھنسا۔ یوں لگا جیسے کانوں کے پاس زوردار دھماکے ہوئے ہیں، سماعت شکن دھماکے۔ فراز صاحب کہہ رہے تھے۔ "ویسے بھی یہ ثواب کا کام ہے، ایک ماں کی ممتا کو سکون پہنچانے کا صلہ آپ کو خدا کے ہاں بھی ملے گا۔"

"میرے خیال میں شیراز کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تو ایک نیک کام ہے۔ فراز صاحب، آپ اطمینان رکھیں۔ میرا دوست انکار نہیں کرے گا۔ میں اسے جانتا ہوں۔ آپ اس سے مل لیے بس مطمئن ہوجائیں۔ کل اسے آپ کی خواہش کے مطابق زین کی حیثیت سے کوٹھی میں پہنچا دیا جائے گا۔"

"کل جس وقت آپ کہیں گے نذیر صاحب، آپ

کے اسٹور پر آجاؤں اور انہیں ساتھ ہی لے جاؤں گا۔"

"بارہ بجے تک مناسب رہے گا۔" نذیر نے مجھ سے پوچھے بغیر کہا۔ مجھ سے پوچھتا، تب بھی میں شاید ہی کوئی جواب دیتا۔ میری کیفیت تو خود بیگم شاہ جیسی ہوگئی تھی۔ 50 لاکھ میری سارے خوابوں کی تعبیر۔ میری چمچاتی کار فیض آباد کی طرف دوڑ رہی تھی۔ سارا راستہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ تایا جی کے نو بچے اور ان کے درمیان میرا مقام..... یہ سب کچھ میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ نجانے کس طرح میں نے فراز صاحب سے ہاتھ ملا کر انہیں رخصت کیا تھا۔ نذیر البتہ انہیں کار تک چھوڑ کر واپس آیا تھا۔

"یار شیراز..... میں نے تیری طرف سے اقرار تو کرلیا مگر تیری خاموشی مجھے پریشان کررہی ہے۔"

"نہیں.....! ٹھیک ہے۔ میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

"کیا.....؟"

"کوئی گھپلا نہ ہو۔ یہ ایک بڑا شہر ہے۔ بڑی بڑی چالیں چلی جاتی ہیں یہاں۔"

"بہت پرانے کسٹمر ہیں یہ لوگ میرے۔ بڑے شریف لوگ ہیں ان کی ضمانت میں لیتا ہوں اور پھر یار، برا مت ماننا، پچاس لاکھ میں تو تمہاری تقدیر بدل سکتی ہے۔ کاش میں اس کا ہم شکل ہوتا۔" نذیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں بھی ہنسنے لگا، پھر میں نے پوچھا۔

"تمہیں میرا پتا کیسے معلوم ہوگیا نذیر.....؟"

"تم نے ہی بتایا تھا ایک بار بھول گئے؟"

"ہاں! مجھے یاد نہیں۔ بہرحال میری نوکری....."

"او میری نوکری..... پچاس لاکھ مل جائیں گے تو ایک گارمنٹ اسٹور کھول لینا، زندگی بھر عیش کرو گے۔ پیسا تمہارا تجربہ میرا۔ ویسے اگر تم چاہو تو چھٹی لے لو۔ یہ بھی احتیاطاً کہہ رہا ہوں۔ ورنہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پرائیویٹ نوکری ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کسی سحر زدہ شخص کے سے انداز میں گردن ہلا دی۔ نذیر مجھے اونچ نیچ سمجھاتا رہا اور پھر دن کے گیارہ بجے مجھے اپنے اسٹور پہنچ جانے کی ہدایت کر کے چلا گیا لیکن یہ رات میرے لیے بے چین کر دینے والی رات تھی۔ کیا واقعی قسمت مہربان ہوگئی تھی مجھ پر؟

یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہوجائے گا؟ خوف، مسرت، بے یقینی اور صبح کا انتظار نہ جانے کس طرح یہ رات گزری تھی۔ صبح پانچ بجے ہی چائے تیار کی غسل کیا، شیو بنایا اور فلیٹ کی ایک ایک چیز کو کریدتا رہا۔ شاید اس کے بعد اس فلیٹ میں آنا نہ ہو تو ضرورت بھی کیا تھی۔ مستقبل کے بے شمار منصوبے ذہن میں آرہے تھے اور میں نے اس خیال سے انہیں دماغ سے جھٹک دیا تھا کہ یہ سب قبل از وقت تھے۔ گھڑی کی سوئیاں جم گئی تھیں۔ ساڑھے نو بجے گھر سے نکلا اور ایک دکان سے دفتر فون کیا کہ آج دفتر نہیں آؤں گا اور پھر نذیر کے اسٹور کی جانب روانہ ہوگیا۔

ساڑھے دس بجے نذیر کے اسٹور کے لڑکے اسٹور کھولتے نظر آئے۔ اس وقت تک میں دو بار ایک چھوٹے ہوٹل پر چائے پی چکا تھا۔ گیارہ بج کر تین منٹ پر میں نذیر کے اسٹور میں داخل ہوا تھا۔

"ابھی ابھی فراز صاحب کا فون آیا تھا۔ بے چارے تمہارے بارے میں فکرمند تھے۔ سوچ رہے تھے کہ کہیں تم اپنا خیال نہ بدل دو۔ کہہ رہے تھے کہ بیگم شاہ مسلسل زین کی گردان کررہی ہیں۔ میں انہیں ٹیلی فون کردوں۔"

میری اجازت پر نذیر نے فراز صاحب کو فون کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد فراز صاحب، نذیر کے اسٹور پر پہنچ گئے۔ اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا بریف کیس بھی لائے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں یہ لباس پہن لوں اور زین بن جاؤں۔ یہ سب کچھ بے حد عجیب لگ رہا تھا۔ لیکن اسی میں میرا سنہرا مستقبل چھپا ہوا تھا۔ لباس پہننے کے بعد میں نے چند انگشتریاں بھی پہنیں جو فراز صاحب اپنے ساتھ لائے تھے۔ نذیر نے مجھے آنکھ ماردی اور اظہار کیا کہ میں جچ رہا ہوں۔ فراز صاحب نے بھی حیرت ناک لہجے میں کہا تھا کہ میں ہو بہو زین لگ رہا ہوں۔

بہرطور میں فراز صاحب کے ساتھ ایک خوب صورت کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوگیا اور اس کے بعد مجھے بیگم شاہ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ بیگم شاہ اس طرح مجھ سے لپٹ کر بلک بلک کر روئیں کہ خود میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ کاش میں سچ مچ زین ہی ہوتا۔ بہرطور اس کے بعد نہ جانے کیا کیا ہنگامے رہے۔ فراز صاحب نے مجھے کہہ دیا تھا کہ میں ہر خطرے سے بے نیاز ہوجاؤں اور جو کوئی بھی مجھے ملے۔ اسے یہ نہ بتاؤں کہ میں زین نہیں ہوں۔ بیگم شاہ ایک لمحے کے لیے بھی مجھے خود سے جدا نہیں ہونے دیتی تھیں۔

عمدہ کھانا، سوٹوں کے انبار، ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ یہ تھی زندگی، اسے زندگی کہتے ہیں۔ میں اجنبی سیاروں کے اجنبی لوگوں کی مانند اجنبی بن گیا تھا۔ کتنا تضاد تھا انسانی زندگی میں، ایک طرف مسائل کے انبار اور دوسری جانب عیش وعشرت کا یہ انداز.....

وقت گزرنے لگا۔ نادرہ مجھ سے شرارتیں کرتی تھی لیکن پھر اچانک سنجیدہ ہوجاتی تھی۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا کہ جو سرتیں میں نے اس گھر کو لوٹا کی ہیں ان کے بارے میں یہ سوچ کر انتہائی خوف محسوس ہوتا ہے کہ وہ عارضی ہیں۔ نادرہ مجھے بھائی جان کہتی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ فراز صاحب خطرناک آدمی تھے اور بارہا میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ میری نگرانی کرتے ہیں۔ یقیناً سوچتے ہوں گے کہ کہیں میں اپنی اس حیثیت سے کوئی ایسا فائدہ نہ اٹھالوں جو ان لوگوں کے لیے نقصان کا باعث بن جائے۔ لیکن مجھے اپنے ان پچاس لاکھ سے غرض تھی۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتا تھا۔ یہ بھی سوچ کا ایک انداز تھا۔ میں ظاہر ہے جرائم پیشہ نہیں تھا کہ کچھ اور پلاننگ کرنے لگتا۔ پچاس لاکھ ہی مل جائیں تو غنیمت ہیں۔

مجھے یہاں آئے ہوئے ایک مہینا اور دس دن گزر چکے تھے۔ اس دوران کبھی بھول کر بھی میں نے اپنے دفتر یا فلیٹ کا رخ نہیں کیا تھا۔ البتہ مکان مالک کو میں نے کرایہ بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دیا تھا تاکہ میرا وہ جھونپڑا برقرار رہے جو میرا سہارا تھا۔ غالباً ایک مہینے کے بعد یہ گیارھواں دن تھا، میں اپنی خوب صورت کوٹھی کے لان میں بیٹھا ہوا نادرہ سے گفتگو کررہا تھا۔ کوٹھی کے صدر گیٹ سے ایک مفلوک الحال سا نوجوان اندر داخل ہوا اور آگے بڑھتا ہوا ہمارے قریب پہنچ گیا۔ میں تو اسے پہچان نہ سکا لیکن نادرہ کے حلق سے ایک دلدوز آواز نکلی۔

"زین بھائی!" اور میں کرسی سے گرتے گرتے بچا۔ بڑھی ہوئی ڈاڑھی، بوسیدہ لباس، الجھے ہوئے بال یقیناً اس کی شخصیت کو بدلنے کا باعث بن گئے تھے لیکن خدوخال پر غور کیا تو مجھے یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ اصل زین ہے۔ میرا کلیجا خون ہوکر رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے زمین گھومتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ زین واپس آگیا تھا۔ نادرہ سسک سسک کر رو رہی تھی اور زین بھی اس سے لپٹا ہوا تھا۔ نادرہ نے مجھے یکسر نظرانداز کر دیا اور زین کو لیے ہوئے کوٹھی کے اندرونی حصے میں پہنچ گئی۔ میں ساکت وجامد اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ یہ عجیب وغریب واقعہ تھا۔ بالکل فلموں کے مانند، کہانی میں ذرا سی تبدیلی ضرور تھی لیکن تھیم وہی تھا۔ اصل شخص آگیا تھا اور نقلی آدمی تنہا رہ گیا تھا۔ لیکن فراز صاحب نے مجھے تنہا نہ چھوڑا۔

بیگم شاہ تو بگڑ ہی گئی تھیں مجھ پر..... اور انہوں نے مجھے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی تھی لیکن خدا بھلا کرے فراز صاحب کا انہوں نے صورت حال کو سنبھال لیا اور پھر تمام تفصیلات ان لوگوں کو بتادیں۔ زین نے میرا شکریہ ادا کیا اور اپنی ماں کی صحت مندی کے سلسلے میں میری کاوشوں کو سراہا، پھر فراز صاحب نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں شیراز صاحب! آپ کے قدم مبارک ثابت ہوئے ہمارا زین ہمیں واپس مل گیا۔ اس سلسلے میں، میں نے آپ سے کچھ وعدے کیے تھے۔ میں ان کی تکمیل کے لیے حاضر ہوں۔ اب آپ اپنی ذمہ داریاں سنبھال سکتے ہیں۔"

"مجھے خوشی ہے، فراز صاحب کہ میں اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے کر واپس جارہا ہوں۔"

"براہ کرم کچھ انتظار کیجیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔" فراز صاحب نے کہا اور میرا رواں رواں مسرت سے کانپنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ فراز صاحب کہاں گئے ہیں۔ پچاس لاکھ روپے کے نوٹوں کی گڈیاں میری نگاہ میں گردش کررہی تھیں۔ بس ایک لمحہ..... اور تقدیر چمکی۔

لیکن تقدیر چمکنے نہ پائی۔ ایک زوردار دھڑدھڑاہٹ نے ہوش وحواس گم کردیے۔ غالباً فراز صاحب پولیس کو لے آئے تھے۔ پچاس لاکھ روپے کے بجائے انہوں نے میری گرفتاری کا انتظام کر دیا تھا۔ میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے دروازے کی جانب دیکھا۔ دھڑدھڑاہٹ پھر ہوئی اور میں ہوش وحواس کی دنیا میں واپس آگیا۔

وہی میرا فلیٹ تھا۔ ٹیپ ریکارڈ آن تھا لیکن کیسٹ ختم ہوچکا تھا اور اس کی سرسراہٹ کی آواز ابھر رہی تھی۔ ہاں یہ میرے جاگتے خواب ہی تھے جنہوں نے مجھے زندگی سے اتنا بیزار کر دیا تھا کہ بعض اوقات مرجانے کو جی چاہتا تھا۔

دروازے پر تیسری بار دھڑدھڑاہٹ ہوئی اور میں گالیاں بکتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ کیا سہانا تصور تھا۔ دروازے پر جو بھی کم بخت ہے کم از کم مجھے پچاس لاکھ روپے تو وصول کرنے دیتا۔ میں نے غصیلے انداز میں آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو مجھے ایک حسین شکل نظر آئی۔

میلے کچیلے لباس، سبک اور نازک نقوش چہرہ گلابی، آنکھیں انتہائی دلکش، سرخ ہونٹ خشک تھے اور آنکھوں میں خوف وہراس کی کیفیت تھی۔ میں ایک لمحے اس پر نگاہیں جمائے رہ گیا۔ عمر اٹھارہ انیس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ابھی وہ کچھ کہنے بھی نہیں پائی تھی کہ دفعتاً سامنے والے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک قوی ہیکل آدمی باہر نکل آیا۔

اس کی مونچھیں لمبی اور نوکیلی تھیں، چہرہ خطرناک،

آنکھیں گہری سرخ۔اس نے خونی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور میں سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔تب وہ آگے بڑھا اور اس نے لڑکی کا بازو پکڑ کر اسے فلیٹ کی جانب گھسیٹتے ہوئے کہا۔

''کیوں تیری موت آگئی ہے حرامزادی! ماری جائے گی بے موت میرے ہاتھوں..... اندر چل.....'' اس نے زور سے لڑکی کو دھکا دیا اور میری غیرت جاگ اٹھی۔ میں دروازے کے قریب آیا۔

''سنیے تو صاحب، سنیے تو.....؟'' میں نے کہا۔

''او جا باؤ، کام کر اپنا۔ دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔'' اس نے خونخوار لہجے میں کہا اور اندر داخل ہو کر دروازہ بند کرلیا۔میں حیرت زدہ سا کھڑا رہ گیا تھا۔

سامنے والا فلیٹ چار پانچ روز تو پہلے خالی ہی تھا۔ پتا نہیں یہ لوگ کب اس میں آگئے تھے مگر یہ شخص، یہ لڑکی.....؟ اس آدمی کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ کتنے زور سے دھکا دیا تھا اس نے لڑکی کو فلیٹ کے اندر.....لڑکی مجھ سے کچھ چاہتی تھی۔ نجانے کیا؟ فلیٹ میں واپس آیا اور دروازے بند کر کے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کون کون سے غم اپنے سینے میں پالوں؟ سر پکڑے بیٹھا رہا۔ عمیز انٹر پرائز کا ڈائریکٹر بھی نہ بن سکا تھا اور نہ ہی زین کی حیثیت سے اپنا رول ادا کرنے کے بعد پچاس لاکھ روپے وصول کر سکا تھا۔ یہ سارا تصور ان خاتون کی بے ہوشی سے پیدا ہوا تھا اور میرے ذہن نے ایک کہانی بن ڈالی تھی۔ ایک ایسی کہانی جو ہر طرح کے جھول سے پاک تھی۔ کوئی بھی مسئلہ نہیں رہ گیا تھا۔ سوائے پچاس لاکھ روپے وصول کرنے کے۔

لعنت ہے مجھ پر، لعنت ہے۔ میں نے زور سے گال پر دو تھپڑ لگائے اور بستر پر لیٹ گیا۔ دوسرے لمحے سامنے والے فلیٹ کی حسین لڑکی کی سوالیہ نگاہیں میرے سامنے آگئیں۔ کون ہے یہ؟ کون ہوسکتا ہے وہ ظالم شخص جو اتنی حسین لڑکی پر ظلم کر رہا ہے۔ یقیناً اس لڑکی کا سوتیلا باپ..... ماں نے باپ کی موت کے بعد اس شخص کے چنگل میں پھنس کر دوسری شادی کرلی ہوگی اور اس شخص نے، جو شکل سے ہی جرائم پیشہ نظر آتا ہے، بیوی کو زہر دے کر ہلاک کر دیا ہوگا اور اس کی بری نیت اس لڑکی پر ہوگی۔ صبح کو یہاں سے سیدھے پولیس اسٹیشن جانا چاہیے اور پولیس افسر کو اس صورت حال سے آگاہ کرنا چاہیے۔

انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور پھر وہ خوب صورت لڑکی جو یقیناً میرے پاس فریاد لے کر آئی ہوگی۔ مجھے یہ بتانے آئی ہوگی کہ وہ اس ظالم شخص کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ میں اس کی مدد کروں یا پھر ہوسکتا ہے.....لڑکی کا باپ کوئی جواری اور شرابی آدمی ہو اور اس نے نشے کی ترنگ میں لڑکی کا ہاتھ اس شخص کے ہاتھ میں دے دیا ہو۔آہ.....!

کیسی دلدوز بات ہے۔اتنی معصوم اور حسین لڑکی، اتنی کم عمر اور خوب صورت..... اور قوی ہیکل بدمعاش اس کا شوہر۔ کیا کرنا چاہیے۔ کوئی ایسی ترکیب سوچوں کہ میں اس لڑکی کی مدد کرسکوں۔

دوسرے دن صبح جب میں باہر نکلا تو سامنے والے فلیٹ میں تالا لگا ہوا تھا۔ کیا یہ صرف میرا تصور تھا۔ کیا میں نے پھر جاگتی آنکھوں کوئی خواب دیکھا تھا؟

لیکن ابھی میں اپنے دروازے کا تالا بھی نہیں لگا سکا تھا کہ دفعتاً بند تالے کے پیچھے ہلکی سی آہٹ ہوئی اور میں چونک پڑا، کوئی اندر موجود تھا..... میں ادھر ادھر دیکھ کر دروازے کے پاس پہنچ گیا پھر میں نے.... دروازے کی جھری سے منہ لگا کر کہا۔

''اندر کون ہے.....؟''

''میں ہوں..... میں..... میں ایک مظلوم لڑکی ہوں۔ اس شخص کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہوں۔ اس نے مجھے اغوا کیا ہے۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے، میری مدد کیجیے۔ خدا کے لیے میری مدد کیجیے۔''

میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس شخص کے بارے میں جو کچھ میں نے سوچا تھا، وہ اس شکل میں نہ سہی لیکن دوسری صورت میں درست تھا۔ لڑکی اس کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر بولا۔

''کیا اس سے تمہاری کوئی رشتہ داری ہے؟ تم اسے پہلے سے جانتی ہو؟''

''یہ بدمعاش اور خطرناک آدمی ہے۔ میں بے سہارا ہوں۔ میرے ماں باپ مر چکے ہیں اور یہ مجھے زبردستی میرے گھر سے اغوا کر کے اس نامعلوم جگہ لے آیا ہے۔ خدا کے لیے میری مدد کرو۔ پتا نہیں، یہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتا ہے۔ یہ مجھے یہاں بند کر کے چلا جاتا ہے اور میں اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ میری مدد کرو۔ خدا کے لیے میری مدد کرو۔''

لڑکی کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔

میں ساکت رہ گیا تھا۔ میں نے کبھی خود کو بہت بہادر آدمی نہیں سمجھا اور لڑائی بھڑائی اور جھگڑوں کے معاملات سے دور ہی بھاگتا رہا ہوں لیکن اس لڑکی کے لیے میرے دل میں ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ اس شخص کی صورت ذہن میں آتی تو وحشت ہونے لگتی، کتنا خوفناک آدمی تھا اور کتنے خطرناک

لہجے میں اس نے کہا تھا کہ میں اپنے کام سے کام رکھوں۔

لڑکی کی سسکیاں اب بھی ابھر رہی تھیں۔ میں اسے کوئی جواب نہیں دے سکا اور خاموشی سے سیڑھیاں اتر کر چلا گیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں؟ دل کہتا تھا کہ پولیس اسٹیشن چلا جاؤں اور تمام صورت حال پولیس کو بتادوں۔ لیکن پھر اندر سے خوف بھی ابھرنے لگا۔ وہ خطرناک آدمی میرا دشمن بن جائے گا اور اس کے بعد نہ جانے وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پولیس اسٹیشن کا رخ تو نہیں کیا لیکن ذہن اسی سوچ میں گم تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ دفتر میں بھی دن بھر دل نہیں لگا تھا۔ شام کو سیدھا فلیٹ پر واپس آیا اور سامنے والے دروازے کو دیکھا۔ تالا کھلا ہوا تھا اور اندر سے آوازیں ابھر رہی تھیں لیکن کوشش کے باوجود اتنی ہمت نہ پڑی کہ میں اس دروازے تک جاتا۔ اپنے فلیٹ کا تالا کھولا اور اندر آگیا۔

معمولات جوں کے توں تھے۔ منہ ہاتھ دھویا۔ دیگچی میں چائے کا پانی چڑھایا، ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور میں اچھل پڑا۔

بہرطور آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو وہی شخص کھڑا ہوا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔ دل تو اس خوف کا شکار تھا کہ کہیں اسے صبح کی گفتگو کے بارے میں معلوم نہ ہوگیا ہو اور اس وقت وہ کسی خطرناک ارادے سے یہاں نہ آیا ہو۔ لیکن اس کی مسکراہٹ بتاتی تھی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بہرطور میں نے سنبھل کر کہا۔

''جی فرمائیے؟''

''باؤ جی! پڑوسی ہوں، آپ کا۔ سامنے والے فلیٹ میں آیا ہوں نیا نیا۔ آپ اکیلے رہتے ہیں جی؟''

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ وہ مجھ سے راہ رسم بڑھانا چاہتا ہے شاید۔ بہرطور لڑکی کی مدد کے سلسلے میں اگر تھوڑی سی چالاکی سے کام لے لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے فوراً ہی اپنا انداز تبدیل کرلیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہاں بھائی اکیلا ہی رہتا ہوں۔ نوکری پیشہ ہوں، دفتر جاتا ہوں، گھر آجاتا ہوں۔ اندر آؤ.....'' وہ ہنستا ہوا اندر آگیا تھا۔

بڑے شہر کی زندگی بھی کیا خوب ہے جی آدمی اور مشین میں کوئی فرق ہی نہیں لگتا۔''

''ہاں بیٹھو۔ میں ذرا چائے نکال لاؤں۔''

''اونہیں جی! اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے؟''

''بن رہی ہے۔'' میں نے کہا اور باورچی خانے میں داخل ہوگیا۔ چائے کی دو پیالیاں بناتے ہوئے میں نے اس سے گفتگو کرنے کے لیے مناسب طریقۂ کار منتخب کرلیا تھا۔ اس سے بات کر کے ہی لڑکی کی مدد کی جاسکتی تھی۔ باہر آکر میں نے ایک چائے کی پیالی اسے دی اور دوسری خود لے کر بیٹھ گیا۔

''تم کہیں باہر سے آئے ہو شاید.....؟''

''ہاں..... جی! نند پور سے آیا ہوں۔'' اس نے کہا اور میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ کم از کم یہ بات اس نے سچ بتائی ہے۔

''کیا یہاں نوکری کی غرض سے آئے ہو؟''

''اور نئیں جی! نوکریاں اتنی آسانی سے کہاں ملتی ہیں۔ ہم تو ویسے بھی زمیندار ہیں جی۔ اپنی زمینیں ہیں، ہل چلاتے ہیں اور زمین سے اپنی روزی حاصل کرتے ہیں مگر باؤ جی کبھی کبھی تقدیر ایسا چکر چلاتی ہے کہ بات سمجھ سے باہر نکل جاتی ہے۔'' اس نے چائے کی پیالی رکھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ میں گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر میں نے کہا۔

''کیوں خیریت۔ کیا بات ہے؟''

''بس باؤ جی محنت مزدوری کر رہے تھے۔ زندگی گزار رہے تھے کہ ایک مصیبت آن پڑی۔ اپنا نام رحیم خان ہے جی۔ اپنے بڑے بھائی بھی تھے..... خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ بھائی اور بھابی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ایک بیٹی ہمارے سر چھوڑ گئے۔ ہم نے شادی کبھی نہیں کی جی۔ بس حالات نے اجازت ہی نہیں دی۔ اس بھتیجی کو پالنے لگے اور محنت مزدوری کر کے یہ کوشش کرنے لگے کہ وہ بڑی ہوجائے اور اس کے ہاتھ پیلے کر کے اپنا فرض پورا کریں۔ دنیا میں اور تھا ہی کون..... بھتیجی جان سے پیاری تھی۔ دوسرے رشتہ داروں میں اور کوئی اتنا سگا نہیں تھا۔ جو اپنی طرف توجہ دیتا۔

بچی ٹھیک ٹھاک پلتی رہی۔ بڑی ہوگئی پر خدا کا کرنا ایسا ہوا جی کہ اچانک ہی اسے ایک زہریلے سانپ نے کاٹ لیا۔ ہم نے اس کا علاج کرایا۔ باؤ جی، جاں تو بچ گئی اس کی، پر زہر دماغ پر چڑھ گیا اور وہ پاگل ہوگئی۔ ہماری جتنی ہمت تھی باؤ جی ہم نے اس کا علاج کرایا۔ مختلف شہروں میں علاج کے لیے مارے مارے پھرتے رہے پر فائدہ کچھ نہ ہوا۔ ہماری زندگی میں کچھ اور تو تھا نہیں، بس یہی بچی اپنا سب کچھ ہے، ہم نے سوچا رحیم خان تیری زندگی میں اور کیا رکھا ہے جس

پودے کو اتنا پروان چڑھایا اس کے لیے اپنی آخری پونجی بھی لگا دے تو باؤجی ہم اس کو یہاں لے آئے ہیں۔ ابھی یہاں رہ رہے ہیں۔ کچھ انتظامات کر رہے ہیں، تھوڑے دنوں کے بعد اسے دماغی اسپتال میں داخل کرا دیں گے۔ بس جی یہ ہے کہانی۔ کبھی کبھی دل جھنجلا جاتا ہے تو اسے برا بھلا بھی کہہ دیتے ہیں۔ پھر گھنٹوں آنسو بہانے پڑتے ہیں۔'' اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں اور میں اپنے آپ پر نادم ہو رہا تھا۔

کیا دماغ کی خرابی ہے۔ یہ الٹے سیدھے خوابوں نے تو مجھے پاگل کر کے رکھ دیا ہے اور شاید وہ دن دور نہیں ہوگا، جب میرا بھی کوئی عزیز میرے لیے اس طرح بیٹھا رو رہا ہو۔ ممکن ہے تایا جان کو اطلاع مل جائے کہ چچیاتی کا رلانے کا دعوے دار ایک اسپتال میں پڑا ہوا ہے، بلاوجہ میں نے اس بے چارے کے بارے میں نہ جانے کیا کیا ہوائی قلعے بنا لیے تھے۔ یہ تو اچھا خاصا معقول آدمی تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ خوب صورت لڑکی پاگل ہے اور ذہنی طور پر بیمار اور اسی بیماری کے عالم میں اس نے یہ تمام بکواس کی تھی۔ بہرطور میں نے اس شخص کا دل دکھانا مناسب نہ سمجھا اور اسے پیشکش کی کہ اسے میری جس طرح بھی مدد کی ضرورت ہو۔ میں حاضر ہوں۔ اس نے کلائی کی آستین سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

''بس باؤجی دعا کرو کہ ہمارا مقصد پورا ہو جائے۔ تھوڑا سا کام باقی رہ گیا بس انتظار کر رہے ہیں۔ چند دن کے بعد اسے اسپتال میں داخل کرا دیں گے اور پھر اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کریں گے۔ زیادہ وقت لگا تو پھر واپس چلے جائیں گے اور اگر ڈاکٹروں نے کچھ امید دلائی تو پھر باؤجی اس وقت تک یہیں پڑے رہیں گے جب تک یہ ٹھیک نہ ہو جائے۔''

''تم فکر نہ کرو، رحیم خان۔ تمہاری بھتیجی یقیناً ٹھیک ہو جائے گی۔'' رحیم خان تھوڑی دیر تک میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ اتنا برا آدمی نہیں تھا جتنا میں نے سمجھا تھا۔ بعض صورتیں دھوکا دیتی ہیں۔ میں اس کے لیے دل میں کافی ہمدردی محسوس کرتا رہا۔

دوسرے دن جب میں دفتر جانے کے لیے اپنے گھر کے دروازے کو تالا لگا رہا تھا تو اس دروازے پر پھر آہٹ سنائی دی۔ دروازے پر باقاعدہ دستک دی جا رہی تھی اور میں جانتا تھا کہ دروازے پر دستک دینے والا کون ہے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور دروازے پر پہنچ گیا۔

''ہاں..... کہو کیا بات ہے؟''

''بابو جی! آپ نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ میں تو سارا دن انتظار کرتی رہی۔ میں تو یہی سوچتی رہی کہ شاید آپ کے دل میں میرے لیے رحم آ جائے اور آپ میری مشکل آسان کر دیں۔ خدا کے لیے بابو جی! میں آپ کی زندگی بھر احسان مند رہوں گی۔ مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دیں۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔'' آواز میں ایک ایسا سوز تھا کہ میرا ذہن پھر ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ یہ الفاظ کسی پاگل لڑکی کے تو نہیں ہو سکتے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''تمہارا کیا نام ہے؟''

''مہ جبیں! میں آپ کو کس نام سے پکاروں بابو جی؟''

''میرا نام شیراز ہے، مہ جبیں..... تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''مر رہی ہوں، زندگی کے عذاب میں گرفتار ہوں۔ اس خوف کا شکار ہوں کہ نہ جانے میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔ انسانیت کے نام پر میری مدد کیجیے بابو جی۔ میں آپ کی غلام بننا پسند کروں گی۔ بابو جی اس شخص کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ یہ مجھے دھمکیاں دیتا رہتا ہے، کہتا ہے کہ اگر میں نے کسی کے سامنے زبان کھولی تو میری گردن دبا دے گا۔ خدا کے لیے بابو جی خدا کے نام پر.....''

میرے ذہن میں انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ ایک طرف رحیم خان تھا جس کا کہنا تھا کہ یہ اس کی بھتیجی ہے اور دوسری طرف مہ جبیں جو اسے ایک غنڈا بتاتی تھی۔ اب اگر پولیس سے رابطہ قائم کیا جائے اور میری دی ہوئی اطلاع غلط نکلے تو پھر خوامخواہ پریشان ہونا پڑے گا اور اگر لڑکی کی فریاد کو نظرانداز کر دیا جائے تو ضمیر کچوکے دینے لگتا تھا۔

دوسرے دن بھی شام کو رحیم خان سے ملاقات ہوئی۔ وہ دستک دے کر خود ہی میرے پاس آیا تھا۔ کچھ تعویذ اس کی مٹھی میں تھے۔ کہنے لگا..... ان کوششوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنی بھتیجی کے لیے پیروں فقیروں کے درباروں میں بھی جاتا ہے اور تعویذ گنڈے کراتا رہتا ہے، کہیں سے ہی کچھ ہو جائے۔

میں نے ایک بات محسوس کی کہ رحیم خان کی آواز میں تشویش تو ہوتی تھی لیکن کچھ عجیب سا انداز ہوتا تھا اس کا۔ بہت الجھنوں میں پڑ گیا تھا میں ان دنوں۔ مہ جبیں بھی روزانہ اس وقت کا انتظار کرتی تھی جب میں اپنے دروازے کو تالا لگاؤں۔ ایک دن اس نے یہ بات کہہ بھی دی۔

''شیراز تم، میرے بارے میں کچھ سوچو یا نہ سوچو لیکن نجانے کیوں تمہارے قدموں کی آہٹ میرے لیے زندگی کا پیغام بن جاتی ہے اور میں اس وقت کا انتظار کرتی ہوں جب تمہارے دروازے پر دستک ہو اور تم باہر نکلو، شاید میری تقدیر

میں وہی سب کچھ لکھا ہے جو وہ شخص چاہتا ہے۔ میں اب تم سے دوبارہ مدد کی درخواست نہیں کروں گی۔ کرنا ہوتا تو تم پہلے ہی میرے لیے کچھ کر بیٹھتے، لیکن ایک بات یاد رکھنا شیراز تمہارا ضمیر ہمیشہ تمہیں پریشان کرتا رہے گا کہ ایک مظلوم لڑکی تم سے مدد کی درخواست کرتی رہی اور تم نے اس کے لیے کچھ نہ کیا.....''

میں خاموش رہا، لیکن اس کے یہ الفاظ دن بھر میرے ذہن پر ہتھوڑے کے مانند برستے رہے اور میں کرب واذیت کا شکار ہو گیا۔ اس دن پھر میں نے شام کو نذیر کے شوروم کا رخ کیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا۔

''کہاں رہے بھئی اتنے دن شیراز؟ ہم تو روزانہ ہی تمہارا انتظار کرتے ہیں۔ نکل آیا کرو یار، آج کل تو ویسے بھی کاروبار کچھ مدھم پڑا ہوا ہے۔''

''نذیر میری کچھ مدد کرو۔'' میں نے کہا اور نذیر سنبھل کر مجھے دیکھنے لگا۔

''خیریت، کیا بات ہے؟''

میں نے نذیر کو تمام تفصیل سنا دی۔ وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ''واقعی الجھن والی بات ہے، غلط اطلاع پر پولیس بھی بگڑ جاتی ہے اور پھر رحیم خان، وہ کیا سوچے گا تمہارے بارے میں۔ بہتر یہی ہے کہ خاموشی اختیار کرو اور صورت حال کا جائزہ لیتے رہو۔''

نذیر بھی مجھے کوئی تسلی بخش مشورہ نہیں دے سکا تھا۔

سات ساڑھے سات بجے جب میں فلیٹ واپس پہنچا تو لوگ غیر معمولی طور پر اس بلڈنگ کے اردگرد جمع تھے میں جس میں رہتا تھا یقیناً کوئی خاص واقعہ ہو گیا تھا..... میں پہنچا تو میرے نچلی منزل کے ایک پڑوسی نے بتایا۔

''کمال ہے شیراز صاحب! آپ کو پتا بھی نہیں چل سکا اور وہ بدمعاش یہاں اپنی من مانی کرتا رہا۔ آپ کا دروازہ تو اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے ہے۔''

''کیا ہوا، کیا بات ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

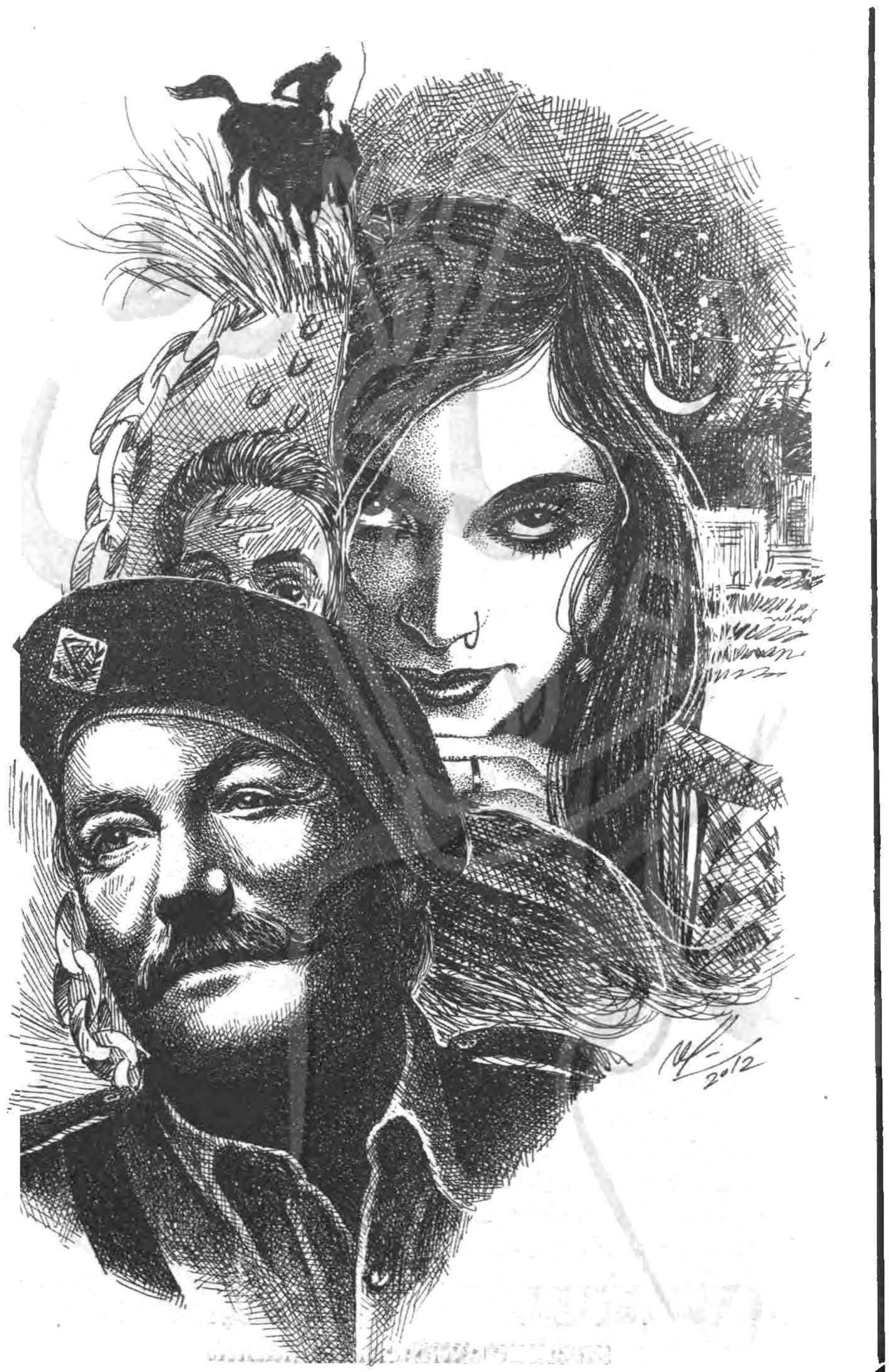
میرے دوسرے پڑوسی نے کہا۔

''پولیس انسپکٹر آپ کا نام بھی لکھ کر لے گیا ہے اور کہہ گیا ہے کہ آپ جب بھی آئیں، تھانے پہنچ جائیں۔'' میرے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ بہرطور معلومات کرنے پر پتا چلا کہ رحیم بخش بردہ فروشوں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور وہ ایک لڑکی کو اغوا کر کے یہاں لے آیا تھا اور اسے فروخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آج جب چند لوگ لڑکی کو دیکھنے کے لیے یہاں پہنچے تو پولیس بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی آ گئی کیونکہ ان میں سے چند افراد پولیس کی نگاہوں میں مشتبہ تھے۔ اس طرح رحیم خان بھی پکڑا گیا اور لڑکی بھی برآمد ہو گئی۔

میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ مہ جبیں سچ کہتی تھی۔ مجھ سے کوتاہی ہوئی اور میں اس کی دادرسی نہ کر سکا۔ میرے سینے میں نہ جانے کیسے جذبے پیدا ہو گئے۔ میں پولیس اسٹیشن پہنچا اور میں نے پولیس انسپکٹر کو تمام تفصیلات بتا دیں۔ پولیس انسپکٹر نے میرا بیان نوٹ کر لیا۔ مہ جبیں کو دارالامان پہنچا دیا گیا اور رحیم خان اور اس کے ساتھیوں کو پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس مقدمے میں، میں خاص گواہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ بہرطور مہ جبیں کے لیے میرے دل میں کافی ہمدردی پیدا ہو چکی تھی۔ میں نے نذیر سے مشورہ کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ مہ جبیں کو دارالامان سے نکال لیا جائے۔ میں مہ جبیں کو اپنی زندگی میں جگہ دینے کو تیار ہو گیا تھا اور پھر اس سلسلے کی تمام کارروائیاں کرنے کے بعد ایک شام نذیر کے گھر پر میرا اور مہ جبیں کا نکاح ہو گیا اور میں مہ جبیں کو اپنی دلہن بنا کر اس چھوٹے سے فلیٹ میں لے آیا۔

مہ جبیں بے حد خوش تھی اور میرے اور اس کے درمیان بڑے اچھے معاملات چل رہے تھے۔ بیوی کی حیثیت سے وہ بلاشبہ انتہائی نیک اور سگھڑ عورت ثابت ہوئی تھی لیکن رفتہ رفتہ میں مالی مشکلات کا شکار ہونے لگا۔ اب اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ پھر اس کے بعد ہمارے ہاں، فرخ شیراز پیدا ہوا۔ فرخ کے بعد خرم شیراز اور خرم شیراز کے بعد شاہ رخ شیراز اور شاہ رخ کے بعد اس خواب سے جاگ جانا چاہتا تھا چونکہ یہ خواب کچھ ضرورت سے زیادہ ہی بھیانک اور طویل ہوتا جا رہا تھا۔

میں اکثر شام کی تنہائیوں میں اپنے گالوں پر زوردار تھپڑ لگایا کرتا تھا کہ اس خواب سے جاگ جاؤں جو جاگتی آنکھوں کا خواب تھا لیکن میرے دوستو میرے ہمدردو! یہ آخری خواب، خواب نہیں حقیقت ہے۔ نجانے میں نے کس عالم میں یہ جذباتی حماقت کر ڈالی۔ غالباً اس تصور کے ساتھ کہ میں پھر جاگتی آنکھوں کو کوئی خواب دیکھ رہا ہوں..... لیکن نہ تو مہ جبیں خواب ہے اور نہ فرخ، خرم نہ شاہ رخ، مہ جبیں زرخیز ہے اور پتا نہیں ابھی وہ کتنی نوازشیں کرے گی؟ کسی چچیاتی کار میں واپس تایا جی کے پاس جانا بھی اب ایک جاگتی آنکھوں کا خواب بن گیا ہے۔ تایا جی کا قرض حسنہ جوں کا توں ہے۔ اب تو اس کی ادائیگی کا تصور بھی ختم ہو گیا ہے۔ بس جی دعا کریں میرے حق میں کہ مجھ کو پوشیدہ دولت ملے یا نہ ملے لیکن یہ نوازشیں مجھ پر بند ہو جائیں۔



پردہ نشین

ملک صفدر حیات

بات جب تک پردے میں رہے تب تک بظاہر خیریت بھی رہتی ہے مگر... بہ قول شخصے "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی" بالخصوص جب ملک صفدر کے پاس کیس ہو اور مجرم پردہ کیے چین کی بانسری بجاتا رہے، ایسا کہاں ممکن ... لہو جب تک رگوں میں دوڑے زندگی بھی دوڑتی ہے اور جب زمین پر بہے تو کتنے ہی دامن رنگین کرجاتا ہے ... اور یہ رنگینی خواہ دامن کی ہو یا لمحات کی بعض اوقات بڑی سنگین صورتِ حال سے دوچار کردیتی ہے۔ وہ جو شکار کرنے نکلے تھے جب خود شکار ہوئے تو احساس ہوا کہ قیدِ تنہائی کس قدر بڑا عذاب ہے۔

گاؤں کی خاموش فضاؤں میں بہتے لہو کی چیخ و پکار

وہ ایک ٹھٹھرتی ہوئی گھپ اندھیری رات تھی۔

میں معمول کے کاموں سے فارغ ہوکر سونے کے لیے لیٹا تو دستک کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ اس وقت رات کے دس بجے کا عمل تھا۔ موسم کی مناسبت سے اتنی رات گئے کسی کا میرے کوارٹر کے دروازے پر دستک دینا کسی خطرناک اطلاع کے آثار ہی تھے۔ بہرحال میں نے گرم بستر چھوڑا اور ٹھنڈے ٹھار صحن میں سے گزر کر کوارٹر کے بیرونی دروازے پر پہنچا۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ شبینہ ڈیوٹی والے عملے میں سے کوئی آیا ہوگا۔

دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے احتیاطاً پوچھ لیا۔

"کون ہے بھئی؟"

میں توقع کررہا تھا کہ جواب میں کوئی مردانہ آواز سنائی دے گی لیکن کیا مردانہ، کیا زنانہ..... کوئی آواز میری سماعت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ میں نے دوبارہ قدرے بلند آواز میں پکارا۔

"اتنی رات کو کون آیا ہے بھئی.....؟"

اس مرتبہ بھی میری آواز صدا بہ صحرا ہی ثابت ہوئی۔ باہر بہ دستور خاموشی طاری تھی۔ ایسی بات نہیں تھی کہ میں دروازہ کھولتے ہوئے کسی قسم کا ڈر یا خوف محسوس کررہا تھا، جب میری دوسری پکار بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی تو میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

باہر مجھے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ تاحدِ نگاہ تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ میں نے گھور گھور کر اندھیرے میں کسی انسانی چہرے کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے اپنی اس کوشش میں ناکامی کا منہ ہی دیکھنا پڑا۔

میرا سرکاری کوارٹر تھانے کے عقبی حصے میں بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد دور تک سرسبز و شاداب کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے تھوڑی سی مٹرگشت کرکے کوارٹر کے دونوں پہلوؤں میں اچھی طرح جھانک کر دیکھ لیا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ جی میں ایک خیال یہ بھی آیا کہ تھانے کے اندر جاکر

صورتِ حال کا جائزہ لیتا ہوں لیکن پھر میں نے فوراً ہی اس خیال کو مسترد کر دیا اور دروازے کو کنڈی لگا کر دوبارہ بستر میں گھس گیا۔

میں سونے کے لیے لیٹ تو گیا تھا، تاہم ذہن اسی دستک کی طرف لگا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے یہ سوچ بھی ذہن میں ابھری تھی کہ یہ میرا وہم بھی تو ہوسکتا ہے۔ اس رات برفیلی ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ ممکن ہے، کوارٹر کا دروازہ ہوا کے تیز جھونکے سے بجا ہو۔

میں اس سوچ پر چند لمحے بھی نہیں رک پایا تھا کیونکہ میں اس آواز کو ہوا کی کارستانی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہوا کی وجہ سے دروازہ بجنا اور کسی انسان کے ہاتھ کی دستک میں نمایاں فرق ہوتا ہے اور میں نے بڑی واضح دستک کی آواز سنی تھی۔

میں اپنے دماغ میں بکھری مختلف النوع سوچوں سے کافی دیر تک الجھتا رہا، پھر پتا نہیں کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح، پچھلی رات کے موسمی تاثرات ہی کا عکس تھی۔ سورج کا کہیں نام ونشان نظر نہیں آتا تھا۔ گہری دھند نے فضا کی ہر شے کو اپنی آغوش میں چھپا رکھا تھا۔ بہ قول شخصے، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ دھند کا سلسلہ گزشتہ کئی روز سے جاری تھا۔ اگرچہ دن کے وسطی حصے میں کبھی کبھار سورج اپنی موجودگی ظاہر کرنے کے لیے بادلوں کی اوٹ سے ہلکی پھلکی جھلک دکھا دیتا تھا لیکن اس کی تمازت ماحول کے حصے میں نہیں آتی تھی۔ ان دنوں ہر شے شدید سردی کی لپیٹ میں تھی۔ وہ جنوری کا مہینا تھا اور لگتا تھا، اب ہمیشہ جنوری ہی رہا کرے گا۔

میں نے حسبِ معمول ناشتا اپنے کوارٹر میں کیا پھر تیار ہو کر تھانے پہنچ گیا۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو رات والا واقعہ میرے ذہن میں تازہ تھا اور اب وہ سوچ کے رتھ پر سوار ہو کر میرے ساتھ ہی تھانے آ گیا تھا۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر شبینہ ڈیوٹی والے اے ایس آئی کو اپنے پاس بلا لیا۔ مطلوب حسین میرے سامنے آ کر ایک کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''رات کیسی گزری مطلوب حسین؟''

''بڑی اچھی جناب.....!'' اس نے جواب دیا۔

''تھوڑی بہت نیند بھی لی یا ساری رات آنکھوں ہی میں کاٹ دی؟''

''رات کے آخری پہر دو تین گھنٹے کے لیے سویا تھا جناب!'' اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔

''پھر اذان کے ساتھ ہی آنکھ کھل گئی تھی۔''

''رات کے آخری پہر.....'' میں نے اس کے کہے ہوئے الفاظ میں سے ایک ٹکڑا زیرِلب دہرایا پھر پوچھا۔

''آدھی رات کے تو بعد ہی سوئے ہوگے تم؟''

''جی بالکل.....'' وہ الجھن زدہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں لگ بھگ دو بجے سونے کے لیے لیٹا تھا۔''

''ہوں.....!'' میں نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا پھر پوچھا۔ ''رات تھانے کے اندر تو سب خیر خیریت رہی تھی نا.....کوئی ناخوش گوار واقعہ تو پیش نہیں آیا تھا؟''

''بالکل نہیں ملک صاحب!'' اس کے تجسس کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ ''ادھر تو سب امن امان ہی رہا ہے۔'' اس نے تشویش ناک لہجے میں بتایا پھر پوچھا۔ ''یہ آپ آج روٹین سے ہٹ کر کیوں باتیں کر رہے ہیں؟ پہلے تو آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا۔''

''پہلے کبھی میرے ساتھ بھی تو ایسا نہیں ہوا ہے نا۔'' میں نے کہا۔

''آپ کے ساتھ ایسا کیا ہوگیا ہے ملک صاحب؟'' اس نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

اس کے استفسار کے جواب میں، میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے رات والے ''دستک'' واقعے سے آگاہ کر دیا۔ اے ایس آئی مطلوب حسین نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور سرسری انداز میں بولا۔

''ملک صاحب! رات کو کافی ٹھنڈی اور تیز ہوائیں بھی تو چل رہی تھیں۔ ہوسکتا ہے آپ کی سماعت کو دھوکا ہوا ہو۔ ہوا کے دباؤ سے بجنے والے دروازے کی آواز کو آپ نے دستک کی آواز سمجھ لیا ہو۔''

''ایسا خیال ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں بھی آیا تھا مطلوب حسین!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا کیونکہ.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے گہری نظر سے اے ایس آئی کو دیکھا پھر جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ میری سماعت ہوا سے بجنے والے دروازے اور دستک کی مخصوص آواز میں بہ خوبی فرق کرنا جانتی ہے۔''

اے ایس آئی نے مجھ سے الجھنے کے بجائے بڑے تحمل سے کہا۔ ''پھر آپ کے خیال میں وہ کون ہوسکتا ہے؟''

''اگر میرا خیال اس سلسلے میں راہنمائی کر دیتا تو اس

وقت میں تم سے سوال وجواب نہیں کر رہا ہوتا مطلوب حسین!'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

''میرا تو ذہن ہی کام نہیں کر رہا جناب!'' وہ بے بسی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے بڑی عجیب وغریب کہانی سنائی ہے۔''

''تمہارا ذہن شاید اس وقت ایک بھرپور نیند کا تقاضا کر رہا ہے مطلوب حسین!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''اس لیے تم گھر جا کر آرام سے سو جاؤ۔''

وہ میرے حکم کی تعمیل میں فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اس نے مجھے سیلوٹ کیا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔

ان دنوں میں ایک چھوٹے سے قصبے فیروز آباد کے تھانے میں بہ طور انسپکٹر تعینات تھا اور اس تھانے کا چارج مکمل طور پر میرے پاس تھا لہٰذا میں تھانا انچارج اور تھانے دار بھی کہلاتا تھا۔ تھانے کا عملہ مختصر سا تھا۔ میرے علاوہ ایک اے ایس آئی مطلوب حسین، ایک حوالدار رجب علی اور چار کانسٹیبلو اصغر علی، امین، آصف اور عمران اس عملے کا حصہ تھے۔ ان میں سے مطلوب حسین اور کانسٹیبل امین مقامی تھے یعنی ان کا تعلق فیروز آباد ہی سے تھا اسی لیے میں نے اے ایس آئی کو گھر جا کر آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ قصبہ چھوٹا سا تھا، تھانا محدود سا اور عملہ مختصر سا تھا اور اسی ''سا، سا، سا'' کے ساتھ مجھے تھانے داری کرنا تھی۔

اے ایس آئی مطلوب حسین کو میرے کمرے سے نکلے بہ مشکل پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ کانسٹیبل امین گھبرایا ہوا میرے پاس آیا۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

''کیا ہوگیا ہے بھئی؟''

''ملک صاحب! قتل کی ایک واردات ہوگئی ہے جناب.....!'' اس نے چڑھی ہوئی سانس کے ساتھ بتایا۔

''کہاں.....؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''ادھر کھیتوں میں.....'' اس نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے کوارٹر کے پچھواڑے.....''

تھانے کے پچھواڑے میرا کوارٹر واقع تھا اور میرے کوارٹر کے پچھواڑے لہلہاتے ہوئے سرسبز کھیت۔ میں نے کانسٹیبل کی گھبراہٹ کے پیشِ نظر جلدی سے پوچھا۔

''قتل کون ہوا ہے؟''

میں بہ ظاہر کانسٹیبل امین سے سوال وجواب کر رہا تھا لیکن لاشعوری طور پر میں اس معاملے کو رات والے دستکی واقعات کے ساتھ نتھی کرنے میں مصروف تھا اور لاشعوری طور پر ہی مجھے کنفرم بھی ہوگیا تھا کہ یہ دونوں واقعات کسی ایک ہی سنسنی خیز سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

''وہ کوئی نوجوان عورت ہے جناب.....!'' کانسٹیبل نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''گوری چٹی اور خوبصورت عورت.....''

''کیا تم اس عورت کی لاش بھی دیکھ آئے ہو؟'' میں نے اسے گھورا۔

''نہیں جناب! مجھے تو خادم حسین نے بتایا ہے۔''

''خادم حسین کون؟''

''جس کے کھیت میں قتل کی واردات ہوئی ہے۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ''وہی اس واقعے کی اطلاع دینے آیا ہے جناب۔ خادم حسین باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے۔''

''اسے فوراً میرے پاس لے آؤ.....'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

کانسٹیبل امین نے فوراً سے پیشتر میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

اگلے ہی لمحے زمیندار خادم حسین میرے سامنے تھا۔

☆☆☆

خادم حسین قصبہ فیروز آباد کا ایک چھوٹا زمیندار تھا جس کے پاس صرف پانچ ایکڑ زرعی اراضی تھی۔ ان پانچ میں سے چار ایکڑ پر وہ موسم کی مناسبت سے مختلف اناج اگایا کرتا تھا اور پانچواں ایکڑ اس نے اپنے شوق کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ پانچویں ایکڑ جس میں اس نے چار آم کے، دو جامن کے، دو شہتوت کے، دو امرود کے، دو کینو کے اور دو انار کے پیڑ لگا رکھے تھے۔ باقی بچ رہنے والی زمین پر اس نے مختلف سبزیاں کاشت کر رکھی تھیں۔ وہ فروٹ، سبزی اور مختلف اناج کے حوالے سے خود کفیل تصور کیا جاتا تھا۔

میں، کانسٹیبل امین کو اپنے ساتھ رکھ کر خادم حسین کے ساتھ فوراً جائے وقوعہ پر پہنچ گیا تھا۔ درجن بھر سے زیادہ افراد پہلے سے وہاں موجود تھے۔ میں نے سب کو ایک طرف ہٹایا اور مذکورہ نوجوان عورت کی لاش کے قریب چلا گیا۔

کانسٹیبل امین نے غلط نہیں بتایا تھا۔ وہ واقعی ایک حسین وجمیل اور گوری چٹی عورت تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، اس کی عمر پچیس اور ستائیس کے درمیان کہیں کھڑی تھی۔ اسے گردن کاٹ کر بڑی بے دردی

سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس نے سرخ رنگ کا گرم جوڑا پہن رکھا تھا جو جگہ جگہ سے اپنی تباہی و بربادی کی داستان سنا رہا تھا۔ اس کے بدن کے بعض حصے قابل اعتراض حد تک کھلے ہوئے تھے۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ موت کے گھاٹ اتارنے سے قبل، کسی کھلونے کے مانند اس کے بدن سے کھلواڑ کیا گیا تھا۔ وہ ایک سو ایک فی صد اس دنیا سے اس دنیا میں منتقل ہو چکی تھی۔

میں اکڑوں بیٹھ کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔

پہلی ہی نظر میں ایک چبھتی ہوئی حقیقت نے مجھے چونکا دیا۔ اس زمین نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرلی جہاں اس عورت کی لاش پڑی تھی اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ زمین کا وہ حصہ خون کے آثار سے قطعی پاک تھا۔ کسی شخص کی گردن کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا جائے اور اس کے بدن سے خون کا ایک قطرہ نہ ٹپکے یہ تو ایسے ہی تھا جیسے یونائیٹڈ اسٹیٹس کا کیپٹل ٹو کیو یا بندر کے بارہ سینگ.....!

مذکورہ عورت کو جتنی بے دردی اور سفاکی سے قتل کیا گیا تھا، اس کے نتیجے میں تو اس بدنصیب کے نرخرے سے خون کا ایک فوارہ پھوٹ جانا چاہیے تھا لیکن اس کھیت کی زمین اپنے سینے پر ایک بوند کا تمغا بھی نہیں سجائے ہوئے تھی۔ اس کا صرف اور صرف ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ اس بدبخت عورت کو کسی اور مقام پر قتل کیا گیا تھا اور بعدازاں اسے اٹھا کر خادم حسین کے کھیت میں پھینک دیا گیا تھا، وہ کھیت جس کی بیشتر فصل کاٹی جاچکی تھی۔ اس کی لاش فصل سے پاک زمین پر پڑی تھی۔

''تم میں سے کوئی شخص اس عورت کو جانتا ہے؟'' میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور وہاں موجود لوگوں کے چہروں کو باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کون ہے یہ.....؟''

کسی جانب سے اثبات میں جواب نہیں آیا۔ میرے سوال پر بیشتر افراد کی گردنوں نے نفی میں حرکت کی تھی اور یہی انکار بعض کی زبان سے بھی سننے کو ملا جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اس بدنصیب مقتول کا تعلق قصبہ فیروز آباد سے نہیں تھا۔

میں نے اس کھیت کے مالک خادم حسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''خادم حسین! کہیں سے چادر کا بندوبست کرواور پہلی فرصت میں اس لاش کو ڈھانپ دو۔''

خادم حسین میرے حکم کی تعمیل میں ایک طرف گیا اور دو منٹ کے بعد وہ ایک گرم شال کے ساتھ واپس آگیا۔ میں نے خادم حسین کی مدد سے مقتول کی لاش کو ڈھک دیا اور اتمام حجت کے طور پر ایک مرتبہ پھر وہاں موجود لوگوں سے اس کے بارے میں استفسار کیا لیکن اس بار بھی کوئی نیا جواب سامنے نہیں آیا جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ اس عورت کی بدبختی اسے کہیں اور سے اٹھا کر فیروز آباد لے آئی تھی۔

اس مقتول عورت کو کوئی جانتا تھا یا نہیں لیکن مجھے تو موقع کی کارروائی مکمل کرنا تھی۔ یہ تحقیق اور تفتیش بعد کے مراحل تھے کہ وہ کون تھی، کہاں سے آئی تھی اور اسے کس نے قتل کیا تھا.....؟

دیگر لوگوں کے علاوہ کانسٹیبل امین نے بھی اس امر کی تصدیق کردی تھی کہ وہ طرح دار عورت موضع فیروز آباد کی رہنے والی نہیں تھی۔ اس نے پہلے کبھی اس عورت کو قصبے میں نہیں دیکھا تھا۔

میں نے ضروری کارروائی سے نمٹنے کے بعد مقتول کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے امین کی نگرانی میں ضلعی اسپتال بھجوادیا پھر اس کھیت کے مالک خادم حسین سے سوال وجواب میں مصروف ہوگیا۔

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا اور وہ یہ کہ آلۂ قتل کی تلاش میں بھی میں نے جائے وقوعہ اور اس کے آس پاس کا علاقہ اچھی طرح دیکھ ڈالا تھا لیکن میری توقع کے عین مطابق آلۂ قتل مجھے کہیں بھی پڑا نہیں ملا تھا۔ مجھے اس بات کا تو سو فی صد یقین تھا کہ اس عورت کو کسی اور جگہ پر موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد یہاں لاکر کھیتوں میں پھینک دیا گیا تھا لہٰذا آلۂ قتل کا جائے وقوعہ پر پایا جانا بعید از قیاس ہی تھا۔ البتہ ایک بات طے تھی کہ اسے کسی تیز دھار آلے کی مدد سے قتل کیا گیا تھا مثلاً کسی خنجر یا چھری سے۔

خادم حسین کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ مضبوط ہاتھ پاؤں کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا۔ رنگت گہری گندمی مگر سانولی ہرگز نہیں تھی۔ پچاس کا ہندسہ عبور کرنے کے باوجود بھی وہ صحت مند، توانا اور چاق وچوبند دکھائی دیتا تھا اور اس صحت وتندرستی کا واحد راز تھا، محنت اور مشقت۔ وہ زمینداری کے کام میں کسی کی مدد نہیں لیتا تھا بلکہ اپنے کھیتوں کے تمام زرعی معاملات وہ خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیتا تھا۔

میں نے خادم حسین سے پوچھا۔ ''چاچا! تم نے اس عورت کی لاش کو کب دریافت کیا تھا..... میرا مطلب ہے، تم نے اسے کب دیکھا تھا؟''

''جناب! میں دریافت کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اور جہاں تک آپ کے

سوال کا تعلق ہے تو..... اس عورت کی لاش کو سب سے پہلے دینو کمہار نے دیکھا تھا۔''

''یہ دینو کمہار کون ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''دینو کا اصل نام دین محمد ہے جی!'' خادم حسین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ادھر قصبے ہی میں رہتا ہے جناب!''

''کیا دینو اس وقت یہاں موجود ہے؟''

جواب دینے کے بجائے اس نے وہاں موجود لوگوں پر ایک متلاشی نگاہ ڈالی پھر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا ''جی..... دینو وہ ادھر کھڑا ہے۔''

میں نے خادم حسین کے اشارے کا نگاہی تعاقب کیا اور بہ آواز بلند پکارا۔ ''دینو بابا! یہاں آجاؤ۔''

اگلے ہی لمحے میرا اندازہ کچھ غلط ثابت ہوگیا جب دو درجن افراد کے مجمع میں سے ایک سانولا سا نوجوان نکل کر میری جانب قدم بڑھانے لگا۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ دینو کمہار اچھی خاصی عمر کا کوئی بندہ ہوگا جبھی میں نے اسے ''دینو بابا'' کہہ کر اپنے پاس بلایا تھا۔ بہرحال، کبھی کبھی انسان کا اندازہ الٹ بھی جاتا ہے۔

میں نے خادم حسین کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا ''جب تمہیں دینو نے اس عورت کی لاش کے بارے میں بتایا اس وقت تم کہاں تھے؟''

''میں گھر سے نکل کر اپنے کھیتوں کی طرف آرہا تھا جناب عالی!'' وہ مجھے تفصیل سے آگاہ کرنے لگا ''آج کل میں اپنی فصل کی کٹائی میں لگا ہوا ہوں۔ کل ایک کھیت میں کٹائی کا کام ادھورا چھوڑ گیا تھا، میں اسے مکمل کرنے کے لیے ہی آیا تھا لیکن ابھی میں اپنے کھیتوں سے دو تین سو گز دور ہی تھا کہ اسی جانب سے میں نے دینو کمہار کو آتے ہوئے دیکھا.....'' وہ سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ مجھے بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی یہ بول پڑا اور اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ مجھے بتایا کہ ادھر میرے کھیتوں میں کسی عورت کی گردن کٹی لاش پڑی ہے۔ میں اس کے ساتھ اپنے کھیتوں میں پہنچ گیا اور پھر میں نے اپنی آنکھوں سے اس بدنصیب عورت کی لاش دیکھ لی۔''

''پھر تم نے کیا، کیا؟'' وہ اپنی بات مکمل کرکے خاموش ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

''جناب! میں تو بہت پریشان ہوگیا تھا۔'' خادم حسین نے جواب دیا۔ ''اس وقت جتنے بھی لوگ آس پاس کے کھیتوں میں کام کررہے تھے، وہ جمع ہوگئے اور ہم سب اس عورت کی دردناک موت کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔ وہ ہم سب کے لیے قطعی اجنبی تھی۔ ہم میں سے کوئی بھی اسے جانتا یا پہچانتا نہیں تھا۔ اس واقعے کی خبر گاؤں کے اندر بھی پہنچ گئی تھی اور لوگ عورت کی لاش کو دیکھنے کے لیے کھیتوں میں آنے لگے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہاں اچھا خاصا رش لگ گیا۔ اسی وقت کسی ہمدرد نے مجھے مشورہ دیا.....'' یہاں تک بتانے کے بعد خادم حسین نے لمحاتی توقف کیا پھر ایک گہری سانس چھوڑنے کے بعد بولا۔

''اس نے سمجھانے والے انداز میں مجھے مشورہ دیا کہ میں فوراً تھانے جاکر اس واقعے کی اطلاع دوں۔ عورت کی لاش میرے کھیتوں میں پڑی ہے۔ اگر میں نے تھانے میں رپورٹ نہ کی تو الٹا کسی وبال میں آجاؤں گا۔ بس جناب! پھر میں تھانے پہنچ گیا۔''

''یہ نیک مشورہ دینے والا تمہارا ہمدرد کون تھا؟'' میں نے دریافت کیا۔

اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''جناب! اس وقت تو مجھے یاد نہیں آرہا۔''

''ٹھیک ہے.....'' یہ کہتے ہوئے میں دینو کمہار کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''جب یاد آجائے تو مجھے بتادینا خادم حسین!''

''اچھا جی.....'' وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

دین محمد عرف دینو کمہار کی عمر بیس اور پچیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک بھاری بھرکم اور سانولا نوجوان تھا۔ اس کے سر کے بال گھونگھریالے تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں بھئی دینو! تم صبح ہی صبح خادم حسین کے کھیتوں میں کیا کررہے تھے؟''

''میں جی..... خادم حسین کے کھیتوں کی طرف تو موتی کی وجہ سے گیا تھا ورنہ میرا وہاں کیا کام.....'' اس نے جواب دیا۔

''موتی کی وجہ سے.....؟'' میں نے زیرلب دہرایا۔ ''یہ موتی کون ہے بھئی؟''

''موتی میرے کتے کا نام ہے تھانے دار صاحب!''

''اچھا..... تو وہ کتا تمہیں خادم حسین کے کھیتوں میں لے گیا تھا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں اسے گھورا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے جناب کہ جب سے ابا کو فالج کا اٹیک ہوا ہے، دریا سے مٹی

نکالنے کی ذمے داری میرے سر پر آ گئی ہے۔ میں اپنے کھوتے (گدھے) اور کتے کے ساتھ صبح صبح مٹی نکالنے دریا کی طرف جا رہا تھا۔ جب میں خادم حسین کے کھیتوں کے قریب سے گزرا تو موتی نے بھونکنا شروع کر دیا۔ میں نے دو چار دبکے مار کر اسے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی لیکن وہ خادم حسین کے کھیتوں کی جانب منہ اٹھا کر مسلسل بھونکے جا رہا تھا۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی دھند کے باعث خادم حسین کے کھیتوں کا منظر واضح نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ موتی خوامخواہ یہ حرکت نہیں کر رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کسی خاص وجہ سے میری توجہ ادھر کروانا چاہتا ہے۔

آپ تو جانتے ہیں تھانے دار صاحب..... بے زبان جانوروں کی حس ہم انسانوں سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔''

''ہاں، بالکل جانتا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور بے زبان جانوروں میں بھی کتے کی سونگھنے اور سننے کی حس انسانوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے۔''

''تو بس جناب! میں موتی کے توجہ دلانے پر ہی خادم حسین کے کھیتوں کی طرف گیا تھا۔'' وہ اپنا بیان مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''اور وہاں پہنچ کر موتی کے بھونکنے کی وجہ سمجھ آ گئی۔ وہ عورت نیم برہنہ حالت میں، کھیتوں میں پڑی تھی۔ اس کی حالت کو دیکھ کر میرے ذہن میں جو پہلا خیال آیا وہ یہی تھا کہ اب وہ زندہ نہیں ہے۔''

''ایک خوبصورت اور دلکش عورت کو خادم حسین کے کھیتوں میں مردہ پڑے دیکھ کر تمہارے احساسات کیا تھے اور تم نے وہ دلخراش منظر دیکھ لینے کے بعد کیا، کیا تھا؟' میں نے سوال و جواب کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''جناب! اس عورت کی لاش کو دیکھ کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''اور فوری طور پر میری سمجھ میں یہی آیا کہ مجھے دوسرے لوگوں کو اس کے بارے میں فوراً بتانا چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ آس پاس کے کھیتوں میں اِکا دُکا لوگ کام تو کر رہے تھے لیکن دھند کے باعث ان کے ہیولے سے نظر آ رہے تھے۔ میں نے انہیں آواز دینے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ خادم حسین مجھے اپنی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ بس..... تو پھر میں نے سب سے پہلے اسے ہی عورت کی لاش کے بارے میں بتا دیا۔''

میں نے دینو کمہار کی نیت کو چیک کرنے کے لیے خاصے سخت لہجے میں کہا ''دینو! تم نے کہانی تو بہت عمدہ جوڑی ہے۔''

''جی..... کون سی کہانی؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''یہی جو ابھی تم نے مجھے سنائی ہے۔''

''جناب..... میں نے آپ سے ایک لفظ بھی جھوٹ یا غلط نہیں کہا۔'' وہ قدرے خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''جو کچھ پیش آیا ہے وہی میں نے آپ کو بتایا ہے۔''

''لیکن میں تمہاری بات کا یقین کیسے کر لوں.....؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس عورت کو تمہی نے قتل کر کے یہاں پھینک دیا ہو؟''

''جناب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' وہ روہانسا ہو گیا۔ ''میں تو اس عورت کو جانتا تک نہیں۔''

''اسے تو یہاں پر کوئی بھی نہیں جانتا دینو!'' میں نے بہ دستور اسے شک زدہ نظر سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اس سے تمہاری بے گناہی کیسے ثابت ہوتی ہے؟''

''تھانے دار صاحب! جو سچ تھا وہ میں نے آپ کے سامنے بیان کر دیا ہے۔ آپ کی مرضی ہے کہ میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں۔''

میرا پیشہ ورانہ تجربہ بتاتا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق دینو اس عورت کے قتل میں ملوث نہیں ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی اسے اپنے دباؤ میں رکھنے کے لیے میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

''دیکھو دینو! تمہاری بات کا یقین کر کے میں تمہیں چھوڑ تو رہا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں نکالنا کہ میں نے تمہیں بے گناہ سمجھ لیا ہے۔ کسی مرحلے میں اگر مجھے تم پر ذرا سا بھی شک ہوا تو میں تمہیں پکڑ کر فوراً تھانے میں بند کر دوں گا۔''

''جی بالکل!'' وہ بڑے نڈر انداز میں بولا۔

''اور اس دوران میں تم اپنی آنکھیں، کان اور دماغ کے دروازے بھی کھلے رکھنا۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''اگر تمہیں اس اجنبی مقتول دوشیزہ کے بارے میں کہیں سے کوئی سن گن ملے تو فوراً آ کر مجھے بتانا۔''

''جی..... میں وہی کروں گا جیسا آپ کہہ رہے ہیں۔'' اس نے بڑی فرماں برداری سے کہا۔

میں نے مزید یہ دو تین سوالات کے بعد دین محمد عرف دینو کمہار کو فارغ کر دیا اور خود ٹہلتے ہوئے تھانے آ گیا۔

☆☆☆

کسی قتل کی واردات میں جب مقتول اجنبی ہو اور علاقے کے لوگ اس کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے ہوں تو قاتل تک رسائی کے لیے تفتیش کی گاڑی کو تقریباً بریک ہی

لگ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں عموماً کھرا نکالا جاتا ہے تاکہ یہ پتا چلایا جا سکے کہ قاتل یا مقتول کن راہوں سے گزر کر جائے وقوعہ تک پہنچا ہوگا۔ کھوج کا یہ کام اکثر بڑے حوصلہ افزا نتائج لاتا ہے لہٰذا نامعلوم حسین و جمیل مقتول کا کھوج لگانے کے لیے میں نے بھی یہی تفتیشی طریقہ اختیار کیا۔

میں نے دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر کھوجی اللہ رکھا کو تھانے بلا لیا۔ اس دوران میں میرا ذہن مختلف زاویوں پر مسلسل سوچ بچار میں مصروف تھا اور میں اس پُراسرار دستک کو بھی ایک لمحے کے لیے نہیں بھولا تھا جو رات کو میرے کوارٹر کے بیرونی دروازے پر سنائی دی تھی۔ مذکورہ دستک کا نامعلوم عورت کے بہیمانہ قتل سے کوئی تعلق تھا یا نہیں لیکن یہ ضرور تھا کہ اس دستک نے گزشتہ رات ہی سے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ میں اسی پریشانی کو ذہن میں لے کر سویا تھا اور اسی الجھن کے ساتھ بیدار ہوا تھا اور پھر جب میں تھانے میں آ کر بیٹھا تو یہ واقعہ سامنے آ گیا۔ کوئی آواز میرے اندر چپکے چپکے سے یہ سرگوشی کر رہی تھی کہ رات والی دستک کا اس اجنبی دلکش عورت کے قتل کے ساتھ ضرور کوئی نہ کوئی تعلق جڑا ہوا تھا۔ کوئی بات واضح تھی اور نہ ہی میرے ہاتھ میں کوئی ثبوت تھا لہٰذا قبل از وقت میں کوئی فتویٰ صادر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے؟

کانسٹیبل، اللہ رکھا کو لے کر تھانے پہنچا تو میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلا لیا۔ کھوجی بابا اللہ رکھا کی عمر پینسٹھ کے اریب قریب تھی۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک مستعد بوڑھا تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی بھی رکھ چھوڑی تھی جو اس کے چہرے پر بڑی بھلی نظر آتی تھی۔ اس کی ڈاڑھی اور سر کے بال مکمل سفید ہو چکے تھے۔ اللہ رکھا نے پاپلین کا کرتہ اور تہبند زیب تن کر رکھا تھا اور اپنے سینے کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے اس نے اوپر نیچے دو اونی سویٹرز پہن رکھے تھے یعنی ایک کرتے کے اوپر اور دوسرا کرتے کے نیچے۔

میں نے نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں اللہ رکھا کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''سو باتوں کی ایک بات..... قاتل کا کھرا نکالنا ہے نا جناب!''

''بالکل..... اللہ رکھا! میں نے اسی مقصد کے لیے تمہیں تھانے بلایا ہے۔''

''کل ملا کر معاملہ یہ ہے کہ ہم جائے وقوعہ پر چلتے ہیں۔'' وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔ ''پھر دیکھتے ہیں، حالات اور قدرت کیا رنگ دکھاتے ہیں؟''

''اللہ رکھا! تمہیں یہ تو احساس ہو گیا ہوگا کہ یہ کتنا حساس معاملہ ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے کھوجی بابا کی طرف دیکھا۔

''آپ فکر ہی نہ کریں جناب!'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''اور اس سلسلے میں جو بھی حقائق سامنے آئیں، انہیں راز میں رکھنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ معاملات صرف ہم دونوں کے بیچ میں رہیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری تحقیق کے نتائج سے قاتل فائدہ اٹھا کر معاملات کو بگاڑ دے یا حالات و واقعات کو الجھا کر رکھ دے۔''

''میرا سینہ بہت وسیع اور گہرا ہے ملک صاحب!'' وہ اپنے سینے کو تھپکتے ہوئے بولا۔ ''اس کنوئیں میں بڑے بڑے عظیم راز دفن ہیں جناب!''

میں مطمئن ہو کر اٹھا اور اللہ رکھا کو اپنے ساتھ لے کر جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔

''اللہ آپ کا بھلا کرے ملک صاحب!'' وہ کام کا آغاز کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے خدمت کا موقع دے کر مجھ پر بڑی نوازش کی ہے جناب، ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا، ان بوڑھی ہڈیوں کو بے کار پڑے پڑے زنگ ہی لگ جائے گا۔''

مخبر اور کھوجی ہر دور میں پولیس ڈیپارٹمنٹ کی ضرورت رہے ہیں۔ ہم لوگ گاہے بہ گاہے ان سے کام لیتے رہتے تھے۔ یہ لوگ بڑے کام کے ہوتے ہیں۔ جب کبھی تفتیش کی گاڑی کسی بند گلی میں جا پھنستی ہے تو یہی لوگ اپنے تجربے اور مہارت کا دھکا لگا کر اسے سڑک پر لاتے ہیں۔ ان کی اہمیت اور افادیت سے کسی بھی صورت انکار ممکن نہیں۔

اللہ رکھا دس منٹ تک جائے وقوعہ اور اس کے گردونواح کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ کبھی جھک کر زمین کو دیکھنے لگتا اور کبھی نیچے بیٹھ کر وہ مختلف زاویوں سے کھیت کا جائزہ لینے لگتا۔ میں بڑی دلچسپی سے اسے کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کا فن تھا لہٰذا میں خاموش تماشائی بنا اس کی حرکات و سکنات کا نوٹس لیتا رہا۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد وہ میرے پاس آیا اور بڑے حتمی لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! چونکہ صبح بہت سارے لوگ جائے وقوعہ پر جمع ہو گئے تھے لہٰذا یہاں درجنوں قدموں کے چھاپے آپس میں گڈمڈ ہو چکے ہیں لیکن میں نے پھر بھی کام کی ایک بات پتا چلا لی ہے۔''

''کام کی بات.....'' میں نے چونک کر اس کی طرف

دیکھا ''وہ کیا اللہ رکھا؟''

''انسان کے متعدد قدموں کے کھرے کے علاوہ مجھے یہاں ایک جانور کا کھرا بھی ملا ہے ملک صاحب!'' وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔

اللہ رکھا کی بات سن کر میرا دھیان لامحالہ دینو کمہار کی طرف چلا گیا۔ آج صبح اسی نے نامعلوم عورت کی لاش دریافت کی تھی اور اس کے ساتھ دو جانور بھی تھے۔ میں نے اسی تناظر میں اللہ رکھا سے استفسار کیا۔

''گدھے یا کتے کا کھرا.....؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ان دونوں میں سے کسی کا نہیں۔''

''پھر.....؟'' میری حیرت الجھن میں بدل گئی۔

وہ بڑے پُراعتماد انداز میں بولا ''میں گھوڑے کے کھرے کی بات کر رہا ہوں ملک صاحب!''

''گھوڑے کا کھرا؟'' میں سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''جی ہاں۔'' اس نے بڑے وثوق سے سر کو اثباتی جنبش دی اور بتایا۔ ''کوئی گھڑسوار یہاں تک آیا تھا اور یہاں سے واپس بھی گیا تھا۔''

میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔ ''وہ کہاں سے آیا تھا اور واپس کدھر چلا گیا؟''

''اس کا پتا تو میں ابھی چلا لیتا ہوں جناب کیونکہ میں نے اس گھوڑے کا کھرا اچھی طرح پکڑ لیا ہے۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔

''جب گھوڑے کا کھرا پکڑا گیا ہے تو پھر گھڑسوار بھی پکڑا ہی جائے گا۔'' میں نے اللہ رکھا کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہارے چہرے پر الجھن کیوں پھیلی ہوئی ہے..... کوئی پریشانی والی بات تو نہیں۔''

''کوئی پریشانی نہیں ملک صاحب!'' وہ تسلی بھرے انداز میں بولا ''کل ملا کر یہ سمجھ لیں کہ گھوڑے کا کھرا مجھے ایک نئے زاویے پر سوچنے کے لیے مجبور کر رہا ہے۔''

''کون سا نیا زاویہ اللہ رکھا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''سو باتوں کی ایک بات ملک صاحب!'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جب گھوڑا اس طرف آیا تو اس پر دو افراد سوار تھے اور جب وہ یہاں سے واپس گیا تو اس کی پیٹھ پر صرف ایک ہی سوار تھا۔''

''کل ملا کر..... سو باتوں کی ایک بات..... حالات اور قدرت کیا رنگ دکھاتے ہیں۔'' جیسے جملے اللہ رکھا اپنی گفتگو میں عام استعمال کرتا تھا جو کسی حد تک اس کے تکیہ کلام کی حیثیت رکھتے تھے لیکن ان لمحات میں ایسے جملوں پر دھیان دینے کا ٹائم نہیں تھا میرے پاس۔ اس نے جو تازہ ترین انکشاف کیا تھا وہ میرے ذہن کو جھنجوڑنے کے لیے کافی تھا لہٰذا میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہے ہو اللہ رکھا؟''

''گھوڑے کے پاؤں کے مخصوص دباؤ کی بنا پر جناب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس جانب آتا ہوا کھرا بتاتا ہے کہ گھوڑے پر ایک سے زیادہ افراد سوار تھے اور یہاں سے واپس جاتا ہوا کھرا ایک سوار کی نشاندہی کر رہا ہے۔ جاتے ہوئے کھرے کی نسبت آنے والا کھرا ڈبل دباؤ کی جانب اشارہ کرتا ہے۔''

''ٹھیک ہے اللہ رکھا!'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اب تم جلدی سے یہ پتا چلانے کی کوشش کرو کہ وہ ڈبل گھڑسوار گھوڑا کہاں سے آیا تھا اور یہاں سے سنگل گھڑسوار گھوڑا بن کر کہاں چلا گیا ہے؟''

''ابھی پتا چلاتا ہوں سرکار!'' وہ پُرعزم انداز میں بولا۔ ''آگے حالات وقدرت کیا رنگ دکھاتے ہیں، یہ بھی سامنے آ ہی جائے گا۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ بڑے ماہرانہ انداز میں کام میں جت گیا۔

مزید ایک گھنٹے کی تحقیق وجستجو کے بعد کھوجی بابا نے جو سنسنی خیز انکشافات کیے وہ سننے اور بتانے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اس سے پہلے میں اس لوکیشن کی وضاحت کرنا چاہوں گا جہاں کی چھان پھٹک کے بعد اللہ رکھا نے اپنا تحقیقی بیان جاری کیا تھا۔

آگے بڑھنے سے قبل ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ اب کھوجی کا کہیں ذکر نہیں آئے گا۔ اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔ اس کیس میں مجھے جس حد تک اس کی تکنیکی مدد کی ضرورت تھی وہ اس نے مجھے فراہم کر دی تھی۔ اس معاملے کی الجھی ہوئی ڈور کا ایک سرا اللہ رکھا کے توسط سے میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ زگ زیگ کرتے ہوئے دوسرے سرے تک رسائی حاصل کرنا اب میرا کام تھا اور مجھے یقین تھا، میں اپنا کام بہ طریق احسن انجام دے لوں گا۔ سنگل گھڑسوار اور ڈبل گھڑسوار کا ذکر سنتے ہی میرے ذہن میں تیز روشنی کا ایک جھماکا ہوا تھا اور میں پلک جھپکتے میں ایک حتمی نتیجے پر پہنچ گیا

تھا۔ اسی جھماکے کی ضیاپاشیوں سے آپ کو بھی منور کرتا ہوں۔

میرے خیال میں قاتل اس نامعلوم عورت کی لاش کو گھوڑے کی پیٹھ پر لاد کر جائے وقوعہ تک پہنچا تھا، پھر اس لاش کو خادم حسین کے کھیتوں میں پھینک کر واپس چلا گیا تھا۔ آپ اگر میرے ان الفاظ پر غور کریں گے تو سنگل دباؤ والا کھرا اور ڈبل دباؤ والا کھرا کا مفہوم بہ آسانی آپ کی سمجھ میں آ جائے گا۔

تو میں آپ کو لوکیشن کے بارے میں بتا رہا تھا۔

جیسا کہ اس کہانی کی ابتدا میں اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان دنوں میں فیروز آباد نامی ایک چھوٹے سے قصبے کے ایک چھوٹے سے تھانے میں تعینات تھا۔ میرا تھانا ایک کچی سڑک کے کنارے واقع تھا جو شمالاً جنوباً رواں دواں رہتی تھی۔ فیروز آباد گاؤں لگ بھگ ڈیڑھ سو گھروں کی ایک آبادی تھی جو لوکیشن کے اعتبار سے میرے تھانے کے عقب میں مشرق کی جانب آباد تھا۔ تھانے اور گاؤں کے درمیان بہ مشکل آدھے میل کا فاصلہ رہا ہوگا جو سرسبز وشاداب کھیتوں کے قبضے میں تھا۔ گاؤں کے چودھری الٰہی بخش کی حویلی بھی گاؤں کے ایک کنارے پر واقع تھی۔

تھانے سے لگ بھگ ایک فرلانگ (دو سو بیس گز) کے فاصلے پر جنوب میں ایک دریا بہتا تھا۔ یہ دریا مشرق سے مغرب کی سمت رواں دواں تھا اور اسی دریا کے کنارے سے دینو کمہار مٹی نکالنے آیا کرتا تھا۔ آسانی کے لیے یوں سمجھ لیں کہ فیروز آباد گاؤں، میرا تھانا، دریا اور کچی سڑک کے بیچ ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور انہی کھیتوں میں دریا کے کنارے کے ساتھ ایک ڈیرا بھی بنا ہوا تھا جو کہ چودھری الٰہی بخش کی ملکیت تھا۔ مذکورہ ڈیرے پر چودھری کا ملازم خاص رحم دین عرف رحمو رہتا تھا جو چودھری کے چھوٹے موٹے کاموں کے علاوہ کاشت کاری کے امور کی نگرانی بھی کرتا تھا اور سب سے دلچسپ اور چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ کھوجی بابا اللہ رکھا نے کھرے کی مدد سے جس گھوڑے کا سراغ لگایا تھا، وہ اسی ڈیرے سے چل کر جائے وقوعہ تک پہنچا تھا اور پھر جائے وقوعہ سے واپس اس ڈیرے پر آیا تھا۔

اس انکشاف نے میرے رگ وپے میں سنسناہٹ بھر دی تھی۔

☆☆☆

غروب آفتاب سے چند منٹ پہلے کی بات ہے۔ اے ایس آئی مطلوب حسین ڈیوٹی پر آیا تو میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ اسی گاؤں کا رہنے والا تھا اور میں امید کر رہا تھا کہ جیسے ہی اسے خادم حسین کے کھیتوں سے اس عورت کی لاش ملنے کی خبر ہوگی، وہ دوڑا دوڑا میرے پاس چلا آئے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، وہ حسب معمول اپنے مقررہ وقت پر ہی تھانے پہنچا تھا۔ اس کی اس ادا پر مجھے حیرت بھی ہوئی جبھی میں نے اسے فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ خوبصورت نامعلوم عورت کی دردناک موت والا قصہ اس کے گھر کی دہلیز سے نہ گزرا ہو۔

''ملک صاحب! یہ آج کیسا واقعہ پیش آ گیا ہے؟'' میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے سوال کر دیا۔

''تم تو ایسے مجھ سے پوچھ رہے ہو جیسے تمہیں کچھ پتا ہی نہ ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شکوہ بھرے انداز میں کہا۔

''یقین کریں، مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس واقعے کا علم ہوا ہے۔'' وہ ایک دم بے حد سنجیدہ نظر آنے لگا۔

میں نے پوچھا ''مطلوب حسین! کیا تم نے آج کا دن فیروز آباد سے باہر کہیں گزارا ہے؟''

''نہیں جناب! میں تو ادھر ہی تھا..... اپنے گھر میں۔''

''کمال ہے، پھر بھی تمہیں اتنے بڑے معاملے کی کوئی خبر نہیں ہوئی۔''

''جناب! میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔''

''تمہارے گھر والوں میں سے کسی نے جگانے کی کوشش نہیں کی؟''

''گھر میں کوئی ہوتا تو یہ کوشش کرتا نا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے آنکھیں سکیڑ کر اسے گھورا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! میری گھر والی بچوں کے ساتھ سسرال یعنی اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ نیند کافی جمع ہو چکی تھی، میں تھانے سے جانے کے بعد ایسا پڑ کر سویا کہ کوئی آدھا گھنٹا پہلے ہی میری آنکھ کھلی ہے۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے جیسے ہی پتا چلا کہ صبح خادم حسین کے کھیتوں میں سے کسی نامعلوم عورت کی لاش ملی ہے، میں آپ کی طرف آ گیا ہوں۔ یہ ہے کل کہانی جناب..... میں نے نہ تو دوپہر کا کھانا کھایا ہے اور نہ ہی ابھی گھر سے کچھ کھا کر نکلا ہوں۔''

''اب تم کل صبح ایک ساتھ ہی ناشتا کرنا۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''کیوں جی؟'' وہ تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''کیونکہ میں ابھی تمہیں ایک اور مشن پر روانہ کرنے والا ہوں۔''

''کیسا مشن ملک صاحب!'' اس کی حیرت میں پریشانی بھی شامل ہوگئی۔

''اس مشن کو تم اس وقت تک نہیں سمجھ سکو گے جب تک تم میں تمہیں صبح والے واقعے کی تفصیلات سے نہ آگاہ کردوں۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''سنو گے تو بھوک، پیاس اور نیند..... سب کچھ اڑن چھو ہو جائے گا۔''

وہ بڑی سنسنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے ہمہ تن گوش ہوگیا۔

میں نے آیندہ پانچ منٹ میں اے ایس آئی مطلوب حسین کو تازہ ترین حالات سے آگاہی فراہم کی پھر کہا۔

''تمہیں ابھی اور اسی وقت ڈیرے کی جانب روانہ ہونا ہے۔ میں آدھے گھنٹے کے اندر چودھری کے خاص ملازم رحم دین عرف رحمو کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''تم اپنے ساتھ ایک آدھ کانسٹیبل کو بھی لے جاؤ تاکہ گرفتاری کے عمل میں کسی دشواری کا سامنا نہ ہو۔'' میں نے لمحاتی توقف کرکے اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی ملک صاحب! بڑی چنگی طراں سمجھ رہا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آدھا گھنٹا تو آپ نے بہت بتایا ہے۔ میں انشااللہ اس سے پہلے ہی آپ کو خوشخبری سناؤں گا۔''

''اور جب تم کامیاب لوٹو گے تو میں بھی تمہیں ایک خوشخبری دونگا۔'' میں نے معنی خیز نظر سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ کوئی سوال کیے بغیر بڑی اطاعت مندی سے اٹھا اور میرے کمرے سے نکل گیا۔ ٹھیک پانچ منٹ کے بعد وہ کانسٹیبل عمران کو اپنے ساتھ لے کر چودھری الٰہی بخش کے ڈیرے کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔

میں جانتا تھا کہ میں نے مطلوب حسین کو خالی پیٹ رحمو کی گرفتاری کے لیے بھیج دیا تھا۔ یہ ایک طرح سے زیادتی والی بات نظر آتی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ اگر پندرہ بیس منٹ مزید اس کے پیٹ میں کھانا نہ پہنچا تو کوئی قیامت برپا نہیں ہوجائے گی۔ وہ اس مشن سے واپسی پر بھی پیٹ پوجا کرسکتا تھا۔ اور پھر میں نے اس کے لیے کچھ اور سوچ لیا تھا۔ اگر میں نے واپسی پر اسے ''خوشخبری دینے'' کی بات کی تھی تو کچھ غلط نہیں کہا تھا۔

اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں نے کانسٹیبل آصف کو اپنے پاس بلایا اور چند ہدایات دے کر روانہ کردیا۔

ہمارے تھانے کے ساتھ ہی ایک تانگا اسٹینڈ تھا جہاں تین چار دکانیں بھی بنی ہوئی تھیں اور انہی دکانوں میں ایک تنور والا ہوٹل بھی تھا۔ کہنے اور دیکھنے کو تو وہ ایک چھپر ہوٹل تھا لیکن یہ بات میرے تجربے میں کئی بار آچکی تھی کہ وہاں کے کھانے بڑے لذیذ اور خوش ذائقہ ہوا کرتے تھے۔ میں نے کانسٹیبل آصف کو اسی ہوٹل پر بھیجا اور تاکید کی کہ وہ بیس پچیس منٹ کے بعد خاصا صحت مند کھانا لے کر آجائے۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ مطلوب حسین کھانے پینے کا بہت شوقین تھا۔ کوئی کھانے کا شائق ہو اور وہ پچھلے بارہ گھنٹے سے بھوکا بھی ہو تو اس کی نظر میں دنیا کی سب سے عظیم نعمت کھانے کا حصول ہی ہوسکتا تھا۔

میں نے اے ایس آئی کی ضیافت کے لیے کانسٹیبل کو مرغی مسالا لانے کا حکم دیا تھا۔ ہوٹل ''علی مدد'' کی اسپیشل ڈش ''مرغی مسالا'' ہی تھی۔ ہوٹل کا مالک دیسی مرغی میں ایک خاص قسم کا مسالا بھر کر اسے بڑے اسپیشل طریقے سے بھونتا تھا کہ کھانے والا اپنی انگلیاں چاٹتا بلکہ انگلیاں کا ٹتا رہ جاتا تھا۔

ہوٹل ''علی مدد'' کے مالک کا نام تو استاد امداد حسین تھا لیکن وہ خود کو علی مدد کہلانا پسند کرتا تھا اور اس کی وجۂ تسمیہ یہ بتاتا تھا کہ ''امداد حسین'' درحقیقت ''علی مدد'' ہی ہے۔ بہرحال سالہا سال سے اس کے ہوٹل کا نام ''علی مدد'' ہی مشہور ہوگیا تھا۔ امداد حسین ایک ریٹائرڈ پہلوان تھا۔

میں ان لمحات میں اپنی کرسی پر بیٹھا مسلسل اسی حسین و جمیل عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کی لاش کو صبح میں نے پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوایا تھا۔ کانسٹیبل امین مذکورہ لاش کو اسپتال پہنچا کر واپس آچکا تھا اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کل شام تک یا پرسوں صبح مل جائے گی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تو جب آتی تب دیکھ لیا جاتا کہ اس میں کون سا انکشاف ہوا ہے، فی الحال تو میں بڑی بے چینی سے اے ایس آئی کی واپسی کا انتظار کررہا تھا۔

☆☆☆

رات کے سات بجے تھے لیکن یوں محسوس ہوتا تھا، رات آدھی سے زیادہ گزر گئی ہو۔ جنوری میں ویسے بھی پانچ

بجے کے آس پاس (پنجاب میں) سورج غروب ہوجاتا تھا اور موسم سرما کے باعث لوگ سرشام ہی گھروں سے باہر نکلنا بند کردیتے تھے۔ اس حساب سے سات بجے کے وقت کو اچھی خاصی رات کہا جاسکتا تھا۔

میں اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھا اور اکیلا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اے ایس آئی مطلوب حسین، چودھری الٰہی بخش کے ڈیرے سے واپس آ گیا تھا اور وہ ''خالی'' ہاتھ نہیں لوٹا۔ میں نے اسی لمحے مطلوب حسین کو شکم سیر قسم کی پیٹ پوجا کے لیے دوسرے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ کانسٹیبل آصف نے بڑی عقل مندی کا ثبوت فراہم کیا تھا اور وہ یہ کہ وہ اے ایس آئی کی آمد سے چند سیکنڈ پہلے ہی ہوٹل ''علی مدد'' سے گرما گرم کھانے کی ٹرے اٹھائے تھانے میں داخل ہوا تھا۔

میرے سامنے رحم دین عرف رحمو گردن جھکائے کھڑا تھا اور اس کے پہلو میں، میں نے حوالدار رجب علی کو ''تعینات'' کر رکھا تھا۔ رحمو خاصا گھبرایا ہوا لگتا تھا حالانکہ قدرت نے اسے اچھا خاصا جثہ اور صحت عطا کر رکھی تھی، اس کے باوجود ان لمحات میں اس کی حالت دیدنی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے تیس اور پینتیس سال کے درمیان قائم کیا۔ وہ ایک قد آور اور لحیم شحیم شخص تھا۔ سانولی رنگت اور چہرے پر کرختگی۔ اس نے ہلکی ہلکی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی جیسے ہفتہ دس دن کا شیو بڑھا ہوا ہو۔ تاہم اس کی مونچھیں خاصی صحت مند اور ہیبت طاری کرنے والی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں مجھے سرخی بھی نظر آئی تھی اور..... یہی رحمو اس وقت ڈرا سہما، سر جھکائے میرے سامنے کھڑا تھا۔

میں نے تفتیش کا آغاز کرتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔ ''رحمو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں اچھی خاصی جان دی ہے پھر یوں میرے سامنے بھیگی بلی بنے کیوں کھڑے ہو؟''

وہ گردن اٹھا کر بولا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ کے تھانے کے دو بندے مجھے ڈیرے سے پکڑ کر لے آئے ہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا اس لیے گھبرایا ہوا ہوں۔ میں بالکل بے گناہ ہوں جناب..... آپ چاہیں تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

''تھانا ہو یا کچہری، قسمیں کھانے اور آنسو پینے سے بات نہیں بنتی رحمو!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ان دو مقامات پر اپنی بے گناہی کو ٹھوس ثبوت کے ساتھ منوانا پڑتا ہے۔ تمہارے پاس ایسی کوئی شے ہے؟''

''جناب! میں خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت یا گواہ پیش نہیں کرسکتا۔'' وہ لجاجت آمیز انداز میں بولا۔ ''میں بالکل سچ بتا رہا ہوں کہ میں نے کسی عورت کو قتل نہیں کیا بلکہ..... میں تو اس عورت کو جانتا تک نہیں، پہچانتا تک نہیں۔''

''یہ کوئی خاص یا اہم اطلاع نہیں ہے رحمو!'' میں نے بہ دستور سخت انداز میں کہا ''یہاں کا کوئی بھی شخص مقتول عورت کو شناخت نہیں کرسکا۔ وہ سب کے لیے اجنبی تھی۔''

''جب مجھے پتا چلا کہ ادھر خادم حسین کے کھیتوں میں کسی عورت کی گردن کٹی لاش ملی ہے تو میں فوراً وہاں پہنچ گیا تھا۔'' وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس وقت تک آپ موقع کی کارروائی مکمل کر کے واپس جا چکے تھے۔ وہاں پر موجود لوگوں نے مجھے بتایا کہ مذکورہ عورت کی لاش کو سرکاری اسپتال بھجوا دیا گیا ہے۔ پھر جناب.....!'' وہ سانس لینے کے لیے تھما پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں واپس ڈیرے پر آ گیا تھا۔ اس کے بعد گاؤں میں کیا ہوتا رہا، مجھے کوئی خبر نہیں۔ اب آپ کے بندے مجھے اس عورت کے قتل کے الزام میں پکڑ کر تھانے لے آئے ہیں۔ مجھ پر رحم کریں سرکار..... قتل کی اس واردات سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

میں نے اس کے بیان کو چیک کرنے کی غرض سے کہا۔ ''اگر تمہارا نام رحم دین ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمہیں کھلی چھوٹ دے دوں گا۔ میں رحم صرف ان لوگوں پر کرتا ہوں جو بے قصور اور معصوم ہوتے ہیں یا پھر ان لوگوں پر جو قانون کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتے ہیں۔''

''سرکار! اس بات کا تو آپ پکا یقین کرلیں کہ میں بے گناہ ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اور جہاں تک قانون سے تعاون کرنے کا سوال ہے تو میں حاضر ہوں۔ آپ مجھے حکم دیں کہ کرنا کیا ہے؟''

اس دوران میں حوالدار رجب علی دو تین بار بڑی معنی خیز اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھ چکا تھا۔ اس کی ایسی نظر کا واضح مطلب یہی تھا کہ..... ملک صاحب، اگر اجازت ہو تو دو چار ہاتھ رکھوں اس سورما کی گردن پر!

اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ میں نے حوالدار رجب علی کو ملزم رحمو کے پہلو میں اسی لیے کھڑا کیا تھا کہ بہ وقت ضرورت وہ اس کی غلط بیانی پر ایک زوردار جھانپڑ رسید کرسکے لیکن میرے خیال میں ابھی ایسا موقع پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے میں نے رجب علی کو زحمت نہیں دی تھی۔ میں ملزموں سے خوامخواہ کی مار پیٹ اور تشدد کا قائل نہیں ہوں لیکن اگر سیدھی انگلی سے گھی نہ نکل پا رہا ہو تو پھر میں انگلی کو ٹیڑھا کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر برداشت نہیں کرتا۔

میں نے رحمو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''تم آج کتنے بجے جائے وقوعہ پر پہنچے تھے؟''

''اس وقت لگ بھگ گیارہ بجے ہوں گے جی!'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے کوئی دس بجے وقوعہ کی کارروائی مکمل کرلی تھی اور دینو کمہار کے انٹرویو کے بعد کم و بیش ساڑھے دس بجے تک میں واپس تھانے آ گیا تھا۔ اس حوالے سے رحمو کا بیان درست تھا تاہم اس معاملے میں ابھی بہت سے پہلو میرے لیے اطمینان بخش نہیں تھے چنانچہ میں نے رحمو کی گھسائی جاری رکھی۔

''سورج اگنے کے فوراً بعد یعنی لگ بھگ صبح سات بجے پورے فیروز آباد کو اس بات کی خبر ہو چکی تھی کہ خادم حسین کے کھیتوں میں کسی نامعلوم عورت کی گردن کٹی لاش ملی ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا ''جائے وقوعہ تمہارے ڈیرے سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر ہے، پھر تم چار گھنٹے دیر سے وہاں کیوں پہنچے تھے؟''

''جناب! جب مجھے پتا چلتا، تب ہی تو جانا تھا نا۔''

''تو تم یہ کہہ رہے ہو کہ اس واقعے کی اطلاع گیارہ بجے کے آس پاس تم تک پہنچی تھی؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

''جی ہاں..... یہی بات ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''تو صبح سے تمہاری نظروں کے سامنے، ادھر کھیتوں میں جو لوگ جمع ہو رہے تھے، وہ تمہیں دکھائی نہیں دیے تھے؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ ''تم یہی سمجھے ہو گے کہ وہاں کبڈی کا کوئی ٹورنامنٹ ہو رہا ہے..... ہیں نا؟''

''جناب! میں آپ کو سمجھاتا ہوں.....'' وہ منت ریز انداز میں بولا۔

''ایک بات اچھی طرح اپنے ذہن میں بٹھا لو رحمو!'' میں نے اس کے کچھ بولنے سے پہلے بڑی سفاکی سے کہا ''مجھے کوئی چکر دینے یا کوئی دلچسپ کہانی سنانے کی کوشش نہیں کرنا۔ میرا حوالدار بڑی دیر سے اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے کے لیے بے چین کھڑا ہے۔ اگر مجھے تمہاری باتوں میں سے غلط بیانی کی بو آئی تو میں اسے اشارہ کرنے میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔ پھر تمہاری ہڈی پسلی کا جو بھی حشر ہو، فریاد نہیں کرنا کیونکہ رجب علی گریہ وزاری کرنے والوں کی اور زیادہ ٹھکائی کرتا ہے.....!''

میری خطرناک اور دھمکی آمیز باتیں سن کر اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ جلدی سے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ کو میری قسم کا چاہے یقین آئے یا نہ آئے مگر میں پھر بھی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ سے ایک لفظ کا بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔''

''ٹھیک ہے، بتاؤ..... سچ کیا ہے؟'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''تمہیں اتنی تاخیر سے جائے واردات کی طرف جانے کا خیال کیوں آیا تھا؟''

''تھانے دار جی!'' وہ سنجیدہ لہجے میں بتانے لگا۔ ''پتا نہیں، کیا بات ہے کہ آج صبح میری آنکھ بہت دیر سے کھلی تھی حالانکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا.....''

''رات کو تم بہت دیر سے سوئے ہو گے نا.....'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''اس لیے صبح اپنے وقت پر اٹھ نہیں سکے، ہیں نا؟''

''آپ خوامخواہ میری ہر بات کو شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں جناب!'' وہ احتجاجی انداز میں بولا۔ ''میں رات کو اپنے مخصوص وقت پر سو گیا تھا..... پتا نہیں، پھر کیا ہوا کہ صبح وقت پر اٹھ نہیں سکا۔ یہ بات خود میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''ملک صاحب! میں چھوٹی بڑی ہر بات اس کی سمجھ میں ٹھونک دوں گا۔'' رجب علی نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس ڈشکرے کو آج کی رات میرے حوالے کردیں۔''

''ہاں، رجب علی..... اب تو میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے، یہ تمہارا ہی کیس ہے۔ شرافت کی زبان ٹھیک طرح سے اس کی سمجھ میں بیٹھ نہیں رہی۔''

رحمو احتجاجی لہجے میں بولا۔ ''جناب! آپ کس بنا پر مجھے اس عورت کے قتل کے الزام میں گھسیٹ رہے ہیں۔ آپ کے پاس ایسا کون سا ثبوت ہے کہ.....؟''

''ثبوت.....!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ثبوت چاہیے تمہیں.....؟''

''آخر مجھے کچھ تو پتا چلے نا کہ.....'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''پتا چل جائے گا..... ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر قطع کلامی کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ''اس عورت کے قتل کا شک تم پر کرنے کے لیے میرے پاس بڑا ٹھوس ثبوت ہے۔ لو، تم بھی سن لو۔''

پھر نہایت ہی مختصر الفاظ میں، میں نے رحم دین عرف رحمو کو کھوجی بابا اللہ رکھا کی تحقیق سے آگاہ کردیا۔ میری بات

سن کر اس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

''جناب..... ڈیرے پر ایک..... مشکی گھوڑا تو ہے لیکن..... میں نے، رات میں اس پر سواری نہیں کی..... اور نہ ہی اور کسی کو استعمال کے لیے دیا ہے..... وہ رات سے ادھر ڈیرے پر ہی بندھا ہوا ہے۔ آپ چاہیں تو جا کر دیکھ سکتے ہیں۔''

''میں اس مشکی گھوڑے کو دیکھنے ڈیرے پر ضرور جاؤں گا لیکن اس دوران میں تم حوالدار کی مہمان داری کا ''لطف'' اٹھاؤ گے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا پھر حوالدار کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کر دیا۔

''رجب علی! اس ڈشکرے کو لے جاؤ اپنے ساتھ۔''

رحمو منت سماجت کرنے لگا لیکن رجب علی نے اسے کالر سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور خونخوار لہجے میں غرایا۔ ''لاش تو اچھی خاصی ہے۔ دیکھتا ہوں، اس میں سے کتنے من گھی نکلتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''گھی کے ساتھ ہی گوشت کا بھی اندازہ لگانا ہے رجب علی!''

''آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب!'' وہ رحمو کو سر سے پاؤں تک تنقیدی نظر سے گھورتے ہوئے بولا ''آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ایسی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا ہنر مجھے خوب آتا ہے۔''

''بس، تو پھر یہ صحت مند لاش آج کی رات کے لیے تمہارے سپرد ہے۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''میں نے محسوس کیا کہ اس کی زبان کا کوئی غدود بڑھا ہوا ہے جس کی وجہ سے اسے میرے سوالات کے جواب دینے میں خاصی دشواری محسوس ہو رہی ہے.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے معنی خیز انداز میں رحمو کی جانب دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے حوالدار سے کہا۔

''اب دیکھنا یہ ہے کہ صبح تک تمہارا ہنر کیا کمالات دکھاتا ہے..... میری بات تو تم سمجھ ہی گئے ہو گے؟''

''بڑی چنگی طراں سمجھ گیا ہوں ملک صاحب!'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ نے اسے میرے حوالے کر ہی دیا ہے تو پھر مطمئن ہو کر سو جائیں۔ میں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس کی ایسی خاطر داری کروں گا کہ ایک زبان ہی کیا، جسم کے ہر ہر اعضا سے پیوست غدود اپنی جگہ چھوڑ دے گا۔''

''اتنی زیادہ سرجری کی بھی ضرورت نہیں ہے رجب علی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے صرف اس کی زبان سے مطلب ہے..... سچ اگلنے والی زبان سے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے ملک صاحب!'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ''آپ نے تو میرا کام ہی آسان اور مختصر کر دیا ہے۔ میں اس کی زبان کے غدود کا ایسا آپریشن کروں گا کہ صبح تک یہ کسی سبیل کے مانند جاری و ساری ہو جائے گی۔''

اس کے بعد رجب علی، رحمو کو دھکیلتے ہوئے اپنے ساتھ لے گیا۔ رجب علی نے جن تفتیشی عزائم کا اظہار کیا تھا، میں سردست ان کے حق میں نہیں تھا تاہم اس نوعیت کی ڈراوے والی باتیں جرائم پیشہ افراد کا پتا پانی کرنے کے لیے بڑی موثر ثابت ہوتی ہیں اور ان ڈائیلاگز سے میرا اصل مقصد بھی یہی تھا۔

پانچ منٹ کے بعد میں نے رجب علی کو اپنے پاس بلایا اور کچھ اس قسم کی ہدایت کی۔ ''رحمو پر ابھی ہاتھ ذرا ہلکا ہی رکھنا ہے۔ ڈرا دھمکا کر کام چلانے کی کوشش کرو۔ تم فی الحال نفسیاتی حربے آزماؤ۔ اگر وہ قتل کی اس واردات میں ملوث ہے تو اس کی زبان سے ضرور ایسی کوئی بات پھسل جائے گی کہ ہم کامیابی سے آگے بڑھنے کے قابل ہو جائیں گے۔''

''ابھی..... فی الحال.....'' اس نے میری کہی ہوئی بات میں سے دو الفاظ چن کر زیر لب دہرائے پھر تصدیق طلب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ملک صاحب! اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو آپ رحمو کے حوالے سے کسی دوسرے زاویے پر بھی سوچ رہے ہیں۔''

''تمہارا اندازہ واقعی غلط نہیں ہے رجب علی!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''رحمو کے حوالے سے مجھے ابھی ایک اہم رپورٹ موصول ہونے کا انتظار ہے.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آج کی رات تم رحمو کے ساتھ تھوڑی سی نیٹ پریکٹس کر لو۔ اصل میچ کل شروع کرنا۔''

''جو آپ کا حکم ملک صاحب!'' اس نے فرمانبرداری سے کہا اور میرے کمرے سے رخصت ہو گیا۔

اگلے ہی لمحے اے ایس آئی مطلوب حسین میرے پاس حاضر ہو گیا۔ اس کے چہرے پر اب خاصی رعنائی اور توانائی نظر آ رہی تھی۔ اس نے خوب سیر ہو کر پیٹ پوجا کی تھی۔ میں نے اس کے بیٹھ جانے پر پوچھا۔

''مطلوب حسین! دن کے کھانے کی کسر نکل گئی یا میں کسی کانسٹیبل کو دوبارہ ''علی مدد'' ہوٹل کی طرف روانہ کروں؟''

''نہیں جناب، اس کی بالکل ضرورت نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ایسا ڈٹ کر کھایا ہے کہ کل کے ناشتے کا بھی کام ہو گیا ہے۔ کافی لذیذ اور مزے دار کھانا تھا جناب!''

''ایسا لذیذ اور مزے دار کھانا اپنا رنگ دکھائے بنا نہیں رہتا مطلوب حسین!'' میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''اور وہ بھی جب شدید بھوک کے بعد اسے معدے میں اتارا جائے۔''

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''کیا مطلب جناب..... یہ کھانا اب کون سا رنگ دکھانے والا ہے؟''

''نیند کا رنگ!'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ آج رات تم پوری مستعدی سے ڈیوٹی کر سکو۔''

''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں اپنے فرض کو پہچانتا ہوں۔ میں کسی بھی طرح کوشش کر کے صبح تک ضرور ڈیوٹی دوں گا۔''

''مجھے تمہاری نیت یا کوشش پر کوئی شک نہیں ہے مطلوب حسین!'' میں نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''لیکن میں انسانی جبلت اور خمار گندم کی حقیقت سے بھی بہ خوبی واقف ہوں لہٰذا میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوں۔''

''رسک!'' وہ تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک صاحب!''

''تمہیں ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ ایک مہم پر روانہ ہونا ہے مطلوب حسین!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد واپس آ کر آرام سے نیند پوری کرتے رہنا.....'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد ڈرامائی انداز میں اضافہ کیا۔ ''لیکن گھر جا کر نہیں، تم یہیں تھانے میں سو گے۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے ملک صاحب!'' اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔ ''لیکن آپ کس مہم پر مجھے لے جانا چاہتے ہیں، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔''

''تم میرے ساتھ جانے کے لیے تیار تو ہو نا؟''

''جی..... میں بھلا کیسے انکار کر سکتا ہوں؟''

''بس، تو پھر ٹھیک ہے...'' میں نے مطمئن انداز میں کہا۔

پھر اسے مہم کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

☆☆☆

رات کے لگ بھگ نو بجے ہم تینوں چودھری الٰہی بخش کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ ہم تینوں سے میری مراد میں، اے ایس آئی مطلوب حسین اور کھوجی بابا اللہ رکھا ہے۔ اللہ رکھا فیروز آبادی کا رہنے والا تھا اور اسے ہم نے اس کے گھر سے اپنے ساتھ لیا تھا۔ اس کی ہمت اور ولولے کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ آج کا پورا دن وہ کھرا اٹھانے کے کام میں تھک کر چور ہو چکا تھا اور رات میں جب میں نے اسے اپنے ساتھ ڈیرے کی طرف لے جانے کی بات کی تو وہ گرم بستر چھوڑ کر ٹھنڈی ٹھار فضا میں کود پڑا تھا۔ اس کے گھر والوں نے مجھے بتایا کہ اسے سوتے میں سے جگایا گیا تھا۔

اگر کوئی اور وقت یا کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں اللہ رکھا کو سردیوں کی اس یخ بستہ رات میں کبھی زحمت نہ دیتا لیکن میں اس کام کے لیے صبح کا انتظار نہیں کر سکتا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ یہ کام اللہ رکھا کے سوا اور کوئی کر نہیں سکتا تھا۔

''ملک صاحب! جب میں یہاں سے رحمو کو گرفتار کر کے لے گیا تھا تو میں نے ڈیرے کا گیٹ بند کر کے اس پر تالا ڈال دیا تھا۔'' مطلوب حسین نے بتایا۔ ''اس تالے کی چابی اس وقت بھی میری جیب میں ہے۔''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''یہ تم نے بہت نیک کام کیا تھا۔ اب اپنے مبارک ہاتھوں سے گیٹ کا تالا تم ہی کھولو گے۔''

مطلوب حسین آگے بڑھا تو میں نے ٹارچ روشن کر کے اس کی مدد کی۔ روشنی کے دائرے میں گیٹ کا تالا بڑا واضح دکھائی دینے لگا۔ اگلے ہی لمحے اے ایس آئی نے چابی گھما کر تالا کھول دیا۔ ہم سب ڈیرے کے اندر داخل ہو گئے۔ میری ہدایت پر اے ایس آئی نے ڈیرے کے گیٹ کو دوبارہ بند کر دیا۔

مجھے امید نہیں تھی کہ کسی نے ہمیں اس طرف آتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ موسم سردیوں کا ہو تو پنجاب کے گاؤں دیہات میں رات نو بجے کا مطلب ہے، آدھی رات..... اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ میں آج سے لگ بھگ پچاس سال پہلے کے پنجاب کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس زمانے میں کوئی سہولت یہاں نہیں تھی۔ گاؤں کا مطلب صرف گاؤں تھا..... ایک ماڈل گاؤں!

چودھری الٰہی بخش کا ڈیرا کم و بیش آدھے کنال رقبے پر پھیلا ہوا تھا جس کے مغربی حصے میں پہلو بہ پہلو تین کمرے بنے دکھائی دیے۔ باقی کی ساری جگہ ایک کشادہ صحن کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ اس صحن کی جنوبی دیوار کے ساتھ چار بھینسیں اور ایک گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ اندھیرا ہونے کے باعث میں ان جانوروں کا رنگ تو نہ دیکھ سکا البتہ بعد ازاں مجھے پتا چلا

کہ ان میں سے دو بھینسیں کالی اور دو بھوری تھیں جبکہ وہ گھوڑا مشکی رنگ کا تھا۔ میں اللہ رکھا کو لے کر سب سے پہلے مذکورہ گھوڑے کی جانب بڑھ گیا۔

تھانے سے نکلتے وقت میں نے اور اے ایس آئی نے ایک ایک ٹارچ اپنے ساتھ رکھ لی تھی تاکہ رات کی تاریکی سے بہ خیر و خوبی نمٹا جاسکے۔ علاوہ ازیں میرا سروس ریوالور بھی بیلٹ کے ساتھ منسلک ہولسٹر میں موجود تھا۔ اگرچہ اس بات کا کوئی امکان تو نہیں تھا کہ ہمیں کسی ایمرجنسی کا سامنا ہو لیکن پھر بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مصیبت کبھی دستک دے کر نہیں آتی لہٰذا کسی بھی مشن میں انسان کو ہر پہلو سے چوکس اور ہوشیار رہنا چاہیے۔

مشکی گھوڑے کی جانب بڑھتے ہوئے میں نے اللہ رکھا سے کہا۔ ''چاچا! آپ کو دن والے گھوڑے کا کھرا تو یاد ہوگا.....؟''

''سو باتوں کی ایک بات۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''کوئی ایسا ویسا یاد ہے ملک صاحب..... یہ سمجھ لیں کہ وہ میرے حافظے میں ایسے نقش ہے جیسے کرنسی سکے پر اس کی مالیت کندہ ہوتی ہے۔''

''پھر تو مزہ آجائے گا۔'' میں نے پرمسرت لہجے میں کہا اور مشکی گھوڑے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''چاچا، مجھے یقین ہے، یہی گھوڑا اس واردات میں استعمال ہوا ہے۔ آپ اب اپنے تجربے کی روشنی میں تحقیق کر کے میرے خیال کی تصدیق یا تردید کرو۔ میں اسی مقصد سے تمہیں اتنی ٹھنڈ میں گرم بستر سے نکال کر لایا ہوں۔''

میں اللہ رکھا کو اس کے گھر سے لے تو آیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم کس جگہ اور کیا کرنے جارہے ہیں۔ وہ گھوڑے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''کوشش کرتا ہوں ملک صاحب..... دیکھتا ہوں، حالات اور قدرت کیا رنگ دکھاتے ہیں۔''

میں نے اور اے ایس آئی نے اپنی اپنی ٹارچ روشن کر کے اللہ رکھا کے کام کو آسان بنانے کی کوشش کی۔ اس نے بڑی مہارت سے گھوڑے کی ٹانگ کو پکڑ کر اس کا پاؤں اوپر اٹھالیا پھر بہ غور اس کے کھر اور سم کا جائزہ لینے لگا۔ چند سیکنڈ کے اس معائنے کے بعد اس نے بڑے مدبرانہ انداز میں گردن ہلائی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! اس گھوڑے کو ذرا زمین پر چلا کر دکھائیں..... سوار سمیت!''

میں نے اے ایس آئی کو اشارہ کیا۔ اس نے کھونٹے پر سے گھوڑے کی رسی کھول لی پھر میری ہدایت کے مطابق اس پر سوار ہو کر ڈیرے کے صحن میں مختصر سی ''گھڑسواری'' کا مظاہرہ کرنے لگا۔

اللہ رکھا نے مطلوب حسین والی ٹارچ اپنے ہاتھ میں لے لی اور گھوڑے کے ہر قدم کی جانچ پڑتال شروع کردی۔ گھوڑا بہ مشکل آٹھ قدم چلا ہوگا کہ اللہ رکھا نے یہ اعلان فرمایا۔ ''سو باتوں کی ایک بات اور کل ملا کر معاملہ سمجھ میں آگیا ہے.....''

میں نے اسی کے انداز میں کہا۔ ''حالات اور قدرت کیا رنگ دکھا رہے ہیں چاچا؟''

''ملک صاحب! یہ بالکل وہی گھوڑا ہے جس پر دو سوار اس ڈیرے کی جانب سے وہاں کھیتوں میں پہنچے تھے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اور پھر واپسی میں یہ گھوڑا ایک سوار کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر اسی ڈیرے کی طرف آیا تھا.....'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''گھوڑے کا کھر دیکھ کر مجھے نوّے فیصد یقین ہوگیا تھا اور اس کی چال اور اس چال کے نتیجے میں بننے والے کھر نے مجھے سو فیصد یہ یقین دلا دیا ہے کہ یہ وہی گھوڑا ہے جس کی آپ کو تلاش تھی ملک صاحب!''

''ہم نے اس ڈیرے پر رہنے والے چودھری الٰہی بخش کے ملازم خاص رحم دین عرف رحمو کو گرفتار کرلیا ہے۔'' میں نے اللہ رکھا کو بتایا۔ ''تھانے میں اس سے پوچھ گچھ جاری ہے۔ انشاءاللہ! بہت جلد یہ کیس حل ہوجائے گا۔''

''اگر یہ رحمو اس کیس میں ملوث ہے تو پھر یہی نظر آتا ہے کہ اس نے نامعلوم عورت کی لاش کو گھوڑے پر لاد کر خادم حسین کے کھیتوں میں پہنچایا تھا اور لاش کو وہاں پھینک کر واپس ڈیرے پر آگیا تھا۔'' اللہ رکھا نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں اظہار خیال کیا۔ ''لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ نامعلوم عورت کو قتل بھی اسی نے کیا ہوگا۔''

''یہ بھی معلوم کرلیں گے۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''اگر اس عورت کی لاش کو اس ڈیرے سے اٹھا کر کھیتوں تک پہنچایا گیا ہے تو پھر اس بات کے روشن امکانات ہیں کہ اسے اسی ڈیرے پر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہوگا۔ پھر میں نے ڈیرے کی مغربی دیوار کے ساتھ بنے ہوئے کمروں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے اے ایس آئی سے کہا۔ ''مطلوب حسین! ہم ان کمروں کی تلاشی لیں گے۔ مجھے یقین ہے، اس عورت کے قتل کے شواہد اسی ڈیرے سے ملیں گے۔''

''اور اس کا کیا کروں ملک صاحب؟'' مطلوب حسین نے گھوڑے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کہیں تو میں اسے دوبارہ کھونٹے پر باندھ دیتا ہوں۔''

''یہاں نہیں.....!'' میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''پھر کہاں ملک صاحب؟''

''ادھر کسی کمرے میں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور اس کے ساتھ ہی چاروں بھینسیں بھی کمرے کے اندر ہی بندھیں گی۔ باہر بڑی کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے۔ یہ بے زبان جانور ہیں تو کیا ہوا، موسم کی شدت تو ہر ذی روح پر اثر انداز ہوتی ہے نا.....''

''ممکن ہے، رحمو انہیں آج کل کمرے کے اندر ہی باندھتا ہو۔'' مطلوب حسین نے کہا۔ ''اتنی عقل اور تجربہ تو اس کا بھی ہوگا۔ میں نے گرفتاری کے وقت اسے کچھ کرنے یا سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔''

''تو پھر تم فی الحال گھوڑے کو ادھر کھونٹے پر ہی باندھ دو۔'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ ''پہلے ہم ان کمروں کا اندرونی جائزہ لے لیں، پھر ان جانوروں کے قیام کا بھی بندوبست کرتے ہیں۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے ملک صاحب؟'' کھوجی اللہ رکھا نے پوچھا۔

''اگر آپ کو یقین ہے کہ جس گھوڑے کا کھرا ادھر خادم حسین کے کھیتوں سے اس ڈیرے تک پھیلا ہوا ہے وہ یہی مشکی گھوڑا ہے تو پھر آپ کا کام ختم ہوجاتا ہے۔'' میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ''اور اگر دن کی روشنی میں آپ اس گھوڑے کے کھرے کی مزید چھان بین کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو پھر صبح میرے پاس تھانے میں آجائیں۔''

''سو باتوں کی ایک بات.....!'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''کل ملا کر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ قدرت اور حالات نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ مجھے اس گھوڑے کے سلسلے میں مزید کسی جانچ پڑتال کی ضرورت نہیں۔''

''تو پھر آپ فارغ ہیں چاچا۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''آگے کے معاملات میں سنبھال لوں گا۔ آپ اس کیس کے اختتام پر اپنا انعام وصول کرنے میرے پاس تھانے ضرور آنا۔''

مخبروں، کھوجیوں اور قانون سے اسی نوعیت کا تعاون کرنے والے دیگر افراد کی محنت کے صلے کو ہم ''انعام'' کہا کرتے تھے اور عموماً ہمیں یہ انعام اپنی جیب خاص ہی سے ادا کرنا پڑتا تھا۔

''تو پھر میں چلتا ہوں جناب!'' اللہ رکھا نے الوداعی انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے چاچا۔'' میں نے اسے جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ معاملہ ابھی راز ہی میں رہنا چاہیے۔''

''آپ بالکل بے فکر رہیں ملک صاحب!'' اس نے مجھے یقین دہانی کرائی۔

اور میں اس کی طرف سے واقعی بے فکر ہوگیا۔

اللہ رکھا کے جانے کے بعد میں اے ایس آئی کی معاونت سے ڈیرے کے تین کمروں کی تلاشی میں مصروف ہوگیا۔ ان تینوں میں سے ایک کو کنڈی لگی ہوئی تھی، باقی دو کے دروازے کھلے دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے سب سے پہلے کنڈی والے کمرے کا رخ کیا۔

میں نے اے ایس آئی سے پوچھا۔ ''جب تم رحمو کو گرفتار کرنے آئے تھے تو تم نے ان کمروں میں جھانک کر بھی دیکھا تھا؟''

''نہیں جناب!'' مطلوب حسین نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''اس وقت میری ساری توجہ رحمو کی گرفتاری پر مرکوز تھی اور کسی چیز پر میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔''

کنڈی گرا کر ہم مذکورہ کمرے میں داخل ہوگئے اور ٹارچ کی روشنی میں اس کا جائزہ لینے لگے۔ وہ کمرا ایک مختصر سے بیڈروم کا نقشہ پیش کررہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اگرچہ کمرے کی جزئیات تک تو رسائی ممکن نہیں تھی تاہم مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ اس بیڈروم کی سیٹنگ کم از کم رحمو کی اوقات سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ وہاں کی ہر شے سے صفائی، سلیقہ اور امارت ٹپکتی تھی۔

''مجھے لگتا ہے، یہ کمرا چودھری الٰہی بخش نے اپنے آرام کے لیے سیٹ کررکھا ہے۔'' اے ایس آئی نے میرے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''میرا بھی یہی اندازہ ہے مطلوب حسین.....!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

چودھری اور وڈیرے اپنے ڈیروں وغیرہ پر ایک آدھ کمرا اپنے لیے سیٹ کر کے رکھا کرتے ہیں جہاں وہ اکثر یا کبھی کبھار فرصت کے ''لمحات'' گزارنے چلے جاتے ہیں۔ میں نے ابھی جن خیالات کا ذکر کیا ہے وہ کوئی فارمولا نہیں اور یہ بھی طے ہے کہ بیشتر صاحب اختیار افراد ان مصروفیات سے بچے ہوئے نہیں۔ عقل مند قارئین کے لیے اشارہ ہی کافی ہے۔

اس سجے سجائے بیڈروم میں جب ہمیں اپنے مطلب کی کوئی چیز نہ ملی تو ہم اس کے برابر والے کمرے میں گھس گئے اور اندر گھستے ہی مجھے یقین ہوگیا کہ یہ کمرا رحمو کے استعمال میں رہتا ہوگا۔ مذکورہ کمرے کے وسط میں ایک چارپائی نظر آرہی تھی جس پر دلائی اور رضائی والا ایک گرم بستر بھی بچھا ہوا تھا۔ کمرے کی ایک دیوار پر بنی دو چھتی پر کھانے پینے کے چند برتن بھی رکھے دکھائی دیے۔ ہم نے ٹارچ کی روشنی ادھر ادھر گھما کر کمرے کا معائنہ کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی بھی مشکوک شے ہماری گرفت میں نہ آسکی۔

اے ایس آئی نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ''ملک صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم دن کی روشنی میں ڈیرے کی خانہ تلاشی کا کام کریں تو ہمیں رحمو کے جرم کا کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور مل جائے گا۔''

''تمہارا مشورہ اپنی جگہ بالکل درست ہے مطلوب حسین۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ہم دن میں بھی اس ڈیرے کا سروے کرنے آجائیں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مشکی گھوڑے کے کھرے کی شکل میں ہمیں جو ٹھوس ثبوت حاصل ہوگیا ہے اس کی مدد سے نامعلوم عورت کے قاتل تک رسائی حاصل کرنا مشکل ثابت نہیں ہوگا۔'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اب تھانے جاکر میں رحمو سے جو سوال وجواب کروں گا۔ تو وہ مجھے کوئی چکر نہیں دے سکے گا۔ مشکی گھوڑا اور اس کا کھرا رحمو کی زبان کے تمام بند کھول دے گا۔''

اے ایس آئی نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور ہم دوسرے کمرے سے نکل کر تیسرے کمرے میں داخل ہوگئے۔

یہ کمرا دوسرے دونوں کی بہ نسبت سائز میں زیادہ بڑا تھا اور ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہوگیا کہ اسے اسٹور روم کے طور پر استعمال کیا جارہا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ مختلف زرعی آلات رکھے نظر آرہے تھے۔ کمرے کے کونے میں جانوروں کے چارے کا ڈھیر بھی دکھائی دیا اور اسی کمرے کے فرش پر چند گھونگنے بھی ٹھنکے ہوئے تھے۔ یقیناً رحمو موسم سرما میں بھینسوں اور گھوڑے کو سردی کی شدت سے بچانے کے لیے اسی کمرے میں باندھتا ہوگا۔ اس کمرے کے مختلف حصوں اور کونوں کھدروں کی تلاشی بھی بے سود ہی ثابت ہوئی۔ نامعلوم عورت کے قتل کے حوالے سے ہمیں کسی قسم کے شواہد تک رسائی حاصل نہ ہوسکی۔

میں نے کمرے سے باہر آتے ہوئے اے ایس آئی سے کہا۔ ''مطلوب حسین! ہمیں اب ان بے زبان جانوروں کو کمرے کے اندر باندھ دینا چاہیے۔''

اے ایس آئی نے میرے خیال کی تائید کی اور دونوں نے مل کر تھوڑی سی کوشش کے بعد چاروں بھینسوں اور مشکی گھوڑے کو کمرے کے اندر پہنچا دیا۔ اے ایس آئی نے اس کام سے فارغ ہونے کے بعد مجھ سے پوچھا۔

''ملک صاحب! اب ہمیں واپس چلنا ہے نا؟''

''بالکل..... ہم واپس تھانے جارہے ہیں۔'' میں نے ڈیرے کے گیٹ کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم دوبارہ گیٹ کا تالا بند کردو۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''جو آپ کا حکم.....!''

ہم جیسے ہی گیٹ کے قریب پہنچے، گیٹ کے باہر مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی تیزی سے گزرا ہو۔ میں نے سوالیہ انداز میں مطلوب حسین کی طرف دیکھا۔ وہ میرے احساس کی تائید میں بولا، اس کی آواز سرگوشیانہ تھی۔

''ملک صاحب! باہر کوئی ہے.....!''

میں نے فوراً اپنے سروس ریوالور کو ہاتھ میں کرلیا اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ تھامے گیٹ کی جانب لپکا۔

گیٹ سے باہر آکر میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور ٹارچ کی روشنی پھینک کر بھی دیکھنے کی کوشش کی لیکن دور دور تک مجھے کسی انسان کے آثار دکھائی نہ دیے۔ مزید تصدیق کے لیے میں نے اس نامعلوم شخص کو پکارا بھی۔

''اوئے..... کون ہو تم..... سامنے آؤ!''

جب میری پکار پر کوئی ردعمل نہیں ابھرا تو میں نے للکارنے والے انداز میں ایک اور کوشش کی۔ ''تم جو کوئی بھی..... فوراً سامنے آجاؤ..... ورنہ میں گولی چلادوں گا۔''

اس مرتبہ بھی میری آواز صدا بہ صحرا ہی ثابت ہوئی۔ میری نگاہ کے سامنے، گھپ اندھیرے میں یہاں سے وہاں تک سرسبز وشاداب کھیت پھیلے ہوئے تھے اور ان کھیتوں میں فصل کھڑی تھی۔ جب میری دوسری پکار پر بھی ادھر سے کوئی جواب نہ آیا تو مطلوب حسین نے کہا۔

''ملک صاحب! وہ کوئی شب بیدار جانور بھی تو ہوسکتا ہے۔''

''ہاں، ہوسکتا ہے.....'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن پتا نہیں کیوں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے..... بلکہ مجھے یقین ہے، وہ کوئی حیوان ناطق تھا

جو..... پُراسرار انداز میں، تاریکی کی آڑ لے کر ہماری سرگرمیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔''

اے ایس آئی نے بے یقینی سے مجھے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

اس کے انداز نے مجھے چونکا دیا، میں نے پوچھا۔

''کیا بات ہے مطلوب حسین؟''

وہ گیٹ پر تالا ڈالنے کے بعد بولا۔ ''کیا ہوا ملک صاحب.....؟''

''تم نے مجھے ایسے شک زدہ انداز میں کیوں دیکھا ہے؟''

''ملک صاحب! آپ کے ساتھ عجیب وغریب واقعات کیوں پیش آرہے ہیں؟'' جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا مجھ سے سوال کرڈالا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میری حیرت الجھن میں بدل گئی۔

''اس وقت رات کے دس بج رہے ہیں.....'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''تو پھر؟'' میں نے اسے بات مکمل نہ کرنے دی۔

''دس بج رہے ہیں تو کیا ہوا؟''

''پچھلی رات اسی وقت آپ نے اپنے کوارٹر کے دروازے پر ایک پُراسرار دستک سنی تھی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور ابھی آپ کو یقین ہے کہ کوئی چھپ کر ہماری سرگرمی کا جائزہ لے رہا تھا، ہم جیسے ہی گیٹ کی جانب بڑھے، وہ یہاں سے بھاگ گیا ہے.....''

''تو کیا تم نے ادھر کسی کی موجودگی محسوس نہیں کی تھی.....؟'' میں نے دائیں بائیں گردن گھما کر اے ایس آئی سے سوال کیا۔

''محسوس کی تھی!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میری سوچ میں اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ وہ کسی انسان کے بجائے کوئی جانور بھی تو ہوسکتا ہے، جیسا کہ رات والی دستک کے بارے میں میرا خیال ہے کہ وہ تیز ہواؤں کا نتیجہ ہوگی لیکن آپ تو.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اسی سنجیدگی سے اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

''لیکن آپ کو تو یقین ہے کہ رات کو بھی آپ کے کوارٹر کے دروازے پر کسی انسان نے ہی دستک دی تھی اور اب بھی کوئی انسان ہی ہماری تاک میں تھا.....''

''میرے دماغ میں ایسی پختہ سوچ کیوں ہے، اس کا جواب میں فی الحال نہیں دے سکتا۔'' میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ ''دیکھتے ہیں، حالات اور قدرت کیا رنگ دکھاتے ہیں۔''

میں نے اللہ رکھا کے تکیہ کلام کو غیر ارادی طور پر استعمال کیا تو اے ایس آئی نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کل ملا کر معاملہ یہ ہوا کہ اب ہمیں واپس تھانے جانا ہے.....''

مطلوب حسین نے سو باتوں کی ایک بات کہی تھی لہٰذا ہم چودھری الٰہی بخش کے ڈیرے سے واپس آگئے۔

☆☆☆

میں ایک مرتبہ پھر رحمو سے سوال جواب کررہا تھا۔ اسے اپنے کمرے میں بلانے سے پہلے میں نے حوالدار رجب علی سے اس کی رپورٹ لے لی تھی۔ حوالدار نے مجھے

حاصل خواری

ایک لڑکی پیدائش سے اپنی طبعی عمر کو پہنچنے تک مختلف حیثیتیں اور پہچان اپناتی ہے مثلاً بیٹی، بہن، کزن، ماں، خالہ، بہو، ساس وغیرہ اور ہر حیثیت کے بعد دوسری حیثیت قبول کرتی جاتی ہے مگر ساس بننے کے بعد پھر کبھی ماں، بہن، بیٹی، بہو میں تبدیل نہیں ہوسکتی۔

اپنے ماں باپ کی آخری یا اکلوتی اولاد بیٹا شادی ہوجانے کے بعد کبھی یہ فیصلہ نہیں کرپاتا کہ اس کی ذہنی اذیت اور پریشانی میں اس کی بیوی کا کردار اور حصہ زیادہ ہے یا اس کی ماں کا۔

دو سوکنیں یا ساس بہو اگر ایک دوسری کے گن گائیں اور ایک ساتھ ہنسی خوشی رہنے کا دعویٰ کریں تو انہیں اگر جھوٹا نہ بھی سمجھو تو مجبور ضرور سمجھنا چاہیے، دعویٰ خواہ عملی ہو یا زبانی۔

کنوارپنے میں ماں، باپ، بہن، بھائیوں سے جو جو زیادتیاں اور بدلحاظیاں روا رکھی جاتی ہیں، شادی کے بعد ایک ایک کرکے ان کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔



مرسلہ: مسٹر ڈب کلاں

بتایا تھا کہ رحمو نے اس نامعلوم عورت کے قتل کا اقرار نہیں کیا۔ وہ ایسے کسی واقعے سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کر رہا تھا۔

''ملک صاحب! آپ نے سختی سے منع کر دیا تھا نا۔'' حوالدار نے رپورٹ کے اختتام پر کہا۔ ''اس لیے میں نے ابھی تک زبانی پوچھ گچھ ہی کی ہے اور بندہ کسی طرح چھری کے نیچے نہیں آ رہا.....''

''ٹھیک ہے، تم رحمو کو میرے پاس لے آؤ۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔ ''لگتا ہے، اس کی گردن پر مجھے ہی چھری پھیرنا پڑے گی۔''

پھر حوالدار رجب علی ایک منٹ سے بھی پہلے رحمو کو لے کر میرے پاس آ گیا تھا۔ میں نے رجب علی کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ کمرے سے نکل گیا تو میں رحمو کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ گردن جھکائے خاصا نڈھال کھڑا تھا۔

''رحمو!'' میں نے گمبھیر انداز میں اسے مخاطب کیا۔ ''ابھی تک اگر تمہارے ساتھ کوئی سختی نہیں کی گئی تو اسے پولیس کی کوئی کمزوری مت سمجھنا۔ میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں سچ بولنے کا..... اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ اس موقعے سے فائدہ اٹھاؤ یا پھر کڑی تفتیش سے گزرنے کے لیے تیار ہو جاؤ.....''

''تھانے دار صاحب! آپ کو میری بات کا یقین کیوں نہیں آتا۔'' وہ فریادی لہجے میں بولا۔ ''جو سچ تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے..... میں نے کسی عورت کو قتل نہیں کیا جناب.....''

''ایک سچ تم نے مجھے بتایا ہے اور دوسرا سچ میری تفتیش کے نتیجے میں سامنے آیا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور ان دونوں سچائیوں میں کوئی تال میل نظر نہیں آتا۔ اب ایک ہی بات ہو سکتی ہے رحمو.....'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا، پھر قدرے سخت لہجے میں اضافہ کیا۔ ''یا تو تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو اور یا پھر میری تفتیش غلط ہے، میں نے صبح سے اب تک جھک ماری ہے۔ مجھے تھانے داری چھوڑ کر آلو چھولے کی ریڑھی لگا لینا چاہیے۔''

وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر میرے خاموش ہونے پر بولا۔ ''تھانے دار جی، آپ نے کیا تفتیش کی ہے؟''

اس کا یہ سوال برمحل تھا کیونکہ میں نے جتنے جذباتی انداز میں آلو چھولے کی ریڑھی والی بات کی تھی اس پر رحمو کا چونک جانا ایک لازمی امر تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کی حیرت اور کانوں کے کیڑے جھاڑنے کی غرض سے کہا۔

''سنو رحمو! وہ جو مشکی گھوڑا تمہارے ڈیرے پر بندھا ہوا ہے وہی قتل کی اس واردات میں استعمال ہوا ہے۔ اس ڈیرے پر سے کوئی اس نامعلوم عورت کی لاش کو مشکی گھوڑے کی پیٹھ پر لاد کر پچھلی رات خادم حسین کے کھیتوں میں پہنچا تھا، اس نے لاش کو وہاں پھینکا اور پھر اسی گھوڑے پر سوار ہو کر واپس ڈیرے پر آ گیا۔ اس حقیقت کو تم کیا، دنیا کی کوئی طاقت جھٹلا نہیں سکتی۔ بتاؤ، اب کیا کہتے ہو تم؟''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے متعجب انداز میں مجھ سے پوچھا۔ ''آپ مشکی گھوڑے کے حوالے سے یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟''

میں نے اسے کھوجی اللہ رکھا کی ماہرانہ محنت کی تفصیل سے آگاہ کیا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی تمہارے ڈیرے سے آ رہا ہوں۔ ٹارچ کی روشنی میں جس حد تک ممکن تھا، میں نے وہاں کی تلاشی لی ہے۔ صبح ایک مرتبہ پھر ادھر کا سروے کروں گا لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ تم صبح سے پہلے ہی اپنے جرائم کا اقرار کر لو..... اب کہ جب میں تمہیں حوالدار کے حوالے کروں گا تو پھر تمہاری ہڈی پسلی کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔''

''سرکار! میں کس طرح آپ کو یقین دلاؤں.....'' اس کے لہجے سے بے بسی جھلکنے لگی۔ ''میں اپنی بے گناہی کے لیے بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں لیکن آپ تو قسم کیا، میری بات سننے کو تیار نہیں ہیں۔ میں کروں تو کروں کیا.....''

''میں نے جتنی بک بک تمہاری سن لی ہے نا رحمو.....!'' میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''میں ملزموں کو اپنے سامنے اتنی زبان چلانے کی اجازت نہیں دیتا ہوں۔ اب تم صرف اور صرف میرے سوالات کے جواب دو گے.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا، پھر پوچھا۔ ''وہ دلکش اور خوب صورت عورت کون تھی؟ وہ تمہارے ہاتھ کیسے لگی؟ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ اور..... ''کیا کرنے'' کے بعد تم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا؟ آلۂ قتل تم نے کہاں چھپایا ہے؟ تم نے اس بدنصیب کو کس جگہ ذبح کیا تھا.....؟''

ان خطرناک اور سنگین سوالات کی بھرمار نے رحمو کی حالت خراب کر دی۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈ گئی اور ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ڈھائی من کی وہ زندہ لاش دھواں دھار انداز میں رو پڑے گی مگر اگلے ہی لمحے اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہونے لگے۔

تبدیلی میرے لیے حیرت انگیز تھی۔ ڈر، خوف اور سراسیمگی کی جگہ اعتماد، سکون اور اطمینان نے لے لی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ کسی حتمی فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ یہ فیصلہ میری تھیوری کی تائید اور تصدیق میں بھی ہو سکتا تھا اور اس کے خلاف بھی۔ پھر جب وہ گویا ہوا تو اس کا دماغ کسی کتاب کے مانند کھل گیا۔

''تھانے دار صاحب!'' وہ بڑی توانا آواز میں بولا۔ ''میں نے منت سماجت کر کے، رو کر، گڑگڑا کر اور بڑی بڑی قسمیں کھا کر آپ کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کر لی ہے لیکن آپ کسی بھی قیمت پر مجھے بے قصور سمجھنے کو تیار نہیں ہیں اس لیے اب میں اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا کیونکہ.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر پہلے سے بھی زیادہ سنجیدگی سے بولا۔

''کیونکہ میں نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ خدا جانتا ہے کہ میں نے کسی عورت کو قتل نہیں کیا۔ آپ اس ناکردہ جرم میں مجھے پھانسی بھی لگوا دیں گے تو میں اف تک نہیں کروں گا۔ پھر میرا خدا خود ہی آپ سے پوچھ لے گا کہ..... اے ملک صفدر حیات! کیا میں نے تمہیں اس لیے تھانے دار بنایا تھا کہ تم بے گناہوں کو ناکردہ جرائم کی پاداش میں کال کوٹھری میں سڑاتے رہو اور انہیں تختے پر لٹکاتے رہو.....!''

رحمو نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ میں اندر سے ہل کر رہ گیا۔ کسی قاتل اور زانی شخص سے ایسی بردباری اور خداترسی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان لمحات میں وہ مجھے بہت ہی معصوم اور بے گناہ نظر آیا اور پھر میرے ذہن میں تیز روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا اور بالکل مختلف انداز میں اس سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔

''تمہارے بے گناہ یا گناہ گار ہونے کا فیصلہ تو صبح تک ہو ہی جائے گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ کل رات میں کسی نے وہ مشکی گھوڑا تم سے استعمال کرنے کے لیے لیا تھا؟''

''نہیں جناب، اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ بڑی قطعیت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ گھوڑا صرف چودھری صاحب کے استعمال میں رہتا ہے جناب۔ مجھے تو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ گھوڑا ابھی تک کھلے میں بندھا ہوا ہے۔ اگر اسے ٹھنڈ لگ گئی تو چودھری صاحب میری کھال کھنچوا ڈالیں گے۔ آپ کے آدمی نے اتنی افراتفری میں مجھے گرفتار کر کے تھانے پہنچایا ہے کہ میں جانوروں کی طرف دھیان ہی نہیں دے سکا۔''

''ان جانوروں کے لیے تم خود کو فکر میں نہ ڈالو رحمو۔'' میں نے بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے چاروں بھینسوں اور مشکی گھوڑے کو ایک کمرے کے اندر باندھ دیا ہے..... وہ کمرا جہاں چارے کا ڈھیر اور چند زرعی آلات رکھے ہوئے ہیں۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے تھانے دار صاحب!'' وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے تو میری بہت بڑی مشکل ٹال دی ہے۔''

جو شخص قتل کے الزام میں زیرتفتیش ہو اور اپنے معاملے کو خدا کے حوالے کر کے مطمئن ہو گیا ہو، وہ چودھری کے غیظ و غضب سے بچ جانے کے لیے دل کی جن گہرائیوں سے میرا شکریہ ادا کر رہا تھا اس نے مجھے یقین دلا دیا کہ رحمو مجرم نہیں ہو سکتا۔ میں نے قدرے نرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''رحمو! اللہ تمہارا ابھی بھلا کرے گا اگر تم میرے ساتھ تعاون کرتے رہو گے۔''

''جی، آپ حکم کریں، میں تو ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔''

''تو تمہیں پکا یقین ہے کہ وقوعہ کی رات کسی نے تم سے مشکی گھوڑا نہیں لیا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''اور نہ ہی تم اس گھوڑے کو ڈیرے سے باہر لے کر گئے تھے؟''

''بالکل نہیں جناب۔'' وہ پورے تیقن سے بولا۔ ''جب میں رات کو سونے کے لیے لیٹا تو میں نے چاروں بھینسوں اور مشکی گھوڑے کو چارے والے کمرے کے اندر باندھ دیا تھا اور آج جب میں کافی دیر سے سو کر اٹھا تو وہ گھوڑا کمرے کے اندر اپنے کھونٹے پر جوں کا توں بندھا ہوا تھا۔''

''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تمہاری غیر معمولی گہری نیند کے دوران میں کوئی ڈیرے کے اندر داخل ہوا ہو۔'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''وہ مشکی گھوڑے کو گھنٹے، آدھے گھنٹے کے لیے ڈیرے سے نکال لے گیا ہو اور پھر تمہاری بے خبری ہی میں اس نے گھوڑے کو لا کر واپس کمرے میں باندھ دیا ہو؟''

''ایسا کبھی ہوا تو نہیں جناب!'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مجھے جو پتا تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے.....''

''کل شام میں، ڈیرے پر تمہارے علاوہ اور کون تھا؟''

''میں تھا اور..... بدری تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''بدری کون؟'' میں چونک اٹھا۔

''اس کا نام تو بدرالدین ہے جی لیکن بچپن ہی سے وہ ''بدری'' مشہور ہے۔''

''جیسے تم رحمو مشہور ہو.....؟''

''جی ہاں.....!''

''یہ بدری تمہارے ڈیرے پر کیا لینے آیا تھا؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''جناب! وہ بھی میرے ساتھ ڈیرے پر ہوتا ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''میری طرح وہ بھی چودھری صاحب کا ملازم ہے پر.....''

''پر کیا رحمو؟'' میں نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

''جناب! بدری کی ڈیوٹی صبح سے شام تک ہوتی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جبکہ میں رات کو بھی ڈیرے پر ہی رہتا ہوں۔''

''بدری کے ذمے کس نوعیت کے کام ہیں؟''

''وہ زیادہ تر جانوروں کی دیکھ بھال کرتا ہے جی۔'' رحمو نے بتایا۔ ''خصوصاً چودھری صاحب نے اسے گھوڑے کی دیکھ بھال کے لیے رکھا ہوا ہے۔''

''وقوعہ کی رات جب بدری ڈیرے سے رخصت ہوا تو کیا گھوڑا ڈیرے پر ہی موجود تھا؟'' میں نے پہلے پوچھے ہوئے سوال کو دوسرے انداز سے کیا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتانے لگا۔ ''اس رات بدری میرے لیے رات کا کھانا لے کر آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کھانا کھایا اور مزے سے سو گیا۔''

ان لمحات میں میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا، میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اور پھر تم دوسری صبح یعنی آج صبح خلاف معمول بہت دیر تک سوتے رہے تھے ہیں نا.....؟''

''جی، بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا آج صبح بدری ٹھیک وقت پر ڈیرے نہیں پہنچا تھا؟'' میں نے جاننا چاہا۔ ''اس کی ڈیوٹی تو صبح سے شام تک ہوتی ہے نا؟''

''اگر وہ آج صبح وقت پر آجاتا تو پھر میرے دیر تک سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جناب۔'' رحمو نے بڑا معقول جواب دیا۔ ''وہ مجھے جگا دیتا۔''

''وہ کتنے بجے ڈیرے پر پہنچا تھا؟''

''دوپہر کے بعد.....!''

''اس تاخیر کا اس نے کیا سبب بتایا تھا؟''

''میں نے پوچھا تو کہنے لگا، رات کو ڈیرے سے جانے کے بعد اسے ٹھنڈ لگ گئی تھی۔'' رحمو نے جواب دیا۔ ''اور وہ پوری رات بخار میں پھنکتا رہا۔ صبح وقت پر، ڈیرے پر آنے کی ہمت نہیں ہوئی اس لیے دوپہر کو وہ گھر سے نکلا تھا۔'' وہ لمحے بھر کو رکا، ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے میں نے اسے، شام سے پہلے ہی گھر بھیج دیا تھا۔ پتا نہیں، اس بے چارے کا اب کیا حال ہوگا.....!''

''اس بے چارے کا حال تو میں تمہیں ادھر تھانے ہی میں ملاحظہ کروا دوں گا۔'' میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم صرف مجھے اتنا بتا دو کہ تمہاری گرفتاری پر ابھی تک حویلی کی طرف سے کوئی ہلچل کیوں نظر نہیں آئی۔ تم تو چودھری الٰہی بخش کے بہت خاص ملازم ہو.....؟''

''میں سمجھتا ہوں، میری گرفتاری کی خبر ابھی حویلی تک پہنچی ہی نہیں ہوگی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''جب مجھے ڈیرے سے گرفتار کیا گیا تو رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا اور اس سے بہت پہلے بدری وہاں سے جا چکا تھا۔ اب صبح جب وہ ڈیرے پر پہنچے گا اور میں اسے وہاں نہیں ملوں گا تو میری تلاش ہوگی، پھر کہیں جا کر پتا چلے گا کہ میں تو تھانے میں بند ہوں۔''

''چلو، میں مان لیتا ہوں کہ تمہاری گرفتاری ابھی تک حویلی اور گاؤں والوں کی نظروں میں نہیں آئی۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''کیا اس نامعلوم عورت کی لاش کا قصہ بھی ابھی تک حویلی کے اندر نہیں پہنچا ہوگا؟''

''اس واقعے کی خبر تو ضرور حویلی کے اندر پہنچی ہوگی جناب۔''

''پھر ادھر سے کوئی ردعمل دیکھنے میں کیوں نہیں آیا؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ کوئی معمولی واقعہ تو نہیں۔ چودھری الٰہی بخش آخر اس گاؤں کے کرتا دھرتا ہیں۔ انہیں تھانے آکر اس معاملے میں اپنی دلچسپی تو ظاہر کرنا چاہیے تھی نا؟''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''لیکن ہمارے چودھری صاحب تو گاؤں میں ہی نہیں ہیں اور حویلی میں ان کے بعد عورتیں ہی عورتیں باقی بچتی ہیں۔ اب وہ تو تھانے آنے سے رہیں۔''

''چودھری الٰہی بخش کہاں گئے ہیں؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''وہ لاہور گئے ہوئے ہیں۔'' رحمو نے جواب دیا۔

''کب سے؟''

''اس واقعے سے ایک دن پہلے وہ لاہور روانہ ہو گئے تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور ان کی واپسی تین چار دن کے بعد ہوگی۔''

''اوہ.....!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''تو اس کا مطلب ہے، یہ گھناؤنا کھیل چودھری الٰہی بخش کے غیاب میں کھیلا گیا ہے.....؟''

رحمو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اسے رجب علی کے حوالے کر دیا۔

تھانے سے اٹھنے سے پہلے میں نے دو تین ضروری کام کیے۔ نمبر ایک، رجب علی کو سختی سے تاکید کر دی کہ ملزم رحمو کو ایک طمانچہ تک نہیں مارنا۔ اس نوعیت کے تمام ترارمان نکالنے کے لیے اسے صبح کوئی اور شکار دے دیا جائے گا۔ نمبر دو، اے ایس آئی مطلوب حسین کو ہدایت دی کہ وہ کل علی الصباح ڈیوٹی آف کر کے سیدھا بدری کے گھر پہنچے گا اور اسے گرفتار کر کے تھانے پہنچائے گا۔ میں جب صبح تھانے پہنچوں تو بدری کو حوالات میں ہونا چاہیے۔ نمبر تین، میں نے مقامی کانسٹیبل امین کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے ساتھ ایک اور کانسٹیبل کو لے کر جائے گا اور رات کا باقی حصہ چودھری الٰہی بخش کے ڈیرے کی نگرانی میں گزارے گا اور جیسے ہی کوئی شخص اس ڈیرے میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو وہ لوگ فوراً اسے گرفتار کر لیں گے۔ پھر میں اطمینان سے اپنے کوارٹر میں آ گیا۔

رحمو میری نگاہ میں بے گناہ ثابت ہو چکا تھا۔ صبح اس کی بے گناہی کا کوئی نہ کوئی عملی ثبوت بھی مل جانا تھا۔ بدری کی ذات میری نظر میں مشکوک ہو گئی تھی۔ صبح اے ایس آئی جب اسے تھانے پہنچا دیتا تو میں اس سے بھی پوچھ گچھ کر لیتا۔ رات ڈیرے سے واپسی پر میں نے ڈیرے کے باہر کسی پُراسرار موجودگی کو محسوس کیا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی چھپ کر ہماری نگرانی کر رہا ہو۔ عین ممکن تھا، وہ ڈیرے کے اندر داخل ہونے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو پھر وہ امین اینڈ کمپنی کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتا تھا۔ میں نے امین کو ہر قسم کی کارروائی کے اختیارات دے دیے تھے۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ بس بندے کو پھڑکانا نہیں باقی سب چلے گا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جب میں صبح تھانے پہنچوں تو مذکورہ شخص سے بھی ملاقات ہو جائے۔

میں اگر کچھ نہیں کر سکا تو اس شخص کے لیے نہیں کر سکا جس کی پُراسرار دستک کے بعد ہنگامہ خیزی کا یہ سلسلہ شروع ہوا تھا جو ہنوز جاری تھا۔ اس کا کوئی نام پتا، سرا ٹھکانا میرے علم میں نہیں تھا لہٰذا میں اس سلسلے میں مکمل بے بس تھا۔

رات کو جب میں سونے لگا تو رحمو کے الفاظ نے میرے ذہن میں کھلبلی مچا دی۔ اس نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر کے مجھے بہت بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ میں نے ان لمحات میں تہ دل سے یہ دعا کی۔

''اے میرے پروردگار! تو میرے ہاتھ سے کسی بے گناہ کو سزا نہ دلوانا ورنہ میں ساری زندگی عذاب مسلسل کا شکار رہوں گا۔''

☆☆☆

اگلی صبح میری دعا قبول ہو گئی!

میں تھانے پہنچا تو وہاں اچھی خاصی رونق لگی ہوئی تھی۔ اے ایس آئی مطلوب حسین کو بدری کی طرف جانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی کیونکہ نصف شب کے بعد کانسٹیبل امین اینڈ کمپنی اسے پکڑ کر تھانے لے آئے تھے۔ بدری دیوار پھلانگ کر چودھری کے ڈیرے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ امین اور اس کے ساتھی کانسٹیبل نے اسے رنگے ہاتھوں قابو کر لیا تھا۔ ''رنگے ہاتھوں'' ان معنوں میں کہ اس کے پاس سے کپڑے میں لپٹا ہوا ایک خنجر بھی برآمد ہوا تھا جس کی دھار پر خون جما ہوا تھا۔

یہ وہی خنجر تھا جس کی تلاش مجھے آلۂ قتل کی حیثیت سے تھی۔ اس نامعلوم عورت کو اسی خطرناک خنجر کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ بدری مذکورہ خنجر کو ڈیرے میں کسی ایسی جگہ رکھنا چاہتا تھا جہاں پولیس کی نظر بہ آسانی رسائی حاصل کر سکے۔ رحمو کو ہم نے گرفتار تو کر لیا تھا لیکن بدری کی خواہش تھی کہ رحمو کے بچاؤ کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ اس کیس کے پوشیدہ گوشے بدری کی گرفتاری کے بعد نمایاں ہو گئے تھے۔

میں نے کسی پوچھ گچھ سے پہلے بدری کو پندرہ منٹ کے لیے حوالدار رجب علی کی مہربانی میں دے دیا۔ رنگے ہاتھوں پولیس کی گرفت میں آنے کے بعد اس کی ہمت ویسے ہی ٹوٹ چکی تھی، رہی سہی کسر رجب علی کے مہربان ہاتھوں نے پوری کر دی۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد وہ پاؤں پڑ کر اور ہاتھ جوڑ کر اقبالی بیان دینے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

اس نے میرے روبرو، خدا کو حاضر و ناظر جان کر جن جرائم کا اعتراف کیا اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ مقتول نامعلوم عورت کا نام شاہدہ تھا اور وہ ایک پیشہ ور عورت تھی۔ بدری کسی دوسرے علاقے سے اسے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اور شاہدہ کو بدری ہی نے دریا کے کنارے کھیتوں میں موت

کے گھاٹ اتارا تھا۔ موت کے منہ میں دھکیلنے سے قبل اس نے شاہدہ کے ساتھ بدتمیزی بھی کی تھی اور یہ سب کچھ سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا گیا تھا جس کا شکار رحمو کو بنانا مقصود تھا اور اس مقصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوگیا تھا۔

اس گھناؤنے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اسی نے رحمو کے کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملائی تھی تاکہ وہ بے سدھ سوتا رہ جائے اور اسے ڈیرے سے گھوڑا نکالنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ مشکی گھوڑا ویسے ہی اس کے ساتھ ہلا ہوا تھا لہٰذا یہ کام اس نے رحمو کی بے ہوشی کے دوران میں بہ آسانی کرلیا تھا۔

جن کھیتوں میں بدری نے شاہدہ کی شہ رگ کاٹ کر اسے موت کی نیند سلایا تھا وہ ڈیرے سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اپنے ظلم کا نشانہ بنانے کے دوران ہی میں اس نے شاہدہ کی کنپٹی کو مسل کر اسے بے سدھ کردیا تھا لہٰذا جب اس کی گردن پر خنجر چلانے کی باری آئی تو وہ بے چاری اپنی زندگی بچانے کے لیے ذرا سی بھی مزاحمت نہ کرسکی۔ جب کٹی ہوئی شہ رگ سے سارا خون نچڑ گیا تو وہ اسے کسی ذبح کیے ہوئے جانور کے مانند گھسیٹ کر ڈیرے کے قریب لے آیا تھا۔ اس نے ڈیرے کے اندر سے مشکی گھوڑا نکالا اور اس کے بعد سب کچھ وہی کیا جس کا اندازہ میں نے اور کھوجی اللہ رکھا نے قائم کیا تھا۔

بدری سے ایک سنگین غلطی یہ ہوئی کہ وہ آلۂ قتل کو اسی جگہ بھول آیا تھا جہاں کھڑی فصل کے اندر اس نے شاہدہ کو انا للہ کیا تھا جبکہ پروگرام کے مطابق یہ خنجر اسے ڈیرے میں کہیں رکھنا تھا تاکہ ہر سمت سے شاہدہ کے قتل کا شک رحمو پر جائے اور اس کے بچاؤ کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ آلۂ قتل کو ڈیرے پر چھپانے کے لیے اس نے ایک کوشش اس وقت کی تھی جب میں اور مطلوب حسین ڈیرے کی تلاشی کے بعد واپس جارہے تھے لیکن ہماری موجودگی نے اسے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کردیا تھا، پھر دوسری کوشش میں وہ پکڑا گیا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ بدری نے ایسا کیوں کیا؟ رحمو کے ساتھ اس کی ایسی کیا دشمنی تھی اور وہ شاہدہ کی جان کا بھی کیوں دشمن ہوگیا تھا؟

ان نہایت ہی اہم سوالات کا بھی بدری نے جواب دیا اور وہ جواب بڑا انکشاف انگیز تھا۔ جی ہاں..... بدری نے یہ سب کچھ رحمو سے کسی ذاتی رنجش کی بنا پر نہیں کیا تھا، بلکہ اس کام کے لیے اسے چودھری الٰہی بخش نے احکامات صادر کیے تھے اور ان معاملات کو صیغۂ راز میں رکھنے کی تلقین بھی کی تھی لیکن پولیس کے حرکت میں آجانے سے کوئی راز، راز نہیں رہا تھا۔

بدری کے اعترافی بیان کے مطابق رحمو نے کچھ زیادہ ہی ہاتھ پاؤں پھیلا لیے تھے۔ وہ چودھری کی عیاشیوں میں برابر کا شریک تھا جس کے لیے ڈیرے کا وہی کمرا استعمال کیا جاتا تھا جو بیڈروم کی طرز پر سیٹ کیا گیا تھا۔ چودھری اپنے دسترخوان کا بچا کھچا مال اسے بھی کھانے کو دے دیا کرتا تھا۔ اس طرح دونوں کی گاڑی بڑی خوش اسلوبی سے چل رہی تھی۔

اسی دوران میں چودھری الٰہی بخش پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ رحمو بڑی خاموشی کے ساتھ اس کی حویلی کی ایک عورت پر بھی ہاتھ صاف کررہا ہے۔ وہ بڑی آزادی سے حویلی کے اندر آتا جاتا تھا لہٰذا اس کام کے لیے اسے کوئی مشکل نہ ہوئی تھی۔ رحمو کی اس گستاخی نے چودھری کے تن بدن میں آگ بھر دی۔ ان ''تعلقات'' کی تصدیق ہوجانے پر چودھری نے رحمو کو عبرت ناک سزا دینے کا منصوبہ بنالیا۔

چودھری اگر چاہتا تو خود اپنے ہاتھوں سے یا کسی بھی شخص سے کہہ کر رحمو کو ٹھکانے لگوا سکتا تھا لیکن اس موقعے پر اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاہدہ نامی اس پیشہ ور عورت سے بھی چودھری کو بہت سی شکایات تھیں اور وہ اسے بھی بدترین سزا دینے کا خواہاں تھا لہٰذا اس نے شاہدہ اور رحمو کو نتھی کرکے ایک پیکیج سا بنا دیا تھا۔

اس کیس کی تمام گتھیاں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے سے پہلے ہی کھل چکی تھیں۔ میں نے ایک کیے کی دیر نہ کی اور بدری کے بعد چودھری الٰہی بخش کو بھی لاہور سے گرفتار کرکے حوالات کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا۔ وہ اپنی ذات کو ہر شک وشبے سے بالاتر ثابت کرنے کے لیے وقوعہ سے ایک روز پہلے ہی منظر سے غائب ہوگیا تھا لیکن بدری کی حماقت اسے لے ڈوبی۔

بدری نے جو کچھ بھی کیا تھا وہ چودھری الٰہی بخش کے حکم کا نتیجہ تھا، قانون کی نظر میں وہ دونوں ایک جیسے مجرم تھے لہٰذا میں نے ان کے خلاف بڑا مضبوط چالان بنا کر انہیں عدالت کے حوالے کردیا۔

بدری اور اس کا پردہ نشین آقا عدالت سے لمبی سزا پاکر جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے چلے گئے اور رحم دین عرف رحمو نے ہمیشہ کے لیے اس گناہ سے توبہ کرلی جس کے سبب وہ اس مصیبت میں گرفتار ہوا تھا۔

یہ فیصلہ اس قدرت کی جانب سے آیا تھا جس کی عدالت عالیہ میں اس نے اپنا کیس دائر کیا تھا۔

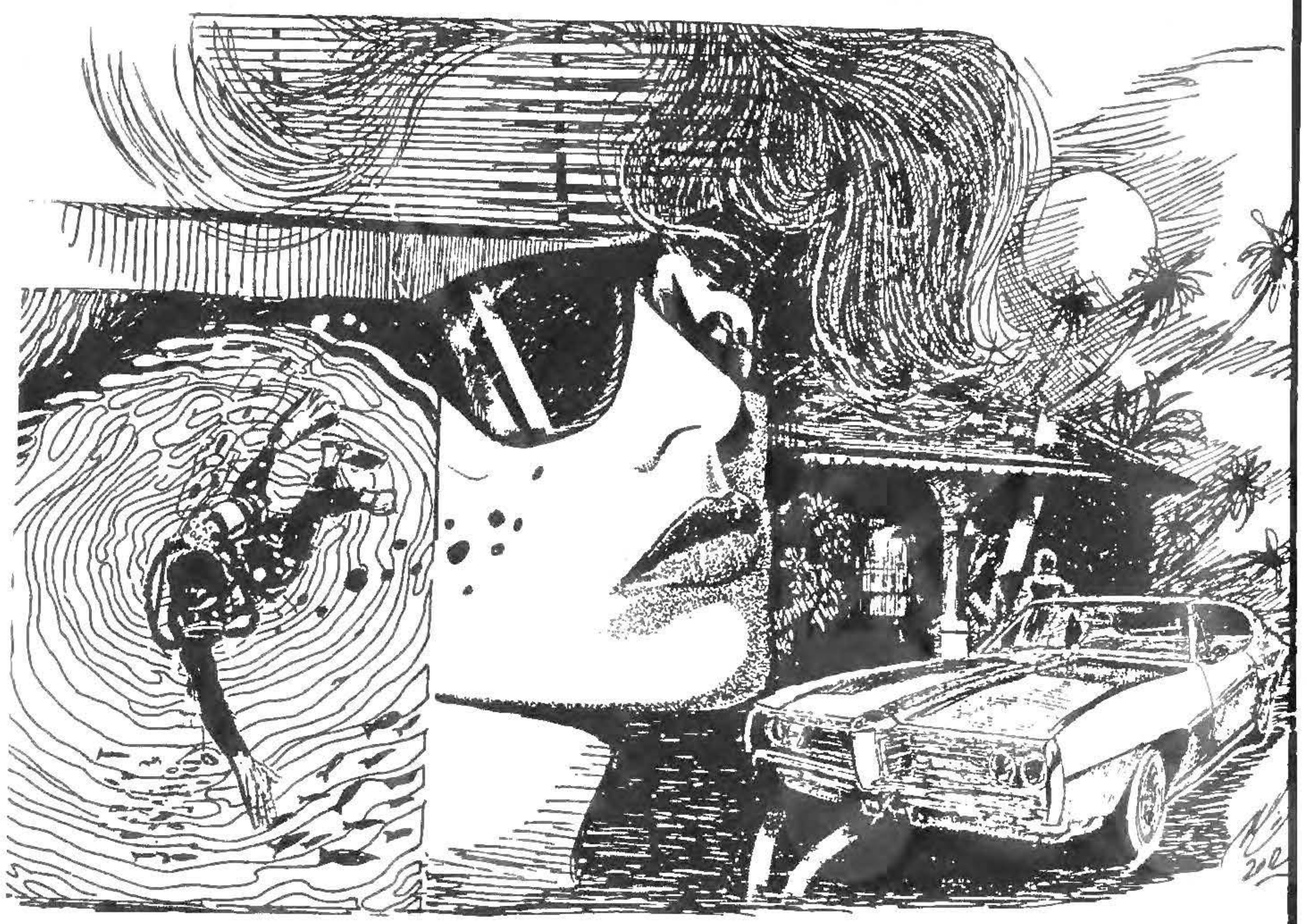
(تحریر: حُسام بٹ)

جنّت

تنویر ریاض

ہر پُرسکون اور خوبصورت جگہ کو انسان جنّت کا نام دیتا آیا ہے مگر... ہر جنت کو تباہ کرنے کے لیے کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی شیطان موجود ہوتا ہے۔ وہ بھی ایسے ہی شیطان صفت لوگوں کے درمیان گھر گیا تھا مگر ہر زندان میں کوئی نہ کوئی روزن بھی ہوتا ہے، ضرورت صرف تلاش کرنے کی ہوتی ہے اور وہ اسے مل گیا تھا۔

سنسنی خیز جرائم کی دنیا میں مغرب کا ایک دلچسپ انداز



ایف بی آئی ایجنٹ ڈینیل لیونارڈ ہونولولو کے علاقائی دفتر میں اپنی ڈیوٹی پر تھا کہ اسے فوری طور پر واشنگٹن ڈی سی میں واقع ڈپٹی ڈائریکٹر کے دفتر میں رپورٹ کرنے کے لیے کہا گیا۔ یہ حکم ملتے ہی وہ پہلی فلائٹ سے دارالحکومت کے لیے روانہ ہوگیا۔ پیر کی صبح جب وہ ڈپٹی ڈائریکٹر ڈینس بوائل کے دفتر پہنچا تو وہ اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ہیلو! مجھے افسوس ہے ڈین کہ تمہیں جنت سے بلانا پڑ گیا۔''

''کوئی بات نہیں جناب۔'' لیونارڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہاں کا موسم بھی اچھا ہے۔ کم از کم برف تو نہیں گر رہی۔''

بوائل نے دفتر میں موجود دیگر دو افراد سے اس کا

تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''ان سے ملو ڈین۔ یہ انٹر پول کے انسپکٹر رولینڈ کیپر ہیں جبکہ کرنل جیکس مینارڈ کا تعلق فرانسیسی پولیس سے ہے۔'' پھر وہ ان دونوں آدمیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ ہمارا اسپیشل ایجنٹ ڈینئل لیونارڈ ہے جس کے بارے میں، میں نے تمہیں بتایا تھا۔''

لیونارڈ نے ان دونوں سے مصافحہ کیا اور بوائل کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بوائل نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''انسپکٹر کیپر اور کرنل مینارڈ، ہم سے ایک ایسے معاملے میں مدد چاہتے ہیں جس نے انہیں تین سال سے پریشان کر رکھا ہے، میرا خیال ہے جیکس، تم خود ہی لیونارڈ کو پوری بات بتا دو۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' مینارڈ بولا۔ ''جیسا کہ تم جانتے ہو کہ بحرالکاہل کے جنوب میں جزائر کا ایک سلسلہ ہے جو فرانس کی ملکیت ہے۔ اس پٹی میں تقریباً سو جزیرے واقع ہیں جن کے مشرق میں جنوبی امریکا اور مغرب میں آسٹریلیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ معروف جزیرہ تاہیٹی ہے اور اس سے قریب ترین جزیرے کا نام موریا ہے۔ ان جزیروں کی اہم پیداوار قدرتی موتی ہیں جو کہ کستورا مچھلی میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان موتیوں کی برآمد سے فرانسیسی حکومت کو ٹیکس کی مد میں ایک معقول رقم ملتی ہے۔ یہ آمدنی اس سے کہیں زیادہ ہے جو تمہارے ملک میں تمباکو اور الکحل پر ٹیکس سے حاصل ہوتی ہے۔''

مینارڈ نے ایک لمحہ کے لیے توقف کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ سیاہ موتی بڑی تعداد میں ہماری حدود سے باہر نکالے اور غیر قانونی طور پر اسمگل کیے جا رہے ہیں۔ ان سے حاصل ہونے والی آمدنی کا کوئی حساب ہے اور نہ ان پر ٹیکس دیا جاتا ہے۔ شاید تمہیں ان موتیوں کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ ہو لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اب تک دریافت ہونے والے موتیوں میں یہ قسم انتہائی نایاب اور قیمتی ہے جو صرف کستورا مچھلی سے ہی حاصل کیے جاتے ہیں۔ ان مچھلیوں کا ٹھکانا عموماً گہرے پانی میں ہوتا ہے اور وہاں تک جانے کے لیے غوطہ خوروں کو بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم تمہاری بات سمجھ گئے۔'' بوائل نے کہا پھر وہ انٹر پول کے افسر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم اس بارے میں کیا کہنا چاہو گے؟''

''شکریہ!'' انٹر پول کے نمائندے نے سر کو ہلکا سا خم دیا اور لیونارڈ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''جیسا کہ تم جانتے ہو کہ ہم بین الاقوامی تنظیم ہیں اور دنیا بھر میں قانون نافذ کرنے والے اداروں سے تعاون کرتے ہیں۔ کوئی بھی ملک ہم سے جرائم کی بیخ کنی اور مجرموں کی گرفتاری کے سلسلے میں رابطہ کر سکتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت کرنل مینارڈ نے سیاہ موتیوں کے مسئلے پر ہم سے مدد مانگی اور اسی سلسلے میں ہم تمہارے پاس آئے ہیں۔''

بوائل نے لیونارڈ کے چہرے پر برہمی کے آثار دیکھے تو بولا۔ ''اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ فرانسیسی پولیس نے اپنے طور پر یہ مسئلہ کیوں حل نہیں کیا یا انہوں نے اس سلسلے میں کوئی کوشش نہیں کی تو یہ غلط ہے۔ انہوں نے اپنے ایک جاسوس کو اس علاقے کی نگرانی کے لیے بھیجا جہاں غیر قانونی طور پر سیاہ موتی نکالے اور اسمگل کیے جاتے ہیں۔ وہ شخص ایک مہینے سے بھی کم وقت میں لاپتا ہو گیا۔ انہوں نے یہ معاملہ انٹر پول کے حوالے کیا تو انسپکٹر کیپر نے اسکاٹ لینڈ یارڈ سے مدد مانگی لیکن ان کا بھیجا ہوا جاسوس بھی چھ ہفتے بعد غائب ہو گیا۔''

''اور اب یہ لوگ ہمارے پاس آئے ہیں تاکہ ہم بھی اپنے کسی بہترین آدمی کو اس پراسرار جزیرے کی بھینٹ چڑھا دیں۔''

''درست!'' بوائل اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''دوستو! اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو کچھ دیر باہر بیٹھ کر انتظار کرو۔ میں اپنے ایجنٹ سے کچھ ذاتی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

جب وہ دونوں باہر چلے گئے تو لیونارڈ بھی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''جناب۔ اگر مجھے اس وجہ سے یہاں بلایا گیا ہے تو میں درخواست کروں گا کہ مجھے واپس اپنے کام پر ہوائی جانے کی اجازت دی جائے۔''

''تمہاری درخواست مسترد کی جاتی ہے۔ اس میں میری خواہش کو دخل نہیں ہے بلکہ ڈائریکٹر کی طرف سے حکم آیا ہے اور میں یہ بھی بتا دوں کہ اسے اٹارنی جنرل کی منظوری حاصل ہے۔''

''ٹھیک ہے اگر آپ مجھے یہ کام دینا چاہ رہے ہیں تو میں استعفیٰ دے دیتا ہوں۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''میں ایسا ہی کروں گا اور یہاں سے جانے کے بعد سیکریٹ سروس کے لیے کام کروں گا۔''

بوائل قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''اب تمہاری اوقات یہ رہ گئی ہے کہ ڈرائیور کے روپ میں روزانہ دو بچوں کو اسکول چھوڑنے اور لینے جایا کرو گے، عام طور پر سیکرٹ ایجنٹ ایسے ہی کام کیا کرتے ہیں۔''

''کم از کم تاہیٹی جانے سے تو بہتر ہی ہوگا، تم کیوں چاہتے ہو کہ پہلے دو ایجنٹوں کی طرح میں بھی وہاں پہنچ کر غائب ہو جاؤں۔ میں شارک مچھلیوں کی خوراک نہیں بننا چاہتا۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔ اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ تم یہ کام کر سکتے ہو تو کبھی وہاں جانے کے لیے نہیں کہتا۔ تمہارے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور تم اس کے لیے بالکل موزوں ہو۔''

''واقعی!'' لیونارڈ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟''

بوائل اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا پھر وہ لیونارڈ کے پاس رکا اور بولا۔ ''تم جوان، اسمارٹ اور مضبوط جسم کے مالک ہو۔ پھر تم زیر آب پیراکی بھی کر سکتے ہو جو تاہیٹی میں تمہارے لیے بہت کارآمد ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے چہرے کی رنگت بھی ایسی ہے جیسی جزیرے پر رہنے والوں کی ہوتی ہے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کا جاسوس سفید فام تھا اس لیے نظروں میں آ گیا۔ اس کے علاوہ تم فرانسیسی جاسوس کی طرح فرنچ بھی نہیں بول سکتے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ تم ان دونوں سے مختلف ہو اور یہ مسئلہ حل کر سکتے ہو۔''

لیونارڈ منہ بسورتے ہوئے بولا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ میری شادی ہونے والی ہے اور میری منگیتر ہوائی کے سینیٹر کی بیٹی ہے۔''

''میں اسے جانتا ہوں۔ ابی گیل نیوسم، نام ہے اس کا۔ میں نے اس کی تصویر اخبار میں دیکھی ہے، بہت خوب صورت ہے۔''

''اگر آپ اسے غصے کے عالم میں دیکھ لیں تو ڈر جائیں گے۔ سوچ رہا ہوں کہ جب یہ خبر اسے سناؤں گا تو میرا کیا حشر ہوگا۔''

''تمہاری شادی میں ابھی تین مہینے باقی ہیں جبکہ میرا خیال ہے کہ تم پانچ چھ ہفتوں میں یہ کام ختم کر لو گے۔''

لیونارڈ نے پوچھا۔ ''کیا ڈائریکٹر کو ان دونوں جاسوسوں کی گمشدگی کا علم ہے؟''

''ہاں، اور اٹارنی جنرل بھی یہ بات جانتا ہے۔''

''اس کے باوجود وہ مجھے اس خطرناک مہم پر بھیجنا چاہ رہے ہیں۔''

بوائل کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''ڈینی! تمہارا نام اس رپورٹ میں نمایاں طور پر درج ہوگا جو انہیں بھیجی جائے گی اور ممکن ہے کہ وہ اسے صدر امریکا کو بھیج دیں۔ تمہاری کامیابی کا ڈنکا بج جائے گا کیونکہ تم وہ کارنامہ انجام دے کر واپس آؤ گے جہاں برطانیہ و فرانس کی حکومتیں اور انٹر پول والے بھی ناکام ہو گئے، یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے تمہارے سر پر تاج رکھ دیا جائے۔''

لیونارڈ کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اب اس کے ذہن میں صرف دو ہی باتیں رہ گئی تھیں۔ صدر امریکا اور تاج۔

ooo

جب لیونارڈ نے ہونولولو پہنچ کر ابی گیل کو یہ خبر سنائی تو وہ اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تاہیٹی.....! تم مذاق تو نہیں کر رہے؟''

لیونارڈ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''کاش یہ مذاق ہی ہوتا لیکن یہ حقیقت ہے اور مجھے یہ ذمے داری سونپی گئی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ڈیڈی کو فون کرتی ہوں۔ وہ گورنر سے بات کریں گے اور گورنر.....''

''تم ایسا نہیں کر سکتیں۔'' اس نے اپنی منگیتر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح محکمے میں میری پوزیشن بہت خراب ہو جائے گی، تم نہیں جانتیں کہ اگر کوئی اسپیشل ایجنٹ اپنی ذمے داری سے جان چھڑانا چاہے تو اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔''

''پھر تم اپنا تبادلہ سیکریٹ سروس میں کروا لو۔''

''تم چاہتی ہو کہ میں بھی ڈرائیور بن کر بچوں کو اسکول لے جایا کروں۔ تم نے ہمیشہ میرے ایف بی آئی ایجنٹ ہونے پر شیخی بگھاری اور اپنی دوستوں کے سامنے اس کا فخریہ اظہار کرتی رہیں۔ اب تم مجھے سیکریٹ سروس میں جانے کا مشورہ دے رہی ہو جس کا مطلب ہے کہ ہمیں واشنگٹن میں رہنا ہوگا جہاں ہمیشہ برف پڑتی رہتی ہے۔''

''تاہیٹی سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ یہ جزیرہ تو شاید اسپین یا کسی اور ملک کے پاس ہے۔''

''فرانس۔''

''پھر اس کام کے لیے تمہیں یا ایف بی آئی کو ہی کیوں منتخب کیا گیا۔'' وہ مشتبہ انداز میں بولی۔ ''ڈینی! کہیں کوئی خطرے والی بات تو نہیں؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ اسے یقین دلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ محض موتیوں کی اسمگلنگ کا کیس ہے۔ تم اسے وائٹ کالر کرائم کہہ سکتی ہو۔'' پھر وہ اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ''بوائل کا خیال ہے کہ میں اس معاملے کو پانچ چھ ہفتوں میں نمٹا لوں گا۔''

''میری شادی کی تیاریاں آج سے ٹھیک دو ماہ بعد

شروع ہو جائیں گی۔'' وہ اسے یاد دلاتے ہوئے بولی۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ شادی سے پہلے کلب کے ممبران تمہارے اعزاز میں بیچلر پارٹی ضرور دینا چاہیں گے۔''

''میں اس سے پہلے ہی واپس آجاؤں گا۔''

○○○

دس دن بعد لیونارڈ، تاہیٹی کے دارالحکومت پے پیٹ کے مضافات میں واقع ایرپورٹ پر اترا تو اس کی شناخت تبدیل ہو چکی تھی۔ اب وہ بل گارسن تھا جس کے پاسپورٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ گزشتہ سولہ ماہ کے دوران شمالی اور جنوبی بحرالکاہل کے مختلف جزیروں کے درمیان سفر کرتا رہا ہے اور ان میں سے بیشتر تک اس کی رسائی صرف کشتی کے ذریعے ہی ممکن تھی۔ ایرپورٹ پر اترتے ہی اسے گرمی اور ہوا میں رطوبت کا احساس ہوا۔ کسٹم اور امیگریشن کی کارروائیوں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور ڈرائیور کو پے پیٹ جانے کا کرایہ پیشگی دیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کچھ دیر کے لیے کارگو ٹرمینل پر رکنا ہوگا تاکہ وہاں سے اپنا سامان لے سکوں۔''

ڈرائیور نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''کوئی بات نہیں جناب۔'' یہ کہہ کر اس نے یوٹرن لیا اور گھوم کر پسنجر لاؤنج کے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا جہاں اس نے ٹوکن رکھ کر اپنا بیگ وصول کیا جس میں غوطہ خوری کا سامان تھا۔

''کیا آپ چھٹیاں منانے آئے ہیں؟'' ڈرائیور اس کے بیگ کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

لیونارڈ نے وہ بیگ پچھلی سیٹ پر رکھا اور خود ڈرائیور کے برابر میں بیٹھ گیا۔ ''چھٹیاں منانے نہیں بلکہ کام کی تلاش میں آیا ہوں۔ سنا ہے کہ یہاں غوطہ خوروں کو آسانی سے کام مل جاتا ہے۔''

''یہاں گہرے پانی میں غوطہ خوری کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ لوگ بیس فٹ سے نیچے نہیں جاتے اور جال میں جتنی مچھلیاں آجائیں وہ پکڑ لیتے ہیں۔ اس امید پر کہ انہیں کچھ موتی مل جائیں گے۔''

''یہاں تو موتیوں کا کافی کاروبار ہوگا؟''

''ہاں۔ سیاحوں کی وجہ سے کافی موتی بک جاتے ہیں۔ وہ ہفتے میں ایک بار جہاز کے ذریعے یہاں آتے ہیں اور سارے موتی خرید کر لے جاتے ہیں۔ اس طرح غوطہ خوروں کو مزید ایک ہفتے کی مصروفیت مل جاتی ہے۔'' اس نے لیونارڈ کی طرف اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور بولا۔ ''اگر تمہیں موتی خریدنا ہوں تو اچھی سی دکان پر لے چلتا ہوں۔''

لیونارڈ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ملازمت کی تلاش ہے اور میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہیں اس لیے مجھے کسی سستے سے ہوٹل میں لے چلو جو صاف ستھرا بھی ہو۔ اس کے علاوہ مجھے کسی بلیئرڈ روم کا پتا بھی بتا دو اگر مجھے کوئی ملازمت نہ ملی تو بلیئرڈ کھیل کر ہی کچھ پیسے کما لوں گا۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں تمہیں ایک ایسے ہوٹل میں لیے چلتا ہوں جو صاف ستھرا اور سستا ہے اور وہاں بار میں ہی بلیئرڈ ٹیبل بھی موجود ہے جہاں بہت سے سیاح پیسے کمانے کے لیے بلیئرڈ کھیلتے ہیں۔''

ٹیکسی ہوٹل، شہر کی مرکزی بندرگاہ کے قریب واقع تھا جہاں سے دوسرے جزیروں کو جانے کے لیے فیری سروس چلا کرتی تھی۔ لیونارڈ کو جو کمرا ملا اس میں معمولی نوعیت کا فرنیچر تھا۔ باتھ روم میں گلابی رنگ کے ٹائل لگے ہوئے تھے اور ٹیکسی ڈرائیور کے کہنے کے مطابق وہ کمرا واقعی صاف ستھرا تھا۔ لیونارڈ نے بیگ کھول کر اپنا سامان چیک کیا۔ اسے غوطہ خوری کے آلات کی فکر تھی کہ دوران سفر انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا ہو۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ سب چیزیں صحیح سلامت تھیں۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور بار میں چلا گیا۔

بار میں زیادہ رش نہیں تھا اور وہ عقبی کونے میں ایک ایسی میز تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جہاں بیٹھ کر وہ بار میں ہونے والی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے ساتھ اپنے آپ کو یہاں کے ماحول میں ایڈجسٹ کر سکے۔ وہ ابھی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک مقامی لڑکی مختصر سی نیکر پہنے اس کے پاس آئی۔ اس کے ایپرن پر ویٹرس کا بیج لگا ہوا تھا۔

''آپ کیا پینا پسند کریں گے؟'' اس نے شیریں لہجہ میں کہا۔

''تمہارے پاس کون سی بیئر ہے؟''

''آسٹریلین کراؤن، جاپانی رائس بیئر، فجی بٹر اور ہینانو۔''

''ہینانو۔ میں نے یہ نام پہلی بار سنا ہے۔''

''یہ مقامی بیئر ہے اور دوسری بیئرز کے مقابلے میں بھاری ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، وہی لے آؤ لیکن ٹھنڈی ہونی چاہیے۔''

اس کے جانے کے بعد لیونارڈ نے ہال کا جائزہ لیا تو اس کی نظر ٹیکسی ڈرائیور پر گئی جو کچھ فاصلے پر دو سفید فام لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔ ان دونوں نے ایک مرتبہ اس کی جانب دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ اسی کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے شاید ٹیکسی ڈرائیور انہیں بتا رہا ہوگا کہ ایک نیا غوطہ خور کام

کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔

ویٹرس بیئر لے کر آئی اور بولی۔ ''چھ ڈالرز پلیز۔''

لیونارڈ نے پرس سے پیسے نکالتے ہوئے اس کے سینے پر لگے ہوئے بیج پر نام پڑھا۔ ''ڈومی!''

''اچھا نام ہے۔ ڈومی، کیا تم یہیں کی رہنے والی ہو؟''

''نہیں۔ یہ ڈومینیک کا مخفف ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم فرانسیسی ہو؟''

''ایک چوتھائی، ڈومینیک میری دادی کا نام تھا، چھ ڈالرز پلیز۔''

لیونارڈ نے اسے دس ڈالرز کا نوٹ دیا اور بولا۔ ''بقیہ پیسے تم رکھ لو۔''

اس کے جانے کے بعد وہ بیئر کی چسکیاں لیتا رہا پھر اس نے اپنا مگ اٹھایا اور ٹہلتا ہوا برابر والے کمرے میں چلا گیا جہاں بلیئرڈ ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ اس وقت بھی ایک مقامی شخص اور ایک سفید فام کے درمیان مقابلہ چل رہا تھا اور درجن بھر افراد دو قطاروں میں لگی بنچوں پر بیٹھے یہ میچ دیکھ رہے تھے۔ وہیں ایک فولڈنگ کرسی بھی رکھی تھی۔ لیونارڈ اس پر بیٹھ گیا۔ دونوں کھلاڑیوں اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے اسے تجسس سے دیکھا پھر ایک مقامی شخص اس کے پاس آکر بولا۔ ''تم یہاں نہیں بیٹھ سکتے۔''

''کیوں؟'' لیونارڈ نے پوچھا۔

''یہ مسٹر تاموکی کرسی ہے اور ان کے علاوہ کوئی شخص اس پر نہیں بیٹھ سکتا۔''

لیونارڈ نے بہ غور اس کا جائزہ لیا۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ اور وزن کم از کم دو سو ساٹھ پونڈ ہوگا، بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں اور اس کا ایک بازو، لیونارڈ کی ران کے برابر تھا۔

''سوری!'' لیونارڈ نے کہا۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا۔''

یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ گیا اور دوسرے تماشائیوں کے ساتھ بنچ پر بیٹھ گیا۔

اسی اثنا میں وہ دونوں آدمی بلیئرڈ روم میں داخل ہوئے جنہیں وہ ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں بیئر کے گلاس تھے۔ وہ لیونارڈ کے بالکل قریب آکر کھڑے ہو گئے اور ان میں سے ایک بولا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے بھی ایک گیم کھیلنا چاہیے۔'' اس کا لہجہ برطانوی تھا اور لیونارڈ اس کی آواز بخوبی سن سکتا تھا۔

''کیا تم میرا ساتھ دو گے؟'' اس نے اپنے ساتھی سے

خوشنودی

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا۔ ''اے مالک! جب تو خوش ہوتا ہے تو کیا کرتا ہے؟'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''جب میں خوش ہوتا ہوں بارش برساتا ہوں۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ عرض کیا۔

''جب تو اور زیادہ خوش ہوتا ہے تو.....!''

''تو میں بیٹیاں پیدا کرتا ہوں۔''

''اے مالک دو جہاں تو سب سے زیادہ خوش ہو تو کیا کرتا ہے؟''

''پھر میں مہمان بھیجتا ہوں۔''

مرسلہ: حسنین عباس بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

پوچھا۔

''نہیں، تم ہی کھیلو۔'' دوسرے نے جواب دیا جو فرانسیسی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔

برطانوی لہجے والا آگے بڑھا اور اس نے دیوار پر لگے ہوئے تختۂ سیاہ پر سفید چاک سے اپنا نام لکھ دیا۔ برٹ، پھر وہ واپس مڑا اور لیونارڈ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''تم بلیئرڈ کھیلتے ہو؟''

''کبھی کبھی۔'' لیونارڈ نے کہا حالانکہ یہ سفید جھوٹ تھا۔ وہ پانچ سال تک بلیئرڈ کلب کا چیمپئن رہ چکا تھا۔

''میرے ساتھ ایک گیم کھیلنا پسند کرو گے؟'' برٹ نے پوچھا۔

جواب میں لیونارڈ نے کندھے اچکا دیے اور بلیک بورڈ پر اپنا نام لکھ دیا۔ ''بل۔''

دونوں کھلاڑی گیم ختم کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنی چھڑی مقررہ جگہ پر رکھ دی اور ایک لڑکے نے پھرتی سے آگے بڑھ کر نئے گیم کے لیے پندرہ گیندیں میز پر سجا دیں۔ لیونارڈ نے اپنا مگ خالی کیا اور چھڑی لینے کے لیے آگے بڑھا۔ عین اسی وقت ایک طویل قامت اور سفید بالوں والا شخص کمرے میں داخل ہوا اور اس کرسی پر بیٹھ گیا جو لیونارڈ نے خالی کی تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہی مسٹر تاموہے۔

''ہم کھیل کو دلچسپ بنانے کے لیے عام طور پر شرط لگا کر کھیلتے ہیں۔'' برٹ بولا۔ ''میرے خیال میں بیس بیس

ڈالرز ٹھیک رہیں گے۔"

"یقیناً۔" لیونارڈ نے اس کی تائید کی۔

ان دونوں نے اپنی جیب سے بیس بیس ڈالرز نکال کر میز کے کونے میں رکھے اور لیونارڈ پہلی بازی جیت گیا۔

جب وہ جیتی ہوئی رقم جیب میں رکھ رہا تھا، فرانسیسی لہجے میں انگریزی بولنے والا اس کے پاس آیا اور بولا۔

"کیا تم واقعی اچھا کھیلتے ہو یا قسمت سے جیت گئے؟"

"اسے میری خوش قسمتی سمجھو۔"

"پھر ایک گیم میرے ساتھ بھی کھیل کر دیکھو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے بیس ڈالرز کے دو نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیے۔

"یقیناً کیوں نہیں۔" لیونارڈ نے بھی اپنی جیب سے چالیس ڈالرز نکال لیے، اس دوران اس کا نیا حریف تختۂ سیاہ پر اپنا نام لکھنے چلا گیا "فراگ"۔

لیونارڈ سمجھ گیا کہ یہ وہی خفیہ ایجنٹ تھے جنہیں سیاہ موتیوں کی اسمگلنگ کے سلسلے میں یہاں بھیجا گیا تھا۔ ان میں سے ایک کا تعلق فرانسیسی پولیس اور دوسرے کا اسکاٹ لینڈ یارڈ سے تھا۔

لیونارڈ نے یہ گیم بھی جیت لیا، پھر اس کے کانوں میں تالیوں کی آواز گونجی۔ یہ مسٹر تامو تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر لیونارڈ کے پاس آیا اور بولا۔ "تم بہت اچھا کھیلتے ہو۔" پھر اس نے تختۂ سیاہ کی جانب دیکھ کر اس کا نام زیر لب دہرایا۔ "بل۔" اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ تمہارا پورا نام نہیں ہے۔"

"گارسن..... بل گارسن۔" لیونارڈ نے اپنا فرضی نام بتایا۔

"آج تک کسی نے فراگ کو محض دو شاٹس میں شکست نہیں دی۔ تم اب تک ساٹھ ڈالرز جیت چکے ہو، کیا میرے ساتھ اتنی ہی رقم کی بازی لگانا پسند کرو گے؟"

"میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے۔"

"یہ اسپورٹس مین اسپرٹ کے خلاف ہے۔ بائی دی وے میرا نام سائمن تامو ہے۔ میں اس ہوٹل، بار اور بلیئرڈ روم کا مالک ہوں۔"

لیونارڈ نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں موجود ہر شخص اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ کسی کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ یہاں تک کہ راہداری میں کھڑی بار کی ویٹرس ڈومی کی نظریں بھی اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ لیونارڈ کو اپنے ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے۔ وہ گھونٹ نگلتے ہوئے بولا۔

"میں تمہاری بے عزتی نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے یہ بازی ضرور کھیلوں گا۔"

تامو کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیونارڈ کو لگا جیسے وہ کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی ہار گیا ہو، اس نے دیکھا کہ تامو نے تختۂ سیاہ پر اپنا نام لکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔

کھیل شروع ہوا۔ لیونارڈ جانتا تھا کہ تماشائیوں میں سے کوئی بھی تامو کی شکست پسند نہیں کرے گا اس لیے وہ جان بوجھ کر اسے جیتنے کے مواقع فراہم کرتا رہا۔ حالانکہ کھیل کے دوران ایسے کئی مرحلے آئے جب وہ بہ آسانی اسے ہرا سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ گیم ختم ہوا تو اس نے تامو کے کھیل کی تعریف کی اور بلیئرڈ روم کے عقب میں بنے ہوئے باتھ روم کی طرف آ گیا۔ جب وہ اپنے ہاتھ دھو رہا تھا تو تامو بھی وہاں آ گیا اور اپنی باری کے انتظار میں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

"تم اگر چاہتے تو بہ آسانی گیم جیت سکتے تھے پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟"

لیونارڈ نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "تمہاری جگہ پر تمہارے لوگوں کے سامنے یہ اچھا نہ ہوتا۔ بہرحال میں نے آخر تک مقابلہ کیا اور آخری شاٹ کو چھوڑ کر یہ گیم تقریباً برابر ہی رہا۔"

"میرے ساتھ ایک ڈرنک لینا پسند کرو گے؟"

یہ ایک اچھا موقع تھا لیکن لیونارڈ کسی قسم کی بے چینی ظاہر کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اس وقت میرا کچھ اور پروگرام ہے۔" وہ اپنی بائیں آنکھ دباتے ہوئے بولا۔ "تمہارے بار میں جو لڑکی ہے ڈومی، میں سوچ رہا تھا کہ اس کے ساتھ قسمت آزمانے کی کوشش کروں۔"

"ٹھیک ہے۔ ڈرنک پھر سہی۔" تامو نے کہا۔

○○○

بار میں داخل ہونے کے بعد وہ دوبارہ اسی کونے والی میز پر بیٹھ گیا۔ ڈومی ایک بار پھر اس کے پاس چلی آئی۔

"مجھے افسوس ہے کہ تم گیم ہار گئے۔"

"ضروری نہیں کہ میں ہر گیم جیتوں۔"

"کیا تمہارے لیے ایک اور بیئر لاؤں؟"

"پلیز!" لیونارڈ بولا لیکن ڈومی فوراً ہی وہاں سے نہیں چل دی بلکہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے؟" لیونارڈ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "یہاں آنے والے عام طور پر پلیز کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔"

جب وہ بیئر لے کر آئی تو لیونارڈ نے پوچھا۔ "تم کب تک یہاں کام کرتی ہو؟"

"یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میرا خیال تھا کہ کام سے فارغ ہونے کے بعد تم میرے ساتھ کہیں چلتیں۔"

ڈومی کے چہرے پر سختی آ گئی اور وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ "اگر تم کچھ غلط سوچ رہے ہو تو اس کام کے لیے تمہیں راہ چلتے کئی لڑکیاں مل جائیں گی۔"

"میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔" وہ گڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ تم سے باتیں کرنا اچھا لگے گا اور تم بھی کسی ایسے شخص سے باتیں کرنا پسند کرو گی جو پلیز کہتا ہو۔"

ڈومی نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کا ذہن ٹٹولنے کی کوشش کر رہی ہو پھر بولی۔ "میری شفٹ دس بجے ختم ہو جاتی ہے۔ ویسے تو گاہک رات گئے تک آتے رہتے ہیں لیکن مسٹر تامو ان اوقات میں کسی عورت کا یہاں کام کرنا پسند نہیں کرتے۔"

"تم مجھے کہاں ملو گی؟"

"سڑک کے بائیں کونے پر ٹیلے ز، کے نام سے مچھلی اور نوڈلز کی ایک دکان ہے۔ تم وہاں میرا انتظار کر سکتے ہو۔"

"تھینک یو۔"

وہ ایک بار پھر دلفریب انداز میں مسکرائی اور بولی۔ "تم بہت اچھے الفاظ استعمال کرتے ہو۔ میرے خیال میں تم سے باتیں کرنے میں مزہ آئے گا۔"

بیئر ختم کرنے کے بعد وہ ہوٹل سے باہر چلا آیا اور وقت گزارنے کے لیے واٹر فرنٹ اسٹریٹ پر ٹہلنے لگا جہاں سیاحوں کے علاوہ بندرگاہ پر کھڑے جہازوں کا عملہ بھی سیر و تفریح میں مصروف تھا۔ جب وہ ٹیلے ز کی دکان کے سامنے سے گزرا تو اسے ڈومی کا خیال آیا اور وہ سوچنے لگا کہ اس نے اسے باہر گھومنے کی دعوت کیوں دی تھی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ مسٹر تامو کی پیشکش قبول کر لیتا۔ شاید ان سے قریب ہونے کی صورت میں اس کے لیے موتیوں کے اسمگلروں تک پہنچنا آسان ہو جاتا لیکن اس کے ذہن نے اس حقیقت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شاید ڈومی کی جسمانی کشش نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کچھ وقت گزارے گو کہ اس کی اپنی منگیتر ابی گیل کے ساتھ بہت بے تکلفی تھی لیکن وہ کبھی حد سے نہیں گزرے تھے۔ ابی گیل پرانے خیالات کی لڑکی تھی اور لیونارڈ بھی اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ چلتے چلتے اسے خیال آیا کہ وہ اس جگہ سے کافی آگے نکل آیا ہے جہاں ڈومی نے اس سے ملنے کے لیے کہا تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بج کر کچھ منٹ اوپر ہو گئے تھے، وہ جلدی سے پلٹا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب وہ مقررہ جگہ پر پہنچا تو ڈومی اس کا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو کر واپس جانے ہی والی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی۔

"میں سمجھی کہ تمہارا ارادہ بدل گیا ہے یا پھر تمہیں کوئی راہ چلتے لڑکی مل گئی ہے۔"

"نہیں۔" وہ اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "میں راستہ بھول گیا تھا۔"

"کیا تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟" ڈومی نے مچھلی کی دکان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بلکہ بیئر کے دو گلاس پینے کے بعد تو میری بھوک چمک اٹھی ہے۔"

دونوں دکان کے اندر چلے گئے۔ مچھلی اور نوڈلز دونوں ہی مزے دار تھے، اس کے ساتھ مینگو جوس نے کھانے کا لطف بڑھا دیا۔

"تم کتنے عرصے سے مسٹر تامو کے ساتھ کام کر رہی ہو؟" لیونارڈ نے جوس کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"دو سال سے۔" ڈومی بولی۔ "میں مکالی کی رہنے والی ہوں۔ اس جزیرے میں مسٹر تامو کا موتیوں کا کاروبار ہے۔ میرا شوہر غوطہ خور تھا لیکن ایک روز اسے شارک مچھلی نے نگل لیا لیکن غلطی اسی کی تھی۔ سب غوطہ خور جانتے ہیں کہ سورج ڈوبنے کے بعد شارک مچھلیاں سطح آب پر آ جاتی ہیں اور اندھیرے میں پانی کا رنگ گہرا ہو جاتا ہے۔ ہماری ایک بیٹی بھی ہے اور وہ اسے اعلیٰ تعلیم کی غرض سے فرانسیسی اسکول میں بھیجنا چاہ رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اسے زائد آمدنی کی ضرورت تھی اور وہ رات میں بھی جال لے کر مچھلیاں پکڑنے کے لیے غوطہ خوری کیا کرتا تھا اور اسی کوشش میں ایک دن اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔"

"اچھا، تمہاری ایک بیٹی بھی ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"ماریا۔ وہ آٹھ سال کی ہو چکی ہے اور ہفتے میں چار دن میری آنٹی اس کی دیکھ بھال کرتی ہیں، جب میں یہاں ڈیوٹی کر رہی ہوتی ہوں۔"

"مسٹر تامو نے شوہر کے مرنے کے بعد تمہیں یہ ملازمت دی؟"

ہاں۔ وہ بہت مہربان ہیں اور انہوں نے مقامی کے لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ انہیں ملازمتیں دی ہیں۔ ایک اسکول کی سرپرستی کرتے ہیں، سستی اشیا کا اسٹور کھول رکھا ہے۔ لوگوں کو رہائش کی سہولت فراہم کرتے ہیں اور ضعیف لوگوں کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں۔''

''کیا اس ہوٹل کے علاوہ بھی ان کا کوئی کاروبار ہے؟''

''ہاں، ان کے پاس چند مچھلیاں پکڑنے والی کشتیاں ہیں لیکن زیادہ تر کاروبار موتیوں کی فروخت سے ہوتا ہے جو وہ پے پیٹ کی دکانوں اور دوسرے جزائر کو دیتے ہیں۔''

''انہیں اتنی بڑی تعداد میں موتی کہاں سے ملتے ہیں؟''

''غوطہ خور سمندر کی تہ میں جا کر مچھلیاں پکڑتے ہیں اور ان کا پیٹ چاک کر کے یہ موتی حاصل کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر یہیں ہیں جبکہ کچھ مکالی اور دوسرے جزائر میں رہتے ہیں۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بھی گہرے پانی میں غوطہ خوری کرتے ہو۔''

''ہاں، میرے پاس زیرآب سانس لینے والا آلہ بھی ہے اور مجھے کام کی تلاش ہے۔''

''شاید مسٹر تاموکہیں ملازمت دے دیں۔''

''ہوسکتا ہے۔'' لیونارڈ نے بے پروائی سے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

کھانے کے بعد انہوں نے سڑک پر ٹہلنا شروع کر دیا۔ ان کے درمیان زیادہ بات نہیں ہو رہی تھی بلکہ وہ اردگرد کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ اچانک ہی رک گئی اور لیونارڈ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں بل۔''

اس کا پیار بھرا لہجہ لیونارڈ کے دل میں اتر گیا اور اس کا دل چاہا کہ وہ اس معصوم لڑکی کو دھوکا دینے کے بجائے اسے اپنی اصلیت سے آگاہ کر دے لیکن وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ''میں بھی تمہیں پسند کرتا ہوں ڈومی۔''

وہ دونوں ہوٹل واپس آئے تو ڈومی بولی۔ ''یہی وہ جگہ ہے جہاں میں پورے ہفتے رہتی ہوں۔''

''میں بھی یہیں ٹھہرا ہوا ہوں۔''

''جانتی ہوں۔ تمہارا کمرا نچلے فلور پر ہے۔''

وہ یہ سن کر حیران رہ گیا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور، برٹ، فراگ، تاموا اور اب ڈومی، کیا یہ لوگ اس کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں جبکہ اسے یہاں آئے ہوئے محض چند گھنٹے ہی ہوئے تھے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اسے مزید محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے دو آدمی اس مہم کے دوران غائب ہو چکے تھے اور وہ اپنا نام اس فہرست میں شامل کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔

دوسری منزل پر پہنچ کر وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول رہا تھا کہ ڈومی نے اپنی ہتھیلی اس کے گال پر رکھ دی اور بولی۔ ''میں تمہیں پسند کرتی ہوں بل۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگی جو نیچے ہال کے ایک کونے میں تھا۔ لیونارڈ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ڈومی نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی لیکن اس نے دروازہ بند نہیں کیا۔ لیونارڈ چند لمحے کھڑا سوچتا رہا پھر وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔

دوسری صبح جب وہ بار میں آیا تو اسے ڈومی کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ ٹہلتا ہوا ہوٹل سے باہر چلا گیا کہ اس کی نگاہ ایک کیفے پر لگے ہوئے بورڈ پر گئی جس پر لکھا ہوا تھا۔ ''یہاں امریکی ناشتا ملتا ہے۔'' وہ کیفے کے اندر چلا گیا اور اس نے اپنے لیے توس اور ابلے ہوئے انڈوں کا آرڈر دیا۔ اس کے ساتھ ہی کافی بھی تھی۔ لیونارڈ کو اس کا ذائقہ بہت اچھا لگا۔ وہ ناشتا کر ہی رہا تھا کہ سائمن تاموبھی وہاں آ گیا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''صبح بخیر! مسٹر بل گارسن؟''

''صبح بخیر! مسٹر سائمن تاموا!''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ گزشتہ شب تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے یا نہیں؟''

''نہیں۔'' اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ''وہ بہت ہی پیاری لڑکی ہے اور اس نے مجھے اس مقصد کے لیے کسی راہ چلتی لڑکی کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔''

''اور تم نے اس کی بات مان لی؟''

''نہیں۔ میں پیشہ ور لڑکیوں کی سرپرستی نہیں کرتا۔''

''تم بہت سمجھ دار ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم گہرے پانی میں غوطہ خوری کر لیتے ہو؟''

''ہاں۔ میں زیرآب تیراکی کر لیتا ہوں۔''

''اور یہ کہ تمہیں ملازمت کی تلاش ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کیا تم کستورا مچھلی پکڑنے کے لیے گہرے پانی میں جا سکتے ہو؟''

''اگر اچھے پیسے ملیں تو میں کسی بھی چیز کے لیے غوطہ

لگا سکتا ہوں۔''

''یہاں سے شمال کی جانب ایک جزیرہ ہے۔ جہاں میں کستورا مچھلیاں جمع کرتا ہوں تاکہ ان سے موتی حاصل کیے جا سکیں۔ اس خوب صورت جزیرے کا نام مکالی ہے۔''

یہ نام سنتے ہی اسے ڈومی یاد آ گئی۔ اس کا گھر بھی تو وہیں تھا۔

''اس وقت تمہارے پاس کتنے غوطہ خور ہیں؟''

''سمندر کی تہ میں جانے والا کوئی نہیں۔ وہ سب سطح آب پر ہی رہتے ہیں اور سمندری ہوا چلنے سے جو مچھلیاں اوپر آ جائیں، انہیں پکڑ لیتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ مجھے ایسے آدمی کی تلاش ہے جو گہرائی میں جا کر مچھلیاں پکڑ سکے۔''

''اندازاً کتنی گہرائی تک جانا ہوگا؟''

تاموئے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ میرے غوطہ خور تیس فٹ گہرائی تک جا چکے ہیں لیکن ان کے قدم تہ تک نہیں پہنچے۔ اس کی گہرائی کا اندازہ کوئی زیرآب غوطہ خور ہی لگا سکتا ہے۔''

''گویا تمہیں مجھ جیسے آدمی کی ضرورت ہے؟'' لیونارڈ نے پوچھا۔

''ہاں، اگر تم چاہو تو۔''

''معاوضہ کتنا ملے گا؟''

''پہلی بار پانچ سو ڈالرز، اس کے بعد معاوضہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ تم کتنی گہرائی میں جا سکتے ہو۔ ایک دن میں کتنے غوطے لگاتے ہو اور ہر بار کتنی مچھلیاں پکڑ کر لاتے ہو۔''

لیونارڈ نے کافی کا آخری گھونٹ لیا اور بولا۔ ''مجھے کب سے کام شروع کرنا ہوگا؟''

❍❍❍

دوسری صبح سائمن تاموکی چالیس فٹ طویل کشتی کے عرشے پر کھڑے ہو کر اس نے دور سے جزیرے کا جائزہ لیا تو اسے پہلی نظر میں ہی وہ بہت خوب صورت لگا۔

''کیسی جگہ ہے؟'' اس کے کانوں میں ایک نرم آواز آئی۔ یہ ڈومی تھی جو ہفتہ وار تعطیل پر اپنی بیٹی سے ملنے مکالی جا رہی تھی۔

''بہت ہی حسین منظر ہے۔'' لیونارڈ بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ یہاں بہت سے سیاح آتے ہوں گے۔''

''نہیں، یہاں کوئی نہیں آتا۔ یہ جزیرہ مسٹر تاموکی ملکیت ہے اور یہاں صرف ان کے چند ذاتی دوستوں کو ہی کشتیوں پر آنے کی اجازت ہے۔''

لیونارڈ سمجھ گیا کہ یہ ذاتی دوست کون ہو سکتے ہیں۔ یقیناً یہی لوگ اس جزیرے سے کشتیوں کے ذریعے موتی اسمگل کر کے لے جاتے ہوں گے۔

''یہ جزیرے کتنا بڑا ہے؟'' اس نے بات کو آگے بڑھانے کی خاطر پوچھا۔

''اس جزیرے کے گرد گھومنے والی سڑک بائیس میل طویل ہے۔ ہماری ملاقات ہوتی رہے گی۔ تم کب سے کام شروع کر رہے ہو؟''

''میں کل صبح سویرے ہی غوطہ لگا دوں گا۔ اس وقت لہریں پرسکون ہوتی ہیں۔ تم مجھے اپنی بیٹی سے کب ملوا رہی ہو؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔''

اسی دوران کشتی کنارے لگ چکی تھی۔ برٹ اور فراگ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بڑی پھرتی سے کشتی کو مضبوط رسیوں کے ذریعے کنارے سے باندھ دیا۔

''کیا یہ دونوں بھی مسٹر تاموکے لیے کام کرتے ہیں؟''

''ہاں۔''

''یہ اتنی جلدی یہاں کیسے پہنچ گئے؟''

''شاید کسی دوسری کشتی کے ذریعے رات کو ہی یہاں آ گئے ہوں گے۔'' ڈومی نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ دونوں کیا کام کرتے ہیں؟''

''یہ مچھلیوں کو چھیل کر ان میں سے موتی نکالتے ہیں۔''

''اس کے علاوہ اور کتنے لوگ یہ کام کرتے ہیں؟'' لیونارڈ نے پوچھا۔

''کچھ مقامی لوگ ہیں جو صرف سطح آب سے پکڑنے والی مچھلیوں کو چھیلتے ہیں لیکن یہ دونوں صرف وہی مچھلیاں چھیلتے ہیں جو سمندر کی تہ سے پکڑی جاتی ہیں۔''

گویا برٹ اور فراگ صرف وہی مچھلیاں چھیلتے ہیں جن میں سے سیاہ موتی بڑی تعداد میں نکلتے ہوں۔

''لیکن مجھ جیسے غوطہ خور کے نہ ہوتے ہوئے گہرے پانی سے مچھلیاں کس طرح پکڑی جاتی ہیں؟''

''کچھ غوطہ خور کبھی کبھی گہرے پانی میں جانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن زیادہ تر کو ناکامی ہوتی ہے، اسی لیے مسٹر تاموئے تمہیں رکھا ہے۔''

❍❍❍

دوسری صبح لیونارڈ اپنی پہلی مہم کے لیے تیار تھا۔ اس

نے پشتہ کے آخری کنارے پر اپنا بیگ کھولا۔ مسٹر تامو، برٹ اور فراگ بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اس نے غوطہ خوری کا لباس پہنا اور کمر کی پشت سے آکسیجن کے سلنڈر باندھ لیے۔

''تمہارے سلنڈر میں کتنی آکسیجن ہے؟'' تامو نے پوچھا۔

''یہ آکسیجن نہیں بلکہ ہیلیوکس نامی گیس ہے جس میں چار حصے ہیلیم اور ایک حصہ آکسیجن شامل ہے اور یہ ستر منٹ کے لیے کافی ہے۔''

جب سب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو اس نے چہرے پر سانس لینے کا آلہ لگایا جس میں دور بر کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک سانس لینے کے لیے اور دوسری اخراج کے لیے۔ اس میں پریشر گیج، گہرائی ناپنے کا آلہ اور مقناطیس بھی نصب تھا۔ پھر اس نے چہرے پر ماسک چڑھایا۔ تامو کو دیکھ کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور سمندر میں چھلانگ لگادی۔

پینتالیس ڈگری زاویہ پر گہرائی میں جاتے ہوئے وہ ایک حیرت انگیز دنیا سے روشناس ہوا۔

پانی بالکل صاف شفاف تھا۔ اس کے اردگرد مختلف سمندری جانور تیر رہے تھے اور اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی ایکوریم کا نظارہ کر رہا ہے۔ وہ ان کی مختلف اقسام اور تعداد دیکھ کر حیران رہ گیا۔ قدرت نے بھی سمندر کی تہ میں کیسے کیسے خزانے چھپا رکھے ہیں۔ وہ دس سال تک مختلف سمندروں میں غوطہ خوری کرتا رہا لیکن ایسا نظارہ اس نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ اسے زیر آب تیرتے ہوئے بائیس منٹ ہو چکے ہیں۔ اس نے تیزی سے نیچے کی جانب جانا شروع کیا اور ستر فٹ کی گہرائی پر پہنچ کر اس کی آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔ وہ زیر آب سطح مرتفع تک پہنچ چکا تھا جو ایک فٹ بال اسٹیڈیم جتنی بڑی تھی اور اس پر سفید مچھلیوں کا بستر بچھا ہوا تھا۔ جیسے پانی کی سطح کے نیچے برف کی تہ جم گئی ہو۔

اس نے پشت سے بندھا ہوا چھ فٹ لمبا جال کھولا اور اسے زمین کی سطح پر پھیلا دیا پھر اس نے ایک بازو لہرا کر مچھلیوں کو ہانکنا شروع کیا۔ پندرہ منٹ کے اندر جال پوری طرح بھر چکا تھا۔ اس نے دونوں ڈوریاں کھینچیں اور وہ جال ایک بوری کی شکل میں بند ہوگیا۔ پہلے وہ بے وزنی کی کیفیت میں زیر آب سطح تک آیا تھا لیکن واپسی کا سفر اسے جال میں بھری ہوئی مچھلیوں کے وزن کے ساتھ کرنا تھا۔ وہ بڑی مہارت کے ساتھ آہستہ آہستہ اوپر آیا اور بھرا ہوا جال مسٹر تامو اور اس کے ساتھیوں کے حوالے کر دیا۔

ooo

اس سہ پہر مارٹ اور فراگ ان سات آٹھ سو مچھلیوں کو چھیلنے میں مصروف تھے جو لیونارڈ گہرے سمندر کی تہ سے پکڑ کر لایا تھا جبکہ سائمن تامو اس کا گیس سلینڈر دوبارہ بھروانے کے لیے لے گیا ہوا تھا تاکہ اگلے روز کی غوطہ خوری کے لیے تیاری مکمل ہو سکے۔ لیونارڈ ایک درخت کے سائے میں لیٹا آرام کر رہا تھا کہ ڈوی اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آگئی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی خوب صورت لڑکی بھی تھی۔

''میں اپنی بیٹی کو تم سے ملانے کے لیے لائی ہوں۔ ماریا، یہ مسٹر بل ہیں۔''

''ہیلو بل!'' ماریا اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم فلمی اداکار ہو؟''

''پہلے کبھی ہوا کرتا تھا لیکن اب میں تھک چکا تھا۔ اس لیے یہ کام چھوڑ دیا۔''

''کیا تم جونی ڈیپ کو جانتے ہو؟''

''ہاں، میں نے ہی تو اسے سکھایا ہے کہ ایکٹنگ کیسے کی جاتی ہے۔''

''واقعی!'' وہ معصوم لڑکی تقریباً چیختے ہوئے بولی۔ ''میں نے تو ٹام کروز کو بھی پڑھایا ہے۔ اس کے ساتھ مسئلہ یہ تھا.....''

''بس آج کے لیے اتنا کافی ہے۔'' ڈوی مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ ''ہم تمہیں اس جزیرے کی سیر کرانے کے لیے آئے تھے۔ میں نے اس مقصد کے لیے مسٹر تامو سے ایک جیپ لے لی ہے، چلو۔''

ڈوی جیپ چلا رہی تھی جبکہ لیونارڈ اس کے برابر میں اور ماریا پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈوی نے ایک ٹوکری میں دوپہر کے کھانے کا سامان رکھ لیا تھا۔ جس میں سے ماریا وقفے وقفے سے کوئی پھل نکال کر کھا رہی تھی اس کی گود میں ایک مہینے پرانا فلمی میگزین رکھا ہوا تھا۔

ڈوی نے جیپ اس سڑک پر ڈال دی جو جزیرے کے گرد گولائی میں گھومتی تھی۔ تقریباً آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے جیپ اندر کی جانب موڑ لی اور چڑھائی چڑھنے لگی۔ آگے ایک گھنا جنگل تھا۔ اس نے دس منٹ چلنے کے بعد جیپ ایک جگہ کھڑی کر دی اور سامان نکال کر ایک صاف جگہ پر چٹائی بچھانے لگی۔ انہوں نے کھانے کا سامان رکھا اور وہاں بنے ہوئے قدرتی تالاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈوی بولی۔ ''پہلے تیراکی کریں گے۔''

لیونارڈ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ اسے ڈوی سے

اس بے تکلفی کی امید نہیں تھی۔ ماریا پہلے ہی پانی میں چھلانگ لگا چکی تھی۔ ڈوی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ''تم بھی آجاؤ۔ یہاں ہمیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہے۔''

لیونارڈ کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے اپنی قمیص اتاری اور ڈوی کے ساتھ ہی پانی میں کود گیا۔

ooo

اگلے دس دنوں تک لیونارڈ پہلے سے طے شدہ معاوضے پر روزانہ ایک غوطہ لگاتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ساٹھ فٹ کی گہرائی سے ساری مچھلیاں نکال لیں۔ اس نے مزید گہرائی میں جا کر مچھلیاں تلاش کرنے کی کوشش کی تو وہاں اسے ایک بہت بڑا غار نظر آیا جہاں ہزاروں مچھلیاں موجود تھیں جس کا مطلب تھا کہ وہ یہاں مزید کئی ہفتوں تک کام کر سکتا تھا۔

دسویں روز جب وہ اپنے بھرے ہوئے جال سمیت واپس آیا تو اس نے سائمن تامو کو ورانڈے میں بیٹھے دیکھا۔ وہ دور خلا میں گھور رہا تھا جیسے اس کی نظریں کسی کو تلاش کر رہی ہوں جب اس نے تامو کو مچھلیوں کے نئے ذخیرے کے بارے میں بتایا تو اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ یوں لگا جیسے اسے لیونارڈ کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

''وہاں بہت ساری مچھلیاں ہیں۔'' لیونارڈ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''ان کو نکالنے کے لیے شاید سو یا اس سے بھی زیادہ غوطے لگانا پڑیں گے۔''

تامو نے اپنا سر نفی میں ہلایا اور بولا۔ ''تم شاید کبھی بھی ان تمام مچھلیوں کو اوپر نہیں لا سکو گے۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''تم جو جگہ دیکھ کر آئے ہو۔ وہاں ان مچھلیوں کی افزائش ہوتی ہے، اگر تم وہاں سے سو مچھلیاں پکڑو گے تو دو سو مزید پیدا ہو جائیں گی۔''

''کیا تم جانتے تھے کہ سمندر کی تہ میں ایسی کوئی جگہ ہے؟''

''مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ تم جو مچھلیاں پکڑ کر لا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ ان کی افزائش گہرے پانی میں ہوتی ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

اسی اثنا میں ورانڈے کی طرف آنے والا دروازہ کھلا اور برٹ اور فراگ اندر داخل ہوئے۔ برٹ کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور فراگ نے ایک ڈنڈا پکڑ رکھا تھا۔

''اتنے معصوم نہ بنو۔'' برٹ نے کہا۔ ''تمہیں بہت کچھ معلوم ہے اور سیاہ موتیوں کے بارے میں جاننے کے لیے ہی تم یہاں آئے ہو۔''

''میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' لیونارڈ نے معصوم بننے کی کوشش کی۔

''ہمارے ساتھ کھیلنے کی ضرورت نہیں۔'' فراگ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے اور تم کس کے لیے کام کر رہے ہو؟''

''مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔''

برٹ نے اس پر ریوالور تان لیا۔ ''کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں مچھلیوں کی خوراک بننے کے لیے سمندر میں پھینک دیا جائے۔ اگر تم اسی طرح جھوٹ بولتے رہے تو شاید ہمیں یہی کرنا پڑے گا۔''

''بس اتنا کافی ہے۔'' سائمن تامو نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنا ریوالور جیب میں رکھ لو اور اسے بتا دو کہ تم دونوں کون ہو۔''

برٹ نے ریوالور جیب میں رکھا اور بولا۔ ''آئن ٹیٹن۔ میں کبھی اسکاٹ لینڈ یارڈ میں ہوا کرتا تھا۔''

''بال ڈوول۔'' فراگ نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''فرانسیسی پولیس کا سابق لیفٹیننٹ۔''

''اب تم بھی ہمیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو۔'' تامو نے کہا۔

لیونارڈ نے گہری سانس لی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کا بھید کھل چکا ہے۔ ''ڈینیئل لیونارڈ۔ ایف بی آئی کا اسپیشل ایجنٹ۔''

''ٹھیک ہے۔'' سائمن تامو اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہم سب اندر چل کر بیٹھتے ہیں تاکہ دوستانہ ماحول میں بات کر سکیں۔''

ooo

سائمن تامو کی اسٹڈی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ چاروں آدمی ایک دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے اور اس برانڈی سے شغل کرنے لگے جو سفید کوٹ میں ملبوس ایک ملازم وہاں رکھ کر گیا تھا۔ تبھی تامو نے لیونارڈ کو اس جزیرے کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

''میں نے چند سال پہلے ایک امریکی اداکار مارلن برانڈو سے یہ جزیرہ خریدا تھا جس کا اب انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے پاس ایسے کئی جزیرے تھے لیکن جب وہ ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں تاہیٹی آیا تو اسے یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ اس نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے اسے منتخب کر لیا اور باقی

جزیرے فروخت کردیے۔ اس سے چند سال قبل میں بھی تاہیٹی منتقل ہو چکا تھا پھر میں نے ایک چھوٹی سی کشتی خریدی جسے میں موتیوں کی تلاش کے لیے استعمال کیا کرتا تھا۔ میں نے کئی مقامی لڑکوں کو ملازم رکھا جو میرے لیے غوطہ خوری کرتے اور اتنے موتی لے آتے کہ میں انہیں اپنی چھوٹی سی دکان کے ذریعے فروخت کردیتا۔ مجھے اس کاروبار میں اچھا خاصا منافع ہو رہا تھا۔ میں نے چند سالوں میں اتنے پیسے جمع کرلیے کہ مزید کشتیاں اور دکانیں خرید سکوں۔ جب کچھ کمپنیوں کے تفریحی جہاز یہاں آنے لگے تو میرا کاروبار چمک اٹھا۔ پھر میں نے یہ ہوٹل خرید لیا۔ میری قسمت زوروں پر تھی اور ایک دن میں یہ جزیرہ بھی خریدنے کے قابل ہوگیا۔ جب میں نے یہ جزیرہ خریدا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ میں نے اسے سنوارنے کے لیے بڑی محنت کی اور اپنے کاروبار کا بڑا حصہ تاہیٹی سے یہاں منتقل کردیا۔ میرے غوطہ خور پہلے کے مقابلے میں زیادہ مچھلیاں پکڑ کر لانے لگے اور اس طرح مجھے بڑی تعداد میں سیاہ موتی ملنے لگے جنہیں میں نے قرب وجوار کے جزیروں پر بھیجنا شروع کردیا۔

ایک دن فرانسیسی ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کے دو افسر میرے پاس آئے اور کہا کہ میں جو موتی برآمد کررہا ہوں ان پر مجھے پینتالیس فیصد ٹیکس ادا کرنا ہوگا اور یہ کہ بندرگاہ پر آنے والے تفریحی جہازوں کے سیاحوں کو جو موتی فروخت کیے جائیں گے، وہ برآمدی اشیا میں شمار ہوں گے اور ان پر بھی ٹیکس دینا ہوگا۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی معلوم کرنا چاہا کہ میں اتنی بڑی تعداد میں یہ موتی کہاں سے حاصل کررہا ہوں۔ میں نے جھوٹ بولا کہ پے پیٹ میں رہنے والے غوطہ خور میرے لیے یہ موتی تلاش کرتے ہیں۔ میں نے ان کے سامنے اس جزیرے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا ہوگا کیونکہ یہاں کسی اور دکان دار کے پاس اتنی بڑی تعداد میں موتی نہیں تھے۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ موتیوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی پر ٹیکس ادا کروں۔

اس ٹیکس کی ادائیگی سے بچنے کے لیے میں نے آہستہ آہستہ اپنی دکانوں پر موتیوں کا ذخیرہ کم کرنا شروع کردیا اور مکالی میں یہ موتی ذخیرہ کرنا شروع کردیے۔ یہیں سے ایک تفریحی جہاز کا آفیسر ان موتیوں کو اسمگل کرکے انڈونیشیا پہنچا دیا کرتا تھا۔ میں نے اسمگلنگ سے ہونے والے منافع کو جزیرے کی حالت بہتر بنانے پر خرچ کرنا شروع کردیا۔ میں نے یہاں مفت اسپتال کھولا اور اسے چلانے کے لیے ڈاکٹر اور نرسوں کو ملازمت دی۔ بوڑھوں کو مفت رہائش کی سہولت فراہم کی اور بچوں کے لیے اسکول کھولا جہاں بہترین ٹیچرز کو رکھا گیا۔ اس کے علاوہ سستی اشیا کا اسٹور بھی کھولا۔ سڑکوں کی مرمت کروائی، لوگوں کو پینے کا صاف پانی مہیا کیا اور بجلی پیدا کرنے کے لیے سورج کی روشنی سے چلنے والا پلانٹ لگایا۔''

''غرضیکہ مسٹر تاموتو نے اس جزیرے کی حالت بدل دی۔'' پال ڈیول بولا۔

''پھر ہم دونوں اس منظر میں داخل ہوئے۔'' آئن بولا۔ ''فرانسیسی حکومت نے پال کو یہ معلوم کرنے کے لیے یہاں بھیجا کہ ٹیکس کی ادائیگی کے بغیر اتنے بڑے پیمانے پر موتیوں کی تجارت کس طرح ہو رہی ہے۔''

''مجھے اس معمے کو حل کرنے میں ایک مہینا لگ گیا۔'' ڈیول نے کہا۔ ''لیکن جب میں پے پیٹ میں لوگوں سے ملا تو وہ سب مسٹر تاموتو کی تعریف کرتے ہوئے نظر آئے کہ کس طرح انہوں نے اس جزیرے میں رہنے والے لوگوں کے لیے فلاحی کام کیے اور اپنی دولت کا بڑا حصہ اس پر خرچ کررہے ہیں تو میں بہت متاثر ہوا اور میں نے اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے اس آپریشن میں عملی طور پر حصہ لینے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک ماہ بعد آئن اسی مشن پر یہاں آیا تو میری نظر اس پر پڑی، میں نے اسے اعتماد میں لے کر سب کچھ بتادیا۔ اس طرح وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگیا۔''

''مجھے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی۔'' آئن نے اعتراف کیا۔ ''مسٹر تاموتو میں ادا کی جانے والی رقم سے کہیں زیادہ اس جزیرے کے لوگوں کی حالت بہتر بنانے پر خرچ کر رہے ہیں۔ اگر وہ فرانسیسی حکومت کو ٹیکس ادا کریں تو یہ رقم خزانے میں چلی جائے گی اور یہاں کے لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے مجھے مسٹر تاموکا طریقہ پسند آیا۔''

لیونارڈ نے برانڈی کا گھونٹ لیا اور بولا۔ ''تم لوگوں نے مجھے کب پہچان لیا تھا؟''

''پہلے ہمیں یقین نہیں تھا کہ تم کوئی ایجنٹ ہو۔ اسی لیے مسٹر تاموتو نے تم پر بھروسا کرنے کا فیصلہ کیا۔''

''پھر تمہیں مجھ پر شک کس طرح ہوا؟'' لیونارڈ نے تاموسے پوچھا۔

تاموسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا تم ڈومی کے سلسلے میں جذباتی ہو رہے ہو لیکن تم نے انکار کردیا، جو سچ نہیں تھا۔ تم اس پر مرمٹے تھے، میرے ہوٹل میں ہونے والا کوئی بھی واقعہ مجھ سے چھپا نہیں رہ سکتا لیکن شاید تم نے اس کی ساکھ بچانے کی خاطر مجھ سے جھوٹ بولا

کیونکہ تم اس کی قربت حاصل کرنا چاہ رہے تھے، اسی وقت تم میری نظروں میں مشکوک ہوگئے اور میں نے تمہاری نقل وحرکت پر نظر رکھنا شروع کردی۔''

''ڈومی ہماری بھی پسندیدہ تھی۔'' آئن نے کہا۔ ''لیکن اس نے ہم دونوں کو ٹھکرا دیا، ہمیں امید ہے کہ تم مستقبل میں اس کا پورا خیال رکھو گے۔''

''کیسا مستقبل؟'' لیونارڈ نے غصے سے پوچھا۔ ''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''اب تمہارا مستقبل اس جزیرے سے وابستہ ہے۔'' ڈیول بولا۔ ''تم یہیں رہو گے۔ مکالی میں ہمارے ساتھ۔''

لیونارڈ نے حیرت سے اسے دیکھا پھر اس کی نگاہ آئن اور تاموپر گئی۔ ان سب کے چہروں پر ایک ہی تحریر تھی۔ اس نے ڈومی اور اس کی بیٹی کے بارے میں سوچا لیکن اسے ابی گیل کا خیال نہیں آیا۔

''ہاں۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب یہیں میرا مستقبل ہے۔''

❁❁❁

دو ہفتے بعد مقامی اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی جس کی سرخی تھی۔

''طیارہ سمندر میں گر گیا۔ تین افراد لاپتا۔''

خبر کے مطابق ایک انجن والا چھوٹا طیارہ جس میں چار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اٹلس ایر لائنز سے کرایہ پر لیا گیا تھا۔ اطلاعات کے مطابق وہ تاہیٹی اور موریا کے درمیان کسی مقام پر سمندر میں گر گیا۔ جہاز پر تین افراد سوار تھے جو لاپتا ہیں۔ ان کے نام کلائیڈ بوائر، جیک ڈوگن اور بل گارسن بتائے جاتے ہیں۔ ان تینوں کا تعلق بالترتیب پیرس، لندن اور ہونولولو سے تھا اور وہ ٹیکی ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ اس جہاز کو بوائر نے کرایہ پر لیا تھا اور ایک دن کا کرایہ بھی پیشگی ادا کردیا تھا۔ وہ لائسنس یافتہ پائلٹ تھا۔ کنٹرول ٹاور سے جہاز کا آخری رابطہ اس وقت ہوا جب وہ تاہیٹی سے دس میل کے فاصلے پر تھا۔ دو دن کی تلاش کے باوجود جہاز کا ملبا یا مسافروں کی لاشیں نہیں مل سکیں۔ متعلقہ سفارت خانوں کو اس حادثے کی اطلاع دے دی گئی ہے۔''

❁❁❁

جب لیونارڈ معمول کے مطابق غوطہ خوری کرکے واپس آیا تو ڈیول اور آئن نے اسے اخبار میں شائع ہونے والی وہ خبر دکھائی جسے پڑھ کر لیونارڈ نے کہا۔ ''بہت افسوس ناک حادثہ ہے۔''

''ہاں۔'' ڈیول سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہمیں ان مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کرنی چاہیے۔'' آئن نے کہا۔

وہ تینوں قہقہہ مار کر ہنس دیے۔ کیونکہ حقیقت سے وہی واقف تھے۔ طیارہ سمندر میں گر کر تباہ نہیں ہوا تھا بلکہ اسے مکالی کے شمالی ساحل پر اتار لیا گیا تھا اور فوری طور پر اس کے مختلف حصوں کو الگ کرکے سمندر میں ڈبو دیا گیا۔ اس وقت تک امدادی پارٹیاں مایوس ہوکر تلاشی کا کام ختم کرچکی تھیں۔

''کیا تم سمجھتے ہو کہ فرانسیسی حکومت موتیوں کی اسمگلنگ کی تحقیقات کرنے کے لیے کسی اور ایجنٹ کو بھیجے گی؟'' ڈیول نے پوچھا۔

''اگر ایسا کوئی شخص آیا تو ہم اسے پہچان لیں گے۔'' لیونارڈ نے کہا۔

''پھر کیا ہوگا؟'' آئن نے پوچھا۔

''یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔'' لیونارڈ نے کہا۔ ''لیکن ہم سب اس پر متفق ہیں کہ مکالی کی حفاظت کریں گے۔''

''یقیناً۔'' ڈیول پرجوش انداز میں بولا۔

''میں بھی تم سے متفق ہوں۔'' آئن نے کہا۔

لیونارڈ نے اپنا غوطہ خوری کا سامان اور لباس جسم سے الگ کیا اور تولیا سے اپنا بدن پونچھنے لگا۔ اسے ہارن کی آواز سنائی دی۔ ڈومی ایک نئی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اس نے لیونارڈ کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور جیپ سے اتر کر دوڑتی ہوئی اس کے پاس آگئی۔ اس کا روشن چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ اس کے پیچھے ماریا بھی دوڑتی ہوئی آرہی تھی۔

''بل۔ تم میرے لیے مچھلی لے کر آئے۔'' وہ چلاتے ہوئے بولی۔

لیونارڈ اس کے لیے روزانہ خاص طور پر مچھلی لے کر آتا تھا اور اکثر اس میں سے ایک سیاہ موتی برآمد ہوتا۔ یہ بات مسٹر تاموکے علم میں تھی لیکن اس نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔

لیونارڈ نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور ڈومی کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''میں یہ بات کیسے بھول سکتا ہوں۔''

وہ مطمئن تھا کہ آہستہ آہستہ اس کے خزانے میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مسٹر تاموسے ملنے والے معاوضے کی رقم اس کے علاوہ تھی۔ اسے یقین تھا کہ بہت جلد وہ بھی تاموکی طرح امیر کبیر ہوجائے گا۔ اسے ایک مرتبہ بھی ابی گیل کا خیال نہیں آیا۔ وہ اپنی اس جنت میں خوش تھا جہاں ڈومی جیسی حور اس کے پاس تھی۔

محفلِ شعر و سخن



❁ احسان اللہ بھٹی.....سکھیکی گاؤں
خرد کی راہ گزر پر کوئی دیوانہ نہیں جاتا
جہاں ناداں جاتے ہیں وہاں دانا نہیں جاتا

❁ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر.....نئی منڈی سکھیکی
بتا رہی ہے یہ آنکھوں کی منجمد لالی
کڑے دنوں کٹھن رت جگوں سے گزرے ہو
بجھا بجھا سا چہرہ دھواں دھواں سی آنکھیں
خوشی کی کھوج میں کتنے غموں سے گزرے ہو

❁ نذیر احمد بزمی.....دھریجہ نگر
تیری یادوں سے بچ نکلوں مجھے تدبیر دے کوئی
میری جانب سے ہر رستہ تیری جانب نکلتا ہے

❁ حسنین عباس بلوچ.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
کب تلک اندھیروں میں یوں رہیں گے ہم
آئے گا کب سورج گھر میں روشنی بن کر

❁ ایم یوسف خان.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
کتنے مجبور ہیں تقدیر کے ہاتھوں فراز
نہ اسے پانے کی اوقات رکھتے ہیں نہ اسے کھونے کا حوصلہ

❁ ریاض شاہد پینٹرز.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
اِک دردِ مسلسل مجھے سونے نہیں دیتا
دل صبر کا عادی ہے مجھے رونے نہیں دیتا
وہ یہ راز تو جان گیا کہ میں اس کا ہوں
وہ کس کا ہے یہ احساس مجھے سونے نہیں دیتا

❁ ظفر اقبال کھوکھر.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
بڑی مدت سے وہ نظارہ نہیں دیکھا
اک چاند چھلکتا تھا شام سے پہلے

❁ احسان سحر.....میانوالی
پھول کاغذ پر بنایا مت کرو
رنگ فطرت کا چرایا مت کرو
آنسو آنکھوں میں ہی اچھے لگتے ہیں
انہیں پلکوں سے گرایا مت کرو

❁ محمد آصف ساجد.....ضلع قصور
ہر شام ہے شام غم ہر رات ہے اندھیری
کوئی نہیں اپنا کیا زندگی ہے میری

❁ حکیم سید محمد رضا شاہ نورنگہ.....میانوالی
ایک دن ایسا بھی ہوگا انتظارِ یار میں
نیند آجائے گی دروازہ کھلا رہ جائے گا

❁ محمد لطیف ساحل.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
خواب دیکھے شب زنداں میں سہانے کتنے
رنگ بھرتے ہیں نگاہوں میں نجانے کتنے
رات ہم نے تیری تصویر سے پوچھا اے دوست
تجھ سے بچھڑے ہوئے بیتے ہیں زمانے کتنے

❁ نادر سیال.....کندیاں، میانوالی
راہوں پہ نظر رکھنا ہونٹوں پہ دعا رکھنا
آجائے کوئی شاید دروازہ کھلا رکھنا

❁ سعدیہ بخاری.....اٹک
خشکی و تری پر قادر ہے آسان مری مشکل کردے
ساحل کی طرف کشتی نہ سہی کشتی کی طرف ساحل کردے

❁ سلطان احمد قائم خانی.....ٹنڈو خان محمد
نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم

❁ قاری محمد رمضان حسرت الحسنی.....نور پور تھل
فقط اتنا کہا تھا ناں! ہمیں تم سے محبت ہے
ہماری جان لو گے کیا؟ ذرا سی بات کے پیچھے

❁ محمد قدرت اللہ نیازی.....حکیم ٹاؤن، خانیوال
غیروں سے پوچھتی ہے طریقہ نجات کا
اپنوں کی سازشوں سے پریشان زندگی

❁ سلطان احمد قائم خانی.....ٹنڈو جان محمد
اب تو شاید ہی مجھ سے محبت کرے کوئی
میری آنکھوں میں تم صاف نظر آتے ہو

❁ سنیہ منظور.....یوحنا آباد، لاہور
اس کے دل پر بھی کیا خوب گزری ہوگی
جس نے اک مرض کا نام محبت رکھا

❁ سید محی الدین اشفاق.....فتح پور، لیہ
مجھے آگیا یقین سا کہ یہی ہے میری منزل
سرِ راہ جب کسی نے مجھے دفعتاً پکارا

❁ مسز ضیا القمر سلطانہ.....رتی ٹبی، ساہیوال
شعور کا ہے کرشمہ یہ شوقِ تنہائی
کہ رفتہ رفتہ نظر سے اتر رہے ہیں لوگ
امیر شہر تیری سادگی قیامت ہے
محو جشن ہے تو فاقوں سے مر رہے ہیں لوگ

❁ محمد اقبال خان احمد خلیل.....چودھوان
اک تبسم جو ان کا مل جاتا
ہم بھی سرمایہ دار ہو جاتے

❁ عرفان سیال ججی.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا بتاؤ کیسا لگا
تم اگلے زخموں کو چھوڑو یہ گھاؤ کیسا لگا

❁ خلیل احمد انجم.....دھنی سیداں، کھاریاں
بے تابیاں سمیٹ کر سارے جہان کی
جب کچھ نہ بن سکا تو میرا دل بنا دیا

❁ حسنین عباس، کمیل عباس.....کھاریاں
اپنے دل میں جگہ نہ دے مجھ کو
دل کی سب کائنات لوٹوں گا
اشک ہوں میں پلک جھپکنے میں
تیری آنکھوں سے گر کے ٹوٹوں گا

❁ محمد جاوید راؤ.....بہاولنگر
میں اس کو چھوڑ تو سکتا ہوں، پر چھوڑ نہیں پاتا
وہ شخص مری بگڑی ہوئی عادت کی طرح ہے

❁ رمضان پاشا.....گلشن اقبال، کراچی
سوچا تھا تیری سادگی پہ لکھوں گا ایک غزل
افسوس کہ تیرے معیار کے الفاظ نہ مل سکے

❁ محمد رشید سیال.....دوہڑی، ضلع سکھر
دل سا بھی کوئی دوست کہاں مجھ کو ملے گا
جلتا ہے میرے ساتھ سلگتا ہے میرے ساتھ

❁ ماریہ علی بھٹو.....شکارپور
دوستوں سے ہم نے وہ صدمے اٹھائے جان پر
دشمنوں سے دشمنی کا سب گلہ جاتا رہا

❁ بشیر احمد بھٹی.....بہاولپور
اس کی قربت میں تیزی سے کٹے ماہ و سال
وہ بچھڑا تو دھیمی ہوگئی وقت کی چال

❁ ریاض بٹ.....حسن ابدال
قلم کیا میرے ہاتھوں کو شب پرستوں نے
میں لکھ رہا تھا چراغوں کی داستاں لوگو

❁ محمد اشفاق سیال.....شورکوٹ سٹی
اب دن کو بھی چراغ لیے گھومتے ہیں لوگ
تاریکیوں کا زہر اجالوں کو ڈس گیا

❁ این ایس آرمدثر.....بلدیہ ٹاؤن، کراچی
میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں

❁ عمران حیدر بلوچ.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
گھر میں عزیز، شوق بھی دل میں سفر کا ہے
یہ روگ ایک پل کا نہیں، عمر بھر کا ہے

❁ رائے نعیم احمد بھٹی.....ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
عجیب لمحہ شام وصال تھا وہ بھی
مجھے بھی رنج تھا، افسردہ حال تھا وہ بھی

❁ محمد زریان سلطان.....اردو بازار، کراچی
جہاں مامور کرتا ہے خدا تخریب کاروں کو
وہاں دو چار وہ بستی بسانے والے رکھتا ہے

❁ گلریز خان.....پشاور
آوارگی کو چھوڑے زمانہ ہوا مگر
آیا نہیں ابھی ہمیں گھر بار دیکھنا

❁ امیر بخت.....اٹک
اونچی عمارتوں کا مقدر بنا گئیں
وہ بارشیں جو میرے گھروندے کو ڈھا گئیں

❁ طیب احمد.....ایبٹ آباد
چلو سفر ہی کٹے گا، کچھ اپنا حال کہو
جو ہم پہ عشق میں بیتی ہے، ہم سنا دیں گے

❁ محمد بوٹا سیٹھی.....صفدر آباد، ضلع شیخوپورہ
تو مصر کے بازار کا بچھڑا ہوا یوسف
دل تیری جدائی میں مانندِ یعقوب رہا ہے

❁ راجا افتخار علی افتی.....چوآسدن شاہ (موہڑہ)
جس کو بھی دیکھا پیار میں روتے ہوئے دیکھا سائل
یہ محبت تو مجھے کسی فقیر کی بددعا لگتی ہے

❁ ارسلا افضل.....روہڑی
اب دیکھتے ہیں کس کی جان جاتی ہے
میں نے اس کی اس نے میری قسم کھائی ہے

❁ رضوان.....لاہور
کم یاد کروں اس کو میرے حق میں ہے بہتر
یہ الفاظ مجھے طبیب نے ہاتھ جوڑ کے کہے ہیں

❁ ثمر فرقان سنی.....شاہ حسین، نور پور تھل
یہ در پردہ رقیبوں سے گلے شکوے نہیں اچھے
تمہیں جو بھی شکایت تھی ہمارے روبرو کرتے

❁ جبران احمد ملک.....گلشن اقبال، کراچی
کل شب ترے خیال سے غافل رہا تھا میں
بھولے سے اپنے آپ کو یاد آگیا تھا میں

❁ بشیر احمد بھٹی.....بہاولپور
رہا نہ دل میں وہ بے درد اور درد رہا
مقیم کون ہوا ہے، مقام کس کا تھا؟

❁ اسلم عارفی.....گوجرہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ
اس سے کب دیکھی گئی تھی میرے رخ کی مردنی
پھیر لیتا تھا وہ منہ، جی کو دوا دیتے ہوئے

❁ ذوہیب احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
بس ہم تو لشکری ہیں پھر بھلا ہتھیار کیوں ڈالیں
کہ ایسا کام تو اپنے سپہ سالار کرتے ہیں

❁ محمد اقبال.....کورنگی، کراچی
تجھ کو کیا معلوم اے جانِ جہاں تیرے بغیر
میرا جیون کٹ گیا اور میں جیا کچھ بھی نہیں

❁ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
اسی کا نام ہے شاید تعلقِ خاطر
سفر میں تم ہو بدن چور چور میرا ہے

❁ احسان سحر.....میانوالی
دل کو پہلے ہی درد کی دیمک چاٹ گئی تھی
روح کو مجھی اب کھاتا جائے تنہائی کا زنگ

❁ ذیشان منہاس.....گلشن اقبال، کراچی
ضبط کرنا نہ کبھی ضبط میں وحشت کرنا
اتنا آساں بھی نہیں تجھ سے محبت کرنا

❁ محمد اظہر.....بلیر، کراچی
اب ضد پہ آگئے ہو تو یہ کام بھی کرو
خود کو ہمارے نام سے بدنام بھی کرو

❁ یمنیٰ احمد.....کراچی
آؤ اک سجدہ کریں عالم بدمستی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

❁ کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی
پھر وہ کہنے لگے، تو مرے گھر آیا تھا
چاند، جن چار گواہوں کو نظر آیا تھا

کوپن برائے شمارہ ستمبر 2012

مُحفلِ شعر و سُخن

نام : ----------

پتا : ----------

تا حدِ نگاہ پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ سبزے کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ ہاں اونچے نیچے ٹیلوں کی چٹخی ہوئی دراڑوں میں کہیں کہیں کانٹے دار جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ جن کا شمار اگر سبزے میں کیا جاسکتا ہے تو وہاں سبزہ ضرور تھا۔ ان اونچی نیچی چھوٹی بڑی پہاڑیوں میں گونجنے والی فائروں کی آواز بے حد عجیب لگ رہی تھی۔

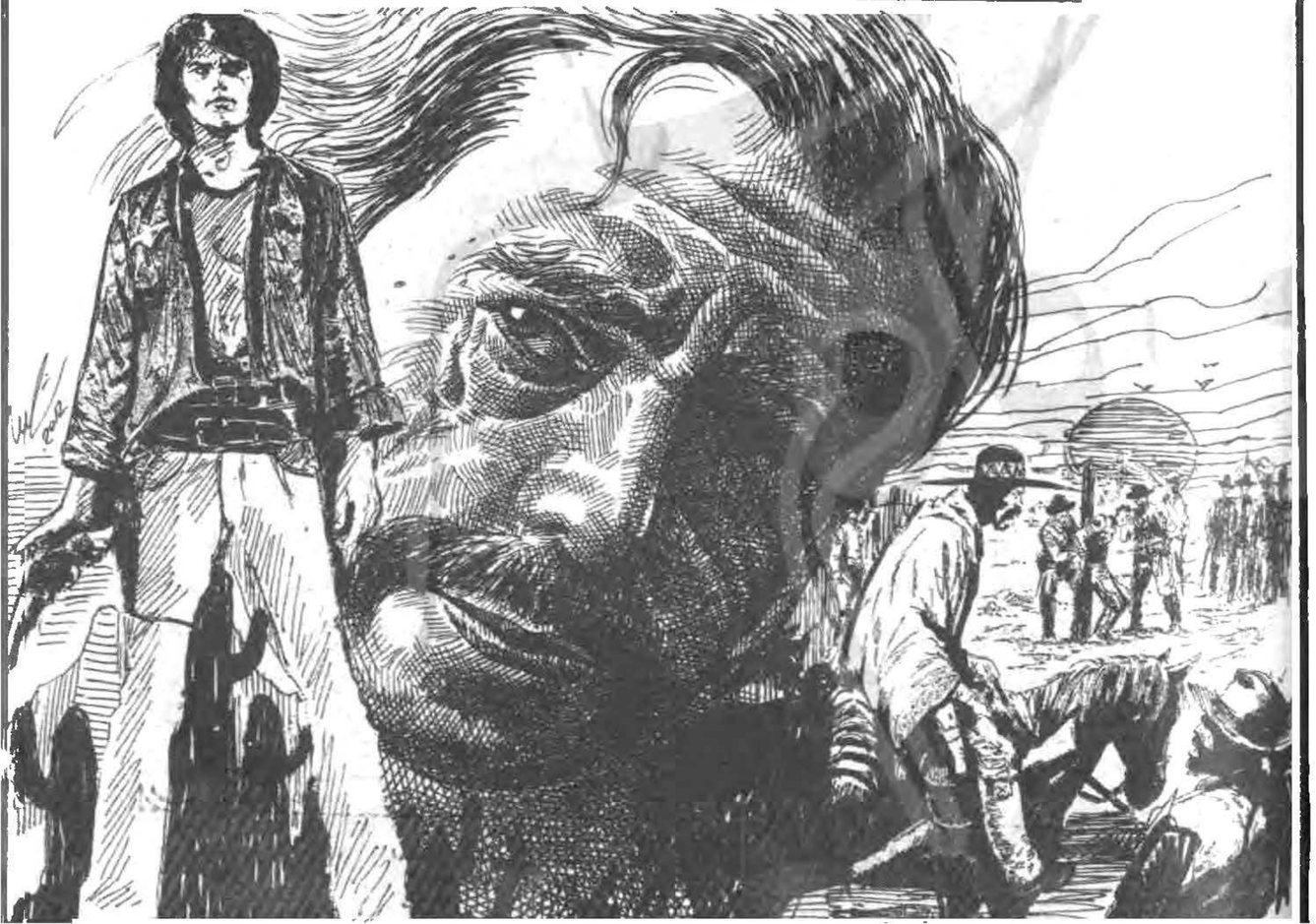
بوڑھے سن برگ نے ابھی تک شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ اس کا شکست تسلیم کرنا مشکل ہی تھا کیونکہ خود اپنی جوانی

ویلٹا کی وحشی

نسیم اقبال

اکثر لوگ بھول جاتے ہیں، ظالم اور بہادر میں بہت واضح فرق ہوتا ہے... ظلم روشنی سے اور بہادری تاریکی سے دور کرتی ہے... بس یہی ایک نکتہ اس سے چُوک گیا... زندگی کے پل پل سے لطف اندوز ہونے والا انسان جانے کن لمحوں کے عذاب میں گرفتار ہو کر ان راہوں پر چل نکلا جہاں وحشت اس کی ہم سفر تھی... شاید اس مخصوص علاقے کا اثر لوگوں پر ایسے ہے پڑتا تھا کہ محبت کو رگیدنا اس کی سرشت میں شامل ہوگیا۔

گلاب لمحوں پر زرد موسم کا حصار اور.....متنازع احساسات کا اظہار



میں وہ ویلٹا کے جیالوں میں شمار ہوتا تھا اور اس نے بڑے بڑے سورماؤں کے دانت کھٹے کردیے تھے۔ وہ تو وائنا کی ماں تھی جس کے حسن جہاں سوز نے اس منہ زور گھوڑے کو رام کرلیا تھا ورنہ اس کے پستول کی گولیاں نہ جانے کتنے خوں رنگ افسانے لکھتیں۔ سن برگ کی زندگی جولیانا کے حسن کی رعنائیوں میں مقید ہوگئی اور وہ اپنی محبوبہ، اپنی بیوی کے شہر میں محدود ہوگیا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ سن برگ پیٹ پالنے کے لیے کسی جغادری امیر کے ہاں ملازمت کرتا یا کسی دکان پر بیٹھ کر کچھ فروخت کرتا۔ شہر کے امیروں کے لیے تو یہی کیا کم تھا کہ اس نے اپنی خطرناک سرگرمیاں ترک کردی تھیں۔ چنانچہ وہ سن برگ کو ایک معقول رقم اکٹھی کرکے بہ طور خراج پیش کرتے اور سن برگ کی زندگی بڑے آرام سے گزر رہی تھی۔

لیکن جس زندگی میں انقلاب نہ ہو وہ موت سے بدتر ہوتی ہے سن برگ کی زندگی میں بھی ایک غمناک موڑ آیا۔ وائنا پیدا ہوئی اور اس کی ماں دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اس انقلاب نے سن برگ کی زندگی بدل دی۔ وہ بزدل بن گیا۔ بیوی کی موت اور بچی کی پرورش کے خیال نے اسے خوفزدہ کردیا۔ حسین بیوی مرتے وقت ایک پریشان کن تحفہ دے گئی تھی۔ اس تحفے کی رکھوالی کے تصور سے اس کے کندھے جھک گئے اور اس دیس میں جھکے ہوئے کندھوں کا... پرستار کوئی نہ تھا۔ بستی کے امیروں نے سن برگ کے جھکے ہوئے کندھے دیکھے اور شیر ہوگئے اس کا خراج بند ہوگیا اور سن برگ کانپ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اس کا زوال ہے چنانچہ بچی کھچی رقم سے اس نے ایک چھوٹا سا قہوہ خانہ کھول لیا۔ اب وہ سن برگ نہ تھا، ایک بوڑھا قہوہ کا ندار، ایک بوڑھا باپ تھا اور ان دونوں عہدوں کے مالک کی زندگی دوسروں کی خوشامد میں بسر ہوتی ہے۔ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ ویلٹا نے صرف سن برگ کو ہی جنم نہیں دیا تھا۔ اس کی مٹی دوسرے بہادر بھی پیدا کرسکتی تھی۔

اور ان دنوں پشکر کا طوطی بول رہا تھا۔ پشکر، سن برگ کی طرح کوئی باوقار بہادر نہیں تھا۔ بلکہ وہ لومڑی کی طرح چالاک اور گیدڑ کے مانند مکار آدمی تھا۔ وہ گروہ بنا کر رہنے کا عادی تھا اور اب پورے ویلٹا میں اس کا گروہ پھیلتا جارہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی تعداد کے سہارے وہ بہادر بنا تھا۔ اس کے ساتھی تباہی اور بربادی کے پیغامبر تھے۔ جس طرف نکل جاتے بستیاں ویران کردیتے..... بے گناہوں کو خون میں نہلا دیتے۔ لوٹ کھسوٹ کی عصمت دری کرتے۔ اس طرح پشکر پورے ویلٹا میں مشہور ہوگیا۔

وائنا کی عمر انیس سال ہوگئی تھی اور بوڑھے سن برگ کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہوگیا تھا کہ ایک دن چھ آدمی اس کے قہوہ خانے میں آئے۔ سب کے سب قوی ہیکل تھے۔ ان کے چہروں سے وحشت ٹپکتی تھی۔ ہولسٹروں میں ریوالور لٹکے ہوئے تھے۔ اندر داخل ہوکر انہوں نے ناپسندیدہ فرنیچر کو ٹھوکریں مار کر ادھر ادھر پھینک دیا اور پھر ایک میز پر قبضہ جما کر بیٹھ گئے۔

''قہوہ!'' ان سے ایک نے بھاری آواز میں کہا اور سن برگ نے پیچھے کھڑی ہوئی وائنا کو گردن سے اشارہ کردیا۔ ویسے نہ جانے کیوں اس کے دل میں ایک خوف سا کروٹیں لے رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ گڑبڑ ٹل جائے اس لیے اس نے لوگوں کے وحشیانہ رویے کے باوجود اپنے چہرے پر مصنوعی خوش اخلاقی قائم رکھی۔

تھوڑی دیر کے بعد وائنا نے ان سب لوگوں کے سامنے قہوہ سرو کردیا۔ جس وقت وائنا ان کے سامنے قہوے کی پیالیاں رکھ رہی تھی۔ وہ سب للچائی ہوئی نظروں سے اس کے گداز جسم کو دیکھ رہے تھے۔ پھر ان میں ایک نے اچانک جھک کر اس کے اسکرٹ کو پیچھے سے الٹ دیا اور وائنا کا پچھلا جسم برہنہ ہوگیا۔ وائنا اس اچانک حادثے پر ششدر رہ گئی۔ میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کے بے ہنگم قہقہوں نے اسے چونکا دیا اور دوسرے لمحے اس کا ہاتھ گھوم گیا۔

اسکرٹ الٹنے والے کے رخسار سے پٹاخے کی آواز بلند ہوئی اور ہنسنے والے ایک دم خاموش ہوگئے۔ وائنا کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا او وہ خونخوار بلی کی طرح اس شخص کو گھور رہی تھی۔ طمانچا کھانے والے نے جھینپی ہوئی نظروں سے اپنے ساتھیوں کے سنجیدہ چہرے دیکھے اور پھر وہ ہنسنے لگا۔ اسے ہنستے دیکھ کر دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے۔

لیکن سن برگ کو اس ہنسی میں چھپی ہوئی غراہٹیں صاف محسوس ہو رہی تھیں اور اس کے ہاتھ اپنے سامنے کاؤنٹر کے ایک خانے میں رکھے ریوالور کو ٹٹول رہے تھے۔ جب ریوالور میں بھری ہوئی گولیوں کا اسے یقین ہوگیا تو اس نے قدرے اطمینان کا سانس لیا اور وائنا کو آواز دے دی۔

وائنا کاؤنٹر کے پیچھے بنے ہوئے رہائشی حصے میں چلی گئی۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک غیظ و غضب کی چنگاریاں اڑ رہی تھیں ان سب نے انتہائی خاموشی اور سنجیدگی سے قہوہ ختم کیا اور پھر آستین سے ہونٹ خشک کرتے ہوئے کھڑے

ہوگئے۔ وہ سب ہی کاؤنٹر کے قریب آگئے۔ سب سے آگے والے نے جیب سے ایک سفید کارڈ نکال کر سن برگ کے سامنے رکھ دیا۔ اس کارڈ پر ایک شکرے کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ تصویر پشکر کا نشان تھا جس کے بارے میں سن برگ بھی بہ خوبی جانتا تھا۔

اس نے گردن ہلائی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے جناب! کوئی بات نہیں ہے۔ پشکر کے آدمیوں سے پیسے لینے کی ہمت بھلا کس میں ہے۔''

''ہم نے تجھے پیسے نہ دینے کے لیے یہ نشان نہیں دکھایا ہے بوڑھے کتے!'' کاؤنٹر پر کارڈ رکھنے والے نے غراتے ہوئے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ ''وہ لڑکی کون ہے؟''

''میری بیٹی ہے جناب۔ میری بیٹی ہے۔'' سن برگ نے بہ دستور خوشامدانہ انداز میں کہا۔

''وہ ہمارے ساتھ جائے گی۔'' اس نے کہا اور سن برگ کے جسم میں سناٹا پھیل گیا۔

''رحم کیجیے، رحم کیجیے جناب۔ میری ایک ہی بیٹی ہے میں اس کے بغیر بے سہارا ہوجاؤں....'' بوڑھے نے گڑگڑاتے ہوئے کہا اور گریبان پکڑنے والے کے زوردار گھونسے نے اس کے داہنے گال پر خون کی لکیر بنا دی سن برگ کاؤنٹر کے پیچھے گر پڑا اور وہ سب اسے چھوڑ کر کاؤنٹر کے پیچھے بنے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

لیکن جوں ہی ان میں سے ایک نے اندر قدم رکھا اچانک رائفل کا دھماکا گونجا اور وہ ایک کریہہ چیخ کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھ کر زمین پر گر پڑا۔ دوسرے لمحے اس کے دوسرے ساتھیوں نے اچھل کر پوزیشن لینے کی کوشش کی لیکن سن برگ کے رعشہ دار ہاتھ بھی صحیح نشانہ لگا سکتے تھے۔ دھائیں دھائیں کی آوازیں پورے قہوہ خانے میں گونج اٹھیں اور چند لمحات کے بعد وہاں چھ جسم تڑپ تڑپ کر سرد ہوگئے تھے۔

سن برگ کی ٹھہری ہوئی زندگی میں ایک بار پھر انقلاب برپا ہوگیا تھا۔ سویا ہوا سن برگ پھر جاگ اٹھا تھا اندر سے وائنا رائفل لے کر نکل آئی۔ سن برگ نے محبت بھری نظروں سے غیور بیٹی کو دیکھا جس نے اپنی بے عزتی کرنے والے پہلے مرد کو موت کی نیند سلا دیا تھا اور اس کا مسرت انگیز قہقہہ گونج اٹھا۔

''ونڈرفل وائنا لیکن اب یہاں سے چلنے کی تیاریاں کرو۔ پشکر اور اس کے ساتھی کسی بھی جگہ معمولی تعداد میں نہیں جاتے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے ساتھیوں کو اپنے ساتھیوں کی موت کا علم ہوجائے گا اور وہ ایک فوج کی شکل میں ہمارے چھوٹے سے قہوہ خانے پر حملہ کردیں گے جلدی کرو۔ اگر ہمارا اس سے مقابلہ ہوا تو اس کے لیے کھلا علاقہ موزوں رہے گا۔''

اپنے ساتھ لانے والے سامان میں ایک بڑی مقدار رائفل اور پستول کے کارتوسوں کی تھی اور باقی دو تین جوڑے کپڑے اور تھوڑی سی کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ جس وقت دونوں باپ بیٹی اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر قہوہ خانے کے احاطے سے باہر آئے تو ایک بڑا مجمع چاروں طرف جمع تھا۔ لوگ شاید گولیوں کی آوازوں کی وجہ سے قریب نہیں آئے تھے۔

''ہے سن برگ! اندر گولیاں کیسے چل رہی تھیں؟''

اس علاقے کے بدمعاش جوشوے نے پوچھا اور سن برگ کے پستول کی گولی نے اس کے سر سے ہیٹ اڑا دیا۔

''ایسے چل رہی تھیں شہدے۔ سامنے سے ہٹ جا ورنہ دوسری گولی تیرا بھیجا اڑا دے گی۔'' سن برگ نے کہا اور پھر قہقہہ لگاتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ جوشوے منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ سن برگ کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی لوگ اس کے قہوہ خانے کی طرف دوڑ پڑے اور بہت جلد انہیں معلوم ہوگیا کہ سن برگ نے پشکر کے چھ لڑاکے مار دیے ہیں۔

''بہتر یہ ہے دوستو۔ اگر اپنی بستی کو تباہی سے بچانا چاہتے ہو تو خود جاکر پشکر کے گروہ والوں کو اس واقعے سے آگاہ کرو اور اس کی حمایت میں آواز اٹھاؤ۔ انہیں سن برگ کے فرار کی سمت بتاؤ۔'' جوشوے نے مشورہ دیا اور بہت سے لوگ پشکر کے ساتھیوں کی تلاش میں چل پڑے۔

☆☆☆

بستی سے تقریباً بیس میل دور جانے کے بعد پشکر کے آدمی سن برگ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوسکے۔ تلاش کرنے والوں میں پشکر بذات خود شامل تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی موت کے انتقام کے لیے بے چین تھا۔ اس وقت سن برگ کا گھوڑا ایک بلندی پر چڑھ رہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اسے نہ دیکھ پاتے۔

پشکر نے ان دونوں کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے اپنی دور مار رائفل سیدھی کی اور سست رفتاری سے بلندی پر چڑھتے ہوئے گھوڑے کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا۔ سن برگ کا گھوڑا بری طرح اچھلا اور دونوں باپ بیٹی نیچے گر پڑے۔ اپنے کامیاب نشانے کے بعد پشکر نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی لیکن اس نے سن برگ اور اس کی لڑکی کو

پتھروں کی آڑ لے کر اوپر جاتے ہوئے دیکھ لیا۔

''اس ٹیکری کو چاروں طرف سے گھیر لو۔ وہ شاید مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔'' پشکر نے گرجدار آواز میں کہا اور اس کے ساتھیوں کے سبک رفتار گھوڑے مختلف سمتوں میں دوڑ پڑے۔

دوسری طرف سن برگ ایک بڑی چٹان کی آڑ لے چکا تھا۔ اس نے اور وائنا نے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ سن برگ کے ہاتھ میں رائفل تھی اور وائنا ریوالور لیے ہوئے تھی۔ دونوں باپ بیٹی کی پشت ملی ہوئی تھی اور وہ چوکنے انداز میں دشمن کو دیکھ رہے تھے۔ سن برگ سمجھ گیا تھا کہ دشمن انہیں چاروں طرف گھیر رہے ہیں۔ مخصوص فاصلے پر پہنچ کر پشکر کے آدمی رک گئے۔ یہ ان کے لیے بہترین پوزیشن تھی۔ یہ جگہ رائفل کے علاوہ پستولوں کی رینج میں بھی تھی۔ البتہ یہاں سے آگے بڑھ کر مقابلہ کرنے میں نقصان ہوسکتا تھا۔ اور پھر فائرنگ شروع ہوگئی۔ پہاڑیاں گولیوں کی آوازوں سے گونج اٹھیں۔ پشکر کا خیال تھا کہ سن برگ چند منٹ سے زیادہ نہ ٹک سکے گا لیکن بہت جلد اسے دشمن کے خطرناک ہونے کا اندازہ ہوگیا۔ سن برگ بڑی چالاکی سے مقابلہ کررہا تھا۔ پشکر کے ساتھیوں کے مقابلے میں وہ بڑی احتیاط سے گولیاں چلا رہا تھا۔ اس کے نشانے خطرناک تھے۔ اگر ان کے پاس صحیح مورچے نہ ہوتے تو شاید پشکر کو زبردست نقصان اٹھانا پڑتا لیکن یہ غنیمت ہوا کہ اس کے ساتھی جوش میں زیادہ آگے نہ بڑھ گئے۔

آدھے گھنٹے کے خوفناک مقابلے کے بعد پشکر نے اپنے ساتھیوں کو رک جانے کا اشارہ کیا۔ ان جگہوں سے مقابلہ گولیاں ضائع کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ جگہ بدلنے کی ضرورت تھی۔ اور پشکر کی نظریں ایسی جگہ تلاش کررہی تھیں جہاں سے وہ سن برگ پر عمدہ نشانہ لگا سکیں لیکن سن برگ کی خوش قسمتی تھی کہ قریب میں کوئی اونچی پہاڑی نہیں تھی ورنہ وہ آسانی سے مارلیا جاتا۔ ان کوششوں میں ناکام رہ کر پشکر بری طرح جھلا گیا تھا۔ کوئی ترکیب نہ پاکر اس نے پھر فائرنگ کا حکم دیدیا اور اس کے ساتھی گولیوں کی بارش کرنے لگے۔ سن برگ کے لیے سر اٹھانا مشکل تھا۔ چٹان سے ٹکرانے والی گولیاں ... آوارہ مکھیوں کی طرح ادھر ادھر اڑ رہی تھیں اور ان کی ضرب سے چٹانوں سے اڑنے والے سنگریزے دھوئیں کی شکل اختیار کرگئے تھے۔

خود سن برگ بھی اس صورت حال سے مطمئن نہیں تھا اسے احساس تھا کہ وہ ابھی تک پشکر کے ایک بھی آدمی کو ٹھکانے نہیں لگا سکا ہے۔ اس نے وائنا کو اشارہ کیا اور رائفل لوڈ کرکے تیار ہوگیا۔ پھر اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور وائنا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ باپ کی چالاکی پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ سن برگ نے اسے گولی چلانے سے منع کردیا تھا۔

''زیادہ سے زیادہ آدمیوں کے نشانے پر آجانے کے بعد فائر کرنا۔'' سن برگ نے اسے ہدایت کی اور وائنا نے سر ہلا دیا وہ پشکر کے آدمیوں کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن پشکر بھی اتنا بے وقوف نہ تھا۔ اس نے پورے پندرہ منٹ انتظار کیا۔ اسے شبہ تھا کہ سن برگ نے کوئی چال نہ چلی ہو لیکن پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد وہ اکتا گیا۔ اس نے اپنے دو آدمیوں کو آگے بڑھایا اور پھر وہ احتیاط سے اوپر چڑھنے لگے آدھے سے زیادہ فاصلہ طے ہوگیا تو پشکر نے مزید دو آدمیوں کو اشارہ کیا۔

سن برگ نے مایوسی سے ہونٹ سکیڑے یہ تعداد اس کی توقع سے بہت کم تھی۔ بہرحال وہ جان گیا کہ پشکر اس سے زیادہ آدمی نہیں بھیجے گا۔ چنانچہ جو کچھ بھی ہیں، وہ ان لوگوں کے مزید آگے بڑھنے کا انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے وائنا کو اشارہ کیا اور دوسرے ہی لمحے اس کی رائفل اور وائنا کا پستول گرجا۔ پشکر کے حلق سے ہذیانی چیخ سی نکل گئی تھی۔ وہ اپنے آدمیوں کے لڑھکتے جسم دیکھ رہا تھا۔ چاروں ہی چھلنی ہوگئے تھے۔ دوسرے لمحے پشکر کے آدمیوں نے رائفلوں کے دہانے کھول دیے۔ پشکر دیوانوں کی طرح چیخ رہا تھا اور اس کے ساتھی خوفناک انداز میں گولیاں برسا رہے تھے۔ وہ اس چٹان کو ادھیڑ ڈالنا چاہتے تھے جس کے پیچھے سن برگ چھپا ہوا تھا۔ سن برگ کی طرف سے بھی برابر گولیاں چل رہی تھیں لیکن اچانک سن برگ کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی اس نے رائفل لوڈ کرنے کے لیے کارتوسوں کے تھیلے میں ہاتھ ڈالا تو تھیلا خالی تھا۔ اس کے پاس کارتوس ختم ہوگئے تھے۔ اس نے بدحواسی سے وائنا کی طرف دیکھا جو اپنا خالی پستول چلا رہی تھی۔ پھر اس نے بھی کارتوسوں کے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن باپ کے لٹکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر چونک پڑی۔

''کارتوس ختم ہوگئے وائنا!'' سن برگ نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

''یہ تو بہت برا ہوا پاپا، پھر اب؟'' وائنا نے بھی تشویش سے کہا۔

''شکست!'' بوڑھے سن برگ نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا اور پھر دونوں ہاتھوں سے منہ کے سامنے بھونپو بنا کر چیخا۔ ''اے پشکر! میرے پاس گولیاں ختم ہوگئی ہیں۔ کیا تم

کچھ گولیاں مجھے ادھار دو گے؟'' اس خطرناک وقت میں بھی باپ کی پرمزاح بات سن کر وائنا مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

''خود کو میرے حوالے کردے سن برگ، ورنہ میں سال بھر تک مقابلہ کرسکتا ہوں۔'' پشکر کی آواز سنائی دی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ گولیاں ختم ہوچکی ہیں۔ کیا تم ایک باعزت فائٹر کی طرح سمجھوتا کرو گے؟'' سن برگ نے کہا اور دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

پھر چند منٹ کے بعد پشکر کی آواز سنائی دی۔ ''اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو ہاتھ بلند کرکے کھڑے ہوجاؤ۔ اس سے پہلے اپنی رائفل اور پستول سامنے پھینک دو۔ مجھے علم ہے کہ تمہارے پاس ایک ہی پستول اور ایک رائفل ہے۔ میں ایک باعزت فائٹر کی طرح تم سے سمجھوتا کرلوں گا۔''

سن برگ نے کھڑے ہوکر پستول اور رائفل دور پھینک دی۔ اور پھر دونوں باپ بیٹی نے ہاتھ بلند کردیے۔ پشکر کے خوفناک چہرے پر تمسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پستول سیدھے کیے اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرکے چڑھائی پر چڑھنے لگا۔ اس کے ساتھی پوری طرح چوکنے، دائرہ بنائے اس کے ساتھ بڑھ رہے تھے۔ اور آہستہ آہستہ وہ اس چٹان کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔ ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس ذلیل بوڑھے نے اس کے پورے دس ساتھی ہلاک کردیئے تھے۔ پشکر کو اپنے دس ساتھیوں کی موت کا تو زیادہ افسوس نہیں تھا لیکن ایک معمولی سے آدمی نے اس کی ساکھ خراب کردی تھی اس لیے وہ بہت تلملایا ہوا تھا۔ اس نے سن برگ کو چٹان کے پیچھے سے نکل آنے کا حکم دیا اور سن برگ ہاتھ بلند کیے چٹان کے عقب سے نکل آیا۔ پشکر کی نگاہوں نے پہلے اسے اور پھر اس کی لڑکی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ لڑکی کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''تو تم مجھ سے باعزت سمجھوتا چاہتے ہو؟'' اس نے غراتے ہوئے کہا۔

''جیالوں کا اصول تو یہی ہے۔ مجھے شکست نہیں ہوئی ہے بلکہ میرے پاس کارتوس ختم ہوگئے ہیں۔ اگر تم لڑنا چاہتے ہو تو تھوڑے سے کارتوس ادھار دے دو اور اپنی پرانی پوزیشن پر چلے جاؤ ورنہ امن اور سمجھوتا!''

''میں تم سے سمجھوتا کرنا چاہتا ہوں سن برگ!'' پشکر نے سرد لہجے میں کہا۔

''بتاؤ۔ کیا شرط ہے؟'' سن برگ نے کہا۔

''شرط!'' پشکر کے کریہہ ہونٹوں پر پھر بھیانک مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''میری شرط ہے سن برگ کہ تم اپنی لڑکی کو برہنہ کرکے میرے ساتھیوں کے حوالے کردو اور خود اس پہاڑی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرلو۔'' وہ بولا اور سن برگ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''میں تمہاری شرط ابھی پوری کردوں گا۔'' اس نے غراتے ہوئے کہا اور اچانک پشکر پر چھلانگ لگادی لیکن اس کے معلق جسم میں درجنوں گولیاں پیوست ہوگئیں اور آدھے راستے میں ہی نیچے گر پڑا۔ وائنا کو باپ کی موت کا یقین ہوگیا تھا۔ اس کے حلق سے ایک گھٹی ہوئی سی آواز نکلی اور بس پھر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان لوگوں کی کارروائی دیکھتی رہی۔

پشکر کے اشارے سے اس کے باپ کی لاش ایک گھوڑے سے باندھ دی گئی۔ خود وائنا کے ہاتھ جکڑ کر اسی گھوڑے پر بٹھایا گیا جس سے اس کی باپ کی لاش بندھی ہوئی تھی اور پھر پشکر نے اپنے آٹھ ساتھیوں کو علیحدہ کرکے حکم دیا۔

''اسے لے کر میرے ولیج پر پہنچو۔ بوڑھے کی لاش میرے دروازے کے سامنے میرے دشمنوں کے قبرستان میں گاڑھ دو۔'' اور پشکر کے دلیر ساتھیوں نے گردن جھکا دی۔

☆☆☆

شائیلا نے دوسرے گھوڑے کی زین بھی مضبوطی سے کس دی اور پھر اس کی مضبوطی کا اندازہ کرنے کے بعد کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ محبت بھری نظروں سے دونوں قوی ہیکل گھوڑوں کو دیکھ رہی تھی جن پر اس کے دونوں شیر دل بھائی سواری کرتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ان دونوں گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین دہل رہی ہوگی۔ اس نے سوچا اور اسی وقت کسی نے پیچھے سے اس کے بال مضبوطی سے پکڑ لیے۔ شائیلا کی چیخ نکل گئی۔ اس نے گردن گھمانے کی کوشش کی لیکن بال اس مضبوطی سے پکڑے گئے تھے کہ وہ گردن نہ گھما سکی۔ تب اس نے زور زور سے چیخنا اور پیچھے ہاتھ کرکے بال پکڑنے والے کو گھونسے مارنا شروع کردیے۔

''اے ٹونی چھوڑ دے اس کے بال کیوں پریشان کررہا ہے؟''

مکان کے دروازے سے لسٹر کی آواز سنائی دی اور ٹونی نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے بال چھوڑ دیے۔ وہ پلٹ پڑی اور جھلائے ہوئے انداز میں ٹونی کے سینے پر گھونسے مارنے شروع کردیے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اسے برا بھلا بھی کہتی جارہی تھی۔ لسٹر مسکراتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

''کیوں پریشان کررہا ہے اسے۔'' اس نے ٹونی کے کان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میرا دل چاہتا ہے لسٹر کہ اس کے تمام بال

اکھاڑ دوں اور یہ گنجی ہو جائے۔ گنجی ہو کر یہ کیسی لگے گی لسٹر؟'' ٹونی نے اس کے ہاتھ کی زد سے اپنا کان بچاتے ہوئے کہا۔

''اور میرا دل چاہتا ہے کہ اس چاقو سے تمہاری ناک علیحدہ کر دوں۔ بغیر ناک کے تم کیسے لگو گے؟'' وہ جھلائے ہوئے انداز میں ٹونی سے بولی۔

''میں تو اور خوبصورت ہو جاؤں گا مگر تم بغیر بالوں کے شتر مرغ کی مادہ معلوم ہو گی۔'' ٹونی نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''میں کہتی ہوں کہ زبان بند کر لو ورنہ اچھا نہ ہو گا۔ اتنا کام کرتی ہوں پھر اوپر سے مجھے چھیڑتا رہتا ہے۔'' وہ بولی اور اسی وقت لسٹر نے ٹونی کی کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے اسے گھوڑے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''جلدی چلو۔ آج ویسے بھی کافی دیر ہو گئی ہے۔'' اس نے کہا اور ٹونی بھی گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

''آج میرے لیے ایک خوبصورت طوطا ضرور پکڑ لینا لسٹر ورنہ اچھا نہ ہو گا!'' وہ چیخ کر بولی۔

''میں بھی تیرے لیے ایک پرندہ پکڑوں گا شائیلا۔ ایک بے حد خوبصورت پرندہ۔'' ٹونی نے کہا۔ لسٹر گھوڑے کو ایڑ لگا چکا تھا۔

''کون سا؟'' وہ تھوڑی دیر پہلے کی ٹونی کی زیادتی بھول کر خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''الو!'' ٹونی نے کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اس نے ٹونی کو منہ چڑایا لیکن اس کی پشت اپنی طرف ہوتے ہی اس کی آنکھوں میں محبت امڈ آئی۔ کتنے پیارے تھے اس کے دونوں بھائی۔ لسٹر سب سے بڑا تھا اور ٹونی اس سے چھوٹا۔ وہ ان دونوں سے چھوٹی تھی اور یہ سب اپنی چھوٹی سی دنیا میں خوش رہتے تھے۔

بوڑھے آسکر نے شہر سے دور اپنی چھوٹی سی دنیا بسائی ہوئی تھی۔ تا حد نگاہ پھیلی ہوئی سرسبز پہاڑیوں کے درمیان اس کا گھر سچ مچ جنت نظیر تھا۔ لکڑی کے خوبصورت اور کشادہ گھر کے پیچھے اس نے سبزیوں کے کھیت لگائے تھے۔ جن کی رکھوالی اس کی بیوی اور بیٹی کرتی تھیں۔ وہ خود بھیڑوں کی نگہبانی کرتا تھا اور اس کے دونوں بیٹے جنگل سے شکار کر لاتے تھے۔ اناج اور دوسری ضروری چیزوں کے حصول کے لیے انہیں ہر تیسرے ماہ شہر جانا پڑتا تھا۔ اس طرح وہ لوگ آبادی سے دور ایک خوبصورت سی پرسکون دنیا بسائے ہوئے تھے۔

آسکر شادی کے بعد سے ہی یہاں آ گیا تھا۔ وحشیوں کی بستی میں اس کا دل نہیں لگتا تھا وہ امن پسند انسان تھا۔ امن کا خواہاں لیکن جتنے دوست اتنے دشمن کا اصول اسے مو تھا۔ اس لیے اسے یہ ہی دنیا بھلی معلوم ہوئی۔ یہیں لسٹر پیدا ہوا اور پھر ٹونی، اس کے بعد شائیلا۔ تب اس کی بیوی مزید بچے پیدا کرنے سے انکار کر دیا اور وہ شہر جا کر اس آپریشن کرا لایا۔ تینوں بچے جنگل کی آزاد فضاؤں میں پرورش پا رہے تھے۔ لیکن آسکر کو اپنی موت کے بعد ان کی زندگی کا خیال بھی تھا۔ بہر حال یہ تینوں بچے اس طرح اس جنگل میں گزارہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے اس نے تینوں کو ماحول کی ضرورت سے پوری طرح روشناس کرا دیا تھا۔

جنگلی سانڈ کی طرح طاقتور اور شیر کا سا دل رکھنے والے لسٹر اور ٹونی بہترین نشانہ باز بھی تھے اور آسکر اپنے شیر دل بیٹوں سے پوری طرح مطمئن تھا۔ اس نے انہیں سکھایا تھا کہ امن دنیا کی سب سے قیمتی شے ہے لیکن اس سے بھی قیمتی شے ایک اور ہے اور وہ ہے عزت! انسان ذاتی غرض کے لیے کبھی جنگ نہ کرے لیکن جب عزت کا سوال آ جائے تو پورے اعتماد سے اپنی زندگی اس کی بھینٹ چڑھا دے اور دونوں بیٹوں نے اس کی بات گرہ میں باندھ لی تھی۔

لسٹر اور ٹونی کے گھوڑے برابر برابر دوڑ رہے تھے۔ وہ دونوں آپس میں گفتگو کرتے جا رہے تھے۔ موضوع بحث لاگاس کے کلب میں رقص کرنے والی رقاصہ جولی تھی۔

''تم اس کی کمر کے بل گن کر بتا سکتے ہو لسٹر۔ اگر تم اس کی کمر کے بل گن سکو تو میں تمہیں دس کارتوس انعام دوں گا۔'' ٹونی نے ہنس کر کہا۔

''ہوں۔ تو تم اس کی کمر کے بل گنتے رہتے ہو۔ مجھے تو اس کا فن پسند ہے۔'' لسٹر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیا خیال ہے لسٹر۔ اس بار اگر گریڈے لے اس کے ساتھ بدتمیزی کرے تو اس کی مرمت کر دی جائے۔ وہ ہمیشہ جولی کو پریشان کرتا ہے۔ خود کو بہت بہادر سمجھتا ہے۔ تم نے دیکھا ہو گا اس کا چوبیس انچ کا سینہ ہمیشہ اکڑا رہتا ہے۔''

''ہاں۔'' لسٹر بے ساختہ ہنس پڑا۔ ''سینہ تو بے شک اس کا چوبیس انچ سے زیادہ نہیں ہے لیکن بلاوجہ کسی سے جھگڑا کرنے سے فائدہ؟ اور پھر جولی سے ہمارا کیا رشتہ ہے اس کے دوسرے بہت سے عاشق وہاں ہیں۔ کوئی نہیں بولتا۔''

''مگر ہم اس کے عاشق تو نہیں۔ میرا مطلب ہے اس کے علاوہ وہ سب بزدل ہیں۔ وہ گریڈے کے سیاہ رنگ کے پستول سے خائف رہتے ہیں۔''

''بکواس مت کرو۔ ڈیڈی نے ہمیں جھگڑا کرنے سے منع کیا ہے اور سچ بات بھی یہ ہے۔ امن کی زندگی میں جو

لطف ہے وہ جھگڑے میں نہیں ہے۔'' لسٹر نے اس کی بات پر جھنجلاتے ہوئے کہا اور ٹونی شانے اچکا کر خاموش ہو گیا۔

ان دونوں کے گھوڑے برابر برابر دوڑ رہے تھے۔ باتیں کرنے کے دوران بھی ان کی نظریں شکار کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں اور وہ اپنے مکان سے تقریباً تین میل دور نکل آئے تھے۔ سبز علاقہ ختم ہو گیا تھا اور اب ان کے سامنے بے آب و گیا پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ہوا کی کاٹ نے انہیں مختلف شکلیں دیدی تھیں۔ ان پہاڑیوں پر ہرن اور دوسرے جانور بہ آسانی مل جاتے تھے۔ وہ قریب کے سرسبز علاقے میں خوراک تلاش کرنے کے بعد یہاں پناہ لیتے تھے۔

ابھی وہ اس پہاڑی میدان میں تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ ٹونی کی نگاہ ایک خوبصورت اور تندرست ہرن پر پڑی ٹونی نے زین سے لٹکے ہوئے ہولسٹر سے رائفل نکال لی اور ہرن کا نشانہ لینے لگا لیکن اسی وقت ہرن اچھل کر بھاگ نکلا یہاں شکار کی کمی نہیں تھی لیکن ٹونی کو وہ ہرن پسند آ گیا تھا۔ اس نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ لسٹر اس کھلنڈرے لڑکے کی فطرت سے واقف تھا، وہ جانتا تھا کہ وہ اس وقت تک ہرن کے پیچھے دوڑتا رہے گا جب تک اسے شکار نہ کر لے۔ ٹونی کی بہ نسبت لسٹر قدرے سنجیدہ تھا۔ بہر حال وہ بھی ٹونی کے پیچھے چل پڑا۔ ہرن ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ رہا تھا اور ٹونی کا گھوڑا بھی تعاقب میں لگا ہوا تھا۔

چند لمحات کے بعد وہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے لیکن ابھی ٹونی دوسری طرف اترنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ پہاڑی کے دوسری طرف پڑی۔ آٹھ گھڑ.... سوار دوڑ رہے تھے۔ ان کے ساتھ نواں گھوڑا بھی تھا جس پر ایک لڑکی سوار تھی لیکن لڑکی کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور لڑکی کے گھوڑے سے ایک انسانی جسم بندھا ہوا تھا جو زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ ٹونی نے ہاتھ کے اشارے سے لسٹر کو بلایا۔ وہ ہرن کا تعاقب بھی بھول گیا تھا۔

لسٹر نے بھی یہ منظر دیکھا اور حیران رہ گیا۔

''یہ تو بڑا ظلم ہے لسٹر، زمین پر گھسٹنے والا تو مر چکا ہو گا۔''

''ہاں یہ ظلم ہے، انہیں روکنا چاہیے۔ یہ غیر انسانی سلوک ہے۔''

''آؤ!'' ٹونی نے گھوڑے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں ٹونی۔ رک جاؤ ظاہر ہے ایسے ظالم لوگ اچھے انسان نہ ہوں گے۔ وہ آٹھ ہیں۔ ہمیں ان سے مقابلہ کرنے میں ہوشیاری سے کام لینا چاہیے!'' لسٹر نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''تم گھوڑے کو پیچھے کھڑا کر دو اور اس چٹان کی آڑ میں رکو میں جاتا ہوں۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں ہاتھ بلند کر دوں گا اور اس کے بعد تم اندازہ کر سکتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے!'' ٹونی نے جواب دیا اور لسٹر نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اس کا قوی ہیکل گھوڑا طوفانی انداز میں نیچے اتر رہا تھا اور لسٹر کی آنکھوں میں خون چھلک رہا تھا۔ وہ ایک چکر کاٹ کر ان کے سامنے پہنچ گیا اور ان لوگوں نے بھی اسے دیکھ لیا۔ ان سب کی رائفل سیدھی ہو گئی تھیں۔ لسٹر آہستہ آہستہ گھوڑا آگے بڑھا کر ان کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے خاموشی سے ان لوگوں کو دیکھا اور پھر ان سے گزر کر اس کی نگاہ لڑکی پر پڑی۔ لڑکی کا چہرہ ویران تھا اور وہ سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد اس کی نگاہ گھوڑے سے بندھے ہوئے آدمی پر پڑی جس کے خدوخال زمین کی رگڑ سے تقریباً ختم ہو چکے تھے اور اب خون اور گوشت کے لوتھڑوں کے علاوہ اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

گھوڑے رک گئے اور ان میں سے ایک آدمی آگے بڑھ آیا۔

''کیا بات ہے، کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟'' اس نے کرخت آواز میں پوچھا۔

''یہ کون ہے؟ اور اس کا کیا قصور تھا جو تم نے اس کے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک کیا ہے؟'' لسٹر نے سنجیدگی سے سوال کیا گھوڑے پر بیٹھا ہوا آدمی اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر ہنس پڑا۔ پھر لسٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پشکر کو جانتے ہو؟''

''شاید تم اس لٹیرے کی بات کر رہے ہو جس کے ظلم کے قصے مشہور ہیں؟'' لسٹر شہر میں پشکر کا نام سن چکا تھا معمولی سے لوگ بھی خود کو پشکر کا آدمی بتا کر جرائم کرتے پھرتے تھے۔

''چلو وہی سہی۔''

''وہ یہ پشکر ہے؟'' لسٹر نے گھوڑے سے بندھے ہوئے شخص کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بکومت پورے ویلٹا میں کس کی مجال ہے جو پشکر کے ساتھ یہ سلوک کر سکے۔ یہ پشکر کا شکار ہے۔ ہٹو سامنے سے اس سے زیادہ گفتگو نہیں کی جا سکتی۔''

''یہ لڑکی کون ہے؟'' لسٹر نے اس کی بات نظر انداز کر کے سرد لہجے میں کہا۔

''سامنے سے ہٹ جاؤ، اس لڑکی کا مستقبل بہر حال

روشن ہے شاید یہ پشکر کی محبوباؤں میں شامل ہوجائے۔"

"اسے کھول دو اور اس شخص کی لاش کو بھی کھول دو۔" لسٹر نے حکم دیا اور گھوڑے والا اسے گھورنے لگا۔

"شاید تیری موت ہی آگئی ہے۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولا اور دوسرے لمحے اس نے ہولسٹر سے اپنا پستول نکالیا۔ لیکن اس سلسلے میں وہ لسٹر سے زیادہ پھرتی نہ دکھا سکا۔ لسٹر کا پستول اس سے پہلے نکل آیا تھا اور گولی گھوڑے والے کی پیشانی توڑتی ہوئی دماغ میں گھس گئی۔ فائر کی آواز سے گھوڑے بھڑک کر منتشر ہوگئے اور لسٹر کا ہاتھ بلند ہوگیا۔

مرنے والے کے ساتھیوں نے لسٹر پر فائر جھونک دیے لیکن لسٹر گھوڑے پر کہاں تھا۔ وہ تو فائر کرنے کے ساتھ ہی پھرتی سے نیچے کود گیا تھا۔ البتہ پہاڑی پر سے ہونے والے فائروں نے دو گھوڑوں کی زین اور خالی کردی۔ نیچے کودتے ہوئے لسٹر کے آٹو میٹک پستول نے مزید دو آدمیوں کو چاٹ لیا۔ باقی تین لڑاکے اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے بھاگ نکلے۔ وہ لسٹر کے پستول کی زد سے تو نکل گئے لیکن ٹونی کی دور تک مار کرنے والی رائفل نے ان میں سے ایک کو ڈھیر کردیا۔ بقیہ دو نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگئے۔

لڑکی کے چہرے کی ویرانی ختم ہوگئی اور وہ خوفزدہ نظر آرہی تھی۔ لسٹر نے گردن اچکا اچکا کر بھاگ جانے والوں کو دیکھا اور پھر لڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے سہارا دے کر لڑکی کو گھوڑے سے اتار لیا اور چاقو نکال کر اس کے ہاتھوں میں بندھی ہوئی رسیاں کاٹ دیں۔ اور اس کے بعد وہ گھوڑے سے بندھی ہوئی لاش کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے لاش کی رسی بھی کاٹ دی اور پھر اسے اٹھا کر گھوڑے پر ڈال دیا۔ اتنی دیر میں ٹونی بھی گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

"میں نے اونچی چٹانوں پر چڑھ کر دیکھا ہے۔ وہ دونوں جنوب کی طرف بھاگے ہیں۔" ٹونی نے کہا۔

"ہاں وہ پشکر کے ساتھی ہیں۔ اس کے گاؤں کی طرف گئے ہوں گے۔" لسٹر نے کہا۔

"یہ کس کی لاش ہے؟" ٹونی نے پوچھا اور سوالیہ نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

"میرے باپ کی!" لڑکی کی غمناک آواز ابھری اور دونوں بھائی چونک پڑے پھر لسٹر نے گردن ہلائی اور لڑکی سے بولا۔

"ہمارے ساتھ چلو! اس لاش کو احترام سے دفنانے کے بعد تم جہاں کہو گی تمہیں پہنچا دیا جائے گا۔" لڑکی نے گردن جھکا دی۔ لسٹر نے ٹونی کو اشارہ کیا اور ٹونی نے تکلفی سے لڑکی کی کمر میں دونوں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھا اور گھوڑے کی پشت پر بٹھا دیا۔ لڑکی چونک کر اس کی شکل دیکھنے لگی لیکن ٹونی کے چہرے کے کھلنڈرے پن نے اسے مطمئن کردیا۔ دوسرے لمحے ٹونی خود بھی اچھل کر گھوڑے پر سوار ہوگیا اور اس نے آہستگی سے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

لڑکی اس کے سینے سے چپکی ہوئی تھی۔ ٹونی کے دونوں ہاتھ اس کے گرد حلقہ بنائے ہوئے لگاموں کو پکڑے ہوئے تھے اور نہ جانے کیوں ٹونی کے گرم سینے سے لگے ہوئے لڑکی کو بے حد سکون محسوس ہو رہا تھا۔

ان کے پیچھے لسٹر اپنے گھوڑے پر آرہا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوسرے گھوڑے کی راسیں بھی پکڑی ہوئی تھیں۔ جس پر بوڑھے سن برگ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ لڑکی اور لاش کی وجہ سے انہیں سست رفتاری سے سفر کرنا پڑ رہا تھا۔ اس لیے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ٹونی گھوڑے سے کود پڑا۔ وہ والدین کے سامنے لڑکی کو اس طرح سینے سے لگائے نہیں جاسکتا تھا۔

لسٹر بھی اس کے گھوڑے سے اترنے کی وجہ سمجھ گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بھی گھوڑے کی رفتار سست کردی۔ دور سے شاید شائیلا نے ان کو دیکھ لیا تھا۔ اس لیے وہ بھاگتی ہوئی مکان سے نکل آئی اور متعجب نظروں سے ان لوگوں کو دیکھنے لگی۔

پھر قریب پہنچنے پر اس نے دونوں گھوڑوں کی لگامیں پکڑ لیں۔ لڑکی کو دیکھ کر وہ کوئی دلچسپ فقرہ کہتی۔ لیکن اس کی نظریں اس مسخ شدہ لاش کو بھی دیکھ چکی تھیں۔

"یہ کیا ہوا۔ یہ کون ہے؟" اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں لاش کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی کو بھیجو۔ وہ کہاں ہیں؟"

"دوسری طرف کھیتوں میں کام کررہے ہیں۔"

"بلاؤ!" لسٹر نے کہا اور شائیلا بے تحاشا باپ کو آواز... دیتی ہوئی دوڑ گئی۔ چند منٹ کے بعد لسٹر کی ماں اور باپ دونوں آتے نظر آئے۔ بوڑھے آسکر نے بھی اسی حیرت سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔ "کیا بات ہے لسٹر! یہ لاش کیسی ہے؟"

"ظلم کا شکار ہے ڈیڈی، کچھ لوگ اسے گھوڑے سے باندھ کر گھسیٹتے ہوئے لے جارہے تھے اور انہوں نے اس لڑکی کو بھی باندھ کر گھوڑے پر بٹھایا ہوا تھا۔"

"اوہ، اوہ۔ ویلٹا کے لوگ آخر اس قدر وحشی کیوں ہیں۔ ان کی نگاہوں میں انسان اس قدر حقیر شے کیوں ہے؟

میری سمجھ میں نہیں آتا!" بوڑھے آسکر نے افسوسناک لہجے میں کہا اور پھر جھک کر لاش کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آسمان کی طرف رخ کرکے سینے پر کراس بنایا اور بولا۔ "بڑا ظلم کیا گیا ہے اس شخص پر مگر لڑکی سے اس کا کیا رشتہ ہے؟"

"یہ اس بے چاری کا باپ ہے۔" لسٹر نے کہا۔

"اوہ۔" بوڑھے کے ہونٹ سکڑ گئے۔ وہ گردن جھکائے کھڑی لڑکی کی طرف دیکھنے لگا جس کے چہرے پر یاس اور محرومی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ پھر بوڑھا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اس نے لڑکی کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور غمزدہ آواز میں بولا۔ "ظالموں نے تیرے باپ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ لیکن اب میں تیرے باپ کو واپس نہیں لاسکتا میری بچی۔ ہاں تیرے لیے باپ کی آغوش اب بھی موجود ہے۔" اس نے لڑکی کو اپنے سینے سے بھینچ لیا اور لڑکی بھی اس سے بری طرح چمٹ گئی، وہ زاروقطار رو رہی تھی۔

بوڑھا آسکر اور اس کی بیوی لڑکی کو تسلی دیتے رہے اور اس کی سسکیاں کم ہوگئیں۔ لسٹر نے ٹونی کو اشارہ کیا اور دونوں ایک طرف چل پڑے۔ مکان کے عقبی حصے میں انہوں نے زمین کھودنے کے اوزار اٹھائے اور بوڑھے کے لیے ایک مناسب حصے میں قبر تیار کرنے لگے۔

"ڈیڈی کو پشکر کے بارے میں کیسے بتایا جائے ٹونی۔" قبر کھودتے ہوئے لسٹر نے کہا۔

"کیا مطلب..... پشکر یعنی وہ غنڈا؟"

"ہاں وہ پشکر کے غنڈے تھے اور لڑکی کو اس کے گاؤں لے جارہے تھے۔"

"تب تو..... تب تو میرا خیال ہے اس کام سے فارغ ہوتے ہی ہمیں سب سے پہلے ڈیڈی کو تفصیل بتانی چاہیے تاکہ ہم سب بے خبری میں نہ مارے جائیں۔ پشکر جیسے کینہ پرور انسان سے خاموشی کی توقع نہیں ہے۔"

"ہاں میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" لسٹر نے جواب دیا۔ قبر تیار کرکے وہ واپس گھر پہنچ گئے جہاں لڑکی، شائیلا اس کی ماں اور بوڑھے کو رو رو کر اپنی کہانی سنا رہی تھی اور بوڑھے کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔

"ہر عروج کو زوال آتا ہے کبھی سن برگ کے نام سے ویلٹا کے باشندے کانپتے تھے اور آج اسی سن برگ کا ایک غنڈے نے یہ حشر کیا ہے۔"

"سن برگ؟" یہ نام دونوں بھائیوں کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

"ہاں لسٹر! مظلوم شخص ویلٹا کا جیالا سن برگ ہے۔ وہ سن برگ جس نے شادی کرنے کے بعد اپنی محبت کرنے والی بیوی کی خواہش پر اپنی سرگرمیاں ترک کردی تھیں اور پھر بیوی کی موت اور بیٹی کی پیدائش کے بعد وہ صرف ایک متفکر باپ رہ گیا تھا۔ یہ وہی سن برگ ہے جو بیٹی کی عزت کے محافظ کی حیثیت میں پھر جاگ اٹھا تھا اور اس نے پشکر کے دس غنڈوں کو قتل کردیا تھا۔ لیکن ایمونیشن ختم ہوجانے کی وجہ سے انہوں نے اس پر قابو پالیا۔"

"مجھے تجھ سے ہمدردی ہے میری بچی۔ لیکن اب ہم بھی ایک جنگ کا آغاز کرچکے ہیں۔ پشکر خاموش بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ ان دونوں کی تلاش میں زمین و آسمان ایک کردے گا۔ بہرحال کچھ بھی ہو تو ہماری پناہ میں ہے اور اب ہماری موت کے بعد ہی تیرا بال بیکا ہوسکتا ہے!" بوڑھے آسکر نے کہا۔ اور پھر ان دونوں کی طرف رخ کرکے بولا۔

"میں نے تم دونوں کو ہمیشہ ہمدردی اور امن کا سبق دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں ایک اور بات بھی کہہ چکا ہوں۔ دنیا میں سب سے قیمتی شے عزت ہے۔ اور اگر عزت پر حرف آنے لگے تو انسان کو پہاڑوں سے ٹکرا جانا چاہیے۔ دائنا ہماری عزت ہے اور اگر پشکر کی آنکھ اس کی طرف اٹھے تو ہمیں اس کی آنکھیں پھوڑ دینا ہوں گی۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟"

"آپ ہمیں شرمندہ کررہے ہیں ڈیڈی ہمارے لہو کا ایک ایک قطرہ اپنی آن پر بہہ جانے کے لیے بے چین ہے۔" لسٹر نے کہا۔ ٹونی کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں جو اس کے شدید جوش میں ہونے کی علامت تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد لسٹر نے کہا۔

"قبر تیار کردی گئی ہے۔"

"ہاں ہمیں اسے دفن کرنے کی تیاریاں کرنی ہیں۔" بوڑھا اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

"ڈیڈی عقبی حصے میں تمہارا انتظار کررہے ہیں۔" شائیلا نے ٹونی سے کہا تو ٹونی گہرے خیال سے چونک پڑا۔

"چلو!" اس نے شائیلا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر چند قدم چلنے کے بعد بولا۔ "دیکھ لیا تم نے لسٹر کتنا برا آدمی ہے۔"

"کیوں؟" شائیلا چونک کر بولی۔

"اس نے آج تم سے طوطا لانے کا وعدہ پورا نہیں کیا۔ میری بات اور ہے، میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا ہے۔"

"کیوں تم نے کون سا وعدہ پورا کیا ہے؟" شائیلا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ تمہارے لیے الو لاؤں گا۔ سو لے آیا" ٹونی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"الو..... کہاں ہے وہ؟"

"اونہہ۔ تم بھی بالکل احمق ہو کیا اس لڑکی کی شکل الو سے ملتی جلتی نہیں ہے؟" ٹونی نے کہا اور شائیلا غصے سے رک گئی۔

"دیکھو ٹونی۔ اگر تم نے اس بیچاری کو ذرا بھی چھیڑا تو پھر میں تم سے کبھی نہیں بولوں گی۔ وہ تو ویسے ہی مظلوم ہے۔ ہائے کیسے رو رہی تھی۔ مجھے اس سے بہت محبت ہو گئی ہے ٹونی میں ہمیشہ اسے اپنے ساتھ رکھوں گی۔"

"کس ظالم کو اس سے محبت نہ ہو گی۔" ٹونی نے آہستہ لہجے میں کہا جسے شاید شائیلا نہ سن سکی اور دونوں اس جگہ پہنچ گئے جہاں بوڑھا آسکر لسٹر سے بات کر رہا تھا۔ سن برگ کو انہوں نے احترام سے دفن کر دیا تھا اور شائیلا کی بوڑھی ماں وائنا کو اپنے ساتھ مکان میں لے گئی تھی۔ تب آسکر نے لسٹر کو بلایا اور الگ لے گیا۔ اس نے شائیلا کے ساتھ ٹونی کو بھی بلایا تھا۔ پھر اس نے اشارے سے شائیلا کو چلے جانے کے لیے کہا اور اس کے جانے کے بعد بولا۔

"بات اتنی معمولی نہیں ہے جتنا تم سوچ رہے ہو۔ پشکر جیسے کینہ پرور انسان کے انتقام سے بچنے کے لیے ہمیں جلد از جلد کچھ کر لینا چاہیے ایسا نہ ہو کہ وہ آرام سے آ کر ہمیں شکار کر لے۔"

"میں آپ سے متفق ہوں ڈیڈی۔" لسٹر نے کہا۔ اور ٹونی نے بھی گردن ہلا دی۔

"میں اپنے اصول کا پکا ہوں ہم نے پوری زندگی عیش و عشرت سے گزاری ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ بقیہ زندگی بھی اسی طرح گزرے۔ لیکن اللہ ہمارا امتحان چاہتا ہے۔ وہ ہم سے اس زندگی کا خراج چاہتا ہے۔ تو ایسے موقع پر ہمیں پشت دکھانی چاہیے؟"

"ہرگز نہیں ڈیڈی۔" ٹونی نے جوشیلے انداز میں کہا۔

"تب ہمیں اس عیش و عشرت کے گھروندے کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کرنا ہو گا۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔ اور میں اس ترکیب سے پوری طرح مطمئن ہوں تمہیں اس پر عمل کرنا ہو گا۔"

"حکم دیں ڈیڈی۔"

"تمام پالتو مویشیوں کو جنگل میں ہانک دو۔ اگر حالات سازگار رہے تو ہم انہیں دوبارہ بھی پکڑ سکتے ہیں۔ صرف سامان باندھ لو اور تم دونوں حفاظت سے تینوں عورتوں کو لے کر کشتاری کی پہاڑیوں میں چلے جاؤ۔ میں پشکر کو بے وقوف بنانے کی کوشش کروں گا۔ اگر بنا سکا تو ٹھیک ہے ورنہ پھر میں اسے ڈاج دے کر تمہارے پاس پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ اگر نہ پہنچ سکوں تو سمجھ لینا کہ میں اپنی آن پر قربان ہونے کی ابتدا کر چکا ہوں اور پھر باقی کام تمہارے سپرد ہو گا۔"

"میں ایک بات کہنے کی اجازت چاہتا ہوں ڈیڈی۔" ٹونی نے دبے دبے لہجے میں کہا اور بوڑھے آسکر کی تیز نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ "آپ یہ کام میرے سپرد کر دیں۔ لسٹر سے ان کی براہ راست دشمنی ہے اور وہ لسٹر کو پہچانتے ہیں۔ آپ کی ضرورت ان سب کو ہے، آپ ان کی بہتر حفاظت کر سکتے ہیں۔ البتہ میں ان لوگوں کو آپ کی ہدایت کے مطابق....."

"بکواس مت کرو ٹونی۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے اپنی اسکیم میں کوئی مداخلت پسند نہیں ہے۔ تم دونوں صرف میری ہدایت پر عمل کرو۔" بوڑھے آسکر نے درمیان سے ٹونی کی بات کاٹ دی "میں نے تمہیں ہدایات دیدی ہیں۔ ان پر اب سے دو منٹ کے بعد عمل شروع کر دیا جائے۔"

اور پھر ٹھیک دو گھنٹے کے بعد سات گھوڑے کشتاری کی پہاڑیوں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ جو غاروں کی پہاڑیاں کہلاتی تھیں۔ ان پہاڑیوں میں بے شمار غار بکھرے ہوئے تھے۔

بوڑھا آسکر گھوڑوں کو اس وقت تک دیکھتا رہا۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ سات گھوڑوں میں سے تین پر عورتیں سوار تھیں۔ دو پر ٹونی اور لسٹر تھے۔ باقی دو گھوڑوں پر ضروری سامان لدا ہوا تھا۔ وہ سب ہاتھ ہلاتے ہوئے ماحول میں گم ہو گئے۔ اور آسکر نے گردن جھٹک دی پھر وہ تیزی سے مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ بوڑھا ہونے کے باوجود وہ جوانوں کی سی پھرتی رکھتا تھا۔ مکان کے نیچے ایک چھوٹے سے تہ خانے کو انہوں نے اسلحہ خانہ بنایا ہوا تھا جہاں کسی بھی ہنگامی ضرورت پر کام آنے کا تمام سامان موجود تھا۔

آسکر نے اسلحہ خانے سے بارود کے کئی بکس نکالے اور باہر لا کر جمع کرنے لگا پھر اس نے انہیں مکان کی پشت پر ایک مخصوص حصے میں چھپا دیا۔ یہاں سے وہ کسی کو نہیں نظر آ سکتے تھے۔ اس کے بعد اس نے بارود میں لپٹی لمبی ڈوری نکالی اور اس کو بکس کے سوراخ سے منسلک کر کے مضبوطی سے باندھ دیا۔ اس کے بعد وہ اس ڈوری کو لکڑی کی دیوار کے ایک رخنے سے نکال کر مکان کو پیچھے دور تک لے گیا اور ایک جگہ اسے باندھ دیا۔ ڈوری کو اس نے گھاس پھونس

سے چھپا دیا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے دونوں پستول لوڈ کیے اور انہیں پتلون کے پائنچوں کے نیچے پنڈلی میں بندھے ہوئے ہولسٹروں میں لگا لیا۔ کارتوسوں کی پیٹی قمیص کے نیچے باندھی اور رائفل لوڈ کر کے باہر نکل آیا اور اس کے سامنے والے حصے میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ اسے یہ رات اسی جگہ گزارنی تھی۔

کرسی پر بیٹھ کر اس نے رائفل قریب رکھ لی اور ایک سگار نکال کر پینے لگا۔ اسے یقین تھا کہ پشکر کے آدمی صبر نہ کر سکیں گے اور آج ہی رات کے کسی حصے میں اس کے مکان پر حملہ آور ہوں گے اور اس کا یہ یقین غلط نہ ثابت ہوا۔

سورج غروب ہونے والا تھا کہ اس نے دور بہت دور تقریباً پندرہ گھڑ سوار دیکھے جو اسی طرف آ رہے تھے۔ تب وہ جلدی سے اٹھا اور اس نے آخری کام بھی کر لیا۔ اس نے اپنا سیاہ رنگ کا گھوڑا دور لے جا کر ایک درخت سے باندھ دیا۔ گھوڑے کی زین وغیرہ کسی ہوئی تیار تھی اس کے بعد وہ دوبارہ آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے غیظ و غضب میں ڈوبے ہوئے پندرہ افراد اس کے سامنے پہنچ گئے۔ ان میں سے آگے پشکر تھا۔ تین آدمی سامنے سے آئے باقی مکان کے چاروں طرف پھیل گئے۔ وہ مکان کو گھیرے میں لے چکے تھے۔

بوڑھا بوکھلائے ہوئے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ پشکر کی آنکھوں میں آگ سلگ رہی تھی۔ وہ گھوڑے سے کود پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دونوں ساتھی بھی نیچے آ گئے تھے۔

"لڑکی کہاں ہے؟" پشکر نے سرد آواز میں کہا۔

"میں آپ کا ہی منتظر تھا جناب، میں سوچ رہا تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔ وہ ناخلف میری اولاد ہے اور جب میں نے سنا کہ اس نے آپ کے آدمیوں سے ٹکرا کر اس لڑکی کو حاصل کیا ہے تو میں نے اس کی موت کی پیش گوئی کر دی تھی۔ لیکن وہ نوجوانی کے جوش میں اندھا ہو رہا تھا۔ میری اس سے جنگ ہو گئی اور اس کی ماں بہن نے بھی اسی کا ساتھ دیا۔ تب میں نے ان سب کو گھر سے نکال دیا۔ میں آپ سے لڑائی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ آپ کو ضرور علم ہو گا کہ میں ایک امن پسند آدمی ہوں۔"

"جاؤ، اندر دیکھو۔" پشکر نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا اور بوڑھے پر پستول تان لیا۔ "دوسرا کون تھا جس نے پہاڑیوں کے پیچھے سے فائرنگ کی تھی؟"

"وہ بھی میرا بیٹا ہی تھا۔ مگر وہ دونوں بے وقوف ہیں جناب۔ بھلا کہاں آپ اور کہاں وہ۔ میں نے ان کی اچھی طرح خبر لی ہے۔ میری درخواست ہے جناب کہ آپ ان دونوں کو معاف کر دیں۔"

پشکر خونخوار انداز میں آگے بڑھا اور اس نے بوڑھے کا گریبان پکڑ لیا۔ "اگر وہ لوگ اندر نہیں ہیں تو تجھے بتانا ہو گا کہ وہ کہاں ہیں اور اگر وہ اندر ہیں تو تیرا حشر بوڑھے سن برگ سے مختلف نہ ہو گا۔"

"میں آپ سے آخری بار درخواست کرتا ہوں جناب کہ انہیں معاف کر دیں۔ وہ مجھ بوڑھے کا سہارا ہیں۔ وہ میری....." لیکن جملہ پورا ہونے سے قبل پشکر کا زوردار گھونسا بوڑھے کے منہ پر پڑا اور وہ اپنی رائفل کے نزدیک جا گرا۔ لیکن اس نے رائفل اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کوشش اسے فوری موت سے ہمکنار کر سکتی تھی کیونکہ پشکر کی انگلی پستول کے ٹریگر پر تھی۔

پشکر کے آدمی باہر نکل آئے۔ "اندر کوئی نہیں ہے۔ پورا مکان خالی ہے۔ وہ لوگ سامان بھی لے گئے ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہوں! اب تم بتاؤ وہ کہاں ہیں؟" پشکر نے کہا۔

"وہ قصبہ تھا کر گئے ہیں۔ وہاں ان کا بچا رہتا ہے مگر میں تم سے رحم کی بھیک مانگتا ہوں پشکر!" بوڑھے نے التجا کی۔

"اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر گھوڑے پر بٹھا لو۔" پشکر نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

"میرا گھوڑا ادھر موجود ہے۔" بوڑھے نے کہا اور پشکر مکان کی عقبی سمت دیکھنے لگا۔

"لے کر آؤ اور تم اس کی نگرانی کرو۔" پشکر نے ایک آدمی سے کہا۔ اور اس نے گردن ہلا دی۔ پشکر نے دوسرے لوگوں کو جو مکان کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ آواز دے کر بلا لیا۔

اب آسکر کو اپنا کام نہایت صفائی سے کرنا تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے مکان کی پشت پر پہنچ گیا اور پھر اس نے سلگتے ہوئے سگار کو بہ ظاہر نہایت بے پروائی سے لیکن دراصل بڑی صفائی سے بارود لپٹی ہوئی ڈوری پر پھینک دیا۔ ڈوری سے اٹھتی ہوئی چنگاریاں دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی۔ اور یہ دستور آہستہ قدموں سے سامنے نظر آنے والے گھوڑے کی طرف بڑھتا رہا۔ وہ ایک ایک لمحے کا اندازہ کر رہا تھا کہ اب ڈوری کی آگ کہاں تک پہنچ چکی ہو گی۔

دور کھڑا ہوا پشکر کا آدمی رائفل تانے اسے گھوڑے تک جاتے دیکھ رہا تھا اور بوڑھے کی کسی بھی حرکت پر

گولیاں برسانے کے لیے تیار تھا۔ بالآخر آسکر کے قدموں میں تیزی آگئی اور اس نے گھوڑے کی لگام درخت سے کھولی اور صرف چند ساعت ـــ کے بعد ایک ساعت شکن دھماکا ہوا اور لکڑی کا مکان فضا میں بلند ہوگیا۔

اس کے ساتھ ہی بوڑھے نے گھوڑے کی پشت پر چھلانگ لگادی اور گھوڑ اہوا ہوگیا۔ وہ طوفانی رفتار سے کشاری کی پہاڑیوں کی طرف جارہا تھا۔ بوڑھے کے چہرے پر مسرت کے آثار تھے۔ اسے یقین تھا پشکر اور اس کے ساتھیوں کا کام تمام ہوچکا ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ اس علاقے کی طرف رخ کرنا خطرناک ہوگا بلکہ جہاں بھی رہنا ہوگا محتاط ہوکر رہنا ہوگا۔

گھوڑا برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ اس بڑھاپے میں بھی آسکر کی ہمت جوان تھی۔ رات ہونے تک وہ کشاری کی پہاڑیوں میں پہنچ گیا۔ پہاڑیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں اور اس تاریکی میں لسٹر وغیرہ کو تلاش کرنا مشکل کام تھا۔ ایک چٹان کے پاس وہ گھوڑے سے اتر گیا اور پھر چٹان پر کھڑے ہوکر اس نے ایک مخصوص انداز میں سیٹی بجائی۔

سیٹی کی آواز ہواؤں کے ساتھ دور دور تک پھیل گئی لیکن اس کا کوئی ردعمل نہ ہوا تب اس نے دوبارہ سیٹی بجائی اور اسی وقت چٹان کے عقب سے لسٹر کی آواز گونجی۔ ''ڈیڈی!''

''اوہ میرے بیٹے!'' آسکر خوشی سے بولا اور لسٹر آکر آسکر سے لپٹ گیا۔ باپ کو زندہ پاکر اسے بے حد مسرت ہوئی تھی۔

''کیا رہا ڈیڈی کیا پشکر آیا تھا؟'' اس نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں۔ تمہارے ساتھ آنے سے پہلے میں ایک کوشش کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پشکر ہمیں نظرانداز کردے میں نے اس ذلیل سے معافی بھی مانگی تھی۔ لیکن وہ طاقت کے نشے میں چور تھا۔ اور جب میں نے یہ کوشش ناکام دیکھی۔ تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

''موت کے گھاٹ اتار دیا؟'' لسٹر خوشی سے چیخ اٹھا۔ ''ہرا! ونڈرفل ڈیڈی، ونڈرفل!'' اس نے خوشی کے عالم میں بوڑھے کو گود میں اٹھالیا۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد بوڑھا ایک غار میں بیٹھا ان لوگوں کو اپنے کارنامے کی روداد سنا رہا تھا۔

''ہمیں اس امکان کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ پشکر زندہ بھی بچ سکتا ہے۔ بالفرض اگر وہ زندہ نہیں ہے تو اس کے ساتھی ہماری تلاش ضرور کریں گے۔ اس لیے ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔ فی الحال یہ غار بہترین جگہ ہے۔ اس کے بعد ہم کوئی فیصلہ کریں گے۔ لیکن غار سے باہر رہ کر نگرانی کرنا ضروری ہے۔'' بوڑھے نے کہا اور وہ گردن ہلانے لگے۔

☆☆☆

وسط ماہ کا چاند پہاڑیوں پر سونا بکھیر رہا تھا۔ جوان چاندنی فضا کو منور کیے ہوئے تھی۔ اور نشیلی ہواؤں نے ماحول کو بے خود کردیا تھا۔ لسٹر ایک چٹان سے پشت لگائے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کی رائفل برابر میں رکھی ہوئی تھی اور اس کی خواب آلود آنکھوں میں ایک حسین چمک لہرا رہی تھی۔ پھر اس کے ہونٹ خود بہ خود مسکرا اٹھے۔ اور اسی وقت اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دوسرے لمحے اس نے کسی خونخوار چیتے کی طرح لپک کر رائفل اٹھالی اور پوزیشن میں آگیا۔

لیکن قدموں کی چاپ اجنبی نہ تھی۔ یہ وہی تھی جسے وہ اپنے خوابوں میں بسائے ہوئے تھا۔ وہ اسی طرف آرہی تھی۔ لسٹر کا رواں رواں خوشی سے جھوم اٹھا۔ وہ اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہوگیا۔

''وائنا!'' اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں آواز دی اور وائنا چونک کر رک گئی۔ ''میں یہاں اس چٹان پر ہوں۔'' لسٹر نے کہا اور وائنا اس کی طرف بڑھ گئی۔ لسٹر نے اسے سہارا دے کر چٹان پر چڑھایا اور جب وہ چٹان پر پہنچی تو لسٹر کا چوڑا چکلا سینہ سامنے تھا۔ وائنا کا جسم اس کے سینے سے ٹک گیا اور لسٹر کے ہاتھ خود بہ خود اس کی کمر پر پہنچ گئے!

''کیسے نکل آئیں وائنا؟'' اس نے اسے خود سے بھینچتے ہوئے کہا۔

''یونہی۔ بس نیند نہیں آرہی تھی۔'' وائنا کسمساتے ہوئے بولی۔ اور پھر چٹان پر بیٹھ گئی! بیٹھنے کی وجہ سے لسٹر کے ہاتھ خود بہ خود اس کی کمر سے نکل گئے تھے۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔

''کیوں نیند نہیں آرہی تھی؟'' اس نے مخمور لہجے میں کہا۔

''میں آپ سب لوگوں سے بے حد شرمندہ ہوں۔ میری وجہ سے آپ کو اپنی دنیا لٹانی پڑی ہے۔ کیسی بدنصیب ہوں میں۔'' وہ گردن جھکا کر بولی۔

''ایسی باتیں کیوں کرتی ہو وائنا کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے زندگی لٹائی جاسکتی ہے۔'' لسٹر نے کہا۔

''آپ سب بڑے رحمدل ہیں۔'' وائنا نے بہ دستور گردن جھکائے ہوئے کہا۔

''سوچنے کا انداز بدل دو وائنا۔ اب تم ہم میں سے

ایک ہو۔ غور کرو ہم سب کی ایک دوسرے کی نگاہوں میں کیا اہمیت ہے۔ ہم میں سے ہر فرد ایک دوسرے کے لیے ایسی ایسی ہزار زندگیاں لٹا سکتا ہے اور وائنا تمہارے آنے سے تو ہماری زندگی میں بہار آگئی ہے۔ تم میری مسرتوں کا اندازہ نہیں کرسکتیں۔''

ماحول نے لسٹر کو مدہوش کردیا تھا۔ ایک بار پھر اس کے ہاتھ وائنا کی کمر کی طرف بڑھے۔ اور اس نے اسے آغوش میں لے لیا۔ وائنا عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی لیکن جب لسٹر کے ہونٹ اس کے رخساروں سے ٹکرائے تو وہ چونک پڑی۔ اس نے لسٹر کی آنکھوں میں دیکھا اور لسٹر نے اس کے دیکھنے کے انداز کو نہ جانے کیا سمجھا۔ اس نے وائنا کے ہونٹ اپنے ہونٹوں میں دبالیے۔

دفعتاً دور کوئی آہٹ ہوئی اور وہ چونک پڑا۔ وائنا بھی ایک دم کھڑی ہوگئی تھی۔ لسٹر رائفل لے کر ادھر ادھر دیکھنے لگا لیکن آہٹ کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ''میں چلتی ہوں لسٹر!'' اس نے کہا اور چٹان سے کود پڑی۔

''کیوں..... نیند آرہی ہے؟'' لسٹر نے پوچھا۔

''ہاں!'' وائنا نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ لسٹر اس کے خوبصورت جسم کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آتی رہی اور پھر اس کے غار میں داخل ہوجانے کے بعد لسٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ وائنا کے نرم وگداز ہونٹوں کے لمس اور ان کی گرمی اپنے ہونٹوں پر محسوس کررہا تھا۔

☆☆☆

یوں تو غار میں انہیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ کھانے پینے کی چیزیں خاصی مقدار میں موجود تھیں۔ لیکن پانی لینے کے لیے یہاں سے دور جانا پڑتا تھا۔ چنانچہ ٹونی کینوس کی مشک لے کر پانی لینے جارہا تھا کہ وائنا بھی اس کے قریب پہنچ گئی۔

''کہاں جارہے ہو ٹونی؟'' اس نے پوچھا۔

''پانی لینے۔''

''میں نے انکل سے نہانے کے لیے کہا تھا تو انکل نے کہا ٹونی کے ساتھ چلی جاؤ، چشمے پر نہالینا۔ میں تمہارے ساتھ چلوں ٹونی؟'' ٹونی نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھا۔ ایک اور زین اٹھا کر دوسرے گھوڑے پر کس دی اور پھر وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ دوسرے گھوڑے پر زین کسنے کا مطلب تھا کہ وہ وائنا کو ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہے۔ چنانچہ وائنا بھی مسکراتی ہوئی گھوڑے پر بیٹھ گئی اور دونوں گھوڑے چٹانیں پھلانگتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ چشمہ یہاں سے کافی دور ایک خوبصورت علاقے میں تھا۔ راستے میں وائنا نے کئی بار اپنا گھوڑا ٹونی کے ساتھ لانے کی کوشش کی لیکن ٹونی ہر بار اپنا گھوڑا آگے نکال لیتا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چشمے پر پہنچ گئے۔ ٹونی گھوڑے سے کود پڑا۔ اور خاموشی سے مشک میں پانی بھرنے لگا۔

''پانی زیادہ ٹھنڈا تو نہیں ہے ٹونی؟'' وائنا نے اس کے نزدیک پہنچ کر کہا۔

''نہیں تم، نہاسکتی ہو۔'' ٹونی نے سرد لہجے میں جواب دیا اور وائنا اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس کی آنکھوں میں اداسی تیرنے لگی۔

''شاید تمہیں اپنا خوبصورت مکان تباہ ہونے، اپنی حسین زندگی کے ختم ہوجانے کا دکھ ہے ٹونی۔'' اس نے رنجیدہ لہجے میں کہا اور ٹونی چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب تاثرات ابھر آئے۔

''کیوں بار بار مکان کا نام لے کر ہمیں ذلیل کرتی ہو۔ کیوں ہمارے خلوص کا مذاق اڑاتی ہو تم۔'' ٹونی نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا اور وائنا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ ٹونی کے غصے سے سرخ چہرے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی اور پھر اس کی آنکھوں ڈبڈبا آئیں اور اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا۔

''تمہیں یہ خیال کیوں آیا ٹونی کہ میں..... میں تمہارے خلوص کا مذاق اڑاؤں گی۔ میں..... جس کا بال بال تمہارے احسانوں سے دبا ہوا ہے۔''

''ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے تمہارے اوپر کوئی احسان نہیں کیا ہے ہم جانتے تھے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ہم نے تمہیں اپنا سمجھ کر یہ سب کچھ کیا تھا۔ لیکن تم ہمیں ہمیشہ غیریت کا احساس دلاتی رہیں۔ آخر کیوں.....؟ کیوں تم ہمارے اوپر اپنا حق نہیں سمجھتیں۔ بتاؤ کون سی ترکیب کی جائے؟'' ٹونی بہ دستور بپھرا ہوا تھا۔

وائنا بہ دستور رسک رہی تھی۔ وہ اسی طرح روتے ہوئے بولی۔ ''میں تو تمہارے اوپر جان بھی نچھاور کرنے کو تیار ہوں ٹونی میں تمہیں غیر کیسے سمجھ سکتی ہوں۔ میں نے اس وقت یہ الفاظ صرف اس لیے کہے تھے کہ تم تین چار دن سے بالکل خاموش خاموش رہنے لگے ہو۔ یقین کرو ٹونی میں نے تمہارے چہرے پر اداسی کی جھلکیاں دیکھی تھیں۔''

اور ٹونی چونک پڑا۔ چند لمحے وہ اسے گھورتا رہا۔ پھر دوسری طرف منہ کرکے بولا۔ ''ہاں وائنا، میں اداس ہوں۔ میرا بھائی مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے آج تک میں نے جو

چاہا اس سے مانگ لیا اس نے مجھے کبھی انکار نہیں کیا۔ پھر ہم دونوں کو ایک خوبصورت موتی ملا، ہم دونوں اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو گئے۔ وہ موتی میرے بھائی نے اپنے قبضے میں کر لیا لیکن میں اس سے وہ موتی نہیں مانگ سکتا کیونکہ وہ مانگنے کی چیز نہیں ہے۔ وہ تو قسمت سے تعلق رکھتا ہے۔''

''خدا کے لیے صاف صاف کہو ٹونی۔ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کس کی باتیں کر رہے ہو؟'' وائنا کسی شبہے کے تحت بولی۔

''اس رات کی بات کر رہا ہوں وائنا جب چاند کی جوانی چھلک رہی تھی اور چٹان کے اوپر محبت کھیل رہی تھی۔ دو جسم ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ کاش میں اس منظر کے لیے خود کو تیار کر سکتا۔ وہ سب اچانک میرے سامنے آیا اور میں خود کو لٹتے دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا۔ میں شرمندہ ہوں وائنا کہ تم نے میرے چہرے سے اس رات کا تکدر پڑھ لیا۔ میں.....'' ٹونی خاموش ہو گیا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ پھر وہ اس وقت چونکا جب پیچھے سے وائنا کے ہاتھ اس کی گردن میں آ گئے۔ اس کے خوبصورت جسم کا گداز ٹونی کے دل میں ہلچل پیدا کر رہا تھا۔ ''میں اپنے بوڑھے مظلوم باپ کی قسم کھاتی ہوں ٹونی کہ وہ منظر میں نے ترتیب نہیں دیا تھا۔ میں اداس تھی اور نیند نہ آنے کی وجہ سے باہر نکل آئی تھی۔ تب لسٹر نے مجھے دیکھ لیا اور پھر اس نے مجھے پاس بلایا۔ میں چلی گئی اور..... اور یقین کرو ٹونی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ میرے لیے اچانک اور غیر متوقع تھا۔ پھر آہٹ سنائی دی۔ وہ غالباً تم تھے اور مجھے وہاں سے آنے کا موقع مل گیا۔''

ٹونی اچانک پلٹ پڑا۔ اس کے چہرے پر مسرت رقص کر رہی تھی۔ ''تو..... تو، کیا..... کیا تم میری محبت قبول کرو گی وائنا۔ تم میری محبت قبول کرو گی؟'' اس نے وائنا کے شانے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

اور وائنا نے مسکراتے ہوئے اپنا سر اس کے سینے سے لگا دیا۔ ٹونی اسے گود میں اٹھا کر ناچنے لگا۔ ''تم نے مجھے زندہ کر دیا ہے وائنا میں شاید لسٹر سے ٹکرا جاتا لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ تم اسے پسند کرتی ہو تو میرا دل ٹوٹ گیا تھا۔''

''میں لسٹر کی عزت کرتی ہوں ٹونی۔ لیکن شائیلا کی طرح'' اس نے جواب دیا۔ اور ٹونی نے اس کی ٹھوڑی اونچی کر کے اس کے خوبصورت ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ وائنا کے ہاتھ اس کی گردن سے لپٹ گئے۔ اس نے ٹونی کے بوسے کا گرم جوشی سے جواب دیا تھا۔ طویل بوسے سے فارغ ہو کر ٹونی نے مست نظروں سے اسے دیکھا اور پھر دوبارہ لپٹا لیا۔ ''اب تم نہا لو وائنا پھر ہم واپس چلیں گے۔'' اس نے کہا۔

''پلیز۔ ادھر چلے جاؤ۔'' وائنا نے التجا کی اور ٹونی گردن ہلا کر ایک ٹیلے کی طرف بڑھ گیا اور پھر ٹیلے کی آڑ سے وہ وائنا کو کپڑے اتارتے دیکھتا رہا۔ وائنا کا ریشم کی طرح ملائم اور چمکدار جسم ایک لمحے کے لیے کنارے پر نظر آیا اور پھر اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ مچھلی کی طرح پانی میں تیر رہی تھی اور پھر اچانک ہی ٹونی کی نگاہ ٹیلے سے دوسری طرف اٹھ گئی۔ اسے ایک گھوڑا نظر آیا جو شاید یہیں کہیں سے نکل کر گیا تھا۔ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے لسٹر کی پشت ٹونی کے سامنے تھی لیکن ٹونی نے اسے آسانی سے پہچان لیا۔

اور اس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات ابھر آئے تو لسٹر ہمارا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ اس نے سوچا۔ ظاہر ہے اس نے سب کچھ دیکھ لیا ہو گا۔ اچھا ہے اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ اس نے سوچا اور پھر وہ پانی میں تیرتی ہوئی وائنا کو دیکھنے لگا جس کا کندنی جسم پانی کی چادر سے بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے وائنا کو جھیل سے نکل کر کنارے پر آتے اور کپڑے پہنتے دیکھا۔ پھر وائنا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اسے غسل سے فارغ ہونے کی اطلاع دے رہی تھی۔

☆☆☆

بوڑھا آسکر کھانے پینے کی چیزیں اور دوسرا سامان لے کر واپس آیا تو متفکر تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہرے غور و فکر کے آثار تھے۔ پھر اس نے شام کو سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے بتایا۔

''شیطان کی زندگی بہت طویل ہوتی ہے اور پشکر بھی شیطان کی نسل کا ایک فرد ہے۔ وہ کم بخت زندہ ہے۔''

''زندہ ہے؟'' شائیلا کی ماں کے ہاتھ سے چمچہ چھوٹ گیا۔

''ہاں۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جب میں نے اسے دیکھا تو مجھے یقین نہیں آیا۔ تب میں نے لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ البتہ وہ ایک ہاتھ سے محروم ہو گیا ہے۔ اور اب اس کا صرف ایک ہاتھ ہے بائیں طرف کا گال بھی اڑ گیا ہے۔ اور اب اس طرف سے اس کے دانت باہر سے نظر آتے ہیں۔ اس کی شکل کافی بھیانک ہو گئی ہے۔ لیکن اس کی خباثت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔''

''خوب!'' ٹونی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے حیرت ہے کہ وہ اس دھماکے سے کیسے بچ گیا

بہرحال ہمیں اور زیادہ محتاط ہونا پڑے گا۔''

''اوہ۔ لسٹر جیسا پہرے دار موجود ہے ڈیڈی تو فکر کس بات کی ہے۔ خاص طور سے چاندنی راتوں میں تو وہ بے حد چوکنا ہو جاتا ہے۔ اس مناسبت سے ہم اسے چاندنی رات کا چوکیدار کہہ سکتے ہیں۔'' ٹونی نے کہا اور لسٹر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ دوسرے لمحے اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کانٹے سے ٹونی پر وار کر دیا اور کانٹا ٹونی کا داہنا گال زخمی کرتا ہوا نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی لسٹر نے ایک پلیٹ اٹھا کر ٹونی پر دے ماری اور عورتیں چیخیں مار کر جلدی سے اٹھ گئیں۔

''لسٹر! کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے؟'' آسکر دہاڑا۔

''یہ..... یہ ہمیشہ میرا مذاق اڑاتا ہے ڈیڈی! میں اسے قتل کر دوں گا۔'' لسٹر غرایا اور بوڑھا عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے لسٹر کے الفاظ پر شدید حیرت تھی۔ یہ دونوں تو ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ پھر یہ الفاظ کہاں سے آئے۔

''یہ تو اس کی عادت ہے لسٹر اس پر تمہیں اس قدر غصہ کیوں آ گیا؟'' بوڑھے نے حیرت سے کہا۔

''اس سے کہہ دو خود کو قابو میں رکھے ورنہ..... ورنہ'' لسٹر مٹھیاں بھینچ کر بولا اور دوسری طرف مڑ گیا۔ ٹونی اپنے گال سے بہنے والے خون کو پونچھ رہا تھا۔

''کیا بات ہے ٹونی۔ لسٹر اس قدر کیوں بگڑ گیا؟'' آسکر نے ٹونی سے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔'' ٹونی نے بھی بگڑے ہوئے لہجے میں کہا اور اٹھ کر ایک طرف چلا گیا۔ آسکر کی آنکھ میں تشویش بڑھ گئی اور پھر وہ آہستہ سے بولا۔ ''ہم جس قدر خطرے میں اب ہیں۔ پہلے کبھی نہ تھے۔ ہمارے محل کے ستون ہل گئے ہیں۔ اور اب کسی بھی وقت کسی بھی وقت.....'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا!

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ دونوں بھائیوں کی کشیدگی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ ہفتوں ایک دوسرے سے بات کیے ہوئے گزر جاتے۔ ویسے اس دوران اور کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن آسکر اور اس کی بیوی حالات سے واقف ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فساد کی جڑ وائنا ہے۔ آسکر کی بیوی نے اس کے سامنے تجویز پیش کی کہ وائنا کو شہر چھوڑ آئے لیکن آسکر اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے کہا کہ وہ مظلوم ہے اس کے لیے گھر لٹا دیا اور اب اسے یوں بے سہارا کر دیا جائے۔''

سنہری باتیں

☆ اچھا انسان وہ ہے جو کسی کا دیا ہوا دکھ تو بھلا دے مگر کسی کی دی ہوئی محبت کبھی نہ بھلائے۔

☆ لوگ آپ کی پیٹھ کے پیچھے تین وجوہات کی بنا پر آپ کے خلاف باتیں کرتے ہیں ((1 جب وہ آپ کی سطح تک نہیں پہنچ پاتے ((2 جب وہ آپ جیسا نہیں کر سکتے ((3 جب وہ آپ کا طرز حیات اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر نہیں کر پاتے۔

☆ ہمیشہ اچھے اور خوش باش رہیے۔ یہ ان لوگوں سے بہترین انتقام ہے، جو آپ کو دکھی اور ناخوش دیکھنا چاہتے ہیں۔

☆ تین دوستوں علم، دولت اور عزت کی خوبصورت کہانی۔ یہ تینوں دوست تھے۔ تینوں میں پیار بھی بہت تھا۔ ایک دفعہ ایسا وقت آیا کہ تینوں کو جدا ہونا پڑا۔ تینوں نے ایک دوسرے سے سوال کیا کہ دوبارہ کہاں ملیں گے؟ علم بولا۔ ''میں مدرسے، مسجد اور اسکول میں ملوں گا۔''

دولت بولی۔ ''میں محل اور امیروں کے پاس ملوں گی۔'' مگر عزت خاموش رہی۔ دونوں نے وجہ پوچھی تو عزت نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ''میں ایک بار چلی گئی تو واپس نہیں آؤں گی۔''

☆ خوش نصیب وہ نہیں جس کا نصیب اچھا ہے بلکہ خوش نصیب وہ ہے جو اپنے نصیب پر خوش ہے۔

مرسلہ: اختر شاہ عارف، ڈھوک جمعہ جہلم

اس نے کہا ''صرف ایک مخمصے میں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ اس کی شادی کر دی جائے لیکن کس کے ساتھ۔ وائنا ٹونی کو پسند کرتی ہے اور ٹونی اسے۔ لیکن لسٹر بھی وائنا کو چاہتا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ کوئی طوفان نہ آ جائے۔ اگر میں وائنا کی شادی لسٹر سے کر دوں تو یہ وائنا کی مرضی کے خلاف ہو گا۔ اور ٹونی بھی میرے فیصلے کو قبول نہ کرے گا۔ اور اگر ٹونی کے ساتھ اس کی شادی کر دوں تو نہیں جانتا کہ انجام کیا ہو۔''

''اس کا ایک ہی حل ہے۔'' اس کی بیوی نے کہا۔ ''وائنا کو خاموشی سے شہر چھوڑ آؤ۔ تھوڑے دنوں کے بعد دونوں بھائی معمول پر آجائیں گے۔'' اور آسکر خاموش ہوگیا۔ وائنا سے ہمدردی اپنی جگہ تھی۔ اس ہمدردی میں وہ اپنی دنیا اجاڑ کر ان پہاڑوں میں تو آبسا تھا لیکن اپنے بیٹوں کی قربانی اسے قبول نہ تھی۔ وہ گہری سوچ میں غرق تھا۔

اور دوسری طرف ایک اور ڈراما ترتیب پا رہا تھا۔

اس دن مطلع صبح ہی سے ابر آلود تھا۔ نشہ انگیز ہوائیں سرسراتی پھر رہی تھیں۔ اور جوان ذہن کیف و سرور میں ڈوبے ہوئے تھے۔ غار میں استعمال کا پانی موجود تھا لیکن ٹونی نے مشک اٹھائی اور وائنا کو اشارہ کرکے چل دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ جھیل پر پہنچ گئے اور وائنا موسم کی شراب کے سرور میں مست ہوکر ٹونی سے ہم آغوش ہوگئی۔ ٹونی نے بھی اس کی محبت کا جواب پوری گرمجوشی سے دیا تھا۔ ابھی وہ کیف و سرور میں ڈوبے ایک دوسرے سے ہم آغوش تھے کہ اچانک ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ اور دونوں اچھل پڑے! ایک زخمی پرندہ ان دونوں پر آگرا۔ نشانہ باز نے اس پرندے کو نشانہ بنایا تھا۔ اور پہاڑی ٹیلے سے لسٹر نیچے اترتا دکھائی دیا۔ وہ خاموشی سے ان کے قریب آیا اور جھک کر پرندہ اٹھالیا۔ ٹونی کی آنکھوں میں غصے کے آثار تھے۔

''تمہیں شکار کھیلنے کے لیے یہی جگہ ملی تھی؟'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''تم بھی اسی جگہ شکار کھیلتے ہو!'' لسٹر نے ذومعنی انداز میں کہا۔ اشارہ وائنا کی طرف تھا۔

''تمہاری زیادتیاں حد سے بڑھتی جارہی ہیں لسٹر، تم مجھ سے صرف ڈیڑھ سال بڑے ہو لیکن میں تمہارا ادب کرتا ہوں مجھے بدتمیزی پر مجبور مت کرو۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم بدتمیزی پر مجبور ہو جاؤ تاکہ فیصلہ جلد ہو جائے۔''

''کیا چاہتے ہو؟'' ٹونی سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم اسے میرے حوالے کردو۔'' لسٹر نے صاف گوئی سے کہا۔

''وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اگر وہ تمہیں چاہتی تو مجھے اعتراض نہ ہوتا۔''

''صرف ایک رات اس نے مجھے بھی چاہا تھا۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی بلکہ زیادتی تھی۔''

''بکواس! یہ آوارہ ہے۔ یہ تمہاری بھی نہیں ہوسکتی یا پھر ایسا کرو۔ ہم اسے آپس میں بانٹ لیں۔'' لسٹر نے کہا۔ ٹونی کا طاقتور گھونسا اس کے جبڑے پر پڑا۔ لسٹر لڑکھڑا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا پستول نکل آیا۔ پستول ٹونی کے پاس بھی تھا لیکن اس نے اسے نکال کر ایک طرف پھینک دیا۔

''میں تم پر پستول نہیں نکال سکتا۔'' اس نے حقارت سے کہا اور لسٹر نے بھی پستول پھینک دیا اور پھر وہ قدم ٹونی کی طرف بڑھانے لگا اور وائنا دہشت زدہ ہوکر کانپنے لگی۔

اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ دونوں ہی گینڈے کی طرح طاقتور اور شیر کے مانند نڈر تھے۔ دونوں ایک دوسرے پر بھاری تھے اور جنگ کا فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

وہ لڑتے لڑتے لہولہان ہوگئے۔ دونوں کے لباس پھٹ گئے تھے اور جسم کے ایک ایک حصے سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ بری طرح زخمی ہوگئے اور لڑنے کے دوران وہ ان گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی نہ سن سکے جو انہیں چاروں طرف سے گھیر رہے تھے۔

خود پشکر بھی اس خونریز جنگ کو دیکھ کر حیران تھا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے بتایا تھا کہ یہ دونوں آسکر کے بیٹے ہیں۔ بہرحال وہ اس جنگ کے انجام کا منتظر تھا۔

لیکن اچانک وائنا کی نگاہ ان لوگوں پر پڑ گئی۔ اور وہ خوف سے چیخ پڑی۔ ''ٹونی لسٹر پشکر آگیا۔''

اور دونوں لڑا کے رک گئے۔ انہوں نے چاروں طرف کھڑے ہوئے دشمن کو دیکھا اور پھر لسٹر آہستہ سے بولا۔

''ٹونی!''

''ہوں؟''

''رائفلوں تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ اس لڑکی کو بچاؤ، میں اس چٹان کے پیچھے چھلانگ لگاؤں گا اور تم اس جگہ محفوظ رہو گے جہاں وائنا کھڑی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ٹونی نے بھی سرگوشی کی اور پھر دونوں نے نہایت چالاکی سے رائفلوں پر چھلانگ لگادی۔ پشکر یہی سمجھا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو مارنے کے لیے یہ کارروائی کررہے ہیں۔ اس لیے اس نے تعرض نہ کیا۔ لیکن جب انہوں نے مورچے لے کر فائرنگ شروع کی تو وہ بوکھلا گیا اور پھر اس نے بھی اندھادھند فائرنگ شروع کردی۔

ٹونی نے وائنا کو بھی چٹان کے پیچھے کھینچ لیا تھا اور پھر اس نے بھی فائرنگ شروع کردی۔ پشکر کے ساتھیوں کی تعداد کافی تھی۔ لیکن وہ کھلے علاقے میں تھے اس لیے نقصان اٹھانے لگے۔ ٹونی کی بہ نسبت لسٹر کی پوزیشن کمزور تھی۔ وہ ایسی جگہ تھی جو پیچھے سے غیر محفوظ تھی۔ پھر بھی وہ

نہایت دلیری سے چاروں طرف فائرنگ کررہا تھا اور اب تک پشکر کے کئی ساتھیوں کو لڑھکا چکا تھا۔

دفعتاً ٹونی کو اس کی چیخ سنائی دی اور اس کا دل دہل گیا۔ یہ لسٹر کی چیخ تھی اس کے بھائی کی۔ اس کا کلیجا منہ کو آنے لگا اور اس نے گولیوں کی پروا کیے بغیر گردن اٹھا کر لسٹر کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن کئی گولیاں اس کے قریب سے نکل گئیں۔

اور پھر دفعتاً پشکر کے ساتھیوں پر پیچھے سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ یہ بوڑھا آسکر، اس کی بیوی اور بیٹی تھے۔ انہوں نے اس طرح جان توڑ کر اندھادھند فائرنگ کی کہ پشکر کو اپنے بے شمار ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ جب پشکر بھاگ گیا تو ٹونی جلدی سے اپنی جگہ سے نکل کر لسٹر کے قریب پہنچ گیا۔ لسٹر کے جسم میں تین گولیاں پیوست تھیں۔ تینوں نازک مقامات پر لگی تھیں اور لسٹر دم توڑ رہا تھا۔ ٹونی کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ٹونی کا ہاتھ پکڑا اور خون آلود آواز میں بولا۔

''میں میں شرمندہ ہوں ٹونی میرے بھائی!''

اور پھر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی! ٹونی کا جسم آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا اور اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ لسٹر کی ماں دھاڑیں مارتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ آسکر بھی بیٹے کی لاش سے چمٹ کر رو رہا تھا۔ اور شائیلا بے ہوش ہوکر گر پڑی تھی۔ اور ٹونی اپنی رائفل اٹھائے آہستہ آہستہ اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سب لسٹر کی لاش سے لپٹ کر رو رہے تھے اس لیے ٹونی کو جاتے ہوئے کوئی نہ دیکھ سکا۔ البتہ جب ان کا غم آنکھوں کے راستے نکل گیا تو انہوں ٹونی کو تلاش کیا لیکن وہ جاچکا تھا۔ نہ جانے کہا؟

☆☆☆

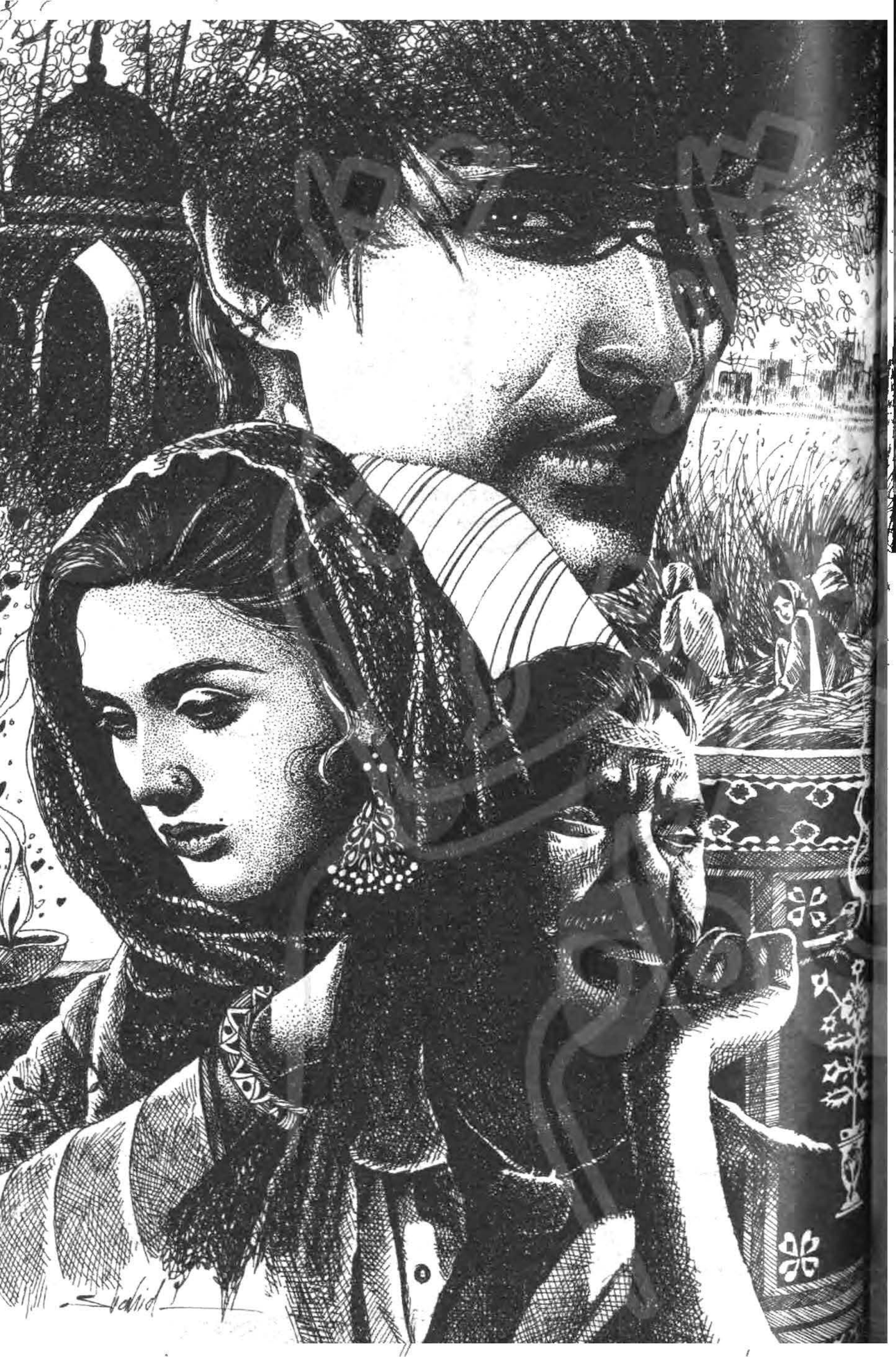
پھر ویلٹا میں ایک اور جیالے کا نام ابھرا، یہ ٹونی تھا۔ طوفان کی طرح تیز و تند۔ جس کی رائفل بادلوں کی طرح گرجتی تھی اور اس کے دشمن دہشت سے مرجاتے تھے۔ پشکر کو اس نے اس کے گاؤں میں اس کے اپنے بیس ساتھیوں کی موجودگی میں قتل کیا اور پھر ان بیس ساتھیوں میں سے صرف چند جان بچا کر بھاگ سکے۔ اور اس کے بعد پشکر کے گروہ کے دوسرے افراد چن چن کر قتل کیے جانے لگے۔ وہ پہاڑوں میں، غاروں میں پناہ لیتے پھر رہے تھے لیکن موت کا فرشتہ ان کا تعاقب کررہا تھا۔ پورے ویلٹا میں پشکر کا ایک بھی حامی زندہ نہ بچا۔ جن لوگوں نے پشکر کے ساتھ کوئی معمولی سی ہمدردی بھی کی تھی۔ وہ خوف و دہشت سے مرے جارہے تھے۔ ہر جگہ ٹونی کے نام کے چرچے تھے۔ اس کے گھوڑے کی رنگت کی باتیں کی جاتی تھیں۔ اس کے لباس اس کی رائفل کے تذکرے ہوتے تھے اور ویلٹا کے رؤسا نے اس کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے تھا۔

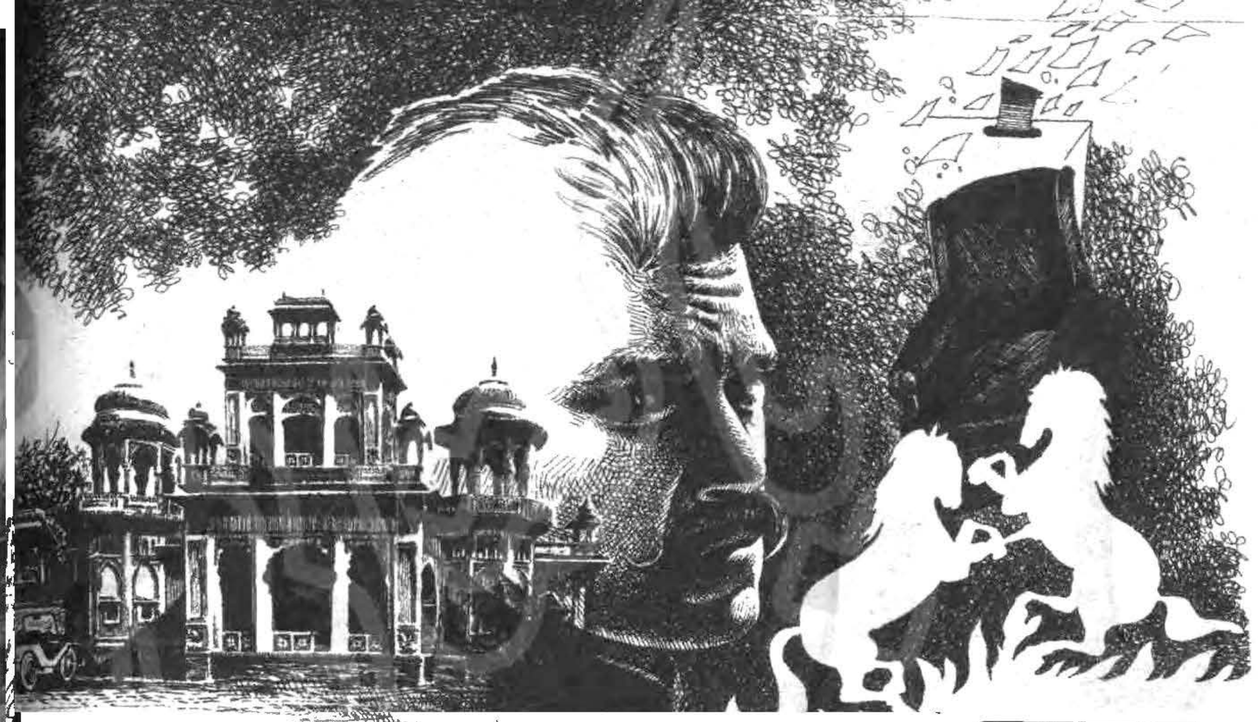
وہ بھی ایک چاندنی رات تھی۔ آسمان سے نور برس رہا تھا اور وائنا اپنے باپ کی قبر کے نزدیک مغموم بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی اس کی نظریں اس دوسری قبر کی طرف بھی اٹھ جاتیں جو یہاں سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ یہ لسٹر کی قبر تھی۔ آسکر نے اپنی دنیا پھر سے آباد کرلی تھی۔ اسے مویشی بھی مل گئے تھے اور کیاریاں خوب سبزی اگل رہی تھیں لیکن اس کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ دونوں بازو بیکار ہوگئے تھے۔ وہ اپنے مکان کے دروازے پر بیٹھا سگار پیتا اور خلا میں گھورتا رہتا۔ اور پھر جب ماحول تاریکی میں ڈوب جاتا تھا وہ ٹھنڈی سانس لے کر واپس اندر آجاتا جہاں اس کی بیٹی شائیلا اور بیوی کے اداس چہرے اس کے منتظر ہوتے۔

دفعتاً وائنا کے کانوں نے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنی اور وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ کوئی آرہا تھا۔ وہ آنے والے سے خوفزدہ ہوکر ایک جگہ چھپی۔ تب اس نے گھوڑے سے اترنے والے کو دیکھا اور اس کا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ یہ ٹونی تھا، اس کا ٹونی! وہ دل میں گدگدی لیے اسے دیکھتی رہی۔ ٹونی نے پہلے اپنا مکان۔ پھر بوڑھے سن برگ کی قبر۔ اور پھر دوسری قبر دیکھی اور آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ سر جھکائے مجرموں کی طرح قبر کے سامنے کھڑا تھا۔ اور وائنا بھی اس کے نزدیک پہنچ گئی۔

''ٹونی!'' اس نے مسرتوں سے لبریز آواز میں اسے پکارا۔ لیکن ٹونی اس کی طرف نہ مڑا۔ وہ بہ دستور گردن جھکائے کھڑا تھا۔ وائنا نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں تو ٹونی خاموشی سے مڑا اور اس نے وائنا کی بانہیں گردن سے نکال دیں۔

''میں تمہاری عزت کرتا ہوں وائنا لیکن میرے قریب مت آؤ۔ میں تم سے محبت نہیں کرسکتا۔ میں تم سے شادی نہیں کرسکتا کیونکہ کیونکہ تم میرے بھائی کا پیار ہو۔ میں اپنے بھائی کی امانت میں خیانت نہیں کرسکتا، میں مجبور ہوں۔ میں بالکل مجبور ہوں میں اسے مرنے کے بعد بھی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور اپنے مکان کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔





ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر:6

کل و کلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضائوں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہالے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر ہیں، راہ کی کٹھنائیوں سے بے خبر اپنے سفر پر رواں ہیں۔ داستان سفر شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف ضروری ہے۔ میرا نام شہریار ہے جسے لوگ پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانا عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا۔ والد صاحب کھیتوں میں مزدوری کرکے عزت کی روزی کماتے تھے کہ ایک روز جب میری عمر پانچ برس تھی ایک خونچکاں واقعے میں میرے والدین کو بے دردی سے قتل کردیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنا لیا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ حالانکہ وہ بھی کوئی آسودہ حال گھرانا نہیں تھا۔ گاؤں ہی میں پھوپی کبریٰ رہتی تھی جنہوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ طے کردیا تھا۔ چچا نے مجھے تعلیم دلائی، میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم

عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر اس کے بعد میں نور پور واپس آ گیا۔ گاؤں میں دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حسابات کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی ویگن چلاتا تھا اور سواریاں لے کر قریشی موڑ تک جاتا تھا، اسی نے مجھے ڈرائیونگ سکھائی تھی جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی کیونکہ اس سے پہلے کوئی ڈاکٹر زیادہ عرصے گاؤں میں نہیں ٹھہرتا تھا۔ میں زیادہ وقت ان کی صحبت میں گزارتا تھا۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مخلص مگر کچھ قنوطی انسان تھے لیکن نڈر اور بہادر۔ میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا اور ساتھ ہی چھوٹے بڑے کام کر دیا کرتا اس کے علاوہ مجھے ان کے ہاں سے کتابیں بھی پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ ایک درزی مراد بخش دیوانہ سے بھی دوستی تھی جو کہ شاعر بھی تھا اور اس کے دروبھرے دو ہڑے کافی اثر رکھتے تھے۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان جو کہ ایک سیاسی لیڈر تھا اور حیات خان کا سرپرست بھی تھا، کی بیٹی اسما کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہو گیا اور اپنی قلبی کیفیت کا مجھ سے اظہار کیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا اور اپنے عشق کی روداد سے مجھے آگاہ کرتا رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن وریام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ وریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کی طبیعت خراب ہوئی تو ہر کارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ مریض کو اسپتال لایا جائے جس پر وریام خان سخت چراغ پا ہوا اور اس کی حاکمانہ انا کو سخت ٹھیس پہنچی۔ چونکہ وہ ایک متنفس مزاج شخص تھا اس لیے مجھے خدشہ تھا کہ وہ کوئی انتقامی سازش ضرور کرے گا جو کہ شاہ جی کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے کھالے سے مشورہ کیا اور ہم دونوں نے شاہ جی کی رہائش گاہ کی نگرانی کی لیکن شاہ جی بھی غافل نہیں تھا انہوں نے پیش بندی کر رکھی تھی، یہ سازش ناکام ہو گئی جس میں بخت خان معاون ثابت ہوا۔ اس کے بعد میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا۔ اس تمام واقعات کے تناظر میں وریام خان نے شاہ جی سے میری حمایت پر مجھے سرزنش کی لیکن میں نے بھی انہیں صاف لفظوں میں جواب دے دیا جس پر انہوں نے میری بہت بے عزتی کی۔ میں نے سوچا کہ حیات خان سے ان کی شکایت کروں گا لیکن انہوں نے وریام خان کی سائڈ لی اور مجھے سخت سست سنائیں یہاں تک کہ مجھے تھپڑ مار دیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں شاہ جی کی صحبت چھوڑ دوں۔ گاؤں کے ماسٹر جی کی بیٹی جس کے پیر میں لنگ تھا اور وہ شاہ جی کے زیر علاج رہی تھی، ان کے عشق میں مبتلا ہو گئی اور جب ماسٹر جی اس کا رشتہ لے کر شاہ جی کے پاس آئے تو شاہ جی نے انہیں سخت سست سنا کر انکار کر دیا۔ پھر زیناں نے ایک خط جو اس نے شاہ جی کو لکھا تھا مجھے دیا۔ میں نے شاہ جی کو وہ خط دے دیا لیکن شاہ جی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ شاہ کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف کا ایک رقعہ کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہار الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھی اور میرا سارا جسم مفلوج ہو گیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو مجھ پر چڑھ دوڑا۔ میں مدافعت میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے میرے جسم کو خنجر کے ذریعے زخمی کر دیا اور آخری وار کرنا چاہتا تھا کہ اسے میری حالت کا احساس ہوا اور وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا جہاں میرا کچھ عرصے علاج ہوا۔ سارے گاؤں میں یہ خبر دوڑ گئی، سب کھالے پر لعن طعن کر رہے تھے اور وہ پشیمان تھا کہ میں نے اسے معاف کر دیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا اور یہ کام سونپا کہ ہم اس کی جاسوسی کریں۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ بخت خان نے ہی مجھے معقول معاوضے پر اپنی بیٹی ملکہ کو پڑھانے پر مامور کر لیا۔۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ ہم دونوں وہاں پہنچے تو اسما وہاں موجود تھی کھالے نے مجھے وہیں رکنے کو کہا اور خود اسما سے ملنے چلا گیا اسی دوران لمبے بالوں والا ہیرو ٹائپ نوجوان وہاں آ گیا اور ان لوگوں کے درمیان کسی بات پر بحث شروع ہو گئی جو لڑائی میں تبدیل ہو گئی یہ معاملہ اتنا بڑھا کہ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان موبی کا قتل ہو گیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن مجھے خبر نہیں تھی کہ وہ زخمی ہے یا نہیں بہرحال میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب ولہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میر وشاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوا لے گی اور ہوا بھی یہی، میڈم شکیلہ نے مجھے چھڑوا لیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر ورسوخ بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی وہ نور پور کے حالات سے بھی واقف تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کر لیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر نور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ کھالا بھی لاپتا تھا، ایسے میں دیوانے نے مجھے دلاسا دیا اور امیر نواز پر شک کا اظہار کیا کیونکہ وہ بھی غائب تھا۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں دل جیت بتا سکتا ہے اور یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس سے کس طرح اگلواتا ہوں۔ میر وشاہ نے مجھے ہتھیار فراہم کیے اور میں زمانہ طالب علمی کی ٹریننگ آزمانے کے لیے دل جیت کے ٹھکانے پر پہنچ گیا لیکن وہ بہت سخت جان ثابت ہوا۔ میں نے اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا اور قتل کا نشان مٹانے کے لیے اس کی لاش کو ڈیرے پر جلا ڈالا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ لیکن اس تمام عرصے میں، میں اپنے والدین کے قتل کو نہیں بھولا تھا۔ شاہ جی کے مطابق اس کے ڈانڈے میری ننھیال شاہ جمال میں تھے لیکن مجھے یقین نہیں تھا۔ میڈم کے اڈے پر میری ملاقات سونیا نامی لڑکی سے ہوئی جس نے مجھے میڈم کے متعلق منفی اطلاعات فراہم کیں لیکن میں یہ ماننے پر تیار نہیں تھا۔ سونیا نے بتایا کہ وہ مجھے ایک چیز دکھانا چاہتی ہے اور اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہاں ایک لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو چونک گیا، وہ اسما تھی، سردار حیدر خان کی بیٹی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا اور مختلف محاذوں پر اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگی کہ اسے اطلاع ملی کہ اڈے پر حملہ ہو گیا ہے۔ میں اس سے ملنے پہنچا تو وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ اس کے چہرے کا رخ جب واضح ہوا تو میں اسے دیکھ کر شدت سے چونک اٹھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

''میڈم! یہ تو کھالا ہے، میرا جانی یار..... ہاں، ہاں!''

مجھے خود بھی احساس ہوا کہ میری آواز جذبات سے مغلوب ہو کر کچھ زیادہ ہی بلند ہو گئی تھی۔ میڈم چونکی، مجھے حیرانی بھری نظروں سے دیکھ کر بولی۔ ''کون کھالا؟''

میں جلدی سے اسکرین کے بہت زیادہ قریب ہو گیا۔ اسکرین پر کھالے کا سائڈ پوز نظر آ رہا تھا۔ میڈم نے ماؤس کی مدد سے 'ونڈو' کا سائز بڑا کر دیا۔ اب کھالے کا چہرہ مانیٹر کی پوری اسکرین پر پھیلا ہوا تھا۔ مجھے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی، وہ میرا یار خالد لوہار عرف کھالا ہی تھا جو اِس وقت کتوں میں گھرے ہوئے بھیڑیے کی طرح گھبرائے ہوئے انداز میں اردگرد دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ننھا سا پستول بھی دبا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میں نے میڈم کو دیکھے بغیر کہا۔ ''بالکل وہی، جس کے ساتھ میں نور پور سے ملتان آیا تھا۔ وہ، جس نے موبی کو پارک کے باہر گولی ماردی تھی..... مگر یہ ان لوگوں کے ساتھ کیوں یہاں آیا؟''

میری بات ختم ہوئی۔ میڈم کی طرف سے کوئی ردِعمل نہ پا کر میں نے اُسے دیکھا۔ وہ بڑے اشتیاق سے مجھے گھور رہی تھی۔ مسکرائی اور بولی۔ ''واٹ آ نیچرل ری ایکشن..... سچ کہتے ہیں، دیہاتی لوگوں کے من میں کوئی کھوٹ نہیں ہوتی۔''

میں نے جھینپ کر نظریں چُرالیں۔ میرے من میں کھوٹ تھا، نہیں تھا، مجھے کوئی سروکار نہیں تھی۔ میرا ذہن تو برق رفتاری سے کھالے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ عافیت یہ تھی کہ وہ زندہ اور باخیریت تھا۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ خطرناک کریمنل گینگ میں شامل ہو کر میڈم پر حملہ کرنے کے جرم کا ارتکاب کر چکا تھا۔ اس کے سر پر منڈلاتے ہوئے موت کے آسیب مجھے آنِ واحد میں دکھائی دے گئے جبکہ اپنی جانب آتی ہوئی کرب ناک موت نظر نہیں آ رہی تھی۔

میڈم نے میری اُدھیڑ بن میں ہی کسی وقت کیمرا بدل دیا۔ منظر بدل گیا۔ کھالا اوجھل ہو گیا۔ اُسے ہمیشہ کے لیے اوجھل نہیں ہونا چاہیے، یہ سوچ کر میں نے مؤدبانہ لہجے میں میڈم سے کہا۔ ''میڈم! کھالے کو مت روکیں۔ اُسے زندہ واپس جانے دیں۔ رابطہ ہونے پر اُسے سمجھا دوں گا، وہ آئندہ آپ کے سامنے نہیں آئے گا۔''

وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتی رہی پھر مسکرا کر فون پر کسی کو ہدایات دینے لگی۔ ''کیا تم لوگوں نے اُسے ٹریس کر لیا ہے؟''

دوسری جانب سے رپورٹ ملی تو خوش ہو کر بولی۔ ''ویری گڈ! اسے اس طرح ٹریپ کریں کہ وہ زخمی نہ ہو۔ 'سی ون' پر پہنچا کر مجھے مطلع کرنا۔ اوکے؟''

میری سانس میں سانس آئی۔ بدقسمتی سے کھالا جان بچانے کے لیے بھاگتا ہوا اُس گلی میں آن پہنچا تھا جو اُس کے لیے چوہے دان ثابت ہونے والی تھی۔ میں نے اَبھی تک میڈم کے تربیت یافتہ لوگ نہیں دیکھے تھے مگر اُس کے اعتماد اور چٹکی بجانے کی سی دیر میں سرانجام ہونے والے کارنامے دیکھ کر بہ آسانی اس کے کارندوں کی مشاقی اور غیر معمولی مستعدی کو تسلیم کیا جا سکتا تھا۔ اب میڈم بالکل نارمل تھی۔ تفکرات کی پرچھائیاں عنقا تھیں اور اس کے خوب صورت چہرے کی فطری معصومیت لوٹ آئی تھی۔

اُس نے ٹیبل سائڈ پر لگے سوئچ بورڈ میں نصب شدہ ایک بٹن کو پش کیا۔ چند لمحوں کے بعد، جو ملازم مجھے بلا کر یہاں لایا تھا، نے دروازے میں جھانکا اور مؤدبانہ انداز میں 'جی میڈم' کہا۔

میڈم نے اُسے قریب بلایا اور کہا۔ ''اِسے ریٹائرنگ روم میں چھوڑ آؤ۔'' پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ''تم تھوڑی دیر کے لیے آرام کرو۔ کچھ لوگوں کی آمد کی بدولت میں بہت مصروف ہونے والی ہوں۔ فارغ ہو کر ریٹائرنگ روم میں آ جاؤں گی۔''

میں نے سرِتسلیم خم کیا اور ملازم کے پیچھے چلتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ گیلری کے اختتام پر واقع آخری کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرا فرنیچر سے عاری تھا اور نہایت دبیز قالین فرش پر بچھا ہوا تھا۔ آٹھ دس جوان العمر لوگ قالین پر براجمان تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ تین لڑکیاں ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ میں نے طائرانہ نظر سے سبھی افراد کو دیکھا۔ ہر کوئی اپنی موج میں تھا۔ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا، کوئی اخبار..... تو ایک ٹولی تاش کے پتوں سے دل بہلا رہی تھی۔

میں نے بہ آواز بلند 'السلام علیکم' کہا تو مجھے دیکھ کر چونک جانے والوں کے استعجاب گیں چہروں پر مسکراہٹیں تیر گئیں۔ شاید اس محفل میں سلام لینے کا رواج نہیں تھا۔

ایک سانولی سلونی سی لڑکی نے شوخی سے کہا۔ ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!''

دو تین دبی دبی ہنسیاں گونجیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے میرے بارے میں مستفسر ہوتے، ملازم مجھے لیے کمرے کے اندر کھلنے والے ایک دروازے میں داخل ہو

گیا۔ یہ آٹھ ضرب دس فٹ سائز کا بکس نما کمرا تھا جس میں آرام کرنے کے جملہ لوازمات موجود تھے۔ میں سنگل بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ملازم نے دروازے کے قریب نصب شدہ سوئچ بورڈ پر چند بٹن پش کیے۔ روشنی پھیل گئی۔ پھر اُس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''یہاں کوئی آپ کو ڈسٹرب نہیں کرے گا، آرام کریں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ بٹن دبا دیجئے گا۔''

اُس نے انگلی کے اشارے سے سوئچ بورڈ میں نصب ایک سوئچ کی نشاندہی کی اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی متصلہ بڑے کمرے سے آتی ہوئی ملی جلی آوازیں ایک دم معدوم ہو گئیں۔ یہ بکس نما کمرا مکمل طور پر ساؤنڈ پروف تھا۔

میں نے کمرے کا بغور جائزہ لیا..... چھوٹا سا کمرا اپنے اندر تمام تر جاذبیت رکھتا تھا۔ ٹی وی، پورٹیبل فریج، آرام دہ کرسی، چھوٹی سی نفیس میز اور اٹیچڈ باتھ..... سمجھ میں آنے والی بیسیوں چیزوں کے درمیان ایک نہ سمجھ میں آنے والی چیز بھی دکھائی دی۔ کمرے کی عقبی دیوار پر بڑا سا سوئچ پینل نصب تھا۔ اِس قدِ آدم جسیم پینل پر اَن گنت سوئچ، لیور اور ایک چودہ انچ کی روشن اسکرین موجود تھی۔ اسکرین پر ایک گیلری کا خاموش اور ٹھہرا ہوا منظر روشن تھا۔

میں تھکا ہوا نہیں تھا مگر فراغت کے سبب موٹے فوم والے بیڈ پر دراز ہو گیا۔ میری آنکھیں بند تھی وی کی سیاہ اسکرین کے عین وسط میں نظر آنے والے روشن بلب کے چمکدار عکس پر مرتکز ہو گئی اور سوچوں کی وسیع بساط بچھ گئی۔

میڈم، عورت کا نہیں، کسی نہ سمجھ میں آنے والے گورکھ دھندے کا نام تھا۔ کسی لمبی اور محتاط منصوبہ بندی کے بغیر میں سائیں دل جیت شاہ کو اُس کے انجام تک پہنچا کر نور پور سے نکلا تو اپنی جنم بھومی سے کٹ کر رہ گیا۔ خبر نہیں تھی کہ میرے بعد وہاں کیا حالات جنم پذیر ہوئے تھے۔ قتل جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب کرنے کے بعد بھی پروین تا حال میری دسترس سے دور تھی۔ ابھی یہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ وہ سردار حیدر خان کے پاس تھی، یا دل جیت نے مجھے چکمہ دیا تھا۔ ابھی یہ یقین نہیں تھا کہ میڈم سردار حیدر خان کے چنگل سے میری پروین کو نکال لینے میں کامیاب ہو پائے گی یا نہیں.....

کھالے کے بارے دل فکر مند رہتا تھا، اب کچھ دلاسا ملا تھا۔ شکر تھا کہ وہ بخیریت نظر آ گیا۔ میڈم نے بظاہر میری درخواست مان لی تھی، خدا جانے اُس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والی تھی۔ ایک اور سوال میرے ذہن میں سانپ کی طرح پھن پھیلائے بیٹھا تھا کہ امیر نواز کہاں گیا تھا؟ اگر پروین کے ساتھ آنے والے حالات و واقعات کے پیچھے اُس کی ذات کارفرما نہیں تھی تو پھر اس کی نور پور سے عین موقع پر عدم موجودگی کو کیا نام دیا جا سکتا تھا؟ میرے بعد ڈاکٹر شاہ جی اور بخت خان کن حالات سے گزر رہے تھے؟ بہ یک وقت پانچ افراد، سائیں دل جیت شاہ، امیر نواز، کھالا، میں اور میری بہن پروین، کے نور پور کے منظر نامے سے اوجھل ہونے پر لوگوں کا ردِ عمل کیا تھا؟

میڈم کے بقول، کوٹھی پر حملہ آور ہونے والا جتھہ کسی استاد ببلو نامی بدمعاش کا بھیجا ہوا تھا، تو سوچنے کی بات یہ تھی کہ کھالے کی رسائی استاد ببلو تک کیسے ہوئی؟ موبی کو قتل کرنے کے بعد کون سے واقعات رونما ہوئے تھے جو اُسے ہانک کر جرائم کی دُنیا میں لے گئے تھے؟ کیا وہ میری طرح جان بچانے کے تردّد میں تھا؟ یا کوئی اور بات تھی..... مجھے ایک لمحے کو شک گزرا، کہیں وہ پہلے سے ہی اِس گینگ میں شامل تو نہیں تھا کیونکہ اُس کی دیدہ دلیریاں اور پھرتیاں معمولی نوعیت کی نہیں ہوا کرتی تھیں۔

کچھ دیر پہلے میڈم نے عجیب انداز کی دفاعی حکمت عملی اختیار کی تھی۔ گنیں کاندھوں پر اُٹھا کر آنے والوں کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ ڈنکے کی چوٹ پر آنے والے قانون کے ہاتھوں میں دو لاشیں، میڈم کے حوالے ایک چیتا جاگتا ہرکارہ گروی رکھنے کے بعد شرمناک انداز میں پسپائی اختیار کرنے کے بعد دُم دبا کر بھاگ چکے تھے۔ میڈم نے 'ہینگ لگے نہ پھٹکری، رنگ بھی چوکھا آئے' کا کامیاب طریقہ اپنایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ پولیس کبھی بھی مخالف گروپ پر فائر نہیں داغے گی جب تک پولیس کا کوئی آفیسر زخمی یا ہلاک نہیں ہو گا۔ تبھی اُس نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے پولیس پر فائر داغ دیا تھا جس کے بعد پولیس کے مفادات پس پشت چلے گئے تھے اور کاغذی جنگ کی دستاویز پر جذباتی رنگ غالب آیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کھالے کی نسبت کسی بڑے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ میڈم چہرے مہرے سے بڑی نرم، عام مزاج کی خوب صورت اور معصوم سیرت لڑکی دکھائی دیتی تھی مگر حقیقت میں وہ ایسی نہیں تھی۔ اتنا نرم خو انسان کس طرح اتنی بڑی اور خون خوار فورس کو قابو میں رکھ سکتا ہے؟

میں اپنے تئیں عام شکل و صورت والا شخص تھا۔ میرے پاس کوئی اضافی خوبی نہیں تھی۔ نہ جانے کیا وصف تھا، جس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں تھا، مگر وہ میڈم کے نزدیک بہت اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ جتنی اہمیت وہ مجھے دینے لگی تھی، وہ میرے نزدیک ناقابلِ یقین نہیں تھی۔ میر و شاہ کے بقول وہ

مجھ پر ریشہ خطمی ہو گئی تھی۔ دل نہیں مانتا تھا کیونکہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے میں نے خود سے کہیں زیادہ خوبرو اور اسمارٹ مردوں کو قالین پر بیٹھے دیکھا تھا۔ ویسے بھی، جتنی دولت اُس کے پاس موجود تھی، جتنے اختیارات اس کی شخصیت کا خاصہ بن چکے تھے، وہ دنیا کے خوب سے خوب رو جوان کو زیرِ دام لا سکتی تھی۔ کہیں وہ مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہی تھی؟ کہیں وہ مجھ سے کوئی ایسا خطرناک کام لینے والی تو نہیں تھی جس میں کسی اور کو جھونکنا نہ چاہتی ہو؟.....

انسانی ذہن بھی عجیب امتزاجی رویوں کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ میرے چاروں طرف تفکرات، اندیشے اور دہشت کے پھن پھیلائے ناگ پھنکار رہے تھے۔ میرا مستقبل داؤ پر لگا ہوا تھا۔ زندگی کا واحد خونی رشتہ جان کنی کے عالم میں کہیں تڑپ رہا تھا اور میں اُس تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایسے میں مجھے کھالے، امیر نواز اور مراد بخش دیوانے کی یادیں ستانے لگی تھیں۔ ہم نے زندگی کے بھرپور لمحات باہم گزارے تھے۔ میرے نیم سوختہ لبوں پر ایک عجیب طمانیت آمیز مسکراہٹ تیر گئی۔ زندگی کی ایک یاد نے اچانک مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

یہ کوئی دو سال پہلے کی بات تھی کہ ایک شام مراد بخش دیوانہ تیز تیز چلتا ہوا ہمارے پاس آیا تھا۔ ہم پانچ چھڑ کے اس وقت نور پور کی اکلوتی کرکٹ کی پچ پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ دیوانے کی غیر متوقع آمد پر چونک کر متوجہ ہوئے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا اشتہار اور سفید رنگ کا لفافہ پکڑا ہوا تھا۔

کھالے نے دبے دبے لفظوں میں کہا۔ ''آج خیر نہیں لگتی، لگتا ہے کسی نے دنگل پر مدعو کیا ہے دیوانے کو!''

چونکہ دیوانہ لاغر پن کی حد تک دُبلا پتلا اور کمزور تھا، اِس لیے سبھی لڑکے کھالے کی بات سن کر ایک دم ہنس پڑے۔

دیوانے نے تاڑ لیا، دور سے ہی ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''میں کھیلنے کے لیے گراؤنڈ میں نہیں آیا بلکہ ایک خاص کام سے آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں۔''

ہم خاموش ہو گئے۔ اُس نے ہمارے دائرہ نما حلقے میں اپنی جگہ بنائی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ہم سب استفہامیہ نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگے۔ اُس نے گردن اکڑا کر سبھی کو باری باری ایک نظر دیکھا، اشتہار کو پھیلا کر پچ پر بچھایا اور بولا۔ ''محمود کوٹ میں کل شام کو بہت بڑا مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ ملتان، میانوالی، بھکر، جھنگ..... پتا نہیں کہاں کہاں سے شاعر منگوائے جا رہے ہیں۔ یہ اشتہار دیکھو۔ چار پائی کے جتنا تو ہے۔''

ہم نے اشتہار پر ایک نظر ڈالی۔ کھالا اُکتا کر بولا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے مگر ہم کیا کریں؟''

''آپ لوگ میرے ساتھ وہاں چلیں۔'' مراد بخش دیوانہ کی گردن پھر اکڑ گئی۔

ایک لڑکا بولا۔ ''ہم وہاں جھک ماریں گے، کیا کریں گے؟ بول ناں!''

دوسرا منہ بنا کر بولا۔ ''پچھلے سال تمہارے ساتھ گیا تھا۔ ساری رات پاگلوں کی طرح بیٹھا رہا۔ نہ چائے، نہ پانی..... اور تو اور..... کہیں سے ایک ڈبیا کے ٹوفلٹر سگریٹ کی نہیں ملی تھی۔ ہمیں معاف ہی رکھو شاعر صاحب!''

''دھت تیرے کی!'' دیوانے نے آنکھیں دکھائیں۔ ''سب کھلایا پلایا حرام کر دیا تو نے کم بخت انسان!''

'کم بخت' قرار پانے والا لڑکا بپھر گیا۔ ضد کرنے لگا کہ محفل میں کھل کر بتایا جائے کہ اُسے کیا کچھ 'کھلایا پلایا' گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اُس کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور دیوانے کی جان چھوٹی۔

میں نے دیوانے سے پوچھا۔ ''وہاں کیا خاص بات ہو گی؟''

مراد بخش دیوانہ نے بڑی لے دے کے بعد قدرے شرماتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔ ''دراصل وہاں بڑے اعلیٰ پائے کے استاد شاعر اپنا اپنا کلام پڑھیں گے۔ مجھے بھی دعوتِ کلام دی گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب لوگ میرے ساتھ جائیں اور جب میں اپنے دو ہڑے سناؤں، آپ لوگ خوب کھل کر داد دیں۔ آپ لوگوں کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی تالیاں بجانے لگیں گے۔'' ساتھ ہی اس نے مؤقف کے پھیکے پن پر روایت کا شہد انڈیلا۔ ''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سبھی شاعر ایسا ہی کرتے ہیں۔ خاص کر، استاد شاعروں کے ساتھ تو شاگردوں کی فوج ظفر موج ہوتی ہے جو اچھل اچھل کر داد و تحسین کے جھوٹے ڈھول پیٹ دیتی ہے۔''

ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سمجھ میں آنے لگا کہ اپنے نور پور کے شاعر کی عزت کا سوال ہے۔ کافی بحث کے بعد دیوانے کے حق میں فیصلہ سنا دیا گیا اور گفت و شنید کے بعد یہ بھی طے پا گیا کہ دیوانہ بہ طور رشوت، محمود کوٹ پہنچتے ہی ہمیں مٹھائی اور دودھ پتی پلائے گا۔ جو لڑکے سگریٹ نوش تھے، اُنہیں سگریٹ خرید کر دے گا۔ دیوانے نے ہماری تمام جائز و ناجائز شرائط پر سرِ تسلیم خم کیا۔

کھالے نے اپنی شرط پیش کی۔ ''لیکن پیارے

دیوانے مستانے! یہ دھیان رکھنا کہ اسٹیج پر چڑھ کر گردن نہ اکڑانا ورنہ ہم دید لحاظ رکھے بغیر جوتے کھینچ ماریں گے۔''
محفل گل و گلزار بن گئی۔

دیوانہ جھینپ کر بولا۔ ''یار! میں کوئی جان بوجھ کے تھوڑا اکڑاتا ہوں۔ خدا نے کوئی ایسا سریافٹ کر رکھا ہے کہ جونہی کوئی مزے کی بات ہوتی ہے، گردن خود بہ خود اکڑ جاتی ہے۔''

''اصل بات یہ ہے ہمارے شاعر کی ہڈیوں پر ماس کی مقدار بہت تھوڑی ہے۔ ہڈیاں قابو میں نہیں رہتیں اور موقع بے موقع اینٹھ جاتی ہیں۔'' کسی نے توجیہہ پیش کی۔

اُس شام دیوانے سے ہم نے بہت سے قیمتی دوہڑے اور غمگین اشعار سنے۔ سینکڑوں مرتبہ کے سنائے ہوئے 'تازہ دوہڑوں' کو بھی سنا اور دیوانے کا دل رکھنے کو داد سے نوازا۔

دیوانے کے کرایے خرچے پر ہم سب مقررہ شام کو سات بجے محمود کوٹ میں قدم رنجہ ہوئے۔ میرے اور کھالے کے علاوہ کسی کو بھی اس مشاعرے سے غرض نہیں تھی۔ ہم صرف نور پور کے اکلوتے شاعر کی شان و شوکت بڑھانے اور کھانے پینے کی غرض سے یہاں آئے تھے۔

اُس نے ہماری شرائط پوری کیں اور ہوٹل پر بٹھا کر خوب عیاشی کرائی۔ سگریٹ کے کئی پیکٹ خرید کر بلا امتیاز بانٹے اور زریں ہدایات سے نوازا۔ ''تم لوگوں نے پنڈال میں الگ الگ جگہوں پر بیٹھنا ہے۔ میرا دوہڑا ختم ہوتے ہی کھڑے ہو کر، ہاتھ لہرا لہرا کر 'مقرر، مقرر' کے نعرے لگانے ہیں اور خبردار! کوئی آدمی ہنسے گا نہیں ورنہ میرا موشن ٹوٹ جائے گا۔''

مشاعرہ کے لیے سجائی سنواری گئی جگہ پر جاتے ہوئے بھی وہ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتا رہا اور ہم ہر ہدایت پر سر خم کرتے رہے۔ وہاں پہنچنے پر انسانوں کا ہجوم دیکھنے کو ملا۔ بہت اچھے انتظامات کیے گئے تھے۔ ہمیں بہ مشکل بیٹھنے کی جگہ میسر آئی۔ عیدملن مشاعرے کے منتظمین نے جنوبی پنجاب بھر کے شعرا کو اکٹھا کر رکھا تھا۔ باقاعدہ آغاز ہونے پر شعراء اسٹیج پر باری باری آنے لگے اور اپنا کلام پیش کرنے لگے۔ چونکہ حاضرین کی غالب اکثریت سرائیکی تھی، اس لیے سرائیکی کلام پیش کرنے والوں کو داد مل رہی تھی۔ دیوانے نے بھی عوامی رجحان کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ صادر کیا۔ ''میں بھی بس سرائیکی شاعری ہی پیش کروں گا۔ اُردو کا ماحول نہیں بن رہا۔''

ہم نے تائید کی۔ رات کا ایک بج گیا، پھر دو..... پھر چار بج گئے مگر اسٹیج سیکریٹری نے مراد بخش دیوانے کا نام نہیں پکارا۔ ہم بری طرح تھک چکے تھے اور جمائیاں لے رہے تھے۔ وہ ہمیں مطمئن اور چاک چوبند رکھنے کے لیے بار بار یہ نقطہ سمجھا رہا تھا کہ بڑے شعرا کو سب سے آخر میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہ اعلیٰ درجے کے مشاعروں کا بنیادی اصول ہے، وغیرہ وغیرہ۔ سب سے آخری شاعر بھی اپنا کلام سنا کر اسٹیج سے اُتر گیا اور مقامی ایم پی اے، جو مشاعرے کی صدارت کر رہا تھا، الوداعی خطاب کرنے لگا۔ پھر وہ بھی ڈائس سے اُتر گیا اور سامعین پنڈال چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

ہم سبھی بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔ دیوانے کا بُرا حال تھا۔ ہمیں یا اپنے دل کو سمجھانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ اسٹیج سیکریٹری میرا نام لسٹ میں لکھنا ہی بھول گیا تھا۔''

اس تاویل کو کارگر خیال نہ کرتے ہوئے اس نے پانسہ پلٹا، بولا۔ ''قریشی چوک والا مجید احقر تو ایک نمبر کا دشمن ہے میرا۔ وہ مجھ سے پہلے یہاں پہنچا ہوا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اُسی نے حرامزدگی کر کے میرا نام کٹوا دیا ہے۔''

کھالا اور فریدن بڑے مشتعل تھے۔ پنڈال خالی ہو گیا تو دونوں نے دیوانے کو بازوؤں سے پکڑ لیا اور گھسیٹ کر باہر لے آئے۔ راستہ چکنی مٹی کی دھول سے بری طرح اَٹا ہوا تھا۔ ہم سب نے دیوانے کو اُس دھول میں دور تک گھسیٹا، ہنسی مذاق میں اُس کی خاصی درگت بنائی اور ''الو کا پٹھا'' بنا کر نور پور لائے۔ اُس دن کے بعد وہ کسی بھی مشاعرے میں ہمیں یا نور پور کے کسی بھی آدمی کو اپنے ساتھ لے کر نہیں گیا۔ گاؤں میں ہمارے تبصروں اور چغلیوں نے اُس کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا کر رکھ دی تھی۔

اُس نے کھالے کو یہ رعایت دے رکھی تھی کہ وہ جب چاہتا، گھروندے پر آ کر دوہڑے ماہیے سن سکتا تھا۔ کھالے کی پسند کا دوہڑا کاغذ پر لکھ کر پیش بھی کر دیتا تھا۔ اِس کے بدلے میں کھالا بغیر کرایہ لیے اسے قریشی موڑ تک لے جاتا تھا اور مفت واپس بھی لے آتا تھا۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ مراد بخش دیوانہ کالر، بکرم اور بٹن وغیرہ خریدنے کے لیے قریشی موڑ جایا کرتا تھا۔

دیوانے نے سود و زیاں کا حساب کیے بغیر مشاعرے سے لوٹتے ہی کھالے کو اپنی دکان پر بلا کر کہہ دیا۔ ''دیکھ بھئی کھالے اُستاد! آج سے تیری میری یاری ختم۔ آئندہ تم میرے پاس دوہڑے ماہیے سننے کے لیے نہیں آؤ گے۔''

کھالے نے جل بھن کر کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم بھی کرایہ جیب میں ڈال کر ویگن پر چڑھو گے۔ اور ہاں! آئندہ میرے ہاتھ یہ پٹی کالر وغیرہ منگوانے کی کوشش بھی نہ کرنا۔''

دیوانے کی گردن اکڑ گئی اور کان سرخ ہو گئے۔

کھالا اُس کی دکان سے نکلا تو بھڑکا ہوا تھا۔ اُس کی شیطانی کھوپڑی نے فوراً ہی پلان بنا لیا۔ دو چار دِنوں کے بعد، ایک شام علم دِین پٹواری سردار حیات خان کے دارے پر فریادکناں تھا۔ اُس نے تین عدد کاغذ خان کی جھولی میں پٹخ دیے۔ ''یہ دیکھیں خان جی! وہ منحوس شاعر، وہ کانگڑی عاشق، میرے گھر میں رقعے پھینکتا ہے۔ دیکھیں! آپ نے ڈھیل دے رکھی ہے اُسے ورنہ اُس کمینے کی اتنی جرأت کہاں کہ وہ میری بیٹی کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے۔''

خان بھونچکا رہ گیا۔ فوری طور پر تحقیقات کا حکم صادر کر دیا۔ پھر مجھے بلایا گیا اور کاغذ دکھا کر پوچھا گیا کہ یہ کس کی تحریر ہے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ دیوانہ کھالے کو اپنے دوہڑے لکھ کر دیا کرتا تھا اور دونوں کے تعلقات اِن دنوں کشیدہ ہیں، وگرنہ میں کچھ نہ کچھ 'ڈنڈی' ضرور مار لیتا۔

لکیر دار کاپی کے تینوں اوراق پر ہجر و ناامیدی کے جذبات سے پُر سرائیکی دوہڑے لکھے ہوئے تھے۔ آخری مصرعوں میں دیوانہ کے لفظ کے اوپر 'تخلص والی لڑھکی' بالخصوص موجود تھی۔ میں نے فیصلہ سنایا کہ یہ مراد بخش دیوانے درزی کے ہاتھ کی ہی لکھائی ہے۔

نور پور میں ہاہا کار مچ گئی۔ دیوانے کو مجرموں کی طرح پنچایت میں پیش کیا گیا اور اُس پر فردِ جرم عائد کر دی گئی۔ اُس نے لاکھ منت سماجت کی، قسمیں کھائیں اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے صفائیاں پیش کیں مگر اُس کی ایک نہیں سنی گئی۔ جب خاصی درگت بن چکی، تب اُس کے چودہ طبق روشن ہوئے اور وہ پھوٹ پڑا۔ ''یہ دوہڑے تو میں نے کھالے اُستاد کو لکھ کر دیے تھے۔ مجھے نہیں پتا کہ چاچے علم دین کے گھر کیسے پہنچے؟''

کھالے کو بھی طلب کر لیا گیا۔ مجھے اُس کی شکل دیکھتے ہی پتا چل گیا کہ یہ حرامزدگی اُسی نے کی تھی۔ کھالے نے دیوانے کو جھوٹا قرار دیتے ہوئے اپنی جان تو چھڑا ہی لی مگر میری طرح حیات خان نے بھی تاڑ لیا تھا۔ اُس نے سخت سست کہہ کر دیوانے کو بھگا دیا۔ کوئی ایک مہینے بعد امیر نواز کی مخلصانہ کوششوں کے نتیجے میں دونوں کی 'صلح' ہوئی اور تعلقات معمول پر آئے۔

میں ریٹائرنگ روم کے بیڈ پر، دونوں ہاتھ گردن تلے رکھے، ٹی وی اسکرین میں بلب کے روشن عکس کو گھور رہا تھا اور کھالے اور امیر نواز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس کے کردار کا تعین کرنا بہت مشکل تھا۔ کیا وہ سردار حیدر خان کا مہرہ تھا؟ کیا پروین کے ساتھ پیش آنے والے اِس غیرت پاش واقعے کی تمام تر ڈوریں اُس کے ہاتھ میں تھیں؟ یہ بعید نہیں تھا کہ اُس کی خواہش پر سردار حیدر خان اور سائیں دل جیت شاہ نے میرے گھر میں نقب لگائی ہو۔ امیر نواز اور ہمارے گھرانے میں بہت بڑی معاشی خلیج حائل تھی۔ اس نے اپنے گھر میں پروین سے شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہو اور اُس کا باپ حیات خان اُس کی فرمائش پوری کرنے پر تیار نہ ہو، یہ بھی ممکن تھا کہ پروین نے کسی موقع پر اُس کی حوصلہ شکنی کی ہو..... میرا سر پھٹنے کو آ گیا۔ ریشم الجھ کر کانٹوں کی شکل اختیار کر گیا تھا اور میری انگلیوں کو زخمانے لگا تھا۔

عجیب طرح کی تھکن رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اضطرابی کیفیت کو مندمل کرنے کے لیے ریٹائرنگ روم سے نکلا۔ بڑا کمرا خالی تھا۔ سبھی رخصت ہو چکے تھے۔ شاید کوٹھی کے حالات ٹھیک ہو گئے تھے۔ میڈم کے کمرے میں جھانکا۔ وہ بھی غائب تھی۔ سونیا کا کمرا آباد تھا۔ وہ سوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے براجمان تھی۔ گود میں بڑے سائز کا فیشن میگزین کھلا ہوا تھا اور وہ پورے انہماک سے مطالعے میں غرقاں تھی۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر مسکرائی اور میگزین سوفے پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے کمرے کے اکلوتے بیڈ پر ہنوز دنیا و مافیہا سے غافل لیٹی اسما کو دیکھا اور قدم بڑھا کر سونیا کے قریب آ گیا۔ ''سونیا! یہ جب سے یہاں آئی ہے، بے ہوش پڑی ہے۔ کوئی انجیکشن دے رکھا ہے اِسے کیا؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا۔ ''کس نے؟''

وہ بولی۔ ''میں نے، میں یہاں آنے سے پہلے اسپتال میں نرسنگ کیا کرتی تھی۔''

''اِسے کچھ کھلایا پلایا بھی ہے؟''

''ہاں..... جب ہوش میں آتی ہے تو گلوکوز پلاتی ہوں۔ اِس کے الٹے سیدھے سوالوں کے جواب دیتی ہوں اور پھر ٹیکا لگا دیتی ہوں۔'' وہ میرے قریب سوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں اِس کی فکر کیوں ہے؟''

میں نے فوراً کہا۔ ''مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ اُسے جب بھی دیکھا، زندگی اور موت کے درمیان معلق دیکھا۔ تبھی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھ لیا۔''

وہ کھسک کر میرے قریب آ گئی۔ اُس کے وجود اور لباس سے پھوٹتی ہوئی مسحور کن خوشبو میرے قلب و دماغ کے گرد اپنا حصار کھینچنے لگی۔ وہ آنکھوں میں عجیب سا تاثر مترشح

کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ سردار حیدر خان کی بیٹی ہے۔ گزشتہ دو برسوں سے میڈم اِس پر ہاتھ ڈالنا چاہ رہی تھی مگر حیدر خان کے گرگے استاد ببلو کی وجہ سے ہاتھ نہ ڈال سکی۔ اَب نہ جانے کون سی طاقت میڈم کو مل گئی کہ اُس نے بغیر کسی پیش بندی کے اِسے اغوا کروالیا۔''

میں نے کندھے اُچکائے، اُس کی کریدتی نظروں کی لپک سے پہلو تہی برت لی اور کہا۔ ''مگر میرا اِس قصے سے کیا تعلق؟''

وہ مسکرائی۔ ''میں یہ تو نہیں جانتی، مگر یہ ضرور جانتی ہوں کہ اِسے میڈم نے تمہاری وجہ سے کڈنیپ کروایا ہے۔''

''میری وجہ سے؟'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ ''مگر میں تو اِسے جانتا تک نہیں ہوں۔ تم نے بتایا کہ یہ کسی سردار حیدر خان کی بیٹی ہے، یہ نام بھی میرے لیے نیا ہے۔''

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ معانی خیز انداز میں مسکرانے پر اکتفا کیا۔ میں سمجھ گیا کہ اُس نے میرے پُرتیقن اندازِ اظہار کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تم یہاں کیا کام کرتی ہو؟''

''میں نے بتایا تو تھا۔''

''کیا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''میں میڈم کے اشاروں پر ناچتی ہوں۔''

''ناچنے سے کیا حاصل ہوتا ہے؟''

''مجھے ڈھیر سارا روپیہ ملتا ہے جس سے میرے گھر والے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ سوسائٹی میں ناک اونچی رکھ کے معزز زندگی گزارتے ہیں۔'' وہ عام سے لہجے میں بولی۔ ''بظاہر میں اُن کے لیے مر چکی ہوں، اُن سے میل و ربط استوار نہیں کر سکتی مگر میرے گناہوں سے لتھڑے ہوئے نوٹ اُنہیں بہت مرغوب ہیں۔''

''میڈم کو کیا ملتا ہے؟'' میں نے دلچسپی لی۔

''سرکاری افسر اور عوامی لیڈر اُس کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ اُسے تحفظ دیتے ہیں۔ جو کہتی ہے، بغیر کچھ سوچے سمجھے اُس پر عمل کرتے ہیں۔'' اُس کے لہجے میں ہلکی سی کڑواہٹ گھل گئی۔ ''یہاں جنسی بھیڑیوں کا شکم بھرنے کے لیے میڈم نے کئی دسترخوان سجا رکھے ہیں۔ یہاں ہر ذائقہ موجود ہے۔ میٹھا بھی ہے، ترش اور نمکین بھی..... باقی دی وے! تمہیں کون سی ڈش پسند ہے؟''

میں بڑی توجہ سے اُس کی باتیں سن رہا تھا، اُس کے چہرے کی تلخ جلد پر نظریں گاڑے گلاب گوں لبوں کی خوب صورت اور تعاش ملاحظہ کر رہا تھا، بے ساختگی میں کہتے کہتے سوال پر چونک گیا۔ بولا۔ ''جو مل جائے، کھا لیتا ہوں۔''

وہ ہنسی اور گھور کر بولی۔ ''اتنے ندیدے ہو؟''

تب تک مجھے اُس کے سوال کی سمجھ آ چکی تھی۔ جلدی سے شرمسار ہو کر میں نے اپنی تصحیح کی۔ ''نہیں، نہیں! جس بھوک کی تم بات کر رہی ہو، وہ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی۔''

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسنے لگی۔ پھر میری ران پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''سچ کہہ رہے ہو؟''

اُس کا کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو۔ ''نہیں! تم سراسر جھوٹ بول رہے ہو۔''

جذبات اور پانی اپنا راستہ خود بنا لیتے ہیں۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر اپنا راستہ بنا رہی تھی۔ میں نے غزالہ سے محبت کی تھی مگر اُس محبت نے بدن کی طرف پیش قدمی کرنے کا اشارہ نہیں کیا تھا۔ بلو نے مجھے ایک نئی سلطنت کی فتح یابی پر اُکسایا تھا۔ مگر ان تحریکوں میں اتنی جان نہیں تھی یا میرے اندر تلاش اور انتقام کی آگ اتنی زیادہ تھی کہ وہ ہر جذبے کو نمو کے ابتدائی لمحات میں ہی نگل لیتی تھی کہ میں بدن شناس نہیں ہوا تھا۔ اُس کا ہاتھ بڑی آہستگی سے میری ران پر پھسل رہا تھا اور آنکھیں میرے چہرے پر لکھی کوئی نادیدہ عبارت پڑھنے اور مفہوم اخذ کرنے میں مشغول تھیں۔ میں نے کہا۔ ''کیا تمہیں اپنے کام سے گھن نہیں آتی؟''

وہ چونکی، بولی۔ ''گھن آئے بھی تو نوٹوں کی مہک میں کہیں دب کر سو جاتی ہے۔ جانتی ہوں کہ میڈم کی کوٹھی سے نکلوں گی تو کہیں شب بھر کی پناہ میسر نہیں آئے گی۔ اس دنیا میں لاکھوں یار ملتے ہیں، ایک یار نہیں ملتا۔ اُس کی تلاش بے سود ہے، اِس لیے ہر شب ایک نئے دوست کا انتظار کرتی ہوں۔''

میں نے کھسک کر فاصلہ کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔ میں پہلے ہی سوفے کے بازو کے ساتھ چپٹا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ''کیا تم نے کسی سے محبت کی، زندگی میں؟''

ایک طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر طلوع ہوئی، بجھ بھی گئی، بولی۔ ''ہاں! میں نے نشتر اسپتال میں نرسنگ کا کورس کیا۔ ڈیوٹی کے پہلے دن ہی مجھے ایک ہاؤس جاب کرنے والا ڈاکٹر نظر آیا، بڑا وجیہہ، اتنا کہ میں نے اپنا دل اُس کے قدموں پر دھر دیا۔ اُس نے میری وارفتگی کو زبان دی اور مجھے محبت کے سنگھاسن پر براجمان کر دیا۔ میں نشے میں تھی۔ جب خمار اُترا تو دیکھا کہ بھونرا رس چوس کر نئی چنبیلی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔''

ایسے ہی وقت میں ہم دونوں، بہ یک وقت، چونک گئے۔ کمرے میں ایک مخصوص آواز اُبھری تھی۔ اکلوتے بیڈ

کی طرف دیکھا، بجلی کی سی تیزی سے اُٹھی اور بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ہوئی اسما کی طرف بڑھی۔ میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

سونیا بولی۔ ''تم کب بیدار ہوئیں؟''

اسما کی خمار آلود آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''پتا نہیں..... تم لوگ مجھے کیوں اُٹھا کر لائے ہو؟''

سونیا نے نرم لہجے میں کہا۔ ''کہا تو ہے، میں نہیں جانتی۔''

مجھے فوری طور پر کمرے سے نکل جانا چاہیے تھا مگر اُس گھڑی دھیان نہیں رہا اور میں کامل انہماک سے اُسے دیکھنے لگا تھا۔ اُس کا چہرہ اور آنکھیں سوجن زدہ تھیں۔ بال بکھر کر چہرے پر پھیلے ہوئے تھے اور دائیں رخسار پر گہرے سرخ رنگ کی ڈیڑھ انچ چوڑی پٹی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ غالباً کافی دیر تک کلائی پر گال ٹکائے پڑی رہی تھی۔ ایک ہی وقت میں وہ رنجیدہ، خوابیدہ اور گم گم دکھائی دے رہی تھی۔

اچانک اُس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ چند لمحوں تک خالی خالی نظروں سے گھورتی رہی پھر ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات سمٹ آئے۔ دو تین مرتبہ آنکھیں جھپکانے کے بعد بے اختیار بولی۔ ''شہریار تم؟ تم نے مجھے اغوا کرایا ہے؟''

کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، کے مصداق میں جہاں کا تہاں رہ گیا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی تو خیر تھی۔ ہوش میں آنے پر خیر نہیں گزری تھی۔ اُس نے بلا تامل مجھے پہچان لیا تھا۔ میری طرف بڑھی تو سونیا نے کلائی تھام لی۔ پیار سے بولی۔ ''نہیں جانم! ادھر بیڈ پر ہی بیٹھی رہو۔ اُس کے قریب نہ جاؤ، یہیں بیٹھ کر باتیں کرو۔''

اُسے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تم بولتے کیوں نہیں ہو؟''

میرے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ میں اپنی بے وقوفی میں خود پر نور پور کے دروازے بند کر بیٹھا تھا۔ وہ اگر یہاں سے آزاد ہو کر اپنے گھر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی، جو اک نہ اک دن ہونا ہی تھا، تو مجھ پر زمین تنگ کر دیتی۔

میں نے کہا۔ ''کون شہریار؟ میرا نام شہریار نہیں ہے۔''

میرے مضبوط انکار اور آنکھوں میں چھائی مصنوعی بے گانگی نے اُس کے ماتھے پر تشکیک کی سلوٹوں کا جال بُن دیا مگر یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ وہ بولی۔ ''اگر تم شہریار نہیں ہو تو پھر تم کون ہو؟''

سونیا نے جھٹ کہا۔ ''اِس کا نام اکبر عدیل ہے، تھانہ حرم گیٹ میں انسپکٹر ہے۔''

''یہ یہاں کیوں آیا ہے؟'' اسما کے لہجے میں خوف سمٹ گیا اور میری جانب انگلی کا اشارہ کر کے بولی۔ ''مگر اِس کی شکل خالد کے دوست شہریار سے کیوں ملتی جلتی ہے؟''

میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے سونیا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں نے گشت پر نکلنا ہے، پھر کسی وقت چکر لگاؤں گا۔ کیا یہ لڑکی ایب نارمل ہے؟''

میں نے اپنی آواز میں ہمدردی کی دبیز چادر پھیلا دی۔ سونیا نے کہا۔ ''نہیں۔ ہے تو نارمل ہی، مگر کافی دیر تک بے ہوش پڑی رہی ہے۔ حواس بحال ہونے میں کچھ دیر لگے گی۔''

میں اسما پر ایک نگاہِ اجنبیت ڈال کر کمرے سے نکل آیا۔ میں نے ایک بھیانک غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ گھبراہٹ کے عالم میں اردگرد دیکھے بغیر تیر کی طرح ریٹائرنگ روم میں آیا۔ یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ میڈم اُسی بیڈ پر نیم دراز تھی جس پر تھوڑی دیر پہلے میں لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دروازے میں دیکھ کر وہ ایڑیوں کے بل تھوڑا اوپر کھسکی اور بیڈ کے عقبی تختے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''میڈم! ڈسٹرب کرنے پر معذرت چاہوں گا، وہ دراصل.....''

''کہاں گئے تھے؟'' اُس نے میرا ملتجیانہ جملہ نظر انداز کر دیا۔

''مم..... میں سونیا کے کمرے میں گیا تھا۔ اکیلا بور ہو گیا تھا۔''

اُس کے لبوں پر بڑی تازہ اور معانی خیز مسکراہٹ ابھری۔ بولی۔ ''کسے دیکھا، اسما کو یا سونیا کو؟''

مجھے خاموش پا کر مستفسر ہوئی۔ ''کیا بات ہے؟''

''وہاں اسما بے ہوش پڑی تھی جبکہ سونیا جاگ رہی تھی۔ میں سونیا کے پاس چند لمحے ٹھہر گیا۔ اسی دوران اسما ہوش میں آ گئی اور اُس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔'' میں نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔!

وہ بولی۔ ''تو پھر کیا ہوا؟''

بے پروائی سے سکڑے ہوئے ہونٹ اچانک وا ہو گئے، چونک کر تیز لہجے میں بولی۔ ''یہ تم نے کیا حماقت کر ڈالی؟''

''جب میں کمرے میں گیا، وہ بے ہوش تھی۔'' میں نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

''کیوں اور کیسے ہوا، مت بتاؤ، یہ سوچو کہ اب کیا ہوگا؟'' وہ متفکر ہو گئی۔ توجہ پوری طرح میری طرف مبذول

ہوگئی۔ ''چونکہ ہم نے اسما کے بدلے میں تمہاری بہن کو حاصل کرنا ہے۔ اسما اُس کے باپ کے حوالے کرنی ہے، یہ مصیبت تو جاتے ہی تمہارا نام بک دے گی اور حیدر خان تمہارے خاندان کو سیخوں پر پرو کر بھون ڈالے گا جبکہ پروین کہیں بھی محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ یہ تم نے کیا کر دیا شہریار!''

وہ درست کہہ رہی تھی۔ میرا دل واہموں اور اندیشوں کی آماجگاہ بن گیا۔ ابھی تک اسما کے اغوا کے سلسلے میں میرا ذکر کہیں بھی نہیں آیا تھا۔ اسما کے گھر پہنچتے ہی میرے خاندان پر سردار حیدر خان بھوکے بھیڑیے کی طرح چڑھ دوڑے گا۔ عین ممکن تھا کہ اِس لے دے میں سائیں دل جیت کے قتل کا معمہ بھی حل ہو جاتا اور میں سلاخوں کے پیچھے چلا جاتا۔ میری ایک چھوٹی سی احمقانہ حرکت کی وجہ سے میری اور میڈم کی ساری ریاضت اکارت جانے والی تھی۔

مجھے دروازے میں متفکر تھما ہوا دیکھ کر بولی۔ ''اِدھر آؤ، یہاں بیٹھو.....''

اُس نے بیڈ کی نکڑ پر بیٹھنے کا حکم دیا تھا۔ میں بیٹھ گیا تو اُس نے کہا۔ ''پریشانی کو چہرے تک آنے سے روکو، ہمارے فیلڈ میں یہ اچھی علامت نہیں سمجھی جاتی۔ دل کی دنیا زیروزبر ہو، دماغ میں ایک سے بڑھ کر ایک بھونچال اُٹھے مگر چہرے پر سکون اور شانتی رقص کرتی نظر آئے۔ کیا ہوا؟ تمہیں اسما نے دیکھ لیا۔ وہ جا کر اپنے گھر بتا دے گی کہ اُس کے اغوا میں شہریار کا ہاتھ بھی تھا۔ یہی پرابلم ہے ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُسے مدوطلب نظروں سے دیکھا۔ وہ بڑے طمانیت آمیز انداز میں ہنس پڑی۔ پھر پاؤں سمیٹ کر بولی۔ ''تو کیا سردار حیدر خان کو، جس نے اتنے قلیل عرصے میں نہ صرف یہ جان لیا کہ اسما کو نیازی نے اغوا کیا ہے بلکہ وہ اُسے اُٹھا کر اپنے اڈے پر لے گیا اور اُس کے منہ سے میرا نام اگلوانے میں کامیاب ہو گیا، اِس نکتے تک نہیں پہنچ سکے گا کہ اس سارے ڈرامے کا مرکزی کردار کون ہے؟ جب اُس سے اسما کے بدلے میں پروین مانگی جائے گی، تب اُسے نہیں پتا چلے گا؟ تب کیا وہ راضی ہوتا؟..... نہیں شہریار! تمہاری دشمنی سردار حیدر خان پر عیاں ہو چکی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ اُس کا دستِ راست سائیں دل جیت شاہ قتل ہو چکا ہے اور وہ بھی تمہارے ہاتھوں..... اسما خانزادی ہے۔ بہت کچھ کر سکتی ہے۔ مگر تب، جب وہ یہاں سے جائے گی جبکہ حیدر خان کا گرگا استاد بلو اَب بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔''

وہ مجھ سے کہیں زیادہ ذہین اور زیرک تھی۔ میں بنے واقعتاً اِس رخ سے نہیں سوچا تھا وگرنہ اتنا پریشان نہ ہوتا۔ میں نے کہا۔ ''میڈم! کیا میری پروین مل جائے گی؟''

مجھے خود احساس ہوا کہ میرے لہجے میں کتنی بڑی التجا چھپی ہوئی تھی۔

وہ بولی۔ ''تمہیں کہا نا کہ وہ تمہیں ضرور ملے گی۔ میں جس کام کا تہیہ کر لیتی ہوں، سرانجام دے کر ہی سکون کی سانس لیتی ہوں۔ اَب ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہیں۔ سردار اگر تمہاری بہن پر کسی ظلم کا بوجھ لاد دے گا تو اُس کی بیٹی بھی اتنے ہی بڑے پتھر تلے دب جائے گی۔ وہ نادان نہیں ہے کہ اتنی سامنے کی بات پر دھیان نہ دے۔''

میں نے کہا۔ ''میڈم! آپ میری سوچ سے بھی زیادہ ذہین اور اثر ورسوخ والی ہیں۔''

وہ بولی۔ ''ہاں! ایسا ہی ہے۔ تم مجھ سے بھی زیادہ خوش قسمت ہو۔ میں زمانے کو اپنی مٹھی میں رکھتی ہوں۔ تم نے میرا دل اپنی مٹھی میں جکڑا ہوا ہے۔''

میں نے چونک کر میڈم کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے رنگ ثبت تھے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''جی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

وہ مجھ پر آنکھیں چپکائے بولی۔ ''کیا کوئی یونہی اتنی بڑی مصیبت کسی کے لیے مول لیتا ہے؟''

اُس نے درست کہا تھا۔ وہ جس حد تک مجھ پر مہربان تھی، اس حد پر کوئی بنا ضرورت کے نہیں پہنچتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''آپ بہت اچھی ہیں۔''

وہ بولی۔ ''یہ جگہ جہاں ہم بیٹھے ہیں، سی ٹو کہلاتی ہے۔ یہ ایسا محفوظ قلعہ ہے جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا، پہنچ بھی جائے تو کچھ نہیں کر سکتا۔ استاد بلو بھی نہیں، قانون بھی نہیں..... میری کوٹھی، پوری کالونی بھی اگر تباہ ہو جائے تب بھی یہاں موت کے ہرکارے نہیں پہنچ سکتے۔ سی ٹو کے سبھی دروازے اندر سے، خاص میکنزم کو آن کرنے سے ہی کھلتے ہیں۔ باہر سے کوئی اِن چور دروازوں کا سراغ لگا بھی لے تو کھول نہیں سکتا۔ سمجھے؟'' اُس کے لہجے میں کڑا تیقن اور احساس تفاخر رچا ہوا تھا۔ ''میں استاد بلو کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ جب تک سردار یار خان یہاں رہا، یہ اس کے آگے پیچھے دُم ہلاتا رہتا تھا، اَب سردار حیدر خان کے ٹخنوں کی گرد جھاڑتا ہے۔ اب اُسے منہ کی کھانا پڑی ہے مگر میں جانتی ہوں کہ وہ اتنی آسانی سے پیچھے ہٹنے والا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جانتا ہو کہ میں مورچہ زن ہو گئی ہوں۔ مجھے نکالنے کے لیے اُس نے اپنے چند غنڈوں کو بھیجا ہوتا کہ انہیں بھگانے کے بعد

میں جونہی مطمئن ہو کر کھجار سے باہر نکلوں، وہ خود حملہ آور ہو جائے۔ اِسی لیے میں نے سبھی لوگوں کو کوٹھی پر بھیج دیا ہے۔ اس وقت ہم پانچ سات لوگ یہاں ہیں.....''

میری آنکھیں پھیل گئیں۔ بلاشبہ وہ عورت نہیں، شیطانی کھوپڑی رکھنے والی جان دار قیامت تھی۔ وہ ایسا پُرپیچ عقدہ تھا جس کی نظر میں آنے کے بعد ہر عقدہ خود بخود کھلنے کے لیے بے تاب ہو جاتا تھا۔

میرے استعجاب سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔ ''شہریار! تھوڑا قریب آؤ۔''

میں ہچکچاتے ہوئے بیڈ پر اُس کی سمت تھوڑا سا کھسکا۔

وہ بولی۔ ''تم سردار حیدر خان کی زندگی میں نور پور جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے ہو۔ کیا میں نے درست کہا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''نہ ہی تمہاری بہن وہاں جا سکتی ہے۔ ہوں؟''

''جی!'' میں نے آہستگی سے کہا۔

وہ بولی۔ ''تھوڑا اور قریب آؤ.....''

میں گھبرا گیا۔ اُس کی آنکھیں مجھے پکارنے لگیں۔ قریب آنے پر اکسانے لگیں۔ میں نے بے بسی سے دیکھا۔ وہ مسکرائی۔ ''کہا نا! قریب آؤ.....''

ناچار مجھے اُس کی جانب کھسکنا پڑا۔ وہ شرارت آمیز نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔ اُس کے داہنے پاؤں کی انگلیاں میرے پہلو میں تھرکنے لگیں۔ بولی۔ ''اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ تم اپنی بہن کو بازیابی کے بعد اسے ملتان میں ہی رکھنے کا پروگرام ترتیب دو۔ میں تمہارے لیے ایک گھر کا بندوبست کر دوں گی۔ کیا تم اپنے تمام اہل خانہ کو گاؤں سے ملتان شفٹ کر سکتے ہو؟''

میں نے کچھ سوچا، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ چاچا چراغ کبھی بھی میرے کہنے پر نور پور سے ملتان نقل مکانی کرنے پر رضامند نہیں ہوگا۔

وہ بولی۔ ''تو کیا تم ان لوگوں کو حیدر خان کے رحم وکرم پر وہیں چھوڑ دو گے؟''

میں نے کندھے اُچکائے، کہا۔ ''اور کوئی چارہ کار بھی تو نہیں.....''

اُس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا، تحکم آمیز لہجے میں بولی۔ ''ہاتھ پکڑو اور اِسے سہلاؤ، کی بورڈ نے تھکا دیا ہے۔''

میں نے شکوہ کناں نظروں سے اُسے دیکھا مگر اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں ناچار اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام کر ہولے ہولے سہلانے لگا۔ ہاتھ کی تھکن عجیب برقی لہر بن کر میرے وجود میں سرایت ہونے لگی۔ اُس نے آنکھیں موند لیں، بولی۔ ''میر وشاہ سردار حیدر خان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ رابطہ ہونے پر سودے بازی کا مرحلہ آئے گا۔ جونہی میر وشاہ اُس سے تمہاری بہن کا مطالبہ کرے گا، وہ ٹھٹک جائے گا۔ نور پور اُس کی مونچھ تلے ہے۔ مونچھ کو بل دے گا تو تمہارا خاندان زیرِ عتاب آ جائے گا۔ تب کیا کرو گے، کیا بے بسی سے سبھی اپنوں کو بے موت مرتا ہوا دیکھتے رہو گے؟''

میرا ہاتھ ساکت ہو گیا۔ گردن پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ چاچا، چاچی اور اُس کی اولاد کے چہرے آنکھوں میں ابھرنے لگے۔ کسی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ انہیں تو اپنی جانب بڑھتی ہوئی موت کی پرچھائیاں تک نظر نہیں آ رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ''تو کیا میں نور پور چلا جاؤں؟''

''وہاں جا کر کیا کرو گے؟''

''سردار حیدر خان کے گرگوں کا مقابلہ کروں گا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ زیادہ ہوگا تو میں بھی اُن کے ساتھ مارا جاؤں گا۔ موت آئے تو آئے، مگر میری ذات پر نمک حرامی کا الزام نہ آئے۔'' میرے لہجے میں پتھر کی سی سختی تھی۔

''اپنے خاندان کے ساتھ ساتھ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ پھر میرا کیا بنے گا؟''

میں نے چونک کر کہا۔ ''کیا مطلب؟''

''سیدھی سی بات ہے کہ میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔ تمہاری دوری برداشت نہیں کر پاؤں گی۔'' اس کے لہجے میں گہری یکسوئی اور کڑی سچائی پنہاں تھی۔ انہونی سی بات اپنی تمام تر سنگینی سمیت میرے سامنے کھل رہی تھی۔ میرے لیے یہ بات بھی نئی تھی کہ کوئی لڑکی اتنی دیدہ دلیری اور غیر روایتی عمومیت سے اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''میڈم! آپ اپنے رتبے اور مقام کا خیال کریں۔ مجھے آپ کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی، ہاتھ کھینچ کر بولی۔ ''کیا میں کسی ایسے عہدے پر فائز ہو گئی ہوں جہاں کسی کو پسند کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے؟''

میں نے لاچارگی سے اُسے دیکھا۔ میرے پاس لاحاصل مباحثے کے لیے کائیاں مواد نہیں تھا، اس لیے ماسوائے خاموشی کے کوئی لائحہ عمل نہیں تھا۔

وہ بولی۔ ''شہریار! محبت کبھی، کہیں اور کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ تمہیں میری نظر نے منتخب کیا ہے، دل نے پسندیدگی کی مہر ثبت کی ہے اور میرے ہاتھ نے یقین دلایا ہے کہ تم

میری دسترس میں ہو۔"

وہ بااختیار تھی، میں رہینِ حالات اور اُس کے تابع تھا۔ وہ جو چاہتی کہہ لیتی، میں جو چاہتا تھا کہہ نہیں سکتا تھا۔ موہوم سی ندائے مزاحمت بلند کی۔ "میڈم! میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔"

"کیا تم میری آنکھوں پر شک کر رہے ہو جنہوں نے تمہیں اپنے قابل جانا ہے؟"

میں نے جلدی سے کہا۔ "نہیں میڈم! میں نے یہ تو نہیں کہا۔ میں تو اپنی حیثیت اور مقام کو مدنظر رکھ کر سچ بیان کر رہا ہوں۔"

وہ آلتی پالتی مار کر بیڈ میں بیٹھ گئی۔ اچانک ہی موضوع بدل کر بولی۔ "کیا تمہارا یار، کیا نام بتایا تھا تم نے اُس کا، ہاں..... کھالا..... کیا وہ تمہارے کہنے پر تمہارے گھر کے تمام افراد کو رازداری سے نور پور سے نکال کر یہاں لا سکتا ہے؟"

میرے ذہن میں ایک برق بلا کوندی، اُمید اور یقین کا ستارہ جگمگایا اور میں مسرت آمیز انداز میں بولا۔ "اوہ کیوں نہیں میڈم؟..... کھالا آسانی سے یہ کام کر سکتا ہے۔ وہ کہاں ہے اِس وقت؟"

"میرے آدمیوں نے اُسے زندہ وسلامت پکڑنے کے بعد رسیوں میں جکڑ کر سی ون میں رکھا ہے۔ بڑا مچل رہا ہے، آزاد ہونے کے لیے اپنی سی کوشش کر رہا ہے۔" وہ قدرے تفاخر سے بولی۔ "تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہیں ملنے اور آزادی پانے کے بعد کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا؟"

میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔ "ہاں میڈم! وہ بڑا یار پال انسان ہے۔ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔"

"سوچ لو، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔" اُس کے لہجے میں تشکیک کا عنصر نمایاں تھا۔

کھالا کیسا تھا؟ یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ میں نے میڈم کو یقین دلایا اور اُس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایسے ہی وقت میں اُس کے موبائل فون کا بزر بجا۔ اُس نے کال ریسیو کی۔ چونکہ کمرا ساؤنڈ پروف تھا، کوئی شور نہیں تھا، اِس لیے میں سپیکر سے پھوٹنے والی نحیف سی آواز بھی سن سکتا تھا۔ دوسری طرف میرو شاہ تھا جو میڈم سے کہہ رہا تھا۔ "میڈم! ماڑا پیر حیدر خان کی دُم پر جا پڑے ہے، اپنے بال نوچ ہے اور چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھاوے ہے۔ باؤلا..... ماڑے کو یقین دلاوے ہے کہ اس کے پنجرے میں پروین نام کی کوئی چڑیا نجر (نظر) نہ آوے ہے۔"

میڈم نے قدرے سخت انداز اختیار کیا، بولی۔ "سیدھی سیدھی بات کرو، کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو میرو شاہ؟"

اُس کے کانوں پر جیسے جوں تک نہیں رینگی تھی، بولا۔ "ماڑے کو بولنے تو دیوے ہے ملکہ رانی! کیا کھا جاوے دنیا کو یہ میرو شاہ؟..... ماڑے کو پتا ہے کہ ماڑی میڈم اِس وقت سی ٹو کے پنجرے میں قید ہووے ہے، اُڑنے کو پر تولے ہے۔ ٹھیک ہے، اپنی جبان (زبان) کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ لیوے ہے میرو شاہ..... اب پوچھ لیوے ماڑے سے، جو پوچھنا مانگے ہے....."

"اچھا بھئی..... بتاؤ، کیا بات چیت ہوئی؟" میڈم نے ہار مانتے ہوئے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔

"ماڑے کو چکر دے گیا حرام جادہ (زادہ)۔" میرو شاہ نے بپھر کر کہا۔ "ماڑے کو جگاڑی لاوے کہ ایسی کوئی لڑکی نہ ہووے ہے اس کے پاس....."

"پھر؟"

"پھر کیا..... ماڑے نے صاف صاف کہہ دیوت ہے کہ نہیں ہے تو پیدا کرے..... لڑکی پیدا نہ ہووے تو سمجھے کہ اُس کی پلی پوسی بیٹی خون میں نہا جاوت ہے۔" میرو شاہ کے لہجے میں غیظ کی کسیلی لہر چھپی ہوئی تھی، کہہ رہا تھا۔ "میڈم! او ماڑی ملکہ رانی! وہ ماڑے سے پوچھے ہے کہ تیرے کو اُس چھوہر (لڑکی) سے کیا غرج (غرض) ہووے..... ماڑے کو چکر دیوے، پر آپ ماڑے چکر میں آ جاوے ہے۔ ماڑے نے سمجھا دیوت ہے کہ بڑی پارٹی لگی ہووے، تگڑی رقم کا معاملہ ہووے....."

"گڈ....." میڈم کے لبوں سے تحسین انگیز لفظ نکلا، تھوڑے توقف سے بولی۔ "تم اِس وقت کہاں ہو؟"

"ماڑا ڈیرہ ملتان میں ہی ہووے ہے میڈم! حکم دیوے ہے، کیا بات ہووے؟"

"کیا یہ بات کھل چکی ہے کہ اسما میرے پاس ہے؟"

"ہاں میڈم! وہ حرام جادہ علیج (غلیظ) گالیاں، ماں بہن کی، دیوے تھا..... ماڑے سامنے ہوتا تو اُس کا منہ توڑ دیوت ہے پر جور (زور) نہ چلت ہے۔"

میڈم کے ہونٹ سکڑے، پیشانی پر برہمی کے مظاہر بل نمودار ہوئے پھر پل بھر کے بعد غائب ہو گئے۔ بولی۔ "تم کسی کو سردار حیدر خان کے ڈیرے پر بھیجو۔ اُس کے بیلے والے ٹھکانے کی ٹوہ لگاؤ۔ نقشہ بناؤ اور سیکورٹی کی تفصیلات اکٹھی کرو تاکہ ضرورت پڑنے پر اٹیک کر کے مال برآمد کرایا جا سکے۔ اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلتا تو پھر انگلیاں ٹیڑھی کرنا ہوں گی۔ اور ہاں! وہ استاد بلو کہاں

غائب ہے؟"

"وہ بھوتنی کا بچہ..... سالا..... ایک دم باؤلا ہوا پھرت ہے۔ اپنے لونڈوں لپاڑوں کی فوجیں لے کر شہر میں مارا مارا پھرت ہے، تمہیں تلاش کرت ہے۔"

"نور پور کی کوئی خبر؟"

"ناں میڈم! جاہد (زاہد) کو بھیجا ہووے..... وہ گنجا جاہد، جو میڈم کے دیدار کو روے تھا، تمہارا عاشق..... پر وہ ابھی واپس نہ آوے ہے۔ خبر ماڑے تک پہنچے تو میڈم تک پہنچے ناں۔"

میرو شاہ بڑی بے باکی سے میڈم سے بات چیت کرتا تھا۔ گنجے زاہد اور اس کی عاشقی کا حوالہ سن کر میڈم کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ اُبھری۔ "اچھا! ٹھیک ہے میرو شاہ!" میڈم نے کہا۔ "تم جو مناسب سمجھو، کر گزرو۔ مجھے شہریار کی بہن زندہ وسلامت چاہیے، ہر قیمت پر۔ حیدر خان سے جنگ چھڑ گئی ہے۔ جانتی ہوں کہ یہ کئی خون پی جائے گی۔ بھلے پی جائے، شکست قبول نہیں ہوگی۔ او کے؟"

"جندہ (زندہ) رہوے میڈم..... جندہ باد..... ماڑے کو ہلاشیری دیتی رہو، ماڑا کام شیر کے منہ سے نوالا کھینچتا ہووے....."

اُس نے اپنے مخصوص انداز میں نعرہ لگایا تو میڈم نے فرطِ طمانیت سے مسکرا کر کال منقطع کر دی۔ فون بیڈ کے سرہانے چوبی تختے پر رکھ دیا اور کھسک کر نیم دراز ہو گئی۔ آنکھیں موند کر کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ "میرو شاہ بڑے کام کا بندہ ہے۔"

"جی میڈم!" میں نے آہستگی سے کہا۔

"وہ تمہیں 'ماڑا غنچہ' کہتا ہے۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے وہ!" میڈم کے لہجے میں عمومیت کا عنصر غالب تھا۔

"جی....." میں نے کہا۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ پروین سردار حیدر کے پاس ہی ہے؟"

اُس نے چونک کر سر اُٹھایا، آنکھ کے اشارے سے قریب آنے کا حکم صادر کیا اور بولی۔ "ہاں!"

میں نے اُس کے حکم کی تعمیل نہیں کی تھی۔ اُس نے میری ہچکچاہٹ بھانپ لی۔ بولی۔ "تم مجھ سے کتراتے کیوں ہو؟"

میں نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔ "نہیں میڈم! دراصل مجھے اپنی اوقات نظر آتی ہے۔"

"کیا میرے پہلو میں بیٹھنے کے بعد بھی تمہیں اپنی اوقات کا شکوہ رہتا ہے؟" اُس کی چبھتی ہوئی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں۔ "کہاں ناں! میرے قریب آؤ....."

میں بادلِ نخواستہ اُس کے پہلو تک کھسک گیا۔ اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میرا رُخ بدل دیا۔ مائل اُس کا ہاتھ گلاب کی طرح میرے ہاتھ میں آیا تھا اور میرے پورے بدن میں سرسرا گیا تھا۔ اب میری آنکھیں حسن کی تمازت برداشت کرنے سے منکر ہونے لگیں اور میڈم کا گل آفریں چہرہ دھندلانے لگا۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور نہایت آہستگی سے کھینچ کر اپنے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ زندگی کو آتشیں شباب کا پہلا لمس عطا ہوا تھا۔ دل زور سے دھڑکنے لگا۔

اُس نے آنکھیں موند لیں اور میرے نیم جان ہاتھ میں روح پھونکنے کا عمل شروع کر دیا۔ میرا ہاتھ اُس کی گرفت میں حرکت کر رہا تھا اور سانسوں کی حدت سے لحہ بہ لحہ دہکتا جاتا تھا۔ میں نے آہستگی سے ہاتھ کھینچنا چاہا تو اُس نے اپنے سر کو دائیں بائیں مخصوص انداز میں حرکت دے کر مجھے ایسا کرنے سے منع کر دیا اور اپنی ترنگ میں بدستور بھٹکتی رہی۔ میں نے ہمت کی اور اُس کے چہرے کو دیکھا۔ پہلے گلابی تھا، اب دہک کر سرخ ہو گیا تھا۔ گالوں پر سرخ لکیریں تن گئیں تھیں اور آنکھوں کے پپوٹے بھاری پن کا شکار ہو گئے تھے۔ اُس نے چند منٹوں میں ہی میرے بدن سے تمام تر خون نچوڑ کر میرے داہنے ہاتھ میں سمیٹ دیا تھا۔

اس میں کلام نہیں کہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اُس کا بدن شیشے کا وہ پیکر تھا جسے چھونے سے اس کے ٹوٹنے کا احتمال ہوتا تھا۔ آنکھیں سمندر کی تمام تر گیرائی سمیٹے ہوئے تھیں اور ہونٹوں پر عمودی مہین لکیروں کا جال اور دو ننھے ننھے چمک دار ابھار مردوں میں روح پھونکنے کا سا اعجاز رکھتے تھے۔ وہ اچانک پہلو کے بدل کروٹ لے گئی۔ اَب اُس کا وسطی بدن میری کمر سے جڑ گیا اور اُس نے میرا ہاتھ لبوں سے ہٹا کر اپنے بائیں گال پر رکھ دیا۔ میرے ہاتھ پر اُس کی گرفت لرزنے لگی اور سانسوں کی چال غیر معتدل ہو گئی۔ آنکھیں موندے قدرے بھاری آواز میں بولی۔ "شہریار! آئی لو یو..... تمہیں پہلی نظر دیکھ کر تمہیں پسند کرنے لگی تھی۔ اَب وہ پسندیدگی کا جذبہ انتہائی حدوں کو چھو کر محبت بن گیا ہے۔ میں نے کیا کہا ہے شہریار؟"

"جی..... جی میڈم..... میں سن رہا ہوں۔" مجھے اپنی آواز کی لرزش نے حیران کر دیا۔

"ہاں..... تم سننے پر مجبور ہو۔ تم اپنی بہن کی وجہ سے میری باتیں سننے پر مجبور ہو۔ میرا ہر حکم ماننے پر مجبور ہو۔ جب تمہاری بہن تمہیں مل جائے گی، پھر تم کچھ بھی سننا گوارا نہیں کرو

گے مگر میں تب تک تمہارے حواس پر چھا چکی ہوں گی۔ تم جانا چاہو گے مگر تمہارا بدن ساتھ نہیں دے گا۔ تم مجھے انکار کرنا چاہو گے مگر زبان تمہیں چھوڑ کر میرے راگ الاپنے لگے گی۔''

وہ جواب سے بے نیاز اپنی ہی رو میں بہکتی جارہی تھی۔ ''سنو! میں کہہ رہی ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ محبت کسے کہتے ہیں؟ جانتے ہو؟..... ہائے! دنیا میں ایسا کون ہے جو نہ جانتا ہو کہ محبت کس جذبے کا نام ہے۔ جہاں یہ ہوتا ہے، وہاں کوئی نہیں ہوتا..... اب یہاں عشق کا راج ہے، سمجھو! یہاں کوئی اور نہیں ہے..... ہُوم! تم نے مجھ پر ایسا کیا جادو کر دیا ہے کہ میں عاشق اور تم معشوق بن گئے ہو۔''

وہ سنا رہی تھی، سننا نہیں چاہتی تھی۔ اپنا دایاں ہاتھ میری گود میں رکھ کر ٹوٹتے لہجے میں بولی۔ ''شہریار! یہ ہاتھ ٹھنڈا ہے، اِس کو آگ اچھی لگتی ہے، جلا دو۔ اپنے ہونٹوں سے لگا لو۔''

میرا ایک ہاتھ مفتوح تھا۔ دوسرا خود پر فاتح کا لیبل لگا کر میڈم کی دسترس میں جانے والا تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے اُس کا لرزتا ہوا نحیف سا گداز ہاتھ تھاما اور لبوں سے لگایا۔

ایسے ہی وقت میں میرے مقابل غزالہ آن کھڑی ہوئی۔ میرے سینے پر انگلی تان کر کراہی۔ ''بس شہریار خان! تمہاری محبت دم توڑ گئی ناں!''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ آنکھیں جھپکائیں، دیکھا، وہ سامنے آ کر دھندلانے لگی تھی۔ پھر جیسے تصور کے پردے پر ابھری تھی ویسے ہی ایک ساعت میں تحلیل ہونے لگی۔

میں نے سر جھٹکا اور میڈم کے ہاتھ کے ساتھ کھیلنے لگا۔ میں اُس سے دور ہونا چاہتا تھا یا میں اُس کے قرب کا خواہاں تھا، یہ سوال پہیلی بن کر رہ گیا۔ گلاب کے پھول نے ہونٹوں کو لمس عطا کر کے ساری تاب اپنے اندر سمو لی تھی۔ میں جن دنوں ملتان کے کالج میں پڑھا کرتا تھا، کئی لڑکیاں فرینڈشپ کی دیوار سے سر ٹکرا کر مجھے اپنے پاس بلایا کرتی تھیں مگر میں اُنہیں نظر انداز کر کے کتاب کو سینے سے لگا لیتا تھا۔ عورت ذات کو شجرِ ممنوعہ سمجھ کر اپنی ہی جھونک میں آگے بڑھتا گیا۔ میں نے آج تک غزالہ کے علاوہ کسی شبیہہ کو اپنی چشمِ تصور میں براجمان ہونے کا موقع نہ دیا تھا۔ آج غزالہ کے عشق کی وہ تاب، وہ تمکنت بے بسی کی عجیب نشہ آور کیفیت میں مصلوب ہوگئی تھی۔ میں یہ تعین کبھی نہیں کر پایا کہ اگر میڈم اتنی بااختیار نہ ہوتی، میں اس کے احسانات کے زیرِ بار نہ ہوتا تو کیا محض اپنے حسن کی جولانیوں سے وہ مجھے بے بس کرنے میں کامیاب ہو جاتی؟.....

ایسے ہی وقت میں غیر متوقع مدد آن پہنچی۔ اُس کے موبائل فون کی بیل بجنے لگی اور وہ چونک گئی۔ پھر ایک نظر مجھے فاتحانہ اطوار سے دیکھتے ہوئے، میرا ہاتھ چھوڑ کر، اپنا چھڑا کر، فون سیٹ کی طرف متوجہ ہوئی اور اسکرین پر نظر ڈال کر بڑبڑائی۔ ''یہ کس کا نمبر ہے؟''

میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے بیڈ چھوڑ دیا۔ پانی پینے کے بہانے فریج کی طرف بڑھا۔ گلاس ہونٹوں سے لگایا تو اس کی شرارت بھری آواز کانوں میں پڑی۔ ''ہر آگ پانی سے نہیں بجھتی شہریار!''

میں نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا تو ماہ رُخ کی آفتابی کشش دل میں کھب گئی۔ دیکھتے رہنے کی خواہش نے سر اُٹھایا جسے میں بہ مشکل کچل کر پانی حلق میں اتارنے لگا۔ فون کی بیل بجتے رہنے کے بعد خاموش ہوگئی۔ پھر بول پڑی تو میڈم نے کال ریسیو کر لی اور سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ''یس! ہو از آن دی لائن؟''

فون میں ابھرنے والی کوئی شناسا آواز سن کر ایک دم ہنس پڑی۔ ہنستے ہنستے نخوت سے بولی۔ ''ارے استاد! میرا نمبر کہاں سے مل گیا تمہیں؟''

کمرے میں سپیکر سے پھوٹنے والی بھنبھناہٹ پھیل گئی۔ ایسے میں میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھ سے پانی طلب کیا۔ میرے ہاتھوں سے پانی کا گلاس تھام کر اُس نے مسکراتے ہوئے فون میں کہا۔ ''تمہیں استاد کہتی ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہاری عزت کرتی ہوں۔ تم بھی میری عزت کرو۔ ایسی باتیں کرو گے تو میری طرف سے بھی طعنے سننے کو ملیں گے۔''

وہ گھونٹ گھونٹ پانی پی رہی تھی۔ آنکھوں سے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اُس نے موبائل فون سیٹ کے کسی بٹن کو دبایا۔ فون کا لاؤڈر آن ہوگیا۔ ایک مردانہ آواز میری سماعت میں اُتری۔ ''میں جان چکا ہوں کہ تم اپنے مورچے 'سی ٹو' میں چھپی بیٹھی ہو۔ اب صرف یہ جاننا باقی ہے کہ 'سی ٹو' کہاں ہے۔ تم جتنی دیر کرو گی، اتنا ہی قرض کے بار تلے آؤ گی۔''

میڈم بولی۔ ''تم نے یہ سوچ کر فون کیا ہے کہ میں تمہاری دھمکیوں سے ڈر کر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے تمہارے اڈے پر حاضری دینے چلی آؤں گی؟''

''ہاں! کیونکہ اسی صورت میں تم زندہ رہ سکتی ہو۔'' اسپیکر سے برآمد ہونے والی آواز میں موت کی سی سردی پنہاں تھی۔

''استاد! بہتر یہی ہے کہ تم اپنے سردار کو سودے بازی پر رضامند کر لو۔ مفاہمت کی راہ اختیار کر لو۔ سچ کہتی ہوں کہ یہ تمہارے لیے گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔''

''تمہارے لیے بہتری اسی میں ہے کہ سردار کی بیٹی میرے حوالے کر دو۔ اونچا اڑنے کی کوشش میں پر کٹوا بیٹھو گی۔''

میڈم نے میری طرف دیکھا، مسکرائی اور فون میں بولی۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اتنی کمزور نہیں ہوں کہ شکست تسلیم کر لوں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایسا موقع آیا کہ مجھے اپنی جان جاتی ہوئی محسوس ہوئی تو تمہارے سردار کی بیٹی کی بھی چھٹی کرا دوں گی۔ میری مطلوبہ لڑکی اتنی قیمتی نہیں ہے جتنی تمہاری..... اس لیے سوچ سمجھ کر بات کرو ورنہ میں ڈیکنگ کی بساط سمیٹ دوں گی۔ جس پارٹی کو وہ لڑکی دینی ہے، اُسے خانزادی تھما کر اپنی جان چھڑا لوں گی۔''

''میڈم! اپنا بنا بنایا گروپ ختم نہ کرواؤ، سیدھی طرح.....''

''ٹھیک ہے اُستاد! جب ضروری سمجھوں گی، تمہاری ہدایات پر عمل کر لوں گی۔ کچھ اور کہنا ہے تو کہہ لو، میں بہت مصروف ہوں۔''

'استاد' کی آواز مزید سرد ہوگئی، بولا۔ ''یعنی تم مرنا چاہتی ہو؟''

''ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی ہے ناں!'' میڈم کے لہجے سے جھلکتی بے پروائی میرے لیے حیرت انگیز تھی۔ ''اگر تمہاری یادداشت کام کرتی ہے تو سبق سیکھو اُس دن سے جب تم طاقت کے گھمنڈ میں میری طرف آئے تھے، ہمارے گروپ آپس میں ٹکرائے تھے..... کیا ہوا تھا؟ تمہاری ایک بے وقوفی نے تمہیں جان کے لالے ڈال دیے تھے۔''

''وقت ایک سا نہیں رہتا میڈم! تم نے سردار کی بیٹی پر سپاری لگا کر اچھا نہیں کیا۔ ہماری دنیا کا یہ اصول کبھی نہیں رہا۔ ہم دوسروں... پر ہاتھ اُٹھاتے ہیں مگر ایک دوسرے کی عزت پر میلی نگاہ نہیں ڈالتے۔ اگر تمہارا کوئی گھر بار ہوتا تو تمہیں اب تک اس حماقت کی سزا مل چکی ہوتی۔ خیر! اب بھی تم کہاں تک چھپی رہ سکتی ہو۔''

میڈم پر اُس کی خنک آواز اور خطرناک دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا، تمکنت سے بولی۔ ''میر وشاہ کے عذاب سے بچ جاؤ تو بہتر ہے استاد ببلو! وہ ایک حد تک تمہاری گستاخیاں برداشت کرے گا پھر تمہارا جینا دوبھر کر دے گا۔ تم عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پروین نامی لڑکی میرے حوالے کر دو، اپنی اسما لے جاؤ..... اپنے سردار کو سمجھا دو کہ پروین اپنے چہرے پر جتنے تھپڑ سجا کر آئے گی، اسما اتنی چیخیں اپنے پلو سے باندھ کر رخصت ہوگی۔''

استاد ببلو بہت سنجیدہ مزاج آدمی تھا۔ وہ میڈم کو خطرناک دھمکیاں بھی کمال سنجیدگی سے سپاٹ لہجے میں دے رہا تھا۔ میڈم کی بات سن کر اُس نے 'اچھا تو پھر انتظار کرو' کہا اور فون بند کر دیا۔ میڈم چند لمحے تک فون کی اسکرین کو گھورتی رہی پھر میر وشاہ کو کال کر کے اُستاد ببلو سے ہونے والی بات چیت دہرانے لگی۔ میر وشاہ نے بتایا کہ کوٹھی میں موجود افراد بھی پوری طرح چوکس ہیں اور کوٹھی کے باہر سپیشل فورس تعینات ہے جو استاد ببلو کے استقبال کے لیے پوری طرح ہتھیاروں سے لیس ہے۔ اُس نے میڈم کو بے فکر رہنے کا مشورہ دیا اور فون بند کر دیا۔

دس پندرہ منٹ تک میڈم آنکھیں موندیں ساکت پڑی رہی، میں کرسی میں بیٹھا ایک ٹک اُس کے ماہتاب چہرے کو دیکھتا اور سوچتا رہا کہ... اتنی نازک اندام عورت کس طرح اتنے بڑے نیٹ ورک کو کامیابی سے چلا سکتی ہے۔ اُس کے سر پر موت کی پرچھائیاں منڈلا رہی تھیں مگر وہ دسمبر کی جھیل کے ٹھہرے ہوئے خنک پانی کی طرح پرسکون تھی۔ کوئی تلاطم، کوئی بھنور، کوئی شور..... کچھ بھی تو نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ اُس کے نزدیک معمول کے حالات ہوں جو اپنی روائتی چال سے آگے کی طرف بڑھتے جا رہے ہوں۔

میں نے ابھی تک اُسے چیختا، چلاتا، رعب جماتا یا جھنجلاتا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ یہ دیکھا تھا کہ اُس کا رویہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ بڑا مشفقانہ تھا۔ وہ اپنی گفتگو، رکھ رکھاؤ اور حرکات و سکنات سے کسی طور پر بھی جرائم پیشہ گروہ کی سرغنہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے ابھی تک جن لوگوں کو سی ٹو میں دیکھا تھا، وہ بھی شکل و صورت سے نہ تو غنڈے دکھائی دیتے تھے اور نہ ہی بدقماش..... یونیورسٹی لیول تک پڑھے لکھے ہوئے لوگوں کا گروہ میڈم کی مٹھی میں تھا۔ میں نے جن بدمعاشوں کی کہانیاں پڑھ سن رکھی تھیں، اخبارات میں جن پولیس مقابلوں کی روئیدادیں پڑھ رکھی تھیں، ان کے کردار ان کرداروں سے یکسر مختلف تھے۔

میر وشاہ اور میڈم شکیلہ کی باہمی گفتگو سے پتا چلا تھا کہ وہ منشیات کی سپلائی کا کاروبار کرتی تھی۔ سونیا نے ایک نئے رُخ سے پردہ کشائی کی تھی کہ میڈم لڑکیوں کو بڑے سرکاری افسروں اور سیاست دانوں کے بستروں کی زینت بناتی تھی۔ وہ اور کیا کرتی تھی؟ یہ تو آنے والا وقت ہی مجھ پر عیاں کر سکتا

تھا۔ سردار حیدر خان اور اُس کے خونخوار گرگے استاد ببلو سے ٹکر لینے کی جرأت کوئی عام عورت نہیں لے سکتی تھی، یہ میں نے حالات کی کروٹیں دیکھ کر اندازہ لگایا تھا۔ وہ بڑے دھڑلے سے حیدر خان کی مونچھیں اپنے پاؤں تلے دبائے بیٹھی تھی۔

اچانک اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ چونکہ میں بڑی محویت سے اُسے دیکھ رہا تھا، اِس لیے جھینپ گیا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، میں نے تمہیں یہ حق دے رکھا ہے۔''

''جی میڈم.....'' میں نے سر جھکا لیا۔

وہ بولی۔ ''جب تم نے سائیں دل جیت کو قتل کیا، تب تمہیں کوئی ڈر نہیں لگا؟''

''نہیں میڈم..... تب میرا خون کھول رہا تھا۔ بعد میں، جب میں نور پور سے نکل رہا تھا، تب میرا دل خوف سے دھڑک رہا تھا۔''

''یقین نہیں آتا کہ تم نے اتنی آسانی سے سائیں جیسے طاقت ور شخص کو بے بسی کی موت مار دیا۔'' اس کے الفاظ استعجاب آمیز تھے مگر لہجہ قطعی سپاٹ تھا ''کیا واقعی سائیں نے اپنی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کر رکھا تھا؟''

''جی میڈم..... اگر اُس کا کوئی شخص پہرے پر تھا بھی تو میرے سامنے نہیں آیا۔''

''تم اسلحہ استعمال کر سکتے ہو؟''

''جی..... کالج کے دور میں عرفان مرزا نے مجھے تربیت دی تھی۔''

''عرفان مرزا..... وہ کون؟''

''وہ ایک اسٹوڈنٹ تنظیم کا لیڈر تھا۔ میں اُس کا نائب تھا۔''

''اوہ یس! وہ عرفان مرزا..... لمبے قد والا۔ تو تم ملتان میں ہی پڑھتے رہے ہو۔ یہ زیادہ پرانی بات تو نہیں..... عرفان مرزا تو بڑا چالاک اور موقع پرست آدمی ہے۔'' اُس کے ہونٹ سکڑ گئے، بولی۔ ''ایک دو مرتبہ اس سے واسطہ پڑا ہے، جھکائی دے کر نکل گیا۔ یہ بتاؤ! تم نے اس سے کیا کچھ سیکھا؟''

میں نے تفصیل سے آگاہ کیا تو خوش ہو کر بولی۔ ''ویری گڈ! وہی تربیت تمہارے کام آ گئی اور تم نے سائیں دل جیت جیسے سانڈ کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔ ویسے بھی دل جیت کی زبان چلتی تھی، شراب نوشی اور زنا کی کثرت نے اُس کے ہاتھ پیر ڈھیل کر دیے تھے۔ اُسے یہ گھمنڈ تھا کہ کوئی اُس کی سلطنت پر حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ یہی غرور اور بے پروائی اُسے لے ڈوبی اور تمہارا وار چل گیا۔ کیا سائیں جیسے کسی اور ہاتھی کو گرانا پڑے تو تمہارے بازو کام کریں گے؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے یقین کی حد تک شبہ ہے کہ میری واپسی کی راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ لوٹوں گا تو بے موت مارا جاؤں گا۔ آگے بڑھوں گا تو مجھے راستے کے کانٹے صاف کرنا ہوں گے۔''

اُس نے میرے جملے سے اپنے مطلب کی بات اخذ کر لی اور کہا۔ ''اوکے! اب تم جاؤ اور اسما کو میرے پاس لے آؤ۔''

'کیوں' کا لفظ میرے لبوں سے پھسلتے پھسلتے اٹک گیا اور میں اٹھ کر ریٹائرنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں بعد میں سونیا کے کمرے میں بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز اسما کے سامنے کھڑا تھا۔ سونیا صوفے پہ بیٹھی تھی، بولی۔ ''کیا بات ہے؟ میڈم نے کچھ کہا ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں! میڈم نے حکم دیا ہے کہ میں اسما کو اس کے کمرے میں لے جاؤں۔''

وہ کندھے اُچکا کر نیم بے پروائی سے بولی۔ ''تو لے جاؤ.....''

میں نے اسما کو دیکھا۔ وہ جاگ رہی تھی اور بڑے غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''اُٹھو! تجھے میڈم نے بلایا ہے۔''

اگر وہ کہیں اور ملی ہوتی تو میں اُسے اپنی خاندانی روایات کے مطابق 'اُٹھو بی بی جی!' کہتا۔ یہاں نہ تو وہ 'بی بی جی' تھی اور نہ ہی میں نور پور کا دیہاتی نوجوان تھا۔

وہ چونکی، دھیرے سے بولی۔ ''کون میڈم؟''

میں نے کہا۔ ''میرے ساتھ چل کر دیکھ لو۔''

وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ''میں کہیں نہیں جاؤں گی، خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو مجھے.....''

سونیا اُٹھ کر میرے عقب میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''باتوں میں وقت ضائع نہ کرو ورنہ میڈم کا موڈ خراب ہو جائے گا۔''

''تو کیا کروں؟ وہ اُٹھے تو تب ناں؟'' میں سونیا کی طرف پلٹا۔

ایک طنزیہ مسکراہٹ اُس کے لبوں پر مچل گئی۔ بولی۔ ''کیا تمہیں خدا نے ہڈ پیر نہیں دے رکھے؟''

اُس کے انداز نے مجھے سمجھا دیا کہ اسما اگر نہیں جانا نہیں چاہتی تو مجھے اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے اُسے میڈم کے قدموں میں لے جا کر پھینکنا ہوگا۔

میں نے قدرے درشت لہجے میں اسما سے کہا۔ ''اُٹھو،

مجھے اُٹھانے پر مجبور کرو گی تو پچھتاؤ گی۔''

اُس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرزیں اور وہ ایک جھٹکے سے، پیچھے، دیوار کی طرف کھسک گئی۔ دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا کر چیخی۔ ''خدا کے لیے شہریار! تم تو ایسا نہ کرو..... مجھے اِس جہنم سے نکالو۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہی۔''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میرا اور سونیا کا سوانگ ناکام ہو گیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ میں شہریار ہوں۔ میں نے ایک پاؤں بیڈ کے فوم پر رکھا اور اُسے کلائی سے پکڑ کر بے دردی سے کھینچ لیا۔ اس نے تڑپ کر میری گرفت سے نکلنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوئی اور قالین پر آن گری۔ چند لمحے قالین پر پڑی رہی پھر ایک جھٹکے سے اُٹھ کر مجھ پر حملہ آور ہو گئی۔ اُس کے بائیں ہاتھ کے ناخن میرے رخسار میں گڑ گئے۔ اُس کی غیر متوقع حرکت اور تیز چبھن نے مجھے اُس کی کلائی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چیخ کر پھر مجھ پر حملہ کرنے کے لیے بڑھی۔ اس کے ردِعمل نے مجھے بے حد برانگیختہ کر دیا اور میں نے اپنی پوری قوت سے تھپڑ اُس کے چہرے پر جڑ دیا۔ وہ پیروں پر گھومی اور لڑکھڑا کر بیڈ پر پیٹ کے بل جا گری۔ بے اختیار میرا ہاتھ میرے رخسار تک گیا، پلٹا تو ہتھیلی پر خون کا بڑا سا داغ نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے ناخن جلد میں خاصی گہرائی تک کھب گئے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ تکلیف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے دانت پیس کر آدھی بیڈ پر، آدھی بیڈ سے نیچے، اوندھی پڑی اسما کو دیکھا۔ پیر کی زوردار ٹھوکر رسید کی اور کمر پر لہراتی ہوئی زلفوں کو مٹھی میں جکڑ کر جھٹکا دیا۔ اُس کے حلق سے دردناک چیخ نکلی اور وہ زخمی ناگن کی طرح بل کھا کر پلٹی۔ اس کا حملہ کارگر نہیں ہوا کیونکہ اب میں سنبھل چکا تھا۔ میں نے بالوں کو جھٹکا دیا تو وہ سنبھل نہ سکی اور کمر کے بل زمین پر گر گئی۔ اس کے منہ سے خون رسنے لگا تھا۔ نازوں پلی ہوئی لڑکی پر میرا ہاتھ کچھ زیادہ ہی سخت پڑ گیا تھا۔

میں نے دو تین ٹھوکریں اُس کے پہلو میں ماریں اور گھسیٹنا چاہا۔ وہ کراہی اور میرے پیروں سے لپٹ گئی۔ ''خدا کے لیے شہریار! مجھ پر رحم کرو..... مجھے مت مارو.....''

اُس کی آواز میں بہ یک وقت شدید رنج اور شکوہ غالب تھا۔ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''اُٹھو.....''

اُس نے میرا وہ ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں سختی سے دبوچ لیا جس میں اُس کے بال جکڑے ہوئے تھے۔ آہستہ سے اُٹھی اور کراہتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کیا بگاڑا.....''

''بکواس نہ کرو.....'' میں نے اپنا ہاتھ تھپڑ مارنے کے لیے لہرایا۔ اس نے ڈر کر سر پیچھے کیا۔ ایسے میں اُس کی آنکھیں فرطِ خوف سے پھٹنے کو آ رہی تھیں۔ میں نے بال چھوڑ دیے اور کلائی تھام لی۔ اسے کھینچتے ہوئے سونیا کے کمرے سے نکالا اور ریٹائرنگ روم میں لے آیا۔ بیڈ پر نیم دراز میڈم کے سامنے پیش کر دیا۔ اُس نے بہ غور اسما کو دیکھا۔ ہونٹ پر ہونٹ چڑھا کر مسکرائی اور مستفسر ہوئی۔ ''یہ خون کیسا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ آپ کے پاس آنا نہیں چاہ رہی تھی۔''

اسما چیخی۔ ''مجھے کیوں یہاں رکھا ہوا ہے تم لوگوں نے، کیا قصور کیا ہے میں نے؟ تم جانتے نہیں ہو کہ میں کس کی بیٹی ہوں؟ میرا باپ تم لوگوں کو الٹا لٹکا دے گا۔''

میڈم کی آنکھیں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس کی دھمکیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے مخاطب ہوئی۔ ''میں اِس کے باپ کا نمبر ملاتی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کی چیخ و پکار اپنے کانوں سے سن لے۔''

میں نے سر تسلیم خم کیا۔ وہ فون ہاتھ میں پکڑ کر اسما سے مخاطب ہوئی۔ ''تمہارے باپ کا موبائل فون نمبر کیا ہے؟''

اسما جلدی سے بولی۔ ''گاؤں میں موبائل فون نہیں چلتا۔''

''گھر کا نمبر؟''

اسما بولی۔ ''زیرو سکس.....''

وہ اٹک اٹک کر بولتی گئی، میڈم بٹن پش کرتی گئی۔ کال مل گئی۔ اسما کچھ کہنا چاہتی تھی مگر سسک کر چپ ہو گئی۔ میڈم کا فون پر رابطہ ہو گیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''سردار صاحب سے بات کروائیں۔ فوراً!''

ایسے ہی وقت میں اسما نے قدم بڑھایا۔ میڈم کی توجہ اُسی پر مرکوز تھی، فوراً بولی۔ ''اِسے روکو، جب کہوں، تب اُس کے حلق سے چیخیں برآمد کرانا..... او کے؟''

میں نے اسما کے بال مٹھی میں بھر لیے۔ وہ سسک کر پلٹی اور مجھے گھورتے ہوئے، دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔ ''چھوڑو میرے بال..... کمینے.....''

میں نے ہاتھ اُٹھایا۔ وہ سہم کر بولی۔ ''نہیں..... خدا کے لیے نہیں.....''

اُس کی آواز کی تندی سسکیوں میں ڈھل گئی اور وہ بے دم سی ہو کر ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

میڈم کی آواز سنائی دی۔ ''سردار حیدر خان! کیسے ہو؟ ملتان سے میڈم شکیلہ بات کر رہی ہوں۔''

سردار حیدر خان کی بات سن کر ایک زہر خند مسکراہٹ میڈم کے لبوں پر ثبت ہو گئی۔ بولی۔ ''انسانوں کی طرح

میری بات سنو۔ میں جانتی ہوں کہ تمہاری پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ تمہیں شاید یہ بات کہتے ہوئے یاد نہیں رہا کہ اوپر والوں کے سر میرے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں نے تمہیں فون اِس لیے کیا ہے کہ تم نے سیکڑوں معصوم لڑکیوں کی درد بھری چیخیں سن رکھی ہیں۔ ہزاروں فریادیں تمہارے کانوں کے پردوں پر ثبت ہیں۔ آج ایک نئی آواز سنو اور محسوس کرو.....''

اسی وقت اُس نے بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں پھیلائیں اور مخصوص انداز میں ہاتھ کو نچا کر مجھے اشارہ کیا۔ میں نے اسما کے بالوں کو زوردار جھٹکا دیا۔ اسما کے ہونٹوں سے ایک سسکاری نکلی۔ میڈم نے مایوسی سے سر ہلایا۔ میں نے اُس کا چہرہ اپنی جانب کیا اور الٹے ہاتھ کا تھپڑ اُس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ اُس کے حلق سے دردناک چیخ نکلی۔ میں نے پھر ہاتھ اُٹھایا۔ دوسری چیخ پہلی سے کہیں زیادہ المناک تھی۔

میڈم نے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا اور فون میں بولی۔ ''کیسی خوب صورت آواز ہے سردار صاحب! پہچانی؟''

سردار حیدر خان نے کیا کہا، علم نہیں مگر اُس کی بات سن کر میڈم کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ سرد لہجے میں بولی۔ ''ان دھمکیوں پر عمل کرنے کے لیے تمہارے پاس طویل وقت پڑا ہے سردار حیدر! لیکن اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے ملنے والی مہلت بہت کم ہے۔ فوراً میری مطلوبہ لڑکی میرے حوالے کرواور اپنی بیٹی وصول کرو ورنہ تمہاری بیٹی بھی اُنہی کوٹھیوں کی دلہن بنے گی جن حویلیوں کے آنگن تم نے آج تک آباد کیے ہیں۔ آج رات بارہ بجے..... اُس کے بعد..... اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی سودے بازی نہیں ہو گی۔''

جملہ مکمل ہوتے ہی اُس نے ہونٹ بھینچ کر کال منقطع کر دی۔ کچھ سوچ کر فون 'پاور ڈ آف' کر دیا۔ اسما کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''خانزادی! اب گیند تمہارے باپ کے کورٹ میں ہے۔ چاہے تو نمبر حاصل کر لے، چاہے تو فاؤل کھیل کر پوائنٹ گنوا لے۔''

اسما کا سر جھکا ہوا تھا۔ سسکیوں کی تال پر جسم جھٹکے لے رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ نڈھال انداز میں فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ وہ ہوش میں تھی مگر اس کے بدن میں طاقت نہیں رہی تھی۔ میں نے اُسے کھینچ کر اُٹھانا چاہا تو میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا، بولی۔ ''اسے اُٹھا کر سونیا کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔ خوبصورت چہروں کو اتنا بگاڑنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ تھوڑا سہلا دینا.....''

اس کے لہجے سے جھلکتا ہوا طنز بڑا زہریلا تھا۔ میں نے اسما کو اُٹھنے کا حکم دیا۔ وہ نفی میں سر ہلا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تم ظالم لوگ ہو، تم انسان بھی نہیں ہو۔ ذلیل کرنے سے بہتر ہے تم مجھے مار ڈالو..... مجھے زندہ مت چھوڑو۔''

میں نے کہا۔ ''زیادہ باتیں نہ کرو، اُٹھو..... جب مارنے کا وقت آئے گا، رعایت نہیں کی جائے گی۔''

وہ بدستور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں اُٹھ نہیں سکتی۔''

میں نے جھک کر اُسے بانہوں میں بھر کر اُٹھا لیا۔ اس کے بدن میں حسن کی تمام تر تابناکیاں موجود تھیں مگر وزن نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں اُس کے بازوؤں کو چھوا تھا۔ کھالے کے ردِعمل نے مجھے دنیا کا خوش قسمت مرد قرار دیا تھا۔ آج وہ میری بانہوں کے حصار میں، میری دسترس میں تھی مگر میرے پہلو میں دھڑکنے والا دل پہلے سے جذبات سے عاری تھا۔ اُسے بانہوں میں بھرے ریٹائرنگ روم سے نکلا۔ بڑے کمرے میں آیا۔ پاؤں قالین پر پڑے تکیے میں الجھا اور توازن برقرار نہ رکھ پاتے ہوئے اُسے لیے قالین پر جا گرا۔ وہ میرے نیچے دب گئی۔ اُس کے حلق سے چیخ نکلی، کراہی۔ ''ہائے! مر گئی.....''

میں جلدی سے اُٹھا اور اسے گھسیٹ کر سونیا کے کمرے میں لے گیا۔ اس دوران اسما کی کراہیں میری سمع خراشی کرتی رہیں کیونکہ میں اتنا ظالم فطرت کبھی نہیں رہا تھا۔ میں نے کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا، نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود ندامت، تکلیف یا رحم دلی کا کوئی جذبہ میرے سینے میں نمو پذیر نہیں ہوا تھا۔

میں نے اسما کو بیڈ کے پاس لا کر پھر بانہوں میں بھرا اور اُٹھا کر بیڈ پر پٹخ دیا۔ وہ پہلو کے بل بیڈ پر گری اور بے جان انداز میں لیٹ گئی۔ اس کے ہونٹوں کے دونوں گوشوں سے خون رس رہا تھا اور رخساروں پر پھیل رہا تھا۔ آنکھیں مجھ پر ساکت انداز میں ثبت تھیں۔ اپنی بے توقیر فریاد زبان کے بجائے آنکھوں سے عیاں کر رہی تھی جسے نظر انداز کرنا میرے لیے ناگزیر تھا۔ میں اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

سونیا کے نزدیک جیسے اِس واقعے کی کوئی اہمیت نہیں تھی، وہ سوفے میں پسر کر بیٹھی میگزین پڑھ رہی تھی۔ نظریں اُٹھائے بغیر بولی۔ ''گڈ شو مسٹر ہینڈسم! مارتے ہو، بانہوں میں بھر کر اُٹھاتے ہو اور جوانی کی شراب پینے سے کتراتے ہو، کیا تضاد ہے؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو بولی۔ ''اَب اس خونخوار بلی کا نقشہ بھی درست کر دو۔ الماری میں کاٹن،

اسپرٹ اور تنکچر وغیرہ پڑے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

''میڈم کو بدصورت لوگ اچھے نہیں لگتے ناں! فرسٹ ایڈ بکس نکالو اور اس کے زخموں پر سپرٹ لگا کر کاٹن سویب رکھ دو۔'' وہ پہلی سی بے پروائی سے بولی۔ ''کیا تمہیں میڈم نے کہا نہیں؟''

مجھے میڈم کا طنزیہ انداز میں کہا گیا جملہ 'ذرا سہلا دینا' یاد آیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری میں جدید نوع کی میڈیکل کٹ پڑی تھی۔ اس میں موجود سامان کا سرسری جائزہ لیا۔ اس سے پہلے نور پور کے سرکاری اسپتال کی کٹ دیکھ رکھی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی سے ابتدائی طبی امداد بہم پہنچانے کے بہت سے قاعدے ضابطے سیکھ رکھے تھے۔ سیکھا ہوا ہنر کام آنے والا تھا۔ کٹ اُٹھائے بیڈ پر آیا۔ اُسے پکارا تو جواب ندارد..... جھنجوڑا تو اس نے بیزاری سے مجھے اور میرے ہاتھوں میں دبی میڈیکل کٹ کو دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

میں نے کہا۔ ''چہرہ ادھر کرو، زخم کی صفائی کردوں۔''

میرے عقب میں سونیا کی آواز اُبھری۔ ''تم اس کی بینڈیج کرنے کے ساتھ ساتھ نگرانی بھی کرو۔ میں آپریشن روم میں جارہی ہوں۔''

لگتا تھا کہ وہ اسما کی نگرانی کے نام پر قید میں رہتے ہوئے بور ہوگئی تھی اور کمرے سے نکل کر چلنا پھرنا چاہتی تھی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ جونہی کمرے سے نکلی، اسما ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی اور میرا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''یہ ڈراما بازی بعد میں کرنا، پہلے میرے سوالوں کا جواب دو؟''

میں نے اپنے لہجے میں درشتی سموتے ہوئے کہا۔ ''کیا مطلب؟ کیا پوچھنا چاہتی ہو؟''

''تم شہر یار ہی ہو نا..... نور پور والے؟'' اُس کے لہجے میں دُکھ آمیز اُمید کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ تن پر اتنا کچھ بیتنے کے بعد بھی اُس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''میں نہ تو کسی شہر یار کو جانتا ہوں اور نہ ہی نور پور سے کچھ واسطہ رکھتا ہوں..... کچھ اور پوچھنا ہے؟''

اسے میری بے گانگی اور بدتمیزی سے دکھ پہنچا۔ مایوس ہو کر بولی۔ ''مانو یا نہ مانو، تم شہر یار ہی ہو۔ پہلی مرتبہ میں نے تمہیں چاچے وریام کی دھی (بیٹی) کی شادی پر بڑے غور سے دیکھا تھا۔ دوسری مرتبہ تب دیکھا تھا جب تم خالد کے ساتھ چمن زار میں آئے تھے..... جب موبی اور اُس کے غنڈے میر تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے اور.....''

میں نے اپنے چہرے کو اسپاٹ رکھا اور قدرے غصے سے کہا۔ ''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔''

''نہیں.....'' اُس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا، آنکھیں موند لیں اور بولی۔ ''میرا دماغ خراب نہیں ہوا۔ میری نظر کمزور نہیں ہے۔ میں تمہیں پہچان چکی ہوں کہ تم شہرے خان ہو۔ نور پور کے رہنے والے ہو۔ خدا کے لیے مجھے اتنا بتا دو کہ تم لوگوں نے مجھے کیوں اغوا کیا ہے؟ کیا تم لوگ مجھے قتل کردو گے؟''

اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے میں باتھ روم میں نصب شدہ واش بیسن کی ٹونٹی سے پانی بھر لایا۔ پھر میڈیکل کٹ کھول کر سپرٹ، آئنٹمنٹ اور کاٹن رول نکالا۔ سیزر اور دوسرے ضروری آلات نکال کر کٹ کے کھلے ہوئے ڈھکن پر رکھے اور چاہا کہ اس کے چہرے اور گردن پر چمکنے والے خون کو صاف کردوں مگر اس نے میرے ہاتھ کو جھٹک کر جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میں نے کیا پوچھا ہے؟''

میں نے آنکھیں دکھائیں۔ ''کیا تم مجھے سختی پر مجبور کر رہی ہو؟ میں نہیں چاہتا کہ تم پر ہاتھ اُٹھاؤں مگر تم نجانے کس مٹی کی بنی ہو کہ تم پر اثر نہیں ہوتا۔''

میں نے اُس کی کلائی پکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ میرے جارحانہ رویے کو بھانپ کر خوف زدہ ہوگئی اور سسکتے ہوئے قریب ہوگئی۔ میں نے پانی میں بھیگی ہوئی روئی سے اُس کے رخسار اور گردن کی جلد کو صاف کیا۔ تازہ خون کے نیچے جما ہوا خون ذرا مشکل سے صاف ہوا۔ اُس کے ہونٹوں کو صاف کیا اور منہ کھولنے کا حکم دیا۔ ماؤتھ جیک کی مدد سے منہ کھولا اور رخساروں کی اندرونی جلد جو تھپڑ کے زور پر دانتوں سے ٹکرا کر کٹ گئی تھی، صاف کی اور کاٹن کے ننھے ننھے سویب بنا کر جلد پر چپکائے۔ اُس کی خاموش آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ایک اینٹی بائیوٹک کیپسول اور پونسٹان کی گولی کھلائی اور پانی سے بھرا گلاس لبوں سے لگا دیا۔

وہ بولی۔ ''جب مارنا ہی ہے تو پھر مرہم لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''میں کچھ نہیں چاہتا۔ میری میڈم چاہتی ہے کہ تم اس کے ساتھ تعاون کرو۔ جو کہا جائے، بلا چوں چراں اس پر عمل کرو۔ یہ ماراماری میڈم کو پسند نہیں ہے مگر.....''

''مگر میں نے کیا بگاڑا ہے تمہاری میڈم کا؟'' وہ کراہی۔ منہ میں کاٹن سویب رکھے جانے کی وجہ سے اُس کی قوتِ گویائی متاثر ہوئی تھی۔

''تم نے نہیں، تمہارے باپ نے پنگا لیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میری میڈم کا کچھ لین دین ہے، نمٹ جانے پر تمہیں گھر پہنچا دیا جائے گا۔''

''کیا وہاں سب کو میرے اغوا کا پتا چل گیا ہے؟'' اُس نے اپنی نم آنکھیں مجھ پر مرتکز کردیں۔

''مجھے تمہارے وسیب کے بارے کچھ علم نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم شہر یار ہی ہو ناں؟'' اس نے اچانک بڑے معصوم انداز میں پوچھا۔

میں نے چہرے پر بیزاری کے آثار ثبت کیے، کہا۔ ''یہ شہر یار کون ہے جس کا تم بار بار نام لیتی ہو۔ کہہ چکا ہوں کہ میرا نام شہر یار نہیں ہے۔''

''پھر تمہاری شکل اُس سے کیوں ملتی ہے؟''

''یہ سوال تم اُس سے کرنا۔''

''کیا وہ مجھے ملے گا؟''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

ایسے ہی وقت کمرے میں ٹیلی فون کی بیل بجی۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ کوئی فون سیٹ نظر نہیں آیا۔ بیل بدستور بج رہی تھی۔ میری سراسیمگی دیکھ کر اسما سنگھار میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ..... انٹرکام بج رہا ہے.....''

سنگھار میز اور سوفے کے درمیان دیوار پر نصب چوبی اسٹینڈ پر انٹرکام دھرا تھا۔ میں نے ریسیور اُٹھا کر کانوں سے لگایا۔ میڈم کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''شہر یار! تمہارا چھپنا بے محل ہے۔ اسما سے سیدھی سیدھی بات کرو۔ میں نے اُس کی آنکھیں پڑھ لی ہیں۔ وہ تمہارے کسی جھوٹ پر یقین نہیں کر رہی۔ اس لیے فضول کوششوں سے بہتر ہے کہ تم اُسے سردار حیدر کے کالے کرتوتوں سے آگاہ کرتے ہوئے اپنے لیے ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔''

''جج..... جی میڈم.....!'' فرطِ استعجاب سے میرے منہ سے لفظ برآمد نہ ہو پائے۔ یہ عجب گورکھ دھندا تھا، عجائب خانۂ انسان تھا۔ وہ دور بیٹھی نہ صرف ہمارے مکالمے سن رہی تھی بلکہ اُس نے اسما کی آنکھوں میں موجزن قلبی یقین کی دارداتوں کا جائزہ بھی لے لیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''جی میڈم..... آپ بہت ذہین ہیں۔''

''تم نے میری ذہانت دیکھ لی، اچھی بات ہے۔ اَب تم مجھے اپنی اہلیت دکھاؤ۔ میں بھی دیکھوں کہ تم بگڑی ہوئی خانزادی کو کیسے اپنے دام میں لاتے ہو۔'' اس کی نقرئی ہنسی میں ترغیب، چیلنج اور آزادی کی بخشش شامل تھی۔

خدارا ◉ خدارا

شوگر کے مریض

ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبۂ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کرلیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کرسکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0308-6627979

0547-521787

میں نے انٹرکام کا ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ پلٹ کر بیڈ پر سر افگندہ براجمان اسما کے پاس آیا۔ قربت نے آگاہ کیا کہ وہ گھٹنوں پر سر رکھے سسک رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''کیا رونے دھونے سے تمہیں نجات مل جائے گی؟''

اُس نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ آنکھیں اشکوں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ بولی۔ ''تم کیوں نہیں مانتے کہ تم شہر یار ہو؟''

مجھے اُس کی ذہنی حالت پر ترس آیا۔ وہ سوچتی کچھ تھی، بولتی کچھ تھی۔ شاید وہ ڈوبتے ہوئے اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ میں اُسے سہارا دے کر پتن پر لے جاسکتا ہوں۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اور تم کیوں اپنی بات منوانے پر بضد ہو؟''

''تم شہر یار ہی ہو..... مگر ڈر کے مارے مکر رہے ہو۔ تمہیں میرے بابا کا ڈر ہے۔ کوئی اور جانے، نہ جانے، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بابا تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''مجھے تمہارے باپ کا کوئی ڈر نہیں ہے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''فرض کیا، میں ہی شہر یار ہوں، پھر؟''

''پھر..... پھر.....'' وہ بولتے بولتے الجھ گئی۔ اس نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر میں واقعتاً شہر یار ہوں تو مجھے کیا کہنا چاہیے گی؟ میرے لبوں پر ابھرتی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر ایک ذرا تلملائی، پھر سنبھل کر بولی۔ ''خالد کہاں ہے؟''

مجھے اِس سوال کی توقع تھی، کہا۔ ''میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ہم چمن زار کے گیٹ پر بچھڑے تھے، پھر آج تک ہم مل نہیں پائے۔''

اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک ابھری اور اس نے آنکھیں موند لیں۔ چند لمحوں تک بیٹھی الفاظ مجتمع کرتی رہی، پھر بولی۔ ''میں ناں کہتی تھی کہ تم وہی ہو..... ہاں! مجھے 'بی بی جی' کہتے تھے ناں تم؟ پھر اسی بی بی کو بھری دنیا میں بے عزت اور ننگا کر دیا..... ہیں؟ اب بتاؤ، میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ کیا تکلیف دی تھی؟''

میں نے سر جھکا لیا۔ اُس پر جھنجلاہٹ کا دورہ پڑا۔ اُس نے بغیر سانس لیے کئی سوال کیے، کئی طعنے دیے اور اپنے طور پر ہی ان کے جوابات سے سرفراز کیا۔

جب وہ بول بول کر تھک گئی تو میں نے سر اُٹھایا اور کہا۔ ''اسما! احترام ہمیشہ دوطرفہ ہوتا ہے۔ محبت کی شاہراہ بھی دوروبہ ہوتی ہے۔ تمہیں 'بی بی جی' کہا کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ میری بہن کو بھی احتراماً 'بی بی جی' ہی کہہ کر پکارا جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ ایک ہی خون..... ایک ہی جاتی..... کیا ہوا جو تمہارے بابا کے پاس جاگیر اور روپیہ پیسہ آ گیا اور ہم تہی دست رہ گئے۔''

میں نے بیڈ چھوڑ دیا۔ پشت پر ہاتھ باندھ کر مقابل کی دیوار تک گیا، پلٹا، کامل سنجیدگی سے بولا۔ ''سردار حیدر خان، تمہارا بابا، بیسا کھیاں مانگنے نور پور آیا کرتا ہے۔ اُسے اسمبلی تک پہنچنے کے لیے ہم دیہاتیوں اور غریب لوگوں کے ووٹ درکار ہوتے تھے۔ تب بھی ہم نے کبھی اُسے مانگنے کی اذیت سے دوچار نہیں کیا بلکہ اس کی آؤ بھگت کرتے ہوئے یقین دلایا کہ ہمارے ووٹ اُس کے انتخابی نشان سے چپکے ہوئے ہیں۔ بھلے وہ ہمیں کوئی گلی، نالی، پلی یا سولنگ دے، نہ دے، ووٹ اُسے ہی ملیں گے۔ ملتے بھی رہے..... نور پور کے کسی لڑکے کو تمہارے بابا نے آج تک نوکر نہیں لگوایا۔ کسی بیٹی کے لیے جہیز فنڈ سے رقم نکلوا کر نہیں دی، پھر بھی نور پور والے اُس کے جوتے سیدھے کرتے ہیں۔''

وہ آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہی تھی اور میرے لبوں سے برآمد ہونے والے زہر خند الفاظ انہماک سے سن رہی تھی۔ میں نے گلا کھنکار کر سلسلہ کلام جوڑا۔ ''اسما! تمہیں بی بی کہا کرتا تھا، مگر آج نہیں کہوں گا کیونکہ آج تم عام سی لڑکی ہو جس کا نام 'اسما' ہے۔ میری نظر میں تم خانزادی نہیں رہی ہو بلکہ کمین زادیوں سے بھی بدتر لڑکی ہو۔ تمہارے باپ نے میری بہن کو اغوا کرایا ہے۔ کیوں؟ جانتی ہو کیوں؟..... اس نے اپنی جنسی بھوک مٹانے کے لیے اپنی برادری کی غریب بیٹی کو، اپنی ہی بیٹی کو لقمہ بنایا ہے۔ وہ اَب بھی اُس کی تحویل میں ہے۔ میں شاید کبھی بھی یہ حرکت نہ کرتا مگر تمہارے بابا کی کمینگی کی وجہ سے تمہیں یہ دن دیکھنا پڑا۔ تجھے اسی طرح اغوا کرنا پڑا جس طرح تمہارے بے غیرت باپ نے میری بہن کو جیتے جی بے غیرتی کی دلدل میں اُتار دیا گیا۔ وہ اگر زندہ بچ بھی گئی تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گی۔ ہر انگلی، ہر نگاہ..... تیر بن کر اُس کا بدن چھیدیں گی۔ جبکہ تم یہاں سے جانے کے بعد بالکل ویسی ہی ہوگی، جیسی یہاں لائے جانے سے پہلے تھیں کیونکہ کسی کو تمہارے بارے میں کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوگی۔''

اُس کے منہ سے ایک کلمۂ حیرت تک نہیں نکلا۔ ایک ٹک مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے اُس کی جانب پشت کر لی اور درشت لہجے میں کہا۔ ''تمہارا باپ، مربعوں رقبے پر پھیلی ہوئی جاگیر کا مالک، مل مالک، منہ کالا کرتا ہے تو اُسے کوئی نہیں پوچھتا کیونکہ وہ ہر محتسب کے بازوؤں کو آستین سمیت خرید لیتا ہے۔ اسے اپنی طاقت پر گھمنڈ ہے۔ بجائے شکست

تسلیم کرنے کے اُس نے اپنے پالتو غنڈے یہاں بھیج کر اعلانِ جنگ کر دیا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ پروین کو لوٹائے بغیر اپنی بیٹی کو حاصل کر لے گا مگر یہ اُس کی بھول ہے..... تم تب تک یہاں ہو، تب تک عذاب میں ہو جب تک میری بہن اُس کتے کی قید میں ہے۔''

میں اچانک پلٹا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا اُس کے پاس آیا، بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور کہا۔ ''مجھے تم سے، تمہارے بابا سے، خاندان بھر سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میری بہن قدم قدم موت کی طرف دھکیلی جا رہی ہے۔ تم بھی لمحہ لمحہ اذیت ناک اور عزت پاش انجام کی طرف لے جائی جا رہی ہو۔ کیا سمجھیں؟''

مارے تکلیف سے اُس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے، گردن اکڑی ہوئی تھی مگر آنکھیں بول رہی تھیں۔ اُس نے اپنے بال چھڑانے کی مطلق کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے غرا کر کہا۔ ''بولتی کیوں نہیں ہو؟ میں نے مان لیا ہے کہ میں شہر یار ہوں..... نور پور والا شہر یار..... یہ بھی بتا دیا ہے کہ میں نے تمہیں کیوں اغوا کر کے یہاں قید میں رکھا ہوا ہے۔''

اُس نے بدقت تمام کہا۔ ''اب کہنے کے لیے میرے پاس کیا بچا ہے شہرے خان! میرے بال چھوڑ دو، تکلیف ہو رہی ہے۔''

میں نے ہاتھ کو ایک جھٹکا دیا، وہ درد سے کراہی تو میں نے بالوں میں پھنسی ہوئی مٹھی کھول دی۔ وہ اپنے بالوں میں نقاہت سے انگلیاں پھیرتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ میں نے بیڈ پر بیٹھ کر سر جھکا لیا اور اگلی پیش قدمی کے بارے میں سوچنے لگا۔

ایسے میں اُس کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''شہرے! کیا میری زندگی تمہاری بہن کی زندگی کے ساتھ مشروط ہوگئی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں اسما! تمہارا بابا جو فصل بیجے گا، تمہیں کاٹنی پڑے گی۔''

''یعنی مجھے نا کردہ جرم کی سزا دی جائے گی؟'' اُس کے لہجے کی غیر معمولی کاٹ نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ پڑھی لکھی اور بڑے گھر کی لاڈلی بیٹی تھی۔ جونہی میں نے اپنی حیثیت کو تسلیم کیا، وہ پل بھر میں بل کھا کر مستحکم ہوگئی، بولی۔ ''جو کچھ تمہاری بہن کے ساتھ کیا جائے گا، میرے ساتھ بھی کیا جائے گا، یہ طے کر لیا گیا ہے..... ہے نا؟''

میرے اعصاب تن گئے۔ ہونٹ بھنچ گئے۔ ہم دونوں ایک ہی محاذ پر مقابل آن ٹھہرے تھے۔ وہ مجھے، میں اُسے پسپا کرنے کے لیے تیار تھا، میں نے کہا۔ ''ظاہر ہے..... بہن سے بڑھ کر تو کوئی پیارا نہیں ہوتا۔''

''تم پڑھے لکھے ہو شہرے خان! کچھ سوچ کر بولو۔''

''تمہارا بابا بھی پڑھا لکھا ہے۔ وہ سوچے سمجھے بنا قدم اُٹھاتا ہے۔''

''مجھے بابا کا طعنہ نہ دو، میری بات کرو۔''

''تمہارا باپ غنڈہ ہے، بے غیرت ہے۔''

''ٹھیک ہے، ایسا ہی ہوگا۔ تم اپنے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بولی۔ ''اُس نے تمہاری بہن کی عزت پامال کرنے کے لیے اپنے اختیارات کو استعمال کیا۔ تم نے اُس کی بیٹی کو قوتِ بازو کے زور پر اُٹھا لیا۔ کوئی فرق؟''

''میں نے جواباً ایسا کیا ہے۔ مجھے میری بہن چاہیے۔ جونہی ملی، تمہیں یہاں سے نکالنے میں دیر نہیں کروں گا۔''

''جرم سوالاً ہو یا جواباً، اُس کی حیثیت ایک سی رہتی ہے۔''

''تم کہہ سکتی ہو کیونکہ اس وقت تمہاری اور میری قلبی کیفیت جدا ہے۔''

''ہاں! میں اور تمہاری بہن ایک ترازو میں تل رہی ہیں۔ تم نہیں۔''

مجھے میڈم کا فکر تھا۔ وہ نظر آئے بغیر میری اور اسما کی بات چیت سن رہی تھی۔ میں شکست کا بوجھ کاندھوں پر لاد کر اُس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اسما دم بہ دم میرے پیروں تلے سے ریت کھسکائے جا رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ''شہرے خان! میں جانتی ہوں کہ میرا بابا بظاہر بہت اچھا آدمی ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ ہر وہ جرم دھڑلے سے کرتا ہے جو ہمارے معاشرے کے فیوڈلز کرتے ہیں۔ میں نے کبھی بھی بابا کی ان ایکٹویٹیز کو پسند نہیں کیا۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ صدف نے تمہیں ڈاکٹر شاہ جی پر حملے کی پیشگی اطلاع دی تھی۔ یاد ہے نا؟ وہ خبر صدف کو کس نے دی تھی؟ تم نہیں جانتے۔ بتائے دیتی ہوں۔ میں نے ہی صدف کو تم تک یہ اطلاع پہنچانے کے لیے دی تھی۔ تم تک پہنچنے والا رقعہ صدف نے نہیں، میں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی اور بخت خان آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ وہ رقعہ، جس سے غلط فہمی کی ڈور تھام کر بلو میرے سر پر سوار ہوگئی تھی اور مجھے کھالے کے ہاتھوں زخمی ہو کر ڈاکٹر شاہ جی کے پاس داخل ہونا پڑا تھا۔ تب میں نے

سمجھا تھا کہ وہ صدف کی ہینڈ رائٹنگ تھی۔ اَب اسما بیٹھی سمجھا رہی تھی کہ ان لفظوں کے تخلیق کار اُس کے ہاتھ تھے۔

میں نے تشکیک آمیز انداز میں پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے؟''

اُس نے قدرے آزردہ لہجے میں کہا۔ ''اگر یہ سچ نہیں ہے تو پھر سوچو، صدف کو بابا کے منصوبے کی خبر کیسے ہوئی؟''

اس کی بات جھٹلائے جانے کے لائق نہیں تھی۔

میں نے کہا۔ ''مگر.....''

''اگر مگر کچھ نہیں شہرے خان!'' وہ تھک سی گئی۔ ''میں رہائی کی بھیک نہیں مانگتی کیونکہ میرے خون میں میرا خاندانی وقار اور میری اَنا رچی بسی ہے۔ میں صرف اتنی سی درخواست کروں گی کہ جب یہ طے کرلیا گیا ہے کہ مجھے ناکردہ گناہوں کی سزا دی جائے گی تو اتنی رعایت ضرور دی جائے کہ مجھے قتل کردیا جائے، میری لاش کو کسی ویرانے میں پھینک دیا جائے مگر میری عصمت دری نہ کی جائے۔ مجھے میری نظروں سے گرایا نہ جائے۔ شاید میرا بابا پروین کے ساتھ یہی کچھ کرے گا مگر چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ ایسا کچھ نہ کیا جائے۔''

اُس کے چہرے پر عجیب سا کرب اپنی تمام تر خنکی سمیت ابھرا تھا۔ مجھے دکھ ہوا، اُس کی درخواست پر ترس آیا مگر میں پروین کے ملنے تک اُس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔

وہ مجھ پر نظریں مرتکز رکھتے ہوئے بولی۔ ''شہرے! میں نے تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ میں نے تو خالد سے بھی نفرت نہیں کی۔ یہ جانتے ہوئے کہ میری اور اس کی راہیں متضاد ہیں، کبھی اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ کسی دل کو ویران کرنا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے سچی محبت کرتا ہے۔ مجھے دیوی مان کر میری پوجا کرتا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ بابا کو جونہی ہماری ملاقاتوں کا علم ہوگا، وہ خالد کو زندہ درگور کردے گا مگر میں پھر بھی اپنی سرشت پر قابو پانے میں ناکام رہتی ہوں..... کیا میرا کوئی عمل بھی لائقِ تحسین نہیں ہے؟ اگر ہے تو مجھے اُسی کا ثمر دیا جائے اور میری عزت پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔''

میری خاموشی کو اُس نے انکار تصور کیا اور میری جانب کھسک کر میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔ ''کیا میری اتنی سی بات بھی نہیں مانی جاسکتی؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ سوجن زدہ، روئی روئی سی..... نڈھال تاثرات لیے درخواست گزار آنکھیں مجھے بے بس کرنے لگیں۔ میں نے آہستگی سے کہا۔ ''اسما! مجھے اس وقت دنیا میں سوائے پروین کے کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔ جا کر اپنی میڈم سے بات کرتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ تمہاری حیدر خان سے فون پر بات ہوجائے اور تم اُسے مجبور کرو کہ وہ پروین کو فوراً رہا کردے۔ میں تمہاری باتوں کو حق مانتا ہوں، تم بھی میری مجبوری کو ناگزیر مانو۔''

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی، بولی۔ ''شہرے! تمہیں پروین کی بے بسی دکھائی دیتی ہے، میری نہیں۔ کیا اس سے پہلے تمہارے ساتھ کوئی ظلم نہیں ہوا؟ کیا تمہیں اپنے ماں باپ کا قاتل ملا ہے؟ کیا تمہیں اُس سبب کا پتا چلا ہے جس نے تمہارے جوان العمر والدین کو نگل لیا؟..... نہیں نا! اگر تمہیں پتا نہ چلتا کہ پروین کہاں ہے تو تم کیا کرلیتے؟ کیا پوری دنیا کی لڑکیاں یرغمال بنا لیتے؟..... انصاف کرو، خدا انصاف کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔''

''کیا تم اُسے جانتی ہو؟''

''کسے؟'' وہ چونکی۔

''میرے ماں باپ کے قاتل کو؟''

''نہیں تو.....'' وہ بولی۔

''پھر تم نے یہ کیوں کہا؟''

''میں نے تمہاری آنکھیں کھولنے کے لیے کہا ہے۔''

اُس نے میری دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ میں جلتے ہوئے روم میں نیرو کی بانسری تھامے زندگی گزارتا آیا تھا۔ آج تک کسی نے یہ طعنہ نہیں دیا تھا۔ اُس نے دیا تو میں بلبلا اُٹھا۔ تڑپ کر، اپنے ہاتھ چھڑا کر کھڑا ہوگیا۔ اُس کی طرف پشت کرکے کھڑا ہوگیا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''مجھے زندگی نے جو کچھ دیا ہے، وہی لوٹاؤں گا۔''

اس کا ہاتھ کاندھے پر محسوس ہوا تو پتا چلا کہ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔ چونکہ مجھے اُس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا، اِس لیے میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور کہا۔ ''اسما! یہ سلطنت میری نہیں ہے۔ یہ میڈم کی ہے۔ میڈم کون ہے؟ میڈم میری محسنہ ہے۔ جس دنیا میں مجھے کسک پر کسک عطا ہوئی، اُسی دنیا میں اُس کے لب و لہجے کے مرہم اور احسانات نے زندہ رہنے کی تقویت دی۔ وہ جو چاہے گی، میں کروں گا۔ اگر وہ کہے گی کہ میں تمہیں کتوں کے آگے ڈال دوں، دیر نہیں کروں گا۔ اگر کہے گی کہ تمہیں پھولوں میں سجا دوں، ایک پل کو بھی نہیں سوچوں گا۔''

اس کی گلوگیر آواز میری سماعت میں پڑی۔ ''میں میڈم سے نہیں، ایک خانزادے کے آگے ہاتھ جوڑ رہی ہوں۔''

''میں خانزادہ نہیں ہوں۔ اگر ہوتا تو میرے ماں باپ کو یوں بے دردی سے قتل نہ کیا جاتا۔ میری بہن کو بھرے

گاؤں سے یوں اُٹھا نہ لیا جاتا۔''

میری بات سن کر وہ بجلی کی سی تیزی سے لپک کر میرے مقابل آ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے میرا گریبان تھام کر جھٹکے دینے لگی، وفورِ جذبات سے چیختے ہوئے بولی۔ ''کیا میں نے یہ سب کچھ کیا ہے؟ سردار حیدر خان نے کیا ہے تو جا کر اُس کی گردن پکڑو..... اس کی عزت وسیب میں اچھالو۔ اگر تمہیں خاندانی غیرت کا کوئی پاس ہے تو مجھے چھوڑ دو اور اپنے مجرم کو پکڑو۔ پھر کہوں گی کہ شہریار غیرت مند انسان ہے، انصاف پسند ہے..... وگرنہ تم میں، تمہاری میڈم میں اور میرے بابا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سب کتے ہیں، سب خونی بھیڑیے ہیں جنہیں کھانے کو کچھ نہ ملے تو اپنی ماؤں بہنوں کا ماس کھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ آئی ہیٹ یو..... آئی ہیٹ یو.....''

میں نے بدقت اپنا گریبان چھڑایا۔ ایک آدھ بٹن بھی ٹوٹ گیا۔ مجھے اُس کی حالتِ زار پر ترس آیا۔ وہ بری طرح لرز رہی تھی۔ آگے پیچھے ڈول رہی تھی۔ کسی پل بھی زمین بوس ہوسکتی تھی۔ میں نے اُسے شانوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا تو وہ لمبی لمبی سانسیں لیتی ہوئی کمر کے بل فوم پر گر گئی۔ آنکھوں پر بازو رکھ کر رونے لگی۔ ایسے میں اُس کا بدن ہچکیوں کے دم پر اوپر نیچے ہونے لگا۔ مجھے دل ہی دل میں شرمندگی کا احساس ہوا۔ کمرے سے نکلنا چاہا تو انٹرکام کی جلترنگ نے قدم تھام لیے۔ ریسیور کانوں سے لگایا تو میڈم کی شوخ آواز سنائی دی۔ ''شہریار! اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور میری طرف چلے آؤ۔''

میں نے انٹرکام کا چونگا کریڈل پر رکھا اور روتی ہوئی اسما پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر کمرے سے نکل آیا۔ ریٹائرنگ روم میں میڈم کو بیڈ پر آلتی پالتی مارے ٹی وی سکرین کو گھورتے پایا۔ ٹی وی پر سونیا کے کمرے کا پورا منظر روشن تھا۔ اسما بدستور بیڈ پر، آنکھوں پر بازو رکھے روتی نظر آرہی تھی۔ میڈم نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تم ہار گئے، بُری طرح ہار گئے۔ خانزادوں کے بعد خانزادی بھی اپنی چکنی چپڑی باتوں سے تمہیں شکست دینے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ کیا اپنی شکست کو فتح میں تبدیل کرنے کے لیے کچھ اور وقت چاہیے؟''

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''نہیں میڈم! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی توقعات پر پورا نہیں اُترا۔''

وہ ہنسی۔ ''یہ تو ہونا ہی تھا..... ہوگیا۔ اس کا مؤقف مضبوط تھا، تمہارا کمزور..... تمہاری شکست یقینی تھی۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اجازت حاصل کرکے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بولی۔ ''خالد عرف کھالا تمہارا بچپن کا دوست ہے۔ بقول تمہارے، وہ تمہارے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی میڈم!''

''میں اُسے 'سی ون' سے یہاں بلوالوں؟''

''آپ بہتر جانتی ہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''شہر میں میرے اور استاد ببلو کے آدمیوں کے درمیان خونی آنکھ مچولی جاری ہے۔ سی تھری پر استاد نے حملہ کیا ہے اور میرے تین آدمی گرا دیے ہیں۔ شہر کے حالات بگڑتے دیکھ کر آئی بی اور پولیس متحرک ہوگئی ہے۔ جگہ جگہ چھاپے مارے جارہے ہیں اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ ایسے میں، میں کوئی خطرہ مول لینے پر تیار نہیں ہوں۔ یہ نہ ہو کہ کھالا یہاں آکر کوئی گڑبڑ پیدا کردے۔''

اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

میں نے کہا۔ ''میڈم! مجھے یقین ہے کہ کھالا کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ پھر بھی، آپ مجھ سے کہیں زیادہ بہتر جانتی ہیں۔ اپنی سوچ سمجھ کے مطابق فیصلہ کریں۔''

وہ مجھے کریدتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ ''سردار حیدر خان ضد پر ڈٹ گیا ہے۔ وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگیا ہے۔ سودے بازی پر نہیں آرہا بلکہ اُس نے خونی محاذ آرائی چھیڑ دی ہے۔ یہ جنگ ہم جیت بھی گئے تو پروین ہمارے ہاتھ نہیں آئے گی۔ کیا اس صورت حال میں خالد کوئی مدد کرسکتا ہے؟''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ کھالا میری کیا مدد کرسکتا تھا؟ اس نے چند دن قبل ہی سردار حیدر خان کے گینگ کو جائن کیا تھا۔ کیا اتنے مختصر سے دورانیے میں وہ کوئی کارآمد معلومات دینے کے قابل ہوگیا تھا۔ شاید نہیں.....

میں نے نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ''میڈم! میرا خیال ہے کہ وہ میری کوئی مدد نہیں کرپائے گا۔''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر موبائل فون کی بیل نے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اُس نے کال اٹینڈ کی۔ پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیریں اُبھر آئیں۔ ابھی فون رکھنا ہی چاہتی تھی کہ دوسری کال آگئی۔ وہ دوٹوک اور مختصر الفاظ میں گفتگو کررہی تھی۔ اوپر تلے آنے والی چار پانچ فون کالز نے اُسے متفکر کردیا۔ میں نے اس کی گفتگو سے اندازہ کیا کہ سی تھری کی صورتِ حال مخدوش ہوگئی تھی۔ اُس کا فائٹر گروپ استاد ببلو کے مقابلے میں پسپا ہورہا تھا۔ میر و شاہ ملتان میں نہیں تھا کیونکہ

اُس سے فون پر رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ سوائے ملتان اور مظفر گڑھ کے شہروں کے علاقے بھر میں سیلولر سگنلز موصول نہیں ہوتے تھے۔

میں نے میڈم کی سوچوں کے ارتکاز کو چھیڑنا مناسب نہیں جانا اور خاموشی سے اُسے دیکھنے لگا۔

وہ مجھے مخاطب کیے بغیر بولی۔ ''پولیس کو جہاں بلایا جاتا ہے، وہاں پہنچتی نہیں ہے اور جہاں اس کی ضرورت نہ ہو، وہاں ٹپک پڑتی ہے۔ شہریار! تم ایسا کرو.....''

موبائل فون کے بزر نے اس کی بات کاٹ دی۔ اُس نے جلدی سے اسکرین پر دیکھا اور فوراً کال ریسیو کر لی۔ ''مجھے آپ کی ہی کال کا انتظار تھا۔''

چونکہ میں کچھ فاصلے پر تھا، اِس لیے موبائل فون کے اسپیکر سے پھوٹنے والی بھنبھناہٹ سے کوئی مفہوم کشید نہیں کر سکتا تھا۔ یہ پتا چلتا تھا کہ بولنے والا مرد تھا۔ اس کی بات خاصی لمبی تھی جسے میڈم شکیلہ نے انہماک سے سنا۔ اس کے خاموش ہونے پر قدرے سخت لہجے میں بولی۔ ''میں آپ کی مجبوریوں کو سمجھتی ہوں مگر آپ بقا کے فلسفے کو مدنظر نہیں رکھتے۔ جو باتیں آپ نے مجھے کہی ہیں، یہی آپ سردار حیدر خان سے کہیں۔ اُس نے پہل کی ہے۔ اب بھی اسی نے ہی یکے بعد دیگرے میری دو کوٹھیوں پر حملے کیے ہیں۔ یہ خون اور آگ کا کھیل ہے۔ یہاں جس نے بھی پسپائی اختیار کی، وہ مارا جائے گا۔ میں اگر اپنے آدمیوں کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیتی ہوں تو وہ بھی مارے جائیں گے۔''

لمحاتی توقف ایک مرتبہ پھر درپیش ہوا۔ میڈم جب بولی تو اُس کا لہجہ بے حد درشت تھا۔ ''مجھے ایک ہی وقت میں آئی بی، ایلیٹ اور سردار حیدر کے غنڈوں سے نمٹنا پڑ رہا ہے۔ آپ اپنی فورسز پیچھے ہٹا لیں۔ میں دیکھتی ہوں کہ استاد ببلو کس کھیت کی مولی کا نام ہے۔''

فون کے سپیکر سے برآمد ہونے والی آواز سننے کے بعد بولی۔ ''اگر آپ کو اُوپر سے احکامات موصول ہوئے ہیں تو کیا ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے؟ چند ہی منٹوں میں آپ کو دوسرے احکامات بھی موصول ہو جائیں گے۔ پلیز! چند منٹ انتظار کیجیے۔''

اس کے ساتھ ہی اُس نے کال منقطع کر دی۔ اس کے چہرے پر برہمی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے فون کی میموری میں محفوظ شدہ کسی نمبر پر کال کی۔ فون کانوں سے لگائے بیٹھی رہی۔ جونہی کال ریسیو کی گئی، نہایت مؤدبانہ انداز میں بولی۔ ''سر! ملتان سے شکیلہ بات کر رہی ہوں۔ ایمرجنسی کی بدولت آپ کو اس وقت ڈسٹرب کر رہی ہوں۔''

اُس کے حد سے بڑھے ہوئے مؤدبانہ انداز نے چونکا دیا تھی کہ فون پر اس کا مخاطب کوئی بہت بڑا آدمی تھا۔ نے نہایت مختصر اور محتاط الفاظ میں مدعا بیان کیا۔ پتا چلا کہ چند لمحے پیشتر موصول ہونے والی کال پولیس کے سینئر سپرنٹنڈنٹ کی تھی۔ اب اس کے کسی بڑے سے اس کی زیادتی کا گلہ کر رہی تھی اور باور کرا رہی تھی کہ سردار حیدر خان نے اُسے اوپر سے سخت کاروائی کرنے کے لیے دباؤ ڈلوایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ انتظامیہ اس معاملے میں دخل نہ دے اور خاموشی سے تماشا دیکھے۔ یہ ممکن نہیں تھا مگر ممکن ہونے والا تھا کیونکہ اُس کے ہاتھ میں 'کچھ لو' اور 'کچھ دو' کی چابی دبی ہوئی تھی جس سے ہر قفل کھل جاتا ہے۔

میڈم پانچ سات منٹ کی طویل گفتگو کے بعد آواز کی لہروں کی بدولت منسلک 'بڑے آدمی' کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی اور اس نے 'تھینک یو سر' کہہ کر فون بند کر دیا۔ بڑبڑائی۔ ''اب دیکھتی ہوں استاد ببلو کی پھرتیوں کو.....''

اس نے جلدی جلدی کئی لوگوں سے رابطہ کیا اور احکامات صادر کیے۔ بظاہر نرم اور خوش دل دکھائی دینے والی میڈم رفتہ رفتہ مجھ پر کھل رہی تھی۔ وہ بہت زیرک اور سفاک عورت تھی۔ اس نے نصف گھنٹے میں ہی ہاتھ سے نکلی ہوئی بازی کی تمام تر ڈوریں اپنی ہتھیلی پر لپیٹ لیں اور حملہ آوروں کو منہ کی کھانا پڑی۔ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا تھا، کیا کیا جا رہا تھا اور کیا کیا جانے والا تھا مگر موبائل فون پر ہونے والی میڈم کی گفتگو سے اندازہ کر رہا تھا کہ جونہی پولیس فورس نے اپنے تیر و ترکش سمیٹے، اُس نے استاد ببلو کے گرگوں پر فیصلہ کن وار کرنے کا حکم دیا تھا۔ اپنی ہدایات کی روشنی میں اُس نے استاد ببلو کی یلغار کو اُس کی گردن کی رسی بنا کر پھندے میں جکڑ لیا تھا۔ اپنا بہت سا نقصان کروانے کے بعد استاد ببلو نہ صرف پیچھے ہٹ گیا تھا بلکہ کہیں چھپنے پر بھی مجبور ہو گیا تھا۔

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے۔ وہ اپنی بچھائی ہوئی بساط کے مہروں کی اٹھک بیٹھک سے فارغ ہوئی تو تھکے تھکے سے انداز میں بولی۔ ''اب وہ الو کا پٹھا کسی ماں کی گود میں چھپ کر چھپائے جان کی امان مانگ رہا ہوگا..... حرامزادہ.....''

میں نے تحسین انگیز نظروں سے اُسے دیکھا اور کہا۔ ''آپ کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔''

''تم پر کھلنا چاہتی ہوں، تاکہ تم مجھے سمجھ جاؤ۔''

''مگر میں ہی اتنا خوش بخت کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ پورے دل سے مسکرائی اور اُٹھ کر کمرے کی عقبی دیوار میں نصب بڑے سے کنٹرول پینل کے سامنے جا کھڑی ہوئی، بولی ''تمہارے اس سوال کا جواب وقت آنے پر دوں گی۔ اَب میں تمہارے دوست خالد کو یہاں طلب کرنے لگی ہوں۔ تم اسما کے کمرے میں جاؤ۔ سونیا کو میرے پاس بھیج دو۔ دس پندرہ منٹوں تک خالد تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ اس کے ساتھ بات چیت کرو۔ تمہارے بقول، اُسے تمہاری بہن پر ٹوٹنے والی قیامت کی خبر نہیں ہے۔ اسے خبر دو، پھر اسما اور خالد کی ہمدردیاں حاصل کرو۔ دیکھو کہ زندگی کتنا بڑا سچ ہے۔ اسے گزارنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ خالد کے دل میں جاگزیں عشق کی گرمی کو ماپو۔ دیکھو کہ یہ کتنا بڑا فریب ہے۔''

میں چونکا کیونکہ وقتی طور پر یہ بھول گیا تھا کہ کھالا اسما کو دیوانوں کی طرح چاہتا ہے، پھر دل نے تقویت دی کہ وہ کبھی بھی عشق کی آبیاری کے لیے دوستی کا خون نہیں کرے گا۔

میڈم مجھے متذبذب دیکھ کر بولی۔ ''جاؤ..... گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سی ٹو کی طنابیں میرے ہاتھ میں ہیں۔''

میں سونیا کے کمرے میں آ گیا۔ سونیا کو میڈم کے پاس بھیجا اور سونے پر بیٹھ گیا۔ اسما آنکھیں موندے لیٹی تھی۔

میں نے پکارا۔ ''اسما! کیا جاگ رہی ہو؟''

اُس نے آنکھیں کھول دیں، بولی۔ ''ہاں..... مگر میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔''

میں نے میڈیکل کٹ میں سے ایک ٹیبلٹ نکال کر اُسے تھمائی۔ پانی اس کے بیڈ کے قریب تپائی پر رکھا تھا۔ اُس نے گولی حلق سے اُتاری، پانی پیا اور بولی۔ ''کیا بنا؟''

اُس کا اشارہ پروین کی طرف تھا۔ میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''تمہارا باپ اپنی انا کے مقابلے میں تمہیں داؤ پر لگا چکا ہے۔''

''کیا میری واپسی کی راہ کھلی ہوئی ہے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''کیا مطلب؟''

''مجھے علم نہیں ہے کہ میرے بعد کیا ہوا؟ کیا میں وسیب میں بدنام ہو چکی ہوں؟''

میں نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کیونکہ میرا رابطہ نور پور سے کٹ چکا ہے۔''

''ہمیشہ کے لیے؟''

سرداریاں

سردار: ''پریتو! اک واری I Love You کہہ دے۔''

پریتو: ''نہیں کہوں گی۔''

سردار: ''صرف اک واری پلیز۔''

پریتو: ''نہیں نا! مجھے شرم آتی ہے۔''

سردار: ''دیکھ لے میری بہن نئیں ایک واری کہہ دے۔''

☆.....☆.....☆

بیوی شوہر (سردار) سے۔ ''بائیک آہستہ چلائیں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

شوہر۔ ''تو تم بھی میری طرح آنکھیں بند کر لو نا۔''

☆.....☆.....☆

لڑکی۔ ''سردار جی آپ کو مجھ سے پیار ہے؟''

سردار۔ ''ہاں ہے۔''

لڑکی۔ ''لیکن آپ کو میری بالکل پروا نہیں ہے۔''

سردار۔ ''اوجھلیے! پیار کرنے والے کسی کی پروا نہیں کرتے۔''

☆.....☆.....☆

مریض سردار ڈاکٹر سے۔ ''ڈاکٹر صاحب مجھے دور سے نظر نہیں آتا۔''

ڈاکٹر۔ ''وہ آسمان پر کیا ہے؟''

مریض۔ ''سورج۔''

ڈاکٹر۔ ''اوماما! ہور اس توں آگے فرشتے نو ویکھنا ای؟''

مرسلہ: محمد قدرت اللہ نیازی۔ خانیوال

☆.....☆.....☆

سردار نے لڑکی کو سائیکل ماردی۔

لڑکی نے کہا۔ ''بے وقوف، اندھے بریک نہیں مار سکتے تھے۔''

سردار نے کہا۔ ''پوری سائیکل تو ماردی ہے۔ اب دی ناراض اوسوہنیو.....''

مرسلہ: حجاب کنول خان، ملکوال

''یہ میں نہیں جانتا۔''

''تمہاری پھوپھی زاد، غزالہ، کیا وہ اس آگ کی لپیٹ میں نہیں آئے گی؟''

اس نے عام سے لہجے میں بہت بڑی دھمکی دی تھی۔ میں تڑپ کر اُٹھا، اُس کے سینے کی طرف انگلی تان کر غرایا۔ ''اس پر اٹھنے والا ہاتھ کاٹ دوں گا۔ اگر سردار حیدر خان نے یہ حرکت کی تو میں اس کے خاندان کو تباہ و برباد کر دوں گا۔''

اس پر میری برہمی کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ طنز سے بھرپور ہنسی اچھال کر بولی۔ ''کیا وہ پروین سے زیادہ مقدس ہے؟''

وہ میری توقع سے کہیں زیادہ گہری تھی۔ ایک جملے میں آگ لگا دینے کی اہلیت رکھتی تھی۔ میں دانت پیس کر رہ گیا۔ وہ میری حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔ ''شہرے خان! تم نے نور پور کو اپنے لیے جہنم کدہ بنا لیا ہے۔ کس کس آگ کو بجھاؤ گے؟''

میں نے جان چھڑانے کے سے انداز میں کہا۔ ''مجھے کسی آگ کی پروا نہیں ہے۔''

''تم اگر چاہو تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔'' اُس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں ہنسا۔ ''تم کچھ بھی نہیں کر سکتی ہو خانزادی..... یہ آگ اور خون کا کھیل ہے۔ نہ کھیلنے والا بچتا ہے اور نہ ہی کھلانے والا زندہ رہتا ہے۔''

''تو کیا اب میں زندہ ہوں؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''کیا یہاں سے جانے کے بعد میں ویسی ہی رہوں گی جیسے یہاں لائے جانے سے پہلے تھی؟ نہیں شہرے خان! میرے دامن پر دھبے لگ چکے ہیں۔ دھونے میں عمر بیت جائے گی مگر داغ نہیں جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ طلوع ہونے والے آفتاب کے ساتھ ہی مجھے بھی بوجھ سمجھ کر کہیں پستی میں اتار پھینکا جائے۔ کوئی شاہ زور اپنی کمزوری کو سینے سے لگا کر نہیں رکھتا۔ میرا بابا بھی شاہ زور ہے۔ ایک مرتبہ کی پسپائی کے بعد مجھ سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑانا چاہے گا۔''

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میرے عقب میں آہٹ ہوئی۔ گھوما تو دروازے میں کھالے کو کھڑے دیکھا۔ اُسے ایک آدمی دروازے پر چھوڑ کر پلٹ رہا تھا۔ کھالے نے جونہی مجھے دیکھا، آنکھیں حیرت سے پھٹنے کی حد تک پھیل گئیں۔ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔ ''شش..... شہرے..... تت..... تم؟ اِہ میں کیا ڈیدھا کھڑاں مولا؟''

(مولا! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں)

میں نے قدم بڑھایا۔ اُسے والہانہ انداز میں بانہوں میں بھرتے ہوئے فرطِ مسرت سے چیخ کر کہا۔ ''تم خواب نہیں دیکھ رہے ہو، میں شہر یار ہوں..... تمہارا یار..... تم مجھے چھوڑ کر کہاں غائب ہوئے تھے؟''

ہم دونوں کا معانقہ طویل ہو گیا۔ یہ ملاقات بڑی یادگار تھی۔ علیحدہ ہوئے تو اس کی نظر اسما پر پڑی۔ سوفے کی طرف بڑھتے ہوئے ناگاہ ٹھٹک کر رُک گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسما کو گھورنے لگا، پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''شہرے! یہ تو بی بی جی ہیں..... اوہ میرے خدا! آج کیسا دن چڑھا ہے۔ خوشیاں ہی خوشیاں..... بی بی جی! السلام علیکم!''

اسے سلام کا جواب نہ ملا۔ اسے قلق نہیں ہوا بلکہ جذبات سے لرزتا ہوا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر سوفے تک آیا۔ ہم دونوں جڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ بولا۔ ''شہرے! تم یہاں کیسے آئے؟''

وہ مجھے اور اسما کو غیر متوقع طور پر دیکھ کر اپنی حیثیت اور یہاں موجودگی کے جملہ اسباب کو بھول گیا تھا۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ ''مجھے یقین تھا کہ میں بی بی جی تک ضرور پہنچ جاؤں گا اور اسے آزاد کروا لوں گا۔ مجھے بتاؤ، کس نے بی بی جی کو ہاتھ لگایا ہے، کس نے اسے یہاں قید کر رکھا ہے؟''

ایسے میں اسما کی آواز کمرے میں گونجی۔ ''کیا کر لو گے اُس کا؟''

وہ چونکا، اسما کی طرف دیکھ کر ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور دانت پیس کر بولا۔ ''اُس حرامزادے کی گردن مروڑ دوں گا جس نے آپ کو میلی نظر سے دیکھا ہے؟''

اسما معانی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم یہاں تک کیسے پہنچے ہو؟''

کھالا اپنی عادت کے مطابق گریبان کے بٹن کھول کر کالر پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''میں غفار خان کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ مجھے اُس نے بتایا تھا کہ یہاں میری 'بی بی جی' کو قید کیا گیا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اُس کا سو واٹ کے بلب کی طرح روشن چہرہ بجھ گیا۔ پرجوش زبان کو گرہ لگ گئی۔ رُک کر استعجاب بھری نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی اسما کو دیکھنے لگا۔ وہ بہت چالاک تھا۔ زود فہم تھا۔ فوراً اپنی اور میری حیثیت بھانپ گیا تھا۔ ٹھہری ٹھہری آواز میں بولا۔ ''کیا تم نے بی بی

جی کو اغوا کر رکھا ہے؟''

اُس کی مخصوص انداز میں اُٹھی ہوئی انگلی کا نشانہ میں تھا۔

میں نے آہستگی سے سر ہلایا اور کہا۔ ''ہاں کھالے! بی بی میڈم کی تحویل میں ہے۔''

''کون میڈم! اُس کی تو ایسی کی.....'' وہ بپھر گیا۔

میں نے کہا۔ ''میری میڈم... اس جگہ کی مالکن ہے جہاں اِس وقت ہم تینوں بیٹھے ہیں۔''

''تو کیا میں بھی اُس کی قید میں ہوں؟''

میرا جواب اثبات میں تھا۔ ''ہاں! اگر میری نظر تم پر نہ پڑی ہوتی تو اِس وقت تک تمہیں گولی چاٹ چکی ہوتی۔''

وہ ہونقوں کی طرح عجیب اُلجھے اُلجھے انداز سے مجھے اور اسما کو باری باری گھورنے لگا۔

اسما جھٹ سے بولی۔ ''تو تمہیں ابھی تک اتنی سی بات کا پتا بھی نہیں چلا، بہت بے وقوف آدمی ہو۔''

کھالے نے ایک نظر اسما کو دیکھا، پھر مجھ پر انگلی اُٹھا کر بولا۔ ''تم لوگوں نے یہ ذلیل حرکت کیوں کی؟''

اس کا لہجہ بہت درشت تھا۔ میں نے کہا۔ ''بیٹھ کر، تمیز سے بات کرو کھالے..... میں تمہارا نوکر نہیں ہوں۔''

وہ دانت پیس کر بولا۔ ''تمہیں علم ہے کہ بی بی جی مجھے کتنی پیاری ہے، پھر تم نے یہ حرکت کیوں کی؟''

میں بچپن سے کھالے کو دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ مجھے اُس کی ہر ادا کا علم تھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں کی مخصوص چمک دیکھ کر فی الفور اندازہ کر لیا کہ عشق نے دوستی کو اپنے سرخ پنجے میں جکڑ لیا تھا۔ اس نے دوست اور محبوبہ میں سے محبوبہ کا انتخاب کر لیا تھا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ''کھالے! ہوش کے ناخن لو۔ ادھر آؤ، بیٹھ کر میری بات سنو۔''

اس نے میری بات پر دھیان نہیں دیا بلکہ اسما کی طرف مڑا۔ ''بی بی جی! سیدھی سیدھی طرح بتائیں، کیا شہرے نے یہ حرکت کی ہے؟''

وہ بولی۔ ''تمہیں جو کچھ نظر آ رہا ہے، یہی سچ ہے۔ جو کچھ تمہارا یار تمہیں اپنے پاس بٹھا کر دکھانا چاہتا ہے، وہ جھوٹ ہے۔''

کھالے کے آگ بگولہ ہونے کے لیے اسما کا یہی جملہ کافی تھا۔ حسبِ عادت سب کچھ بھول کر، کالر پیچھے کی طرف ڈال کر، سرخ آنکھیں لیے میری جانب بڑھا اور بولا۔ ''شہرے! چلو، اِسے ابھی چھوڑو..... اسے گھر پہنچاؤ ورنہ میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ''یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر تم میری کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہو تو اِس بات کو یہیں ٹھپ دو۔''

وہ بُری طرح سیخ پا ہو چکا تھا۔ میں چونکہ اس کی رگ رگ پہچانتا تھا، اِس لیے اس کے برق رفتار تھپڑ سے پہلو کے بل سرک کر بچ گیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں آگے بڑھا اور سوفے سے ٹکرا کر قالین پر جا گرا۔

میں اچھل کر چند قدم دور ہو گیا۔ چیخ کر کہا۔ ''کھالے! عقل کے ناخن لو، میری بات سن لو، پھر جی میں جو آئے، کرنا۔''

اس نے اُٹھنے میں دیر نہیں کی تھی اور نہ ہی مجھ پر حملہ آور ہونے میں تاخیر کی تھی۔ وہ ایک پیر پر گھوما اور اس کا پوری قوت سے گھوم کر آتا ہوا پاؤں میرے بائیں بازو پر پڑا۔ میں لڑکھڑا کر دیوار تک لڑھک گیا۔ اگر دیوار کا سہارا نہ لیا ہوتا تو زمین بوس ہو چکا ہوتا۔ جونہی پلٹا، اُس کا مکا پوری قوت سے میری پیشانی پر پڑا۔ میری نظروں کے سامنے سورج آن چمکا اور پورا کمرا گھومتا دکھائی دینے لگا۔ میں نے اُسے روکنے کے لیے ہاتھ بڑھائے مگر اُس نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر چند ہی لمحوں میں مجھے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ میں قالین پر دیوار کی جڑ میں آڑا ترچھا لیٹا 'کھالا، کھالا' کرتا رہ گیا۔ اس کے طوفانی مکے نے میرے بدن کے تمام اعصاب شل کر دیے تھے۔

وہ میرے سینے پر اپنا پاؤں رکھ کر غرایا۔ ''تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟ کیا تمہیں علم نہیں تھا کہ کھالا اپنی بی بی جی کے لیے جان بھی قربان کر سکتا ہے۔ ہاں! کھالا تیرے جیسے یار مار کی جان لے بھی سکتا ہے؟''

کوشش کے باوجود میرے منہ سے کوئی کلمہ برآمد نہیں ہوا۔ اسی لمحے اسما کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوئے، تالی بجاتے ہوئے فاتحانہ انداز میں بولی۔ ''شہرے! اب تم بھی اسی انداز میں زندگی کی بھیک مانگو جس طرح کچھ دیر پہلے میں نے تمہارے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔''

وہ آگ لگا رہی تھی۔ کھالا دم بہ دم شعلے کی طرح بھڑک رہا تھا۔ میری چھاتی پر سے پاؤں ہٹائے بغیر پلٹا اور بولا۔ ''کیا کہا بی بی جی؟ اس نے آپ پر ہاتھ بھی اُٹھایا ہے؟''

اس نے اپنے سر کو اوپر نیچے حرکت دی۔ لبوں سے کچھ نہ کہا۔ کھالا جھکا اور میرے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے چیخا۔ ''تم نے مجھ پر ظلم کیا ہے خانزادے! تم نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اس نے مجھے کالر سے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ سوچیں گڈ مڈ ہونے لگیں مگر یہ احساس پوری توانائی سے بیدار ہو گیا کہ کھالا اس وقت اپنے حواس میں نہیں تھا۔ وہ جو کہہ رہا تھا، کر گزر سکتا تھا۔ میں نے سر جھٹکا اور پوری قوت سے مکا اُس کے منہ پر دے مارا۔ میرے ہاتھ کو کرنٹ سا لگا۔ ہاتھ غلط پڑ گیا تھا۔ کھالا مجھے چھوڑ کر ڈگمگاتا ہوا چند قدم پیچھے ہٹا۔ جب اس نے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا، تب مجھے پتا چلا کہ میرا وار بڑا کارگر ثابت ہوا تھا۔ اس کے منہ پر رکھے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں کے بیچ میں سے خون جھلکنے لگا تھا۔ اس نے آگ برساتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں سانڈ کی طرح مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔

میں اس کے غصے کی تاب دیکھ چکا تھا۔ اس پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ جونہی وہ قریب آیا، میں جھکائی دے کر ایک طرف نکل گیا۔ وہ اپنی جھونک میں دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے اپنے ہاتھ بروقت بڑھا لیے تھے ورنہ اس کا سر دیوار سے ٹکرا کر پھٹ جاتا۔ اُس کے پلٹتے ہی میں نے چھاتی پر کک رسید کی۔ وہ دیوار سے ٹکرایا اور دیوار کی جڑ میں بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت میرا دوست نہیں تھا، اسما کا عاشق تھا جو اُس کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا اس لیے اُسے زیر کرنا ضروری تھا۔ میں نے پاؤں جوڑ کر چھلانگ لگائی اور دونوں پیروں کی زور دار ضرب اُس کے کاندھوں پر لگائی۔ وہ 'اوغ' کی آواز حلق سے نکال کر ایک طرف گر گیا جبکہ میں پشت کے بل قالین پر گر کر برق مستعدی سے کھڑا ہو چکا تھا۔ اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا مگر جونہی میں نے اُسے ٹھوکر مارنے کی کوشش کی، اُس نے میرا پیر پکڑ کر مروڑ ڈالا۔ میں سانپ کی طرح بل کھا کر قالین پر جا گرا۔ ٹخنے میں ٹیس جاگی مگر یہ وقت درد کی پروا کا نہیں تھا۔ میں نے فوراً کروٹ بدلی اور دوسرے پاؤں کی نپی تلی ضرب اُس کی کنپٹی پر لگائی۔ اس کے ہاتھ سے میرا پاؤں چھوٹ گیا اور میں سینے کے بل پھر زمین پر گر گیا مگر اچھل کر کھڑا ہونے میں ایک لمحہ لگایا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے اکڑوں بیٹھا دکھائی دیا۔ میں نے اُسے بالوں سے پکڑ کر کمرے کے وسط میں گھسیٹ لیا اور پٹخ دیا۔ اس کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں نکل رہی تھیں۔

وہ رعایت کے لائق نہیں تھا کیونکہ موقع ملتے ہی اس نے میرا استیاناس کر دینا تھا۔ میں اسے فٹ بال کھیلنے کے سے انداز میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ ایسے ہی وقت میں اچانک وہ سپرنگ کی طرح اچھلا اور میرے مقابل کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ کی پشت سے خون میں لتھڑا ہوا چہرا صاف کرتے ہوئے غرایا۔ ''خانزادے! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

میں نے جواب دینے کے بجائے اچھل کر زوردار فلائنگ کک اس کے سینے پر رسید کی۔ میں کمر کے بل گرا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اسما پر گرے دیکھا تو لمحہ بھر کی مہلت ضائع کیے بغیر اس کی جانب بڑھا۔ اس نے میرے جارحانہ طور سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دونوں پیر اُٹھا کر بیچ میں حائل کر دیے۔ جونہی میری چھاتی اس کے دونوں پیروں پر ایک لمحے کو ٹکی، اس نے پوری قوت سے مجھے اچھال دیا۔ 'دھپ' کی زوردار آواز کے ساتھ میں کمر کے بل قالین پر جا گرا۔ میں نے اُٹھنے میں سستی کا مظاہرہ نہیں کیا مگر وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ مجھ پر آن گرا۔ اس کے گھٹنے میرے پیٹ میں آن لگے۔ درد کی ایک لہر پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ میں نے اسے خود سے اتار پھینکنے میں پوری توانائی صرف کر دی مگر کامیاب نہیں ہو پایا۔ اس نے اپنی کہنی کی ضرب میرے سر پر ماری جس نے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ایک پل میں سلب کر لیں۔

پھر اس نے بغیر تعطل کے مجھے کہنی کی ضربیں لگانا شروع کر دیں۔ ہر چوٹ پر ذہن بری طرح جھنجھنا اُٹھتا۔ مجھے احساس تھا کہ یہ خطرناک چوٹیں میری موت کا سبب بن سکتی تھیں۔ میں نے اپنی تمام تر طاقت مجتمع کر کے اس کے پہلو میں گھونسا مارا، پھر دوسرا، پھر میرے دونوں ہاتھ مشینی انداز میں حرکت کرنے لگے۔ کوئی ایک چوٹ کارگر رہی اور وہ 'ہائے' کی دردناک آواز نکال کر پہلو کے بل الٹ گیا اور بے آب ماہی کی طرح تڑپنے لگا۔

اس نے اپنا ہاتھ پشت کی جانب پہلو پر سختی سے جما رکھا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میرے مکے کا شر اس کے گردے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ کھالا مہلت سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے، میں فوری طور پر بدقت کھڑا ہوا مگر لڑکھڑا کر نشست کے بل قالین پر گر گیا۔ پھر اُٹھا اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ کم بخت کی کہنی کی ضربوں نے میرے حواس مختل کر دیے تھے۔ کوئی شئے نظروں میں ٹھہرنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں میری نگاہ اسما پر پڑی۔ وہ دیوار کے ساتھ کمر ٹکائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

کھالا دونوں ہتھیلیاں قالین پر ٹکا کر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا جب میں نے پوری قوت سے لات اس کی پسلیوں کے نیچے پہلو میں ماری۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ

بڑی دردناک تھی۔ میری اگلی ٹھوکر کا نشانہ بھی وہی جگہ تھی۔ وہ لڑھکتا ہوا سونے سے جا ٹکا اور سر جھٹک کر اپنے اوسان بحال کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ ابھی اس نے شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر زوردار تھپڑ جبڑے پر رسید کیا۔ اس نے منہ پھیرا۔ ادھر میرا الٹے ہاتھ کا تھپڑ اس کا منتظر تھا۔ اوپر تلے لگنے والے سات آٹھ تھپڑوں نے کھالے کی مت ماردی۔ میرے دونوں ہاتھ دکھنے لگے تو میں نے اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کے بیچ پاؤں کی زوردار ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلا کر اُچھلا اور تڑپ کر سونے پر گر گیا۔ اس کا جسم تیزی سے جھٹکے لینے لگا۔ وہ بڑی قابلِ ترس حالت میں اپنے دونوں ہاتھ ٹانگوں میں دبائے اوندھے منہ پڑا بری طرح کراہ رہا تھا۔

میں نے اچھل کر زوردار کہنی اُس کی کمر کے درمیان، عین ریڑھ کی ہڈی پر ماری۔ وہ سیدھا ہوا پھر کمر کے بل سونے پر گر کر چت لیٹ گیا۔ میری کہنی کا اگلا وار اس کی پسلیوں کے نیچے پیٹ کے بالائی حصے پر لگا۔ اس نے ایک جھٹکا لیا اور 'ہاہ' کی لمبی آواز نکال کر ساکت ہو گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ پیر نہیں روکے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بے ہوش ہو چکا ہے، تو دانت پیس کر کھڑا ہو گیا اور پیچھے ہٹتا ہوا دیوار تک الٹے قدموں چلا گیا۔ دیوار سے پشت ٹکا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

کھالا لوہار میرے ہاتھوں پٹ کر چت پڑا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اُس سانڈ کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا اور خون چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری فاتح نظریں اس کے بے حس و حرکت وجود پر سے پھسل کر سامنے والی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑی اسما کی طرف اُٹھیں۔ اس کا چہرہ خوف سے سپید ہو گیا تھا۔ میری نظروں کی غضب ناکی کو دیکھتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور بے جان انداز میں دیوار کی جڑ میں ڈھے گئی۔

میں اُس کی طرف بڑھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ کھالے کی آہنی چوٹوں نے میرے بھی کس بل نکال کر رکھ دیے تھے۔ کم بخت کا جسم اور اعصاب فولاد کی تھے۔ اگر مجھے اپنی بقا خطرے میں پڑی محسوس نہ ہوتی تو شاید اس پر قابو نہ پا سکتا اور اس کے بجائے زمین پر پڑا اپنا خون چاٹ رہا ہوتا۔

میں نے دونوں ہاتھوں میں اپنے سر کو اچھی طرح جکڑا اور دائیں بائیں جھٹکے دیے مگر صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ مجبوراً مجھے میڈیکل کٹ سے دو پین کلر گولیاں نکال کر حلق سے اتارنا پڑیں۔ کئی منٹوں تک سونے پر بیٹھا رہا جبکہ کھالا بدستور قالین پر بے ہوش اور اسما دیوار کے ساتھ ساکت و جامد پڑی رہی۔ اس کی آنکھیں آدھی کھلی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی سیاہ پلکیں جھپک کر سدھ مندی ظاہر کر رہی تھیں مگر اس کا بدن بے جان انداز میں قالین پر آڑا ترچھا پڑا تھا۔ وہ اس وقت شدید ترین فرسٹریشن کی زد میں تھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ کھالا کسی وقت بھی ہوش میں آ کر مجھ پر حملہ آور ہو سکتا تھا، اسے باندھنا ضروری تھا۔ اردگرد نظر دوڑائی۔ الماری کھنگالی مگر رسی نہ ملی۔ اسما کے گلے میں ہلکے نارنجی رنگ کا دوپٹا دکھائی دیا۔ میں نے دوپٹا کھینچ لیا۔ تب بھی اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ مزاحمت کے لیے دم خم نہیں رہا تھا۔

کھالے کو الٹایا اور اس کی دونوں کلائیاں جوڑ کر پشت پر دوپٹے سے کس کر باندھ دیں۔ اس کی ٹانگیں باندھنے کے لیے کچھ نہ ملا تو میں نے میڈیکل کٹ میں پڑی ہوئی کریپ بینڈیج کا منی رول کھول لیا۔ اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد میں نے کھالے کو سیدھا کیا اور اس کا خون سے لتھڑا ہوا چہرہ گیلی روئی کی مدد سے صاف کیا۔ اس کی فرسٹ ایڈ سے فارغ ہو کر اسما کے عین سامنے قالین پر پیروں کے بل بیٹھ گیا۔

وہ آنکھیں جھپک کر مجھے خالی الذہنی کی سی کیفیت میں گھورنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''کیا تم ہوش میں ہو؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اپنے عاشق کا انجام دیکھ لیا تم نے؟'' میرے لہجے میں از حد تلخی رچی ہوئی تھی۔

وہ آہستگی سے بولی۔ ''وہ ہار کر دل کو اچھا لگا، تم جیت کر پہلے سے بھی برے لگنے لگے ہو۔''

میرے لبوں پر زہر خند مسکراہٹ تیر گئی۔ کھالے کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ وہ عشق کی بارگاہ میں سرخرو ہو چکا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تم دونوں احمق ہو۔ اگر میں مر بھی جاؤں تب بھی تم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ عجیب فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے اس کا بازو ہوا میں بلند کیا، چھوڑ دیا۔ اُس نے اپنا بازو سنبھال لیا اور گرنے نہیں دیا۔ بولی۔ ''میں ٹھیک ہوں۔''

میں اس کی طرف سے بے فکر ہو کر اٹیچڈ باتھ سے پانی کا مگ بھر لایا۔ کھالے کے منہ پر چھینٹے مارے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہوش میں آ گیا اور بھینس کی طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ جونہی اُس کا ذہن پوری طرح بیدار ہوا، اس نے ایک جھٹکے سے اُٹھنا چاہا مگر اُٹھ نہ پایا۔ ایسے ہی وقت میں

اسے اپنے بندھے جانے کا احساس ہوا۔ اس نے فطری انداز میں ہاتھ پاؤں چلائے مگر ناکام ہو کر ہانپنے لگا۔ کراہ کر بولا۔ ''تم نے مجھے مارا، باندھ دیا..... تم اتنے طاقتور ہو گئے ہو شہرے خان؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم آج تک یار بن کر زور آزمائی کرتے رہتے تھے۔ میں ہار جاتا تھا۔ آج مجھ پر میرے یار کھالے نے نہیں، خانزادی کے بے وقوف عاشق نے ہاتھ اُٹھایا تھا، اسے اوقات دکھانی ضروری تھی۔''

اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ بولا۔ ''پانی..... میرا حلق سوکھ رہا ہے۔''

میں نے تپائی پر پڑی ہوئی بوتل سے پانی بھرا اور گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ پانی حلق سے اُترا تو حلق سے کراہ برآمد ہوئی۔ بولا۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم نے مجھے مار مار کر بے ہوش کر دیا ہے۔''

میں نے بیزاری سے کہا۔ ''یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ کیا اَب تم میری بات سنو گے؟''

اس کے لبوں پر ایک شاطرانہ مسکراہٹ ابھر آئی، بولا۔ ''اب تمہاری بکواس سننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کھالے! تو میرا یار ہے۔ تجھ سے پیارا کوئی نہیں، میری نظر میں..... مگر تم نے یہ تو سنا ہی نہیں کہ مجھے کون سا گھاؤ لگا ہے؟'' میں نے اسما کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا اور بات جاری رکھی۔ ''اسما کو میں نے نہیں، میری میڈم نے قید کر رکھا ہے۔ بڑی مشکل سے اسما کو سمجھانے اور تم سے ملنے کی مہلت میڈم سے ملی ہے مجھے وگرنہ وہ ان جھمیلوں میں پڑنے والی نہیں ہے۔ وہ گولیوں سے راستہ بناتی ہے اور سینہ تان کر دشمن کا گریبان پکڑتی ہے۔''

وہ بولا۔ ''میں نے تمہاری میڈم کو دیکھا نہیں ہے مگر اُس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ اپنی بات کرو۔''

میں نے گھٹنے کا زور اس کی چھاتی پر بڑھایا، کہا۔ ''انسانوں کی طرح میری بات سنو.....''

میری زبان ٹیپ پلیئر کی طرح چل پڑی۔ وہ آنکھیں موندے، بے تاثر چہرہ لیے میری کہانی سنتا رہا۔ میں نے اسما کی موجودگی کی وجہ سے سائیں دل جیت شاہ والا قصہ سرے سے گول کر دیا تھا۔ جونہی میں اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا، اس نے آنکھیں کھول دیں اور بولا۔ ''تمہیں کس نے کہا ہے کہ پروین کو سردار حیدر خان نے اغوا کرایا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میڈم نے۔''

اس نے ایک استہزائیہ مسکراہٹ میری طرف اچھالی، بولا۔ ''بھولے خان زادے! کیا تمہاری میڈم کو الہام ہوا تھا؟''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے پروین پر ٹوٹ پڑنے والی قیامت پر کوئی دکھ نہیں ہوا تھا۔ میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''تمہیں میری بہن کا کوئی دکھ نہیں ہے؟''

وہ جلدی سے بولا۔ ''مجھے چند دن پہلے خبر ملی تھی۔ میں اس دکھ کو جھیل چکا ہوں۔ وہ نہیں، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری بلو (خالدہ) یا پھوری (غفوراں) نے یہ قیامت جھیلی ہے۔ مگر میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں کہ کسی پرلے (غیر متعلق) آدمی کے کہنے پر سردار حیدر خان کو اپنا مجرم مان لوں۔''

''مجھے یقین ہے کہ یہ کام حیدر خان نے ہی کیا ہے۔'' میرے لہجے کا یقین کامل تھا۔

''کوئی ثبوت؟''

میں اس پر اسما کی موجودگی میں سائیں دل جیت سے نبرد آزمائی کا خونریز مرحلہ آشکار نہیں کر سکتا تھا۔ کہا۔ ''میرے پاس ثبوت ہے۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔ ایسے ہی وقت میں اسما کی آواز کمرے میں اُبھری۔ ''شہرے خان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے مگر میں مان لیتی ہوں کہ پروین میرے بابا کے پاس ہی ہے۔ مگر کھالے! تم اپنے دوست سے میرا قصور پوچھو..... ان لوگوں نے مجھے کیوں یہاں قید کر رکھا ہے؟''

میں نے جھٹ سے کہا۔ ''تم جانتی ہو۔ کھالا بھی نادان نہیں ہے۔''

کھالا ادھ کھلی آنکھوں سے ایک ٹک مجھے دیکھے گیا۔ عجیب بے تاثر، پژمردہ اور مضمحل آنکھیں..... کافی دیر تک ہم تینوں میں سے کوئی نہ بولا۔ یوں کہ جیسے ہمارے پاس کہنے کو کچھ رہا ہی نہ ہو۔ کھالے نے اس سکوت کو توڑا، نقاہت آمیز لہجے میں گویا ہوا۔ ''میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟..... بی بی جی پر جان قربان کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ پروین میری بھین (بہن) ہے۔ اس کی چنی (دوپٹہ) پر لگے ہوئے دھبے کو اپنی شاہ رگ کے خون سے دھونا فرض سمجھتا ہوں۔ مگر کیا کروں؟..... شہرے! تم ہی بتاؤ.....''

مجھ سے پہلے اسما بول پڑی۔ ''کھالے! شہرے کی بہن کو بابا کی تحویل سے نکالو، میری فکر نہ کرو۔ میں شہرے کے پاس ہوں اور جانتی ہوں کہ شہرا بے غیرت نہیں ہے۔ اس کی رگوں میں سوہنے خان کا غیرت مند خون دوڑ رہا ہے۔ یہ مجھے قتل تو کر سکتا ہے مگر میری عزت پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا اور نہ کسی

کو میرے قریب پھٹکنے دے گا، مجھے یقین ہے۔ پروین کی جان اور عزت دونوں خطرے میں ہیں.....''

میں نے ٹھٹک کر اسما کو دیکھا۔ کہیں اُس کا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا تھا؟..... وہ عجیب لڑکی تھی۔ میرے ہاتھوں پٹ کر، اپنے عاشق کی درگت بنوا کر سچ بول رہی تھی۔ پھر اپنا مدعا بیان کر کے گھٹنوں میں سر ڈال کر رونے لگی تھی۔ مجھے اس پر اس گھڑی ٹوٹ کر پیار آیا، ترس بھی اور جی چاہا کہ اُسے اسی وقت آزاد کر دوں مگر یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔

کھالا بولا۔ ''یار! میرے ہاتھ پیر تو کھول دو.....''

میں نے تشکیک آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم بڑے کمینے انسان ہو، ہاتھ پیر آزاد ہوتے ہی مجھ پر کتے کی طرح جھپٹ پڑو گے۔''

اس نے کہا۔ ''مجھے بی بی جی کی قسم..... جو کہو گے، وہی کروں گا۔ ویسے بھی اَب تمہیں لڑنا بھڑنا آ گیا ہے۔ ڈرو نہیں۔''

اس کے ملتجیانہ انداز نے مجھے اس کی بات ماننے پر مجبور کر دیا اور میں نے اس کے ہاتھ پیر کھول دیے۔ وہ دونوں ہتھیلیوں کے بل بدقت تمام اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسما کا دوپٹا ایک کلائی سے بندھا رہ گیا تھا۔ میں نے کھولنا چاہا تو اس نے کراہتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ بی بی جی کا دوپٹہ ہے؟''

میں نے نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں!''

وہ بولا۔ ''تو پھر نہ کھولو یار..... کچھ دیر تو مجھے اس چنی (دوپٹے) سے بندھا رہنے دو۔''

میں نے مسکرا کر ایک نظر اسما کی طرف دیکھا جو ہماری گفتگو سے بے نیاز گھٹنوں میں سر ڈالے سسک رہی تھی۔ میں نے کھالے کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور اسے قدم قدم چلاتے ہوئے سوفے تک لے گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا وقت ہوگا؟''

میں نے کہا۔ ''علم نہیں۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں، سورج نہیں دیکھا۔ مجھے تو یہ اندازہ تک نہیں کہ اس وقت رات ہے یا دن.....''

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، لجائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''یار شہرے! مجھے معاف کر دے..... اصل میں، میں نے جب بی بی جی کو دیکھا تو یوں لگا کہ جیسے پوری دنیا میری دشمن ہے اور.....''

میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا، کہا۔ ''میں جانتا ہوں۔''

کن انکھیوں سے اسما کو دیکھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ رہی تھی۔ ہماری باتیں سن رہی تھی۔ کھالے کی بات سن کر اس کے چہرے پر فخر کا رنگ جگمگایا۔ کھالے نے کہا۔ ''کیا تم مجھ سے نہیں پوچھو گے کہ مجھ پر کیا بیتی؟''

میں نے چونک کر کہا۔ ''کیوں نہیں..... بتاؤ ناں!''

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ ایسے ہی وقت میں انٹر کام کا بزر بجا۔ میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ ریسیور اُٹھایا۔ حسبِ توقع میڈم کی دل فریب آواز پردۂ سماعت پر اُتری۔ ''ویری گڈ..... اَب دونوں کو اپنے دل کی باتیں کرنے دو اور تم میرے پاس چلے آؤ۔''

میں کھالے کی آپ بیتی سننا چاہتا تھا مگر میڈم کے حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ کھالے اور اسما سے معذرت کر کے میڈم کے پاس پہنچا۔ وہ بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی جبکہ سونیا آپریشنل پینل کے سامنے، میری طرف پشت کیے کھڑی تھی۔

میڈم نے تالی بجائی، خوش ہو کر بولی۔ ''آئی لو یو شہر یار..... تم نرے خوب صورت ہی نہیں ہو، دلیر اور طاقت ور بھی ہو۔''

میرا سینہ پھیل گیا۔

سونیا بولی۔ ''میڈم! میں جاؤں؟''

''ہاں! جاؤ مگر مین آپریشن روم میں مداخلت کیے بغیر دونوں قیدیوں کی مانیٹرنگ کرو۔ ان کی گفتگو سنو۔ کوئی کارآمد بات ہو تو نوٹ کر لینا۔ یہ ذہن میں رکھنا کہ وہ یہاں سے نکلنے کی کوشش میں تم پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔''

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''تو کیا وہ یہاں سے نکل سکتے ہیں؟''

سونیا نے کہا۔ ''وہ تو رہے ایک طرف، تم بھی میڈم کی اجازت کے بغیر 'سی ٹو' سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔''

اس کے جانے کے بعد میڈم نے ستائشی نظروں سے مجھے سر تا پا دیکھا۔ اپنی کلائی میری جانب بڑھا کر کہا۔ ''پکڑو.....''

میں نے جھجکتے ہوئے کلائی تھامی۔ وہ بولی۔ ''زور سے.....''

میں نے اپنی انگلیوں کا دباؤ بڑھایا۔ نرم سی کلائی میں انگلیاں پیوست ہو گئیں۔ وہ بولی۔ ''اور زور سے..... پوری طاقت سے پکڑو۔''

میں نے اپنی پوری قوت صرف کی۔ ایک بار اپنی جان سے پیاری غزالہ کی کلائی تھامی تھی۔ زور لگانے پر بلبلا اُٹھی تھی۔ شانو کا بازو تھاما تھا، وہ رو پڑی تھی۔ میڈم شکیلہ کے چہرے پر بجائے تکلیف کے، عجیب ستائش انگیز اثرات ثبت دیکھ کر حیران ہوا۔

وہ بولی۔ ''میرا اندازہ تھا کہ تم خالد کے ہاتھوں بُری طرح پٹ جاؤ گے۔ وہ دیکھنے میں تم سے زیادہ جسیم اور قوی نظر آتا ہے، مگر تم نے کمال کر دیا۔ میں بہت خوش ہوئی ہوں تمہارا فائٹنگ سپرٹ دیکھ کر۔''

''تھینک یو میڈم! میں ناکام ہونا نہیں چاہتا تھا۔''

''کھالا اسما سے بہت محبت کرتا ہے۔ ہے ناں؟'' اس نے 'کھالا' لفظ پر خصوصاً زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اسے طیش میں یاد تک نہیں رہا کہ یہاں پر اس کی اپنی حیثیت ایک قیدی کی سی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جی میڈم! آپ کا کہنا بجا تھا کہ عشق کے سامنے کوئی اور جذبہ سر نہیں اٹھا سکتا۔''

وہ دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے گاؤں، نور پور کی تفصیلی رپورٹ موصول ہو گئی ہے۔ تم بڑے لکی ہو۔ تمہاری لگائی ہوئی آگ جہنم کی آگ ثابت ہوئی اور اس نے دل جیت کی ہڈیاں تک جلا کر بھسم کر ڈالی ہیں۔ سبھی کے نزدیک سائیں دل جیت دنیا والوں سے اوجھل ہو کر کوئی چلہ کاٹ رہا ہے۔ جلد یا بدیر نئی روحانی طاقتوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوگا۔''

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا اس کے گھر والوں کا بھی یہی خیال ہے؟''

اس نے مزہ لیا۔ ''ہاں تو..... یہ بات گھر سے ہی تو نکلی ہے۔''

''پروین کے بارے میں کیا چہ میگوئیاں ہیں؟''

''گاؤں والے متفق ہیں کہ امیر نواز اُسے بھگا کر لے گیا ہے اور اب تک اس نے پروین کے ساتھ عدالتی شادی رچا لی ہوگی۔''

یہ فکرمندی کی بات تھی کہ امیر نواز اَبھی تک نہیں لوٹا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ نور پور میں پھیلی ہوئی اس افواہ میں بھرپور صداقت ہو اور میری ٹاک ٹوئیاں رائگاں جانے والی ہوں۔ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر میڈم بولی۔ ''یہ درست ہے کہ تمہاری بہن کے اغوا میں امیر نواز کا کوئی کردار نہیں ہے مگر اس کا تعلق اِس واردات سے ضرور ہے۔ کیا؟ یہ وقت آنے پر ہی عیاں ہوگا۔''

میں نے سوچ کر کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ امیر نواز کو اس ٹھکانے کا پتا ہو جہاں پروین کو رکھا گیا ہو، وہ اُسے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا ہو اور اسے بھی روک لیا گیا ہو؟''

وہ بولی۔ ''ایسا ہو تو سکتا ہے مگر اس اندازے کو حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔''

''اور میرے گھر والوں کا کیا حال ہے؟''

''وہ ٹھیک ہیں مگر پریشان ہیں کہ شہر یار کہاں گیا؟''

وہ عام سے لہجے میں بولی۔ ''البتہ سردار حیدر خان کی لڑکی کے اغوا کی خبر پورے دسیب میں پھیل چکی ہے۔ تمہارے گاؤں کے سبھی بڑے سردار حیدر خان کی کوٹھی پر پہنچ چکے ہیں، اپنے باس کا دکھ بانٹنے کے لیے۔'' بات کرتے ہوئے پل بھر کو ٹھہری، اکتائے اکتائے سے انداز میں بولی۔ ''اچھا..... چھوڑو ان باتوں کو..... اِدھر آؤ، پینل پر وہ بٹن پش کرو جس پر اسپیکر کا مونو بنا ہوا ہے۔ سنوں تو سہی، دونوں عاشق کیسی مایوس رومانوی گفتگو کرتے ہیں۔''

اس کا اشارہ کھالے اور اسما کی طرف تھا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ سوئچ پینل پر مطلوبہ بٹن تلاش کر کے پش کر دیا۔ تین چار مرتبہ 'ٹوں' کی آواز کمرے میں گونجی، پھر اسما کی آواز سنائی دی۔ ''مجھے شہرے خان سے خوف آنے لگا ہے۔ وہ بالکل باؤلا ہوا جا رہا ہے۔ اس سے کوئی بعید نہیں کہ وہ پروین کو نہ پا کر مجھے مار ڈالے۔''

کھالے کی آواز سنائی دی۔ ''بی بی جی! آپ کیسے یقین سے کہہ سکتی ہیں کہ پروین آپ کے بابا کے پاس ہے۔''

وہ وثوق سے بولی۔ ''یہ کوئی پہلی واردات تو ہے نہیں کہ شبہ کیا جائے۔ بابا نے نجانے کتنی لڑکیوں کو برباد کر کے بیچا ہے۔ ویسے بھی یہ میڈم نے اپنے طور پر یقین کرنے کے بعد ہی مجھ پر ہاتھ ڈالا ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' کھالے کی حیرت سے معمور آواز ریٹائرنگ روم میں گونجی۔

''میں سچ کہتی ہوں۔ ہم جہاں موجود ہیں، یہ بھی بابا کے قماش کے لوگوں کی پناہ گاہ ہے بلکہ یہ بابا سے بھی زیادہ خطرناک لوگ ہیں۔'' کچھ دیر خاموشی حائل رہی، پھر اسما کی آواز سنائی دی۔ ''کھالے! بابا کے پاس اشتہاری مجرموں کی بڑی کھیپ موجود ہے جو نہ صرف اس کے لیے دولت اکٹھی کرتے ہیں بلکہ اس کے سیاسی دشمنوں کو بھی مختلف محاذوں پر الجھائے رکھتے ہیں تاکہ وہ سیاسی میدان میں بابا کی ہم سری نہ کر پائیں۔ استاد ببلو نام کا ایک بدنام اور خطرناک غنڈہ بابا کے تلوے چاٹتا ہے، اشارے پر حرکت میں آتا ہے اور آگ لگاتا جاتا ہے۔''

میڈم نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا، بولی۔ ''سن رہے ہو شہر یار؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی میڈم! شاید اسما کی ذہنی حالت درست نہیں رہی ورنہ کوئی بیٹی ایسی باتیں اپنے

باپ کے بارے میں نہیں کرتی۔''

وہ بولی۔ ''اسما پڑھی لکھی ہے۔ حقیقت پسند ہے۔ جانتی ہے کہ اس وقت باپ کے کرتوتوں کی پردہ پوشی محض اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔''

کنٹرول پینل پر لگے ہوئے اسپیکر سے دونوں کی آواز پھوٹتی رہی۔ اسما حیرت بھرے انداز میں اس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ اس کے پیچھے کس طرح یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ ٹال رہا تھا مگر صاف عیاں تھا کہ وہ زیادہ دیر تک ایسا نہیں کرپائے گا اور اسما کے سامنے ریت کا محل ثابت ہوگا۔

میں ہمہ تن گوش تھا مگر میڈم جلد ہی بور ہوگئی، بولی۔ ''شہر یار! اسی بٹن کو جا کر پش کردو۔ یہ الو کے پٹھے وہ باتیں تو کر ہی نہیں رہے، جو میں سننا چاہتی ہوں۔''

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ بٹن پش کرنے کے بعد پلٹا۔ ایسے میں وہ بیڈ سے اُتری۔ میرے مقابل چند لمحوں کو ٹھہری، بغور دیکھتی رہی پھر اپنا داہنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''لو..... شکریہ ادا کرو، پھر میں کچھ دیر آرام کرنا چاہوں گی۔''

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ سمجھ گئی۔ ہونٹ پر ہونٹ چڑھا کر، آنکھیں آدھی میچ کر، شرارت آمیز لہجے میں بولی۔ ''کس ی.....''

میں دم بخود رہ گیا۔ میرے لیے اس کی غیر معمولی وارفتگی اور محبت پاش اجازتیں ناقابلِ یقین تھیں۔ میں نے جھجکتے ہوئے ہاتھ تھاما، گلاب کی طرح نازک اور خوب صورت ہاتھ کو لبوں پر لگایا اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس گھڑی میں مسرت اور طمانیت کے اُس جھولے پر سوار تھا جس میں بیٹھنے والا اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ اچانک اس کا ہاتھ پھسل کر دور ہوگیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو میڈم کو پینل کے سامنے کھڑا دیکھا۔ ایک ادا سے پلٹ کر بولی۔ ''میں تھک گئی ہوں رونا چاہتی ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانا آجائے گا، کھا کر لیٹ جانا، نیند پوری کرلینا۔''

میں نے کہا۔ ''میڈم! وہ کھالے اور اسما.....''

وہ بولی۔ ''ان کی فکر نہ کرو۔ ان کے لیے بھی کھانا آرہا ہے۔''

اس نے کنٹرول پینل پر یکے بعد دیگرے تین بٹن پش کیے۔ پورے کا پورا پینل کسی دروازے کی طرح کھلا اور چار ضرب اڑھائی فٹ کا خلا نمودار ہوگیا۔ پینل کے عقبی حصے میں سیاہ اور سرخ تاروں کا جال سا تنا ہوا تھا۔ کئی تاریں لٹک رہی تھیں۔ میڈم شکیلہ اُن تاروں سے بچ کر خلا میں سے گزری اور میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ چند لمحوں بعد پینل خودکار انداز میں بند ہوگیا جبکہ میں پھٹی پھٹی نظروں سے گھورتا رہ گیا۔ اس عمارت نما عجائب کدے کو کسی بہت ذہین اور ماہر انجینئر نے اپنے تمام تر ہنر کو بروئے کار لاتے ہوئے تخلیق کیا تھا۔ میں نے تو آج تک دروازوں کو آپوں آپ کھلتے نہیں دیکھا تھا، یہاں تو دیواریں بھی ایک بٹن دبانے پر کھل جاتی تھیں۔ میڈم شکیلہ کو 'سی ٹو' میں تحفظ کا یقین تھا تو بے جا نہیں تھا۔ یہاں قدم قدم پر غیر متوقع صورت حال اور نہ سمجھ میں آنے والے میکنزم موجود تھے جو کسی بھی شخص کو آنِ واحد میں ورطہ حیرت میں مبتلا کرکے مفلوج کرسکتے تھے۔

میں نے سوچا، 'ہوسکتا ہے کہ اس دنیا میں یہ معمول کی باتیں ہوں جو مجھ جیسے دیہاتی کو بہت بڑی اور غیر یقینی لگ رہی ہیں۔'

کچھ دیر بعد سونیا گتے کا ایک سرخ ڈبہ تھامے ریٹائرنگ روم میں داخل ہوئی۔ مخصوص سائز کا ڈبہ بیڈ پر رکھ کر بولی۔ ''کسی چیز کی ضرورت ہو تو انٹرکام پر رابطہ کرلینا۔ میڈم کا حکم ہے کہ دو چار گھنٹوں کی نیند لے لو۔ پھر نجانے کیسے حالات سے واسطہ پڑ جائے۔''

میں نے کہا۔ ''خطرہ ہے؟''

وہ بولی۔ ''ہے تو نہیں مگر کیا ہونے والا ہے، یہ علم بھی نہیں۔''

وہ 'گڈ بائی' کہہ کر رخصت ہوگئی۔ میں نے بیڈ پر بیٹھ کر ڈبہ اپنی جانب کھینچ لیا جس پر شہر کے ایک بڑے ہوٹل کا مونوگرام اور نام چھپا ہوا تھا۔ اس میں بریڈ کے چار قتلے، چکن لیگ پیس اور کولڈ ڈرنک سمیت کئی لوازمات ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ عرصہ پہلے جب میں عرفان مرزا کے ساتھ تنظیمی کاموں میں متحرک رہا کرتا تھا، ایسے ہی لنچ بکس ملتے رہتے تھے۔

میں نے سیر ہوکر کھانا کھایا اور بیڈ پر دراز ہوگیا۔ کھالا کس طرح میڈم کی کوٹھی تک پہنچا تھا؟ وہ مولوی کو قتل کر کے بھاگنے کے بعد کن حالات سے گزرا تھا؟ آگے کیا ہوگا؟ انہیں سوچوں کی گنجلک ادھیڑ بن میں، لیل و نہار کے گرداب میں میرا ذہن تھک گیا، چکرا گیا۔ بھی آرام چاہتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں میری آنکھ لگ گئی اور میں دنیا و مافیہا سے غافل ہوگیا۔

نہ جانے کس وقت میری آنکھ کھلی۔ میری بیداری کا سبب کوئی کھٹکا نہیں تھا بلکہ نیند پوری ہوجانے پر آپوں آپ بیدار ہوا تھا۔ میں نے فی الفور بیڈ چھوڑ دیا۔ بھرپور انگڑائی لی، ریٹائرنگ روم کا طائرانہ جائزہ لیا، اپنے سوا کوئی دکھائی

نہیں دیا تو وال کلاک تلاش کرنے کے لیے نظریں دوڑائیں۔ کمرے میں کلاک نہیں تھا۔ اگر کلاک نصب ہوتا بھی تو میں یہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ میں کتنی دیر تک سویا رہا تھا کیونکہ میں نے سونے سے پیشتر وقت نہیں دیکھا تھا۔ زیرِ زمین ہونے کی بنا پر 'سی ٹو' میں شب و روز کا فرق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر بڑے کمرے میں جھانکا۔ وہ بھی خالی تھا۔ میرے پاس سوائے ہاتھ لینے کے کوئی مصروفیت نہیں تھی۔

تازہ دم ہوکر انٹرکام کا ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا۔ علم نہیں تھا کہ کون سا بٹن پش کرنا ہے۔ اندازے سے 'ایک' کا بٹن دبا دیا۔ تھوڑی دیر بعد سونیا کی آواز سنائی دی۔ ''کیا بات ہے؟''

میں نے پوچھا۔ ''میڈم کہاں ہیں؟''

وہ بولی۔ ''میڈم تو چلی گئیں۔''

''کہاں؟'' میں نے متعجب ہوکر استفسار کیا۔

''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ سی ٹو سے چلی گئی ہیں۔ کہاں؟ یہ انہوں نے بتایا نہیں، میں نے پوچھا نہیں۔ کیا تم نے ہاتھ لے لیا؟''

''ہاں..... اب مجھے بھوک محسوس ہورہی ہے۔''

''ٹھیک ہے، انتظار کرو۔'' وہ بولی۔ ''میں کھانا بھجواتی ہوں۔''

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''کیا وقت ہوا ہے؟''

وہ بولی۔ ''گیارہ بجے ہیں..... تم آٹھ گھنٹے سوئے رہے ہو۔''

''گیارہ دن کے، یا رات کے؟''

وہ بولی۔ ''رات گزر چکی ہے۔''

مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے پوچھا۔ ''اسما اور خالد موجود ہیں؟''

''ہاں!'' وہ بولی۔ ''مگر تمہیں ان سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''میڈم نے کہا ہے؟''

''ہاں! تمہارے لیے میڈم کا حکم ہے کہ تم ریٹائرنگ روم تک محدود رہو گے۔'' وہ ہنسی۔ ''ایک قیدی کی طرح!''

''اچھا..... تو پھر ایک کرم کرو، آکر پینل کو آپریٹ کرنا سکھا دو۔ اور نہیں تو میں وقت گزاری کے لیے ان دونوں کو دیکھتا رہوں۔'' میرا اشارہ اسما اور کھالے کی طرف تھا۔

''سوری!'' اس نے کہا۔ ''اجازت نہیں ہے۔''

میں نے منہ بنا کر ریسیور رکھ دیا۔ چونکہ میں میڈم کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا، اس لیے سوائے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ دل کو یہ تقویت بھی میسر آئی کہ وہ سی ٹو سے نکل کر میری بہن کی بازیابی کے سلسلے میں ہی مصروف ہوگی۔ سونیا آئی اور کھانا میرے سامنے بیڈ پر رکھ کر چلی گئی۔ کم و بیش پہلے سا ہی لنچ بکس تھا۔ میں نے شکم سیر کیا۔ چائے کی شدید طلب محسوس ہوئی۔ انٹر کام پر سونیا سے چائے کا مطالبہ کیا۔ وہ دس منٹ بعد چائے سمیت ریٹائرنگ روم میں داخل ہوئی۔ میں نے چاہا کہ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھے، ہم باتیں کریں مگر اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''نہیں شہر یار! میں بہت مصروف ہوں۔ پھر کبھی سہی۔''

میں نے اصرار نہیں کیا اور چائے کی لطف کشیدگی میں محو ہوگیا۔ کافی دیر، میرے اندازے کے مطابق چار ساڑھے چار گھنٹے گزر گئے مگر کوئی تغیر واقع نہ ہوا۔ میں ریٹائرنگ روم میں لیٹا، نہایت محدود جگہ پر چہل قدمی کی، کنٹرول پینل پر موجود تمام بٹن دیکھے اور ان پر لکھے ہوئے ہر لفظ کو کئی کئی بار پڑھا مگر بوریت کا احساس فزوں تر ہوتا گیا۔ سونیا نے میری فرمائش پر دو تین مرتبہ چائے پلائی۔ جب میں نے انٹرکام پر اس سے وقت کے بارے دریافت کیا تو اس نے کہا۔ ''پانچ بجنے کو ہیں..... خیریت؟''

میں نے زچ ہوکر کہا۔ ''اب تو مجھ سے ریٹائرنگ روم میں بیٹھا ہی نہیں جارہا۔''

''بیٹھا نہیں جاتا تو لیٹ جاؤ، لیٹا نہیں جاتا تو نہانے لگ جاؤ.....''

اس نے ہنستے ہنستے رابطہ منقطع کردیا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد اس کی شکل دکھائی دی۔ اس کے ہاتھوں میں بڑا سا سیاہ رنگ کا شاپنگ بیگ دکھائی دیا جسے کرسی میں رکھتے ہوئے بولی۔ ''شہر یار! تمہاری قید ختم ہوگئی ہے۔ اس بیگ سے سوٹ نکالو، چینج کرلو اور پوری طرح تیار ہوکر ریٹائرنگ روم سے باہر آجاؤ۔ ایک دھیان رکھنا، اس لباس کے اوپر اپنا یہی ڈھیلا ڈھالا لباس پہن لینا۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ بولی۔ ''میں کچھ نہیں جانتی۔ جو حکم ملا، تم تک پہنچا دیا۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے بیگ کو بیڈ پر الٹا دیا۔ سوٹ کے نام پر برآمد ہونے والے سامان کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ اس میں ڈارک گرے کلر کا باڈی ٹائٹ سوٹ، سیاہ شیشوں والی عجیب ساخت کا گلز، لیزر سرچ لائٹ، جرمن ساخت

ریوالور اور بازو پر باندھے والا بلٹ بیلٹ..... ایسی ہی کچھ اور چیزیں بھی بیڈ میٹرس پر پڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں تامل نہیں ہوا کہ مجھے کسی خاص موقع کے لیے تیاری کا حکم دیا گیا ہے۔

چونکہ مجھے جلد تیار ہونے کا حکم صادر ہوا تھا، اس لیے میں پانچ سات منٹ میں پوری طرح تیار ہوگیا۔ تسلی کی خاطر میں نے باتھ روم میں نصب شدہ قدآدم آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنا جائزہ لیا۔ لیدر کی چست پینٹ شرٹ، بڑے بڑے گاگلز، ایک بازو پر بندھے ہوئے چرمی بلٹ بیلٹ سے جھانکتی ہوئی کوئی درجن بھر گولیاں، پینٹ کے بیلٹ میں اڑسا ہوا سامان..... سیاہ جوتے نئے اور سائز میں کچھ چھوٹے تھے جو اس کے پیروں پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ مجھے اپنی کمانڈوز جیسی نئی وضع قطع عجیب لگی۔ ہم دیہاتیوں میں پینٹ شرٹ پہننا بھی معیوب خیال کیا جاتا ہے اور بے نام سی جھجک آڑے آتی ہے مگر چونکہ میں نے کالج کے زمانے میں پینٹ شرٹ پر مشتمل یونیفارم پہن رکھی تھی، اس لیے مجھے یہ لباس پہننا عجیب نہیں لگا تھا۔

میں نے بخوبی جائزہ لیا۔ مبادا کہ کوئی سامان جسم سے چپکانا بھول گیا ہوں پھر اپنی اتاری ہوئی شلوار قمیص پہن لی۔ سوائے گاگلز اور جوتوں کے، سب کچھ میرے ڈھیلے ڈھالے لباس کے نیچے چھپ گیا۔ میں نے اپنے گھر سے نکلتے ہوئے نوٹوں کی تقریباً آدھی گڈی جیب میں درپیش آنے والے ناگفتہ بہ حالات کے پیش نظر رکھ چھوڑی تھی۔ تھوڑی سی رقم کرایہ کی مد میں خرچ ہوئی تھی۔ باقی محفوظ رہی تھی اور ابھی میری جیب میں ہی تھی۔

ریٹائرنگ روم سے نکلا تو بڑے کمرے میں سونیا کو اپنا منتظر پایا۔ وہ بولی۔ ”بہت دیر لگا دی تم نے..... میڈم دو مرتبہ پوچھ چکی ہیں۔“

میں کوئی جواب دیے بغیر اُس کے پیچھے چلتا ہوا لاؤنج نما گیلری میں آیا۔ جس کمرے میں کھالے اور اسما کو رکھا گیا تھا، وہ بند تھا۔ وہ مجھے گیلری کے آخری سرے پر ایک مخصوص جگہ پر ٹھہرا کر پلٹی، بولی۔ ”میں آپریشن روم میں جارہی ہوں تاکہ تمہیں ’سی ٹو‘ سے باہر نکالنے کے لیے راستے کھولوں۔ تم یہیں کھڑے رہو۔ جونہی راستہ کھلے، ناک کی سیدھ میں چلتے جانا۔ میڈم کے ساتھ یہاں تک آتے ہوئے تم نے راستہ دیکھ لیا تھا۔ اوکے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ مجھ پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے ایک کمرے میں گھس گئی۔ ایک آدھ منٹ بعد میرے سامنے والی دیوار نہایت بے آواز طریقے سے ہٹنا شروع ہوگئی۔ جونہی خلا بڑا ہوا، میں نمودار ہونے والی گیلری میں داخل ہوگیا۔ یہ وہی کم روشنی والی گیلری تھی جس میں سے گزر کر میڈم شکیلہ کی معیت میں ’سی ٹو‘ پہنچا تھا۔ پانچ سات منٹ کے بعد میں میڈم کی کوٹھی کے گیسٹ روم میں تھا۔ میری توقع کے خلاف میر وشاہ کی شکل دکھائی دی۔ کمرے میں اس کے علاوہ کھالا اور دو توانا، جسیم اور کسرتی جسموں والے افراد موجود تھے۔ میر وشاہ نے بڑے پرتپاک انداز میں میرا استقبال کیا اور سوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ماڑے غنچے! جندگی (زندگی) اور موت کا کھیل شروع ہوجاوت ہے۔ اب تم اپنی جان ہتھیلی پر رکھے اور نجر (نظر) اپنے شکار پر.....“

”شکار؟“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے مستفسرانہ انداز میں اُسے دیکھا۔

وہ بولا۔ ”شکار، وہی سالا حیدر خان..... ماڑی میڈم بولے کہ شہر یار کے جسم میں آگ ہووے ہے آگ..... ریچھ کی طاقت اور بجلی کی پھرتی ہووے ہے تیرے پٹھوں میں۔ وہ بے غیرت..... کا بچہ! وہ حیدر خان..... تمہاری بہنا کو دینے سے انکاری ہووے ہے غنچے! سمجھ میں آوے؟..... ہاں! اس مردود کے اڈے پر آج کی رات حملہ کرے اور سب کو تہس نہس کر کے رکھ دیوے ہے تم۔ یہ لونڈے تیرے ساتھ جاوے ہیں۔ کیا سمجھے ہے؟“

میں نے چونک کر پہلے میر وشاہ کو، پھر کھالے کو دیکھا، دونوں کے چہرے سپاٹ تھے۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ امتحان کی گھڑی سوالیہ نشان بن کر سر پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ میرے مختلف سوالوں کے جواب میں میر وشاہ نے بتایا کہ سردار حیدر شاہ نے اسما کے بدلے پروین کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے پروین کی اپنے ہاں موجودگی کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا تھا اور بہت خطرناک نتائج کی دھمکیاں دی تھیں۔ میر وشاہ نے اپنے طور پر یہ کھوج لگایا تھا کہ وہ اپنے ’شکار‘ کو دریائے سندھ کے کنارے پر واقع بیلے والی حویلی میں رکھتا تھا۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ پروین کو بھی وہیں رکھا گیا تھا۔ چونکہ میڈم زیادہ دیر تک اسما کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتی تھی، اس لیے اس نے میری خوابیدگی کے دورانیے میں ہی کھالے اور میر وشاہ سے مشاورت کے بعد ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میڈم نے کھالے سے کیا باتیں کی تھیں؟ کھالا کیونکر میرے ساتھ جانے پر تیار ہوا تھا؟ ان باتوں کا سردست کوئی علم نہیں تھا۔

میر وشاہ نے بیڈ پر ایک بڑا سا ایوری کارڈ پھیلا دیا

جس پر مارکر سے ایک نقشہ بنایا گیا تھا۔ ہم چاروں بیڈ کے پائنتی والے تختے کے ساتھ جڑ کر کھڑے ہوگئے۔ وہ نقشے کی مدد سے ٹارگٹ تک پہنچنے کی ہدایات دینے لگا۔ اسی دوران ظاہر خان چائے، غیر ملکی شراب کی سربمہر بوتل اور نقرئی گلاس ٹرے میں رکھے گیسٹ روم میں داخل ہوا۔ جسے جو درکار تھا، اُسے سرو کرنے کے بعد خاموشی سے واپس چلا گیا۔

کھالا پی رہا تھا۔ زندگی بھر ’کپی‘ پر عیاشی کرتا آیا تھا۔ ’ولائتی‘ دیکھ کر اوقات سے نکلنے لگا تو میر وشاہ نے ہاتھ تھام لیا۔ بولا۔ ”ابے ندیدے! یہ سمے ہوش میں رہنے کا ہے، لہرا کر پھوکٹ میں جندگی (زندگی) حرام کرنے کا نہیں ہووت ہے..... بس کر..... جیت کر آوے تو ڈرموں پر بٹھا دیوے ہے لاڈے کو.....“

کھالا کھسیا گیا۔ میر وشاہ نے ازحد سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم چاروں میں سے ایک آدمی کو گینگ لیڈر نامزد کیا۔ وہ کسرتی بدن والا لحیم انسان تھا۔ چہرے مہرے سے پڑھا لکھا اور معصوم فطرت دکھائی دیتا تھا مگر میں اس کے اندر چھپی بربریت اور خون ریز فطرت کو بہ آسانی محسوس کر سکتا تھا۔ میر وشاہ نے اسے ’پیا‘ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اصل نام نجانے کیا تھا۔ میر وشاہ اسے آپریشن کے بارے میں سنہری ہدایات سے سرفراز کرنے کے بعد ہم سب سے مخاطب ہوکر بولا۔ ”یہ دونوں جانت ہیں کہ ماڑی میڈم کیا چیج (چیز) ہووے ہے۔ تم دونوں غنچے نہیں جانت ہو۔ جان لیوے ہے کہ میڈم ہار کر آنے والے تنچنوں کو اپنے ہاتھوں توڑ پھینکے ہے، نہ دیکھے کہ کون کتنا گھبرو ہووے ہے..... جیت کر آوے تو راستے کھلے ہوویں، ہار کر آوے تو صرف موت کا روٹ سواری مانگے ہے..... سمجھ گئے ناں غنچے؟“

میر وشاہ کی سرد آواز سن کر میری گردن پر چیونٹیاں سی رینگیں۔ یہی حال کم وبیش کھالے کا تھا۔

”کیا ان دونوں کو اسلحہ چلانا آتا ہے؟“ پیا نے استفسار کیا۔

میر وشاہ نے جواب دینے کے بجائے مجھے اور کھالے کو باری باری دیکھا۔ پوچھا۔ ”ہاں بھئی غنچے؟“

ہلکے پھلکے ہتھیاروں سے شناسائی کی حد تک تعلق رہا تھا۔ یہاں نجانے کس قسم کا اسلحہ زیر استعمال تھا، علم نہیں تھا۔ پھر میری درخواست پر میر وشاہ اور پیا دونوں کمرے سے باہر گئے، واپس آئے تو ان کے ہاتھوں میں ایک ایک گن دبی ہوئی تھی۔ پیا نے مشاقانہ انداز میں ہمیں ان گنوں سے روشناس کرایا۔ کلیدی ہدایات دینے اور ہماری طرف سے

دنیا کی ہر گوشے میں اور ملک بھر میں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

کا سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

ن کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔

امنیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمع عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

'اوکے' رپورٹ ملنے کے بعد عقیل کے ہاتھ گنیں باہر گاڑی میں رکھوادی گئیں۔

میر وشاہ 'پیا' سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ماڑے پیا جی! یہ غنچے ہوویں، ابھی گلاب نہ بنت ہیں..... پر تم بنا دیوے، انعام پا لیوے..... گاڑی اور مورکھ پستول وستول باہر ہووے ہے، تم سب بارود اُٹھا کے جاوے اور پیچھے مڑ کر مت دیکھے ہے..... گاڑی چوری کی ہووے ہے، جہاں مصیبت بنت، وہیں پھینک دیوے ہے۔ اوکے؟''

اس نے نقشہ اُٹھا کر پیا کے حوالے کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔ یوں جیسے اس نے محفل برخاست کرنے کا اعلان کیا ہو۔ اچانک تھم کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''اڑے لاڈے! گاڑی میں مرہم پٹی والا ڈبا رکھا ہووت ہے، کوئی گولی شولی لگ جاوے، کوئی جخم (زخم) لگ جاوے تو ڈاکٹری کر دیوے ہے۔ میڈم بولت ہے کہ تم نے ڈاکٹری سیکھ رکھی ہووت ہے۔''

میں نے حامی بھری۔ پھر وہ ہم چاروں کو باری باری گھورتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد پیا نے کہا۔ ''شہر یار! میرا نام سراج الدین ہے، یہاں مجھے سبھی پیا کہتے ہیں۔ یہ تخلیل ہے۔ قدرت نے پیدا کرتے ہی اس کی زبان پر قفل لگا دیا۔ جوان ہوا تو اس نے اپنے ہاتھوں کو بولنا سکھا دیا۔ اور عقیل! یہ خالد عرف کھالا ہے، زبردست ڈرائیور ہے۔ یہ شہر یار ہے..... ان دونوں کے بازوؤں میں کتنا دم ہے، نہیں معلوم مگر آج معلوم ہو جائے گا۔ کیا ہم چلیں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے ریسٹ ہاؤس سے باہر آئے۔ اس وقت شام گہری ہو رہی تھی۔ لمبے دورانیے کے بعد کھلے میں آنا عجیب سا لگا۔ ظاہر شاہ نے گیٹ پر کھڑے کھڑے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی کی نشاندہی کی۔ کوٹھی کی احاطی دیوار کے ساتھ سرو کے پودوں کے قریب گرے کلر کا چوڑے ٹائرز والا ڈبل کیبن ڈالا کھڑا نظر آیا۔ سائڈ پر بڑا سا اسٹکر چسپاں تھا۔ انگریزی حروف میں لکھا ہوا 'سرف' دور سے پڑھا جاتا تھا۔

پیا خوش ہو کر بولا۔ ''میڈم زندہ باد..... آج مزہ آئے گا۔''

پیا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور اس نے مجھے اگلی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب ہم سب بیٹھ گئے تو پیا نے مجھے مخاطب کیا۔ ''شہر یار! گاگلز اتار کر جیب میں رکھ لو۔ اور ہاں! تم نے نقشے پر ٹارگٹ لوکیشن اچھی طرح سمجھ لی ہے ناں؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں! مجھے یقین ہے کہ میں تمہیں وہاں تک لے جا سکتا ہوں۔''

کھالے نے جھٹ سے کہا۔ ''میں نے سردار حیدر خان کی وہ حویلی دیکھ رکھی ہے جس پر ہم نے حملہ کرنا ہے۔''

''ویری گڈ..... ہم کتنی دیر میں وہاں پہنچ سکتے ہیں؟'' پیا نے پوچھا۔

''زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں.....''

''ابھی تو بہ مشکل آٹھ بجے ہیں۔ دو گھنٹوں بعد دس بجیں گے..... نہیں..... ہمیں ایک اور دو بجے کے درمیان وہاں پہنچنا چاہیے۔ کیوں عقیل؟''

اس نے بیک مرر میں جھانکا۔ عقیل کا سر اثبات میں ہلا۔ پیا نے کہا۔ ''ہم دو تین گھنٹے مظفر گڑھ کے ہوٹل میں گزاریں گے۔''

کھالے نے تائید کی۔ پیا نے سیٹی بجاتے ہوئے ڈالے کو ریورس کیا، ٹرن لیا اور گیٹ عبور کر لیا۔ ڈالا بالکل نیا تھا اور پیا کو ڈرائیونگ پر غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ ملتان کی رش والی سڑکوں پر، جہاں کھوئے سے کھویا چھلتا تھا، ڈالا مچھلی کی طرح سڑک پر پھسلتا جا رہا تھا۔ دریائے چناب کے پل پر گاڑیوں کی لمبی قطار دیکھ کر پیا بولا۔ ''افوہ! پھر وہی مصیبت..... پل بلاک ہے، نجانے کس وقت کھلتا ہے۔''

اس نے ٹرکوں اور بسوں کی طویل قطار میں جگہ بنائی اور ڈالے کو بریک لگا دیے۔ اس کی دیکھا دیکھی میں بھی ڈالے سے اُتر کر سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ روشنیوں کی طویل قطار..... کوئی ڈیڑھ میل لمبی لائن..... پیا لمبی سانس پھیپھڑوں میں اتار کر بولا۔ ''گھنٹا یا اس سے بھی زیادہ وقت یہاں ضائع ہو گا۔''

میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ ڈالے کا گھوم پھر کر جائزہ لینے لگا جبکہ میں کھلی ہوا میں، ٹھنڈی، نم اور شوخ ہوا کو سینے میں اتارنے لگا۔ کھالا بھی اُتر کر میرے قریب آن کھڑا ہوا۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''شہرے خان! اُساں ٹھیک کریندے پئے ہائیں؟''

(شہرے خان! کیا ہم درست کر رہے ہیں؟)

میں چونکا، کھالے کا چہرہ سنولائی ہوئی فضا کا حصہ محسوس ہوا۔ میں نے کہا۔ ''خدا جانے.....''

وہ بولا۔ ''ہم جس راستے پر چل نکلے ہیں، اس میں واپسی نہیں ہوتی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا، ایک قدم آگے بڑھ کر سڑک کے ڈھلوانی کنارے پر رُک گیا، بولا۔ ''کھالے! تم کہاں رہے اتنے دن؟ تم نے میری خبر تک نہیں لی کہ میں کس

حال میں ہوں۔''

وہ بولا۔ ''نہیں شہرے! میں ایک رات چوروں کی طرح نور پور گیا تھا۔ وہاں تمہیں باخیریت دیکھ کر لوٹ آیا۔ موبی کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ بہت بڑے گینگ لیڈر تھا۔ مجھے علم ہوتا تو میں اس سے پنگا نہ لیتا۔ جب پتا چلا تب میرے پاس سوائے موبی سے بڑے گینگ لیڈر کی چھتری تلے جانے کے، کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرے پیچھے پولیس اور موبی کے کتے لگے ہوئے تھے۔ استاد ببلو نے مجھے ان سے بچا لیا ورنہ وہ میری تکا بوٹی کر دیتے، زندگی ملتی بھی تو سلاخوں کے پیچھے گزر جاتی۔''

میں چونکا۔ ''استاد ببلو نے؟''

وہ بولا۔ ''ہاں یار..... وہ تمہاری میڈم سے بھی بڑا خبیث ہے۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''مگر میری میڈم تو خبیث نہیں ہے۔''

''تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔ وگرنہ دنیا اسے بہت شاطر اور ظالم عورت قرار دیتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اس مشن سے فارغ ہو جاؤں، پھر تمہیں تفصیل بتاؤں گا۔ میں نے بہت تھوڑے عرصے میں بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔ تم وہ سب کچھ شاید تمام عمر میں نہ دیکھ سکو گے۔''

پیا کی آمد پر ہماری گفتگو کا سلسلہ رک گیا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد کہیں جا کر رستہ کھلا اور رنگ برنگ روشنیاں چیونٹی کی سی چال سے پل کے اوپر رینگنے لگیں۔ یہ پل اپنی نوعیت کا منفرد پل تھا۔ ایک ڈیڑھ کلومیٹر لمبائی والا یہ پل دوہرا تھا۔ نیچے والے پل پر ریلوے ٹریک بچھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر، ہوا میں معلق، دور رویہ سڑک تھی جس پر چھوٹی بڑی ٹریفک کا غیر معمولی رش ہر وقت دکھائی دیتا تھا۔ شاید اپنی معیاد پوری کر چکا تھا تبھی لرز تا رہتا تھا، ڈراوا دے کر سمجھاتا تھا کہ ٹریفک کا دباؤ بڑھنے پر نیا پل تعمیر کرنا ضروری ہے۔

پیا نے ہمیں آواز دے کر گاڑی میں بٹھایا اور رسٹ روی سے دو ٹرکوں کے بیچ سرکنے کا عمل شروع ہو گیا۔ تلیری موڑ پر پہنچ کر پیا نے ڈالے کو علی پور بائی پاس والی سڑک پر ڈال دیا۔ شاید وہ شہر میں داخل ہونے والی سڑک پر بیریر لگائے کھڑے پولیس کے سست الوجود اہلکاروں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا یا اس نے وقت گزاری کو مدنظر رکھا تھا۔

پل پر ہمارا کافی وقت ضائع ہوا تھا۔ ایک گھنٹا ہم نے مظفر گڑھ کے ایک معیاری ہوٹل میں چائے اور سینڈوچ حلق سے اُتارنے میں صرف کیا۔ خوش گپیاں لگائیں۔ پیا بہت زندہ دل اور مزاحیہ طبیعت کا مالک شخص تھا۔ ہوٹل کے روشن ماحول میں مجھے احساس ہوا کہ سبھی میری طرح دوہرے لباس میں تھے اور کسی بھی ناگہانی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ کھالا اور پیا بہت جلد ایک دوسرے سے فری ہو گئے۔

کھالے نے قدرے نیچی آواز میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ نقشے میں بتائے ہوئے راستے کی بجائے ہمیں غازی گھاٹ والا راستہ اپنانا چاہیے۔ وہ کچھ طویل تو ہے مگر بالکل محفوظ ہے۔ دریائی علاقہ رات کو سنسان ہو جاتا ہے۔ ہم کسی کی نظر میں آئے بغیر خان کی حویلی تک پہنچ سکتے ہیں۔''

پیا نے پوچھا۔ ''کیا تم نے وہ راستہ دیکھا ہوا ہے؟''

نور پور سے دریا کے پتن تک سارا علاقہ کھالے کا دیکھا بھالا تھا۔ اس نے فخریہ انداز میں چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''مجھ سے کیا چھپا ہے اس علاقے کا؟ چپہ چپہ چھانا ہوا ہے میں نے۔''

ہم کھالے کی ایما پر پونے بارہ بجے ہوٹل سے اُٹھے اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔ چوک قریشی سے آٹھ دس کلومیٹر آگے جا کر اُس نے دائیں ہاتھ مڑنے والی ایک ناپختہ سڑک پر مڑنے کا اشارہ کیا۔ پیا نے فوراً ڈالا کچے راستے پر ڈال دیا۔ تھوڑی دور جا کر رُک گیا۔ مجھے پیچھے جانے اور کھالے کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ٹارگٹ سے تقریباً ایک کلومیٹر دور ہم گاڑی چھوڑ دیں گے۔ اب تم لوگ گاگلز لگا لو۔''

ہم نے نشستوں کا تبادلہ کیا۔ میں نے جونہی گاگلز آنکھوں پر لگائے، مناظر کی دیدگی میں واضح تغیر پیدا ہو گیا۔ پہلے اندھیرے میں صرف وہی کچھ دکھائی دیتا تھا جو ڈالے کی طاقت ور ہیڈ لائٹس کی زد میں آتا تھا۔ اب اطراف کی جھاڑ جھنکار اور فصلوں کا سلسلہ بھی دکھائی دینے لگا تھا۔ یہ اس مخصوص ساختہ گاگلز کے شیشوں کا کمال تھا۔

جھٹکوں کی تال پر سفر آغاز ہو گیا تھا۔ ایک فرلانگ تک راستہ قدرے ہموار تھا جبکہ آگے اونچا نیچا اور تنگ تھا۔ فصلوں کے بیچ موڑ پر موڑ کاٹتے ہوئے ہم بلند قامت کوندر اور جنگلی گھاس پھوس میں آدھے چھپے آدھے عیاں راستے پر آن پہنچے۔ یہ علاقہ چکنی مٹی کا تھا۔ جہاں بھی زمین نم ہوتی تھی، وہیں چپک جانے والا کیچڑ بن جاتا تھا۔ اگر ڈالا فور وہیکل نہ ہوتا تو شاید اس راستے پر ہمارا سفر جاری نہ رہ پاتا۔ یہ دریائے سندھ کے بیلے کا سنسان اور ویران علاقہ تھا جہاں دن کو بھی خوف محسوس ہوتا تھا۔ دریا کے اس کنارے

پرکوندر اور جنگلی گھاس کے وسیع علاقے میں جنگلی جانوروں کی بہتات تھی جن کے خوف سے لوگ ادھر کو کم نکلتے تھے۔ تین چار میل کے بعد راستہ مزید دشوار ہو گیا۔ آخر ایک ڈھلانی جگہ پر ڈالا پھسل کر گھاس میں پھنس گیا۔ ہم تینوں کو اُتر کر دھکا لگانا پڑا۔ بہ دقت تمام ڈالا اپنے ٹریک پر چڑھا اور ہمارا سفر شروع ہوا۔

خدا خدا کر کے کھالے نے رُکنے کا اشارہ کیا، بولا۔ ''خان کی حویلی دائیں طرف کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ یہ راستہ ہمیں چھوڑنا ہوگا کیونکہ یہ حویلی کی طرف نہیں جاتا۔''

کھالے کی مشاورت سے پیا نے راستہ چھوڑ دیا اور نسبتاً زیادہ گنجان گھاس کی طرف گاڑی بڑھائی۔ مشاقانہ انداز سے ٹرن لیا اور ڈالے کو واپسی کے سفر کے لیے بالکل تیار حالت میں کھڑا کر کے ہیڈ لائٹس بجھا دیں۔ اندر والی بتی روشن رہنے دی۔ ہم نے اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس اُتار کر گاڑی میں رکھ دیے اور مستعدی سے نیچے اُتر آئے۔

پیا نے ڈالے کی عقبی نشست اُٹھائی۔ جدید طرز کی ایک دس بائیس کی رگر گن اور اضافی میگزین نکال کر مجھے تھمائی۔ مجھے گیسٹ روم میں اس گن کو چلانے کی سرسری ٹریننگ دی گئی تھی۔ اس کا وجود مختصر تھا مگر وزن کافی تھا۔ کھالے کو کرنکو منی اسالٹ رائفل دی جبکہ اس نے اپنے اور عقیل کے لیے روسی ساختہ کلاشن کوف گنیں نکالیں۔ گاڑی کی اندر والی بتی گل کی اور ہمیں دھیمی آواز میں سمجھایا۔ ''ہماری گنیں اور پستول گولیاں اگلنے کے لیے بالکل تیار ہونی چاہئیں مگر گولی انتہائی ناگزیر حالت میں چلائی جائے گی۔''

اس نے چند اور مفید ہدایات دیں۔ پھر کھالے کی سربراہی میں ہم چاروں پر مشتمل قافلہ گھنی گھاس کے بیچ ناہموار اور کیچڑ آلود زمین پر چل پڑا۔ رات کے دبیز اندھیرے میں گھنی گھاس کے اندر رست کا اندازہ نہیں ہوتا تھا مگر گاگلز اور ننھی ننھی سرچ لائٹس کی مدد سے ہم بہ آسانی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہم دریا کے کنارے سے خان کی حویلی کی طرف یعنی مشرق کی جانب سفر کر رہے تھے۔

کوندر اور جنگلی جھاڑیوں کی سرسراہٹ، کہیں جانوروں کے اُٹھ بھاگنے سے پیدا ہونے والی آوازیں، دل کی دھڑکنوں کو لمحہ بہ لمحہ تیز کیے دے رہی تھیں۔ ہم ایک قطار میں چل رہے تھے۔ اچانک جھاڑیوں کے بیچ ایک بڑی قامت والا کتا اُلٹے قدموں زور لگا کر کچھ کھینچتا ہوا دکھائی دیا۔ کھالا رُک گیا۔ اُس نے کتے پر لائٹ ڈالی پھر سرگوشی کی۔ ''پیا جی! اِہ کتا نہیں، اِہ تاں ناہر ہے۔''

(پیا جی! یہ کتا نہیں، یہ بھیڑیا ہے۔)

بگھیاڑی نسل کا کتا اور اس علاقے میں پایا جانے والا بھیڑیا ایک جیسی قامت اور شکل وصورت کے مالک ہوتے ہیں۔ عام نظر میں بھیڑیا بگھیاڑی کتا ہی دکھائی دیتا ہے۔ کتے کی دُم چھوٹی جبکہ بھیڑیے کی خاصی موٹی اور لمبی ہوتی ہے۔ آوازوں کی نوع سے بھی دونوں میں تمیز کی جاتی ہے۔

وہ بھیڑیا ہی تھا جو کسی چیز کو کھینچ کر جھاڑیوں سے باہر لانے میں مصروف تھا۔ ہماری موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ پلٹ کر ہماری جانب متوجہ ہوا۔ کھالے نے گن کی نالی کا رُخ اُس کی جانب کیا۔ پیا نے فوراً نالی پر ہاتھ رکھ کر گن کو نیچے جھکا دیا اور سرگوشی کی۔ ''گولی چلانے کی حماقت نہ کرنا۔''

وہ اِس دوران چاقو نکال چکا تھا مگر بھیڑیا ہم میں سے کسی پر حملہ آور ہونے کے بجائے دانت نکوستا ہوا جست لگا کر ایک طرف بھاگ گیا اور لمحوں میں ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ کھالا اُس گھنی جھاڑی کی طرف بڑھا جہاں چند لمحے پیشتر بھیڑیا دکھائی دیا تھا۔ وہ جونہی جھک کر جھاڑی کے نیچے گھسا، اُس کے لبوں سے دَبی دَبی چیخ برآمد ہوئی۔ میں نے لمبی زقند بھری اور کھالے کے پیچھے پہنچا، پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

وہ پلٹا اور بولا۔ ''لاش پڑی ہے شہرے!''

''کس کی؟''

میں نے جھک کر اُس کے کندھوں کے اوپر سے جھاڑی کی جڑوں میں دیکھا۔ اوندھی پڑی ہوئی لاش کا نچلا آدھا دھڑ نظر آ رہا تھا۔ کھالا گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ میرے عقب میں پیا کی سرگوشی اُبھری۔ ''لاش کو کھینچ کر باہر نکالو۔''

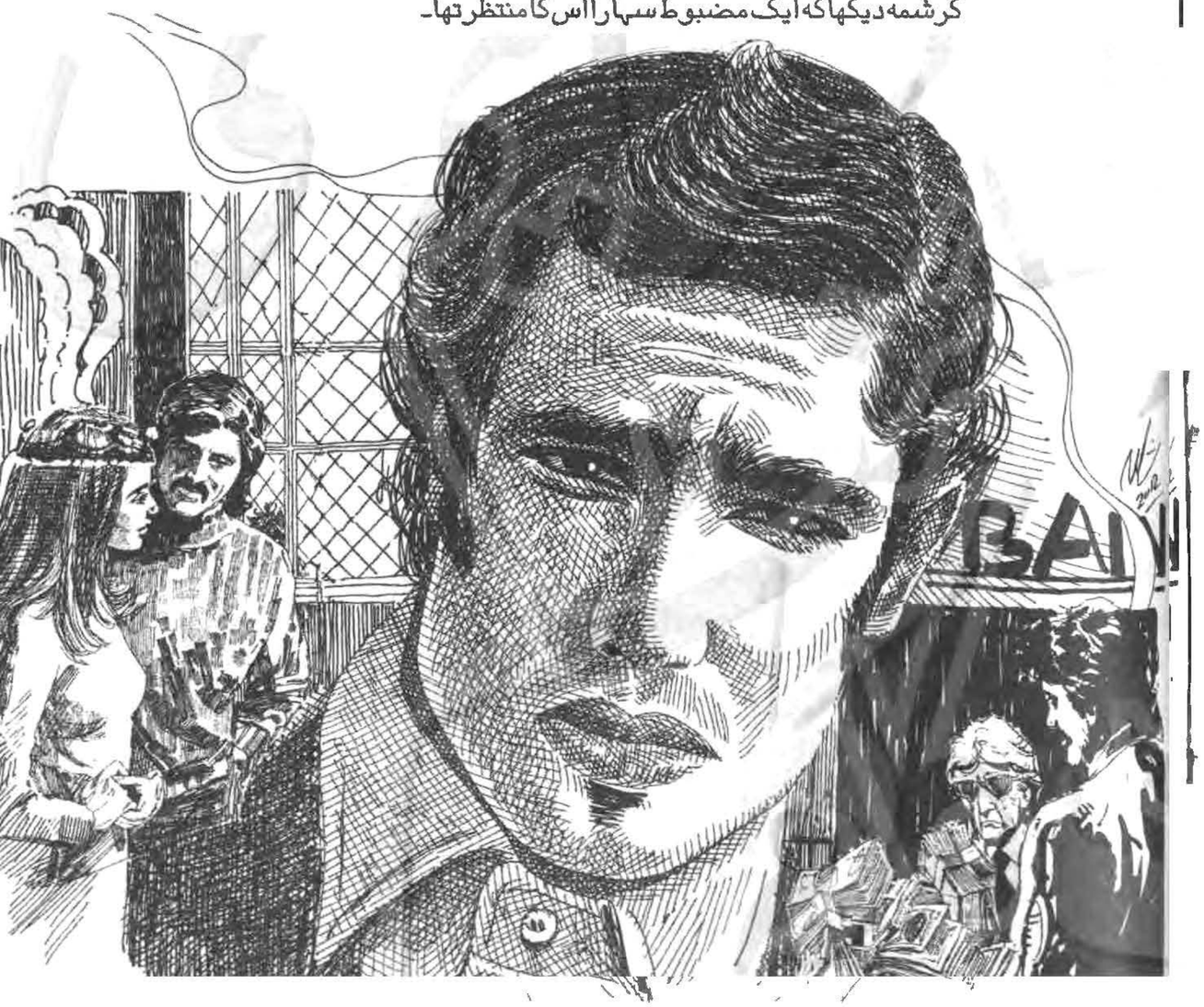
کھالا تب تک ابتدائی ذہنی جھٹکے کی ٹرانس سے نکل کر کافی حد تک سنبھل چکا تھا۔ اُس نے پیٹ کے بل پڑی ہوئی انسانی لاش کو دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔ اِس اثنا میں پیا اور عقیل بھی ہمارے قریب آ گئے۔ کھالے نے جونہی لاش کو سیدھا کیا، پیا نے سرچ لائٹ کی روشنی سے لاش کا چہرہ روشن کر دیا۔ میں لاش کے پیروں کی سمت زمین پر بیٹھا تھا۔ دیکھنے کے لیے کہ وہ کون بدقسمت تھا، تھوڑا سا اوپر اُٹھا۔ جونہی میں نے لاش کا چہرہ دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل نے اچانک دھڑکنا بند کر دیا ہو۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

امانت

بابر نعیم

ایمان دار انسان کسی ہیرے سے کم نہیں ہوتا مگر وہ تو نہ صرف بہ ذات خود ہیرا تھا بلکہ کتنے ہی ہیروں کا مالک بھی تھا پھر ایسے میں بھلا زمانہ کیسے دشمن نہ بنتا... لیکن اس کی بدقسمتی یہ کہ اس کا دشمن وہ نکلا جس پر اسے گمان تک نہ تھا... پھر ایسے ٹوٹے ہوئے حالات میں اس نے قدرت کا کرشمہ دیکھا کہ ایک مضبوط سہارا اس کا منتظر تھا۔



مسیحاؤں کے روپ میں چند ستم گروں کا قصہ

آج کیس کو مکمل ہوئے صرف تین ہی دن گزرے تھے اور میں اپنے دفتر میں بیٹھا کھڑکی سے باہر برف باری کے رکنے پر گھروں سے نکلنے والے ہجوم کو دیکھ رہا تھا کہ دروازے میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا۔ جو ظاہری طور پر ایک باحیثیت شخص نظر آ رہا تھا۔ تاہم اس کی حرکات وسکنات اس کی اندرونی پریشانی و بے چینی کی غماز تھیں۔ اندر آتے ہی اس نے کپڑوں اور جوتوں سے برف جھاڑی اور پریشان کن انداز میں بغیر کچھ کہے ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ میرا دفتر ایک آٹھ منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر واقع تھا اور آنے والے کے بھاری بھرکم جسم کے لیے تیسری

منزل تک سیڑھیوں کی چڑھائی اچھی خاصی ورزش ثابت ہوئی تھی۔ چند منٹ تک وہ اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو قابو کرتا رہا پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''مسٹر میلکم۔ مجھے میرے بزنس پارٹنر سر ڈگلس نے آپ کا پتا دیا ہے کہ میرے مسئلے کو آپ حل کر سکتے ہیں۔ میرا نام الیگزینڈر ہولڈر ہے اور میں لندن کے مرکزی بینک کا سینئر پارٹنر ہوں۔ سبھی بینکوں کی طرح ہمارا بینک بھی منافع کے کسی موقعے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور اگر صاحب حیثیت لوگ ضرورت کے تحت اپنی قیمتی چیزیں گروی رکھ کر قرض لینا چاہیں تو انہیں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ کامیاب بینکاری کے لیے یہ سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ میرے ساتھ جو سانحہ پیش آیا ہے اس کا تعلق اسی قسم کے لین دین سے ہے۔ کل صبح میں بینک میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام میں مصروف تھا کہ ایک کلرک میرے پاس ایک وزیٹنگ کارڈ لایا۔ کارڈ ملک کی ایک مشہور و معروف ہستی کا تھا۔ میں نے خود بڑھ کر اسے خوش آمدید کہا اور اپنے دفتر میں لے آیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس کے لیے کسی تواضع کا اہتمام کرتا وہ کاروباری گفتگو شروع کر بیٹھا۔

''مسٹر ہولڈر مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا بینک لوگوں کو قرضے دیتا رہتا ہے۔''

''جی ہاں! اگر بینک کو تحفظ اور مناسب گارنٹی مل جائے تو قرضے پر رقوم مہیا کر دی جاتی ہیں۔''

''مجھے فوری طور پر پچاس ہزار پاؤنڈز درکار ہیں۔'' اس نے بھی دھیمی سی آواز میں مجھ سے کہا۔ چند لمحے توقف کے بعد اپنی گفتگو کو بڑھاتے ہوئے اپنی مشکل کے بارے میں بتانے لگا۔ ''میرے لیے یہ رقم اپنے دوستوں سے قرض لینا قطعاً مشکل نہیں لیکن کسی کا احسان لینے سے میری موجودہ حیثیت متاثر ہوتی ہے اور تم سمجھ سکتے ہو کہ میری حیثیت کے آدمی کے لیے کسی کا زیر احسان ہونا کس قدر غیر دانش مندانہ ہوتا ہے۔''

''آپ کو یہ رقم کتنے عرصے کے لیے درکار ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اگلے سوموار کو مجھے ایک بڑی رقم ملنے والی ہے اور میں اسی دن یہ رقم مع سود کے لوٹا دوں گا لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ مجھے پچاس ہزار پاؤنڈز اسی وقت درکار ہیں۔''

''آپ کی شخصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں یہ رقم اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے بھی دینے کو تیار ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح میرے پارٹنر کی حق تلفی ہوگی۔ لہٰذا میں آپ کے معاملے میں بھی تمام کاروباری تقاضے پورے کرنا پسند کروں گا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ معاملے کو ذاتیات سے نکال کر کاروباری شکل دے دی جائے۔ مسٹر ہولڈر! تم نے ہیروں کے اس جڑاؤ تاج کے متعلق تو سنا ہوگا جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس معزز شخص نے ایک سیاہ ڈبے کو کھول کر میرے سامنے کر دیا۔ میرے سامنے جیولری کا شاہکار نمونہ پڑا ہوا تھا۔ اس میں اٹھالیس بیش قیمت ہیرے جڑے ہوئے تھے اور میرے اندازے کے مطابق اس کی قیمت ایک لاکھ پاؤنڈز سے کسی طور بھی کم نہیں تھی۔ میں نے ڈبے کو ہاتھ میں لے کر تاج کا بہ غور معائنہ کیا۔

''کیا تمہیں اس کی مالیت پر شبہ ہے؟'' میرے موکل نے پوچھا۔

''ہرگز نہیں!'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے صرف یہ اندیشہ ہے کہ کیا آپ واقعی سوموار تک اسے واپس لینے میں کامیاب رہیں گے؟''

''تمہیں اس کے متعلق فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر مجھے اس بات کا ذرہ برابر بھی خدشہ ہوتا کہ میں سوموار تک اسے واپس نہ لے سکوں گا تو میں ایسا سودا ہرگز نہ کرتا اور تمہیں بھی اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ میں نے یہ شاہی ملکیت تمہارے حوالے کر کے جس اعتماد کا اظہار کیا ہے اسے ٹھیس نہ لگنے پائے۔ اس کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام ہونا چاہیے کیونکہ اس کے گم ہونے یا خراب ہونے سے جو اسکینڈل بنے گا وہ شاہی خاندان کی نیک نامی کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ اگر تم مطمئن ہو تو رقم میرے حوالے کرو کیونکہ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔''

میرے اطمینان کے لیے اس کی شخصیت ہی کافی تھی لہٰذا میں نے کیشئر سے پچاس ہزار پاؤنڈز لانے کو کہا اور رقم اپنے موکل کے حوالے کر کے اسے رخصت کر دیا۔ دفتر میں تنہا ہوتے ہی مجھے اپنی اس ذمے داری کا احساس ہوا جو کہ تاج کی میرے پاس موجودگی سے مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ تاج ایک طرح سے قومی ملکیت تھی اور اس کو کسی قسم کا نقصان مجھے تباہ کر سکتا تھا۔ تاہم اب تو میں نے اس ذمے داری کو قبول کرنا ہی تھا۔ میں نے احتیاط کے ساتھ اسے اپنے ذاتی سیف میں بند کر دیا اور ایک بار پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ شام کو گھر جاتے ہوئے مجھے خیال ہوا کہ ایسی قیمتی چیز کو خود سے دور اکیلا چھوڑنا مناسب نہیں۔ بینکوں کے سیف عموماً توڑے جاتے رہے ہیں، ایسا نہ ہو کہ میں گھر میں سو رہا ہوں اور کوئی ہاتھ صاف کر جائے۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگلے چند روز تک میں اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھوں گا۔

چنانچہ میں اسے گھر لے گیا اور بالائی منزل پر ڈریسنگ روم میں نصب پرانے سیف میں بند کر دیا۔

اور اب اس سے پہلے کہ میں اپنی بدنصیبی کی اصل روداد بیان کروں بہتر ہوگا کہ میں اپنے گھریلو ماحول کو واضح کر دوں تاکہ آپ حالات کو مکمل طور پر سمجھ سکیں۔

میرے پاس تین نوکر ہیں اور تینوں ہی صنف نازک سے متعلق ہیں۔ ان میں سے دو تو کئی سال سے میرے ساتھ ہیں اور ان کی ایمانداری کسی شبہے سے بالاتر ہے۔ تیسری ملازمہ ایک خوب صورت لڑکی ''لوسی پارٹ'' ہے جو صرف تین ماہ قبل ملازم ہوئی ہے۔ اب تک اس کے کردار میں کسی قسم کی خامی سامنے نہیں آئی سوائے، اس کے کہ اس کے چاہنے والے عموماً میرے گھر کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ میرا اپنا خاندان مختصر ہے اور اس کے کوائف بیان کرنے میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوگا۔ عرصہ ہوا میری بیوی ایک لڑکے کو جنم دے کر مجھے تنہا چھوڑ گئی اور میں نے آج تک اس بچے کی دیکھ بھال پوری توجہ سے کی ہے تاہم جوان ہو کر اس نے مجھے مایوس کر دیا ہے۔ سبھی کہتے ہیں کہ آرتھر کو میں نے خود بگاڑا ہے اور یہ ہے بھی درست کیونکہ جب سے میری بیوی مری ہے میں نے اس کے چہرے سے مسکراہٹ ایک لمحے کے لیے بھی معدوم نہیں ہونے دی، کبھی اس کی کسی خواہش کو رد نہیں کیا۔ اگر میں کچھ سختی برتتا تو شاید یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہوتا۔ میں چاہتا تھا کہ آرتھر بینک کے کام میں میرا ہاتھ بٹائے لیکن اس میں محنت اور تندہی کچھ زیادہ ہی ہے اور میرے کاروبار کے لیے تحمل مزاجی پہلا زینہ ہے جس پر قدم رکھ کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوا جا سکتا ہے۔ درحقیقت میں خود زیادہ بڑی رقوم کا لین دین اس کے ذریعے کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ جب وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا تو وہ ''ارسٹوکریٹک کلب'' کا ممبر بن گیا اور اپنی دولت کے بل بوتے پر بہت سے غیر پسندیدہ لوگوں کا دوست بن گیا جن کی صحبت نے اسے جوئے کی لعنت میں مبتلا کر دیا۔ وہ اپنے ماہانہ الاؤنس کے علاوہ بھی مہینے میں کئی مرتبہ رقوم کا تقاضا کرنے لگا تھا۔ میرے سمجھانے پر کئی بار اس نے کلب کے دوستوں سے پیچھا چھڑانا چاہا لیکن ہر مرتبہ اس کا دوست ''سر جارج برین ویل'' اسے واپس گھسیٹ لے جانے میں کامیاب ہو جاتا۔ آرتھر پر سر جارج اس بری طرح اثرانداز ہوا ہے کہ وہ سر جارج کو اپنے گھر بھی لے کر آتا رہا ہے۔ وہ آرتھر سے کافی بڑا ہے اور میرے اندازے کے مطابق وہ دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی گفتار میں شیرینی اور کشش کو دیکھتے ہوئے میں سمجھ سکتا ہوں کہ وہ آرتھر پر اس قدر اثرانداز کیوں ہے۔ میرے خاندان کی آخری فرد میری بھتیجی ''میری'' ہے اور پانچ سال پہلے جب میرا بھائی اسے اس دنیا میں تنہا چھوڑ گیا تو میں نے اسے اپنا لیا۔ وہ میرے گھر کی رونق ہے اور کسی گڑیا کی طرح وہ میرا دل بہلاتی ہے۔ وہ چوبیس سال کی ایک خاموش طبع لڑکی ہے اور سارے گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ آرتھر کئی مرتبہ یہ مطالبہ کر چکا ہے کہ اس کی شادی میری سے کر دی جائے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا لیکن ہر مرتبہ میری انکار کرتی رہی۔ شاید وہ میری بات مان لیتی لیکن افسوس اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب یہ خواب کبھی پورا نہ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اپنے گھریلو پس منظر کو بالکل واضح کر دیا ہے اب میں اپنی بدقسمتی کی داستان بیان کرتا ہوں۔

رات کے کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں کافی پیتے ہوئے میں نے آرتھر اور میری کو اپنے آج کے تجربے کے متعلق بتایا اور یہ بھی بتا دیا کہ میں وہ قیمتی تاج گھر لے آیا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جب میں یہ باتیں کر رہا تھا تو لوسی پارٹ جو کہ کافی لائی تھی کمرے سے جا چکی تھی لیکن مجھے یہ یقین نہیں ہے کہ کمرے کا دروازہ بند تھا یا نہیں۔ میری اور آرتھر نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور تاج دیکھنے کی خواہش کی لیکن میں نے اسے مناسب نہ سمجھتے ہوئے انہیں ٹال دیا۔

''ڈیڈی آپ نے اسے کہاں رکھا ہے؟'' آرتھر نے پوچھا۔

''بالائی منزل کے سیف میں۔'' میں نے جواب دیا۔

آرتھر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آج رات کوئی ڈاکو ہمارے گھر قسمت آزمائی نہ کرنے آجائے۔''

''برخوردار وہ سیف میں بند ہے۔'' میں نے دہرایا۔

''ڈیڈی اس پرانے سیف کو تو کوئی بھی چابی کھول سکتی ہے۔ جب میں چھوٹا تھا تو میں نے اسے اسٹور روم کی چابی سے کھول لیا تھا۔ کسی ڈاکو کے سامنے اس کی کیا حقیقت ہے، چونکہ آرتھر کی بڑائی ہانکنے کی عادت سے میں واقف تھا اس لیے میں نے اس کی بات کا سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا۔ رات گئے آرتھر میرے کمرے میں چہرے پر سنجیدگی طاری کیے ہوئے آیا اور بولا۔ ''ڈیڈی کیا آپ مجھے دو سو پاؤنڈز دے سکتے ہیں؟''

''نہیں، ہرگز نہیں۔ میں پہلے ہی تمہیں احمقانہ حد تک فیاضی سے رقوم دیتا رہا ہوں۔''

''ڈیڈی میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ مجھ پر بہت مہربان ہیں، تاہم ایک مہربانی اور کریں اور مجھے دو سو پاؤنڈز دے دیں

ورنہ میں کلب میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

"اور یہی سب سے اچھی بات ہوگی۔" میں نے غصے سے جواب دیا۔

"لیکن ڈیڈی میں اپنی بے عزتی برداشت نہیں کرسکتا۔ اگر آپ نے مجھے رقم نہ دی تو مجھے کوئی دوسری راہ دیکھنا پڑے گی کیونکہ مجھے ہر حال میں رقم چاہیے۔"

چونکہ اسی مہینے وہ پہلے بھی دو مرتبہ مجھ سے رقم لے چکا تھا اس لیے میں نے غصے میں صاف انکار کردیا۔ میرا اٹل فیصلہ سن کر وہ ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے باہر چلا گیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے سیف کھولا اور تاج کو باہر نکال کر یہ تسلی کرنے کے بعد کہ وہ محفوظ ہے دوبارہ سیف میں لاک کردیا۔ اس کے بعد میں نے سارے گھر کی کھڑکیاں اور دروازے چیک کرنے کے لیے ایک چکر لگایا حالانکہ یہ ڈیوٹی عموماً میری بھتیجی سرانجام دیا کرتی تھی۔ جب میں سیڑھیاں اتر رہا تھا تو میں نے میری کو ہال کی بڑی کھڑکی میں کھڑے دیکھا مگر جب تک میں اس تک پہنچتا اس نے کھڑکی بند کرکے کنڈی چڑھادی اور بولی۔

"انکل! کیا آپ نے آج رات لوسی پارکو گھر سے باہر جانے کی اجازت دی ہے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"وہ ابھی پچھلے دروازے سے واپس آئی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ سائڈ گیٹ تک کسی سے ملنے گئی تھی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے اور اس سلسلے کو ختم ہونا چاہیے۔"

"صبح میں اس سے بات کروں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا تمام کھڑکیاں اور دروازے وغیرہ بند ہیں نا؟"

"جی ہاں انکل!"

یہ سن کر میں میری کو شب بخیر کہہ کر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا اور جلد ہی سوگیا۔ میں آپ کو ہر تفصیل بتا رہا ہوں تاہم کوئی بات وضاحت طلب ہو تو پوچھ لیجیے گا۔ میں ہمیشہ سے کچی نیند سوتا ہوں اور موجودہ حالات میں چونکہ میرے ذہن میں خدشات موجود تھے اس لیے میں مزید چوکنا تھا۔ تقریباً دو بجے رات گھر میں کسی قسم کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میرے خیال میں کھڑکی آہستگی سے بند کی گئی تھی۔ میں پوری طرح چوکنا ہوکر ہر آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے دوسرے کمرے میں چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں فوراً بستر سے نکل کر ڈریسنگ روم میں پہنچا۔ ڈریسنگ روم کے دروازے سے میں نے آرتھر کو کمرے کے وسط میں تاج ہاتھ میں لیے کھڑے دیکھا وہ تاج کو موڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آرتھر!" میں نے چیخ کر کہا۔ "تمہیں اس تاج کو ہاتھ لگانے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

میری آواز سنتے ہی اس کا رنگ زرد ہوگیا اور اس نے تاج ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ اس کا ایک کونہ تین ہیروں سمیت غائب تھا۔

میں نے غصے میں چلا کر کہا۔ "تم نے اسے تباہ کردیا ہے۔ تم نے مجھے ہمیشہ کے لیے رسوا کردیا ہے۔ بتاؤ تم نے جو ہیرے چرائے ہیں وہ کہاں ہیں؟"

"ہیرے چرائے ہیں؟" وہ حیرانی سے بولا۔

میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا "دو تین ہیرے غائب ہیں اور تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہیں۔ میں تمہیں چور کے علاوہ جھوٹا بھی کہوں گا۔ میں نے خود تمہیں تاج کو توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ آستین کے سانپ بتا، ہیرے کہاں ہیں؟"

"ڈیڈی آپ نے مجھے کافی گالیاں دے لی ہیں اور میں مزید گالیاں برداشت نہیں کرسکتا۔ اب میں منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہوں گا اور صبح یہ گھر چھوڑ دوں گا۔"

"اس سے پہلے کہ تم یہ گھر چھوڑو میں تمہیں پولیس کے حوالے کردوں گا۔" میں غصے کی زیادتی کی وجہ سے پاگل ہو رہا تھا۔

"ڈیڈی آپ یا پولیس مجھ سے کچھ معلوم نہیں کرسکتی۔"

آرتھر نے ایسے استقامت سے بھرپور لہجے میں کہا جس کی میں آرتھر جیسے کھلنڈرے انسان سے توقع نہیں کرسکتا تھا۔ اس قدر ٹھہراؤ اور صبر کا مظاہرہ کرنا اس کی فطرت میں ہرگز نہیں تھا۔ غصے کی زیادتی کی وجہ سے چونکہ میں خاصی بلند آواز میں بول رہا تھا اس لیے سارا گھر جاگ گیا تھا۔ سب سے پہلے میری کمرے میں داخل ہوئی۔ جونہی اس کی نظر تاج پر پڑی وہ صدمے سے بے ہوش ہوکر گر پڑی۔ میں نے ایک ملازمہ کو پولیس بلانے کے لیے کہا۔ معاملے کو فوراً ان کے سپرد کرتے ہوئے میں نے انسپکٹر کو ساری تفصیل بتادی۔

آرتھر نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈی میں پانچ منٹ کے لیے گھر سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے۔"

"تاکہ تم فرار ہوسکو یا جو کچھ تم نے چرایا ہے اسے چھپا سکو۔" یہ کہتے ہوئے مجھے اپنی خطرناک پوزیشن کا احساس ہوا جس میں، میں تین ہیروں کے گم ہوجانے کی وجہ سے گھر گیا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ "بیٹے اگر تم مجھے بتادو کہ گمشدہ ہیرے کہاں ہیں تو میں اب بھی سب کچھ بھول کر معاف کرنے کے

لیے تیار ہوں۔"

"اپنی معافی ان لوگوں کے لیے بچا کر رکھیے جو اس کے طلب گار ہیں۔" آرتھر نے سخت لہجے میں کہا۔

یہ جواب سن کر میں نے اسے انسپکٹر کے حوالے کردیا۔ انسپکٹر اور کانسٹیبل نے مل کر نہ صرف آرتھر بلکہ اس کے کمرے کی بھی مکمل تلاشی لی۔ لیکن کچھ دستیاب نہ ہوسکا اور نہ ہی اس نے اپنی زبان کھولی۔ پولیس اب اسے مزید پوچھ گچھ کے لیے پولیس اسٹیشن لے گئی ہے۔ لیکن پولیس نے مجھے یہ کہہ کر مایوس کردیا ہے کہ فوری طور پر وہ کچھ کرنے سے معذور ہیں۔"

"مسٹر ہیلکم۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ہر قسم کے اخراجات سے بے پروا ہوکر آپ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچادیں۔ میں پہلے ہی اس سلسلے میں ایک ہزار پاؤنڈز کا انعام مقرر کرچکا ہوں۔ میری بدنصیبی کا اندازہ کیجیے کہ میں ایک ہی رات میں اپنا وقار، دولت اور اپنے بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔"

مسٹر الیگزینڈر ہولڈر نے آخری فقرہ ایسے درد بھرے انداز میں کہا کہ میری تمام ہمدردیاں اس کے لیے وقف ہوگئیں۔

"مسٹر ہولڈر! براہ کرم میرے چند سوالوں کا جواب دیں۔ کیا آپ وسیع سوسائٹی رکھتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ صرف میرا پارٹنر اور اس کی فیملی یا میرے بیٹے آرتھر کا دوست سر جارج برن ویل ہمارے گھر آتے ہیں۔"

"کیا گھر سے باہر آپ وسیع حلقۂ احباب رکھتے ہیں؟"

"آرتھر یقیناً وسیع حلقۂ احباب رکھتا ہے لیکن میں اور میری زیادہ تر وقت گھر پر گزارتے ہیں۔"

"مسٹر ہولڈر کیا یہ بات میری جیسی جوان لڑکی کے لیے غیر معمولی نہیں ہے اور آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس نے اس واقعے کا بڑا شدید اثر لیا ہے اور وہ تاج کو دیکھ کر بے ہوش ہوگئی تھی۔"

"جی ہاں۔ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ متاثر ہوئی ہے۔"

"مسٹر ہولڈر میرے خیال میں آپ کو اپنے بیٹے کے چوری کرنے پر پورا یقین ہے۔"

"یقین کیسے نہ ہو میں نے خود تاج اس کے ہاتھوں میں دیکھا ہے۔"

"یہ چور ہونے کا پختہ ثبوت نہیں ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ تاج کے اس حصے کو جو کہ آرتھر کے ہاتھ میں تھا کوئی

خوف خدا

حضرت رابعہ بصری بادشاہ وقت کی کنیز تھیں، ایک دن وہ اس کا نرم وگداز بستر صاف کر رہی تھیں کہ چند لمحوں کے لیے اس قیمتی آرام دہ اور نرم وگداز بستر پر سوگئیں، اوپر سے حاکم وقت آگیا، غصے کے عالم میں اس نے انہیں چابک سے مارنا شروع کردیا۔ پہلے تو آپ روئیں پھر مسکرانے لگیں۔ بادشاہ نہایت حیران ہوا اس نے کہا۔ "رابعہؒ مسکرا کیوں رہی ہو؟"

آپ نے جواب دیا۔ "بادشاہ سلامت، میں تیرے بستر پر صرف چند لمحوں کے لیے سوئی اور مجھے اتنی سخت سزا ملی۔ سوچ رہی ہوں کہ تو جو ساری عمر اس بستر پر سوتا رہا ہے۔ اللہ تمہیں کتنی سزا دے گا۔" یہ سن کر بادشاہ تھر تھر کانپنے لگا اور اس نے حضرت رابعہ بصریؒ کو آزاد کردیا۔

مرسلہ: حجاب کنول خان، ملک وال

نقصان پہنچا تھا؟"

"ہاں وہ مڑا تڑا ہوا تھا۔ وہ خود اسے موڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ اسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔"

"آپ آرتھر کی حمایت میں جو جی چاہے مفروضے قائم کریں، میں اس کی بے گناہی کا یقین نہیں کرسکتا۔"

"پھر آپ ہیروں کے غائب ہونے کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ وہ آرتھر سے کیوں نہیں ملے؟"

"پولیس والے ابھی تک تلاش جاری رکھے ہوئے ہیں انہیں امید ہے کہ وہ ہیرے ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"کیا انہوں نے گھر سے باہر بھی انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے؟"

"ہاں انہوں نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے باغ کا چپا چپا چھان مارا لیکن تمام تلاش بے سود ثابت ہوئی۔"

"مسٹر ہولڈر تمام روداد سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ اسے جس قدر آسان اور سیدھا سادا کیس

سمجھ رہے ہیں یہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور الجھا ہوا ہے۔ آپ کے نظریے کے مطابق آرتھر نے آپ کے سیف والے کمرے میں داخل ہو کر سیف کھولا اور تاج نکال کر اس کا ایک حصہ توڑ کر باہر جا کر کہیں چھپا دیا اور باقی ماندہ تاج لے کر دوبارہ آپ کے کمرے میں آیا۔"

"اگر یہ ایسے نہیں ہے تو پھر کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔" مسٹر ہولڈر نے مایوسی سے کہا۔

"یہ میرا کام ہے کہ میں وہ طریقہ ڈھونڈ نکالوں۔ اب میں آپ کے ساتھ جا کر موقع واردات کا معائنہ کرنا پسند کروں گا تا کہ کوئی نتیجہ خیز صورت حال سامنے آ سکے۔"

مسٹر ہولڈر کا گھر سفید پتھر کی دو منزلہ شاندار عمارت تھی جس کے چاروں طرف باغ بنا ہوا تھا تاہم برف باری کی وجہ سے ہر چیز پر برف کا سفید پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے سارے گھر کے گرد ایک چکر لگایا اور اپنی دلچسپی کی کئی باتیں نوٹ کیں۔ اس کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ ابھی گفتگو کا آغاز ہوا ہی تھا کہ اندرونی دروازے سے ایک جواں سال لڑکی داخل ہوئی۔ وہ درمیانے قد کی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ زرد چہرہ، تیکھے نقوش، چمکدار آنکھیں جو رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ میری موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ سیدھی مسٹر ہولڈر کے پاس پہنچی اور بولی۔

"انکل آپ نے آرتھر کو رہا کرنے کے لیے کہہ دیا ہے نا؟"

"نہیں میری جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی یہ ممکن نہیں۔" مسٹر ہولڈر نے جواب دیا۔

"لیکن انکل مجھے یقین ہے کہ آرتھر بے گناہ ہے اور آپ کو بعد میں پچھتاوا ہو گا کہ آپ نے اس پر اس قدر سختی کیوں کی۔"

"اگر وہ بے گناہ ہے تو خاموش کیوں ہے؟"

"شاید وہ اس بات سے ناراض ہے کہ آپ نے اس پر شک کیا۔"

"میں اس پر شک کرنے پر حق بجانب ہوں کیونکہ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے تاج تھامے ہوئے دیکھا ہے اور میں اس معاملے کو اس وقت تک ختم نہیں ہونے دوں گا جب تک ہیرے بازیاب نہیں ہو جاتے۔ آرتھر سے انسیت کی وجہ سے تم یہ بھول رہی ہو کہ ہیروں کی گم شدگی میرے لیے کس قدر تباہی کا باعث بنے گی۔ میں ان صاحب کو اسی معاملے کی چھان بین کرنے کے لیے لایا ہوں۔" مسٹر ہولڈر نے آخری فقرہ میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سر!" اب میری نے مجھے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ آرتھر کو بے گناہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"میں تمہارے اس خیال کی تائید کرتا ہوں اور اسے ثابت کرنے کے لیے چند سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"بڑی خوشی سے پوچھیے۔ اگر میں آرتھر کو بے گنا ثابت کرنے میں کسی قسم کی مدد کر سکتی ہوں تو اس سے بڑھ مسرت کی کیا بات ہو سکتی ہے؟"

"گزشتہ رات تمہاری آنکھ کیسے کھلی؟"

"میں چچا کی آواز سن کر بیدار ہوئی تھی۔"

"پچھلی رات آپ نے تمام دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح مقفل کر دی تھیں تو کیا صبح بھی وہ سب بند تھیں؟"

"جی ہاں۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ ملازماؤں میں سے ایک رات کو اپنے چاہنے والے سے ملنے باہر گئی تھی؟"

"جی ہاں اور یہ وہی ملازمہ ہے جو ہمارے لیے ڈرائنگ روم میں کافی لے کر آئی تھی۔ ہو سکتا ہے اس نے تاج کے متعلق سن لیا ہو۔"

"تم یہ تو نہیں کہنا چاہتیں کہ اس نے تاج کے متعلق سن کر اپنے محبوب کو بتایا اور پھر دونوں نے اسے چرانے کا منصوبہ بنا لیا۔"

"یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔" مسٹر ہولڈر نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔ "جب میں نے آرتھر کو خود اپنی آنکھوں سے تاج تھامے ہوئے نہ دیکھا ہوتا۔"

"مسٹر ہولڈر آپ تھوڑا صبر کریں۔ ہم اس طرف بھی آ رہے ہیں۔ ہاں تو مس "میری" کیا ملازمہ پچھلے دروازے سے واپس آئی تھی؟"

"ہاں وہ پچھلے دروازے سے اندر آئی تھی۔ میں نے اس کے محبوب کو بھی دیکھا تھا۔"

"کیا آپ اس شخص کو جانتی ہیں؟"

"ہاں وہ ایک سبزی فروش ہے جو ہمارے ہاں بھی سبزی سپلائی کرتا ہے۔ اس کا نام فرانسس ہے۔"

"کیا وہ گیٹ کے پاس بائیں طرف کھڑا تھا؟"

"جی ہاں۔ وہ گیٹ سے کافی دور بائیں جانب کھڑا تھا۔"

"مس میری شاید آپ کو علم ہو کہ اس کی ایک ٹانگ لکڑی کی ہے۔"

"آپ تو جادوگر معلوم ہوتے ہیں۔" وہ حیرت اور

خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولی۔ ''آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ واقعی اس کی ایک ٹانگ لکڑی کی ہے؟''

''میں اب اوپر جانا چاہتا ہوں۔'' اس کے سوال کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے میں مسٹر ہولڈر سے مخاطب ہوا۔ پھر ایک خیال کے تحت میں نے پہلے باہر جانا پسند کیا۔ باہر جا کر میں نے ہر کھڑکی اور دروازے کے باہر برف میں بنے ہوئے نشانات کا بہ غور معائنہ کیا اور مطمئن ہو کر بالائی منزل پر گیا۔

مسٹر ہولڈر کا ڈریسنگ روم جس میں کہ سیف نصب تھا، سادہ سے فرنیچر اور ہلکے براؤن قالین سے سجا ہوا تھا۔ میں نے سیف کے تالے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مسٹر ہولڈر اس کو کھولنے کے لیے جو چابی استعمال کی گئی ہے وہ کہاں ہے؟''

''میں نے وہ چابی یہاں ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی ہے۔''

ڈریسنگ ٹیبل سے چابی لے کر میں نے سیف میں آزمائی سیف بغیر کسی آواز کے کھل گیا۔ میں نے سیاہ رنگ کا وہ ڈبا جس میں باقی ماندہ تاج تھا، اٹھا کر کھولا۔ تاج واقعی کاریگری کا اعلیٰ نمونہ تھا لیکن تین ہیروں کی عدم موجودگی نے اس کے حسن کو غیر متوازن کر کے رکھ دیا تھا۔ تاج اس قدر مضبوط بنا ہوا تھا کہ ایک عام آدمی کی طاقت اسے توڑنے سے قاصر تھی۔

میں نے بینکر کو مخاطب کر کے کہا۔ ''مسٹر ہولڈر آپ ذرا اس تاج کو توڑنے کی کوشش کیجیے۔''

یہ سن کر بھاری بھرکم بینکر کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ بولا۔ ''میں ایسا کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو میں ایسا کرنے لگا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے تاج کو دونوں ہاتھوں سے توڑنے کی کوشش کی لیکن بے سود! تاج درحقیقت ٹھوس اور مضبوط تھا۔ مسٹر ہولڈر حیرت کی زیادتی کی وجہ سے منہ کھولے مجھے تاج توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

''آپ نے دیکھا مسٹر ہولڈر۔ تاج کافی مضبوط ہے اور کوئی غیر معمولی قوت ہی اسے توڑ سکتی ہے اور جب اتنی مضبوط چیز ٹوٹتی ہے تو خاصی زوردار آواز پیدا ہوتی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ سب کچھ آپ سے چند قدموں کے فاصلے پر ہو اور آپ کچھ نہ سن سکیں۔''

''آپ کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں مسٹر میلکم۔''

''مسٹر ہولڈر آپ یہ بتائیں کہ جب آپ نے اپنے بیٹے کو تاج سمیت دیکھا تھا تو کیا وہ ننگے پاؤں تھا؟''

''جی ہاں۔ تاہم اس نے سلیپنگ سوٹ پہنا ہوا تھا۔''

''مسٹر ہولڈر جہاں تک سوالات کا تعلق ہے اب میں یہ سلسلہ بند کرتا ہوں آپ نے اور مس میری نے میری جس قدر مدد و تعاون کیا ہے اس سے میں یقیناً اس معاملے کو نمٹانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں ایک بار پھر باہر کا معائنہ کرنے جا رہا ہوں۔ امید ہے آپ مجھے تنہا جانے دیں گے کیونکہ زیادہ لوگوں کی موجودگی برف پر بنے ہوئے نشانات مٹا سکتی ہے۔''

اور جب میں واپس آیا تو سبھی کچھ جان چکا تھا سوائے اس کے کہ گمشدہ ہیرے کہاں ہیں۔

''مسٹر ہولڈر اب ہمیں جدا ہو جانا چاہیے۔ تاکہ میں اس کی باقی ماندہ کڑیاں بھی تلاش کر لوں۔ اگر آپ کل صبح نو اور دس بجے کے درمیان میرے دفتر آ جائیں تو میں آپ کو ساری تفصیل سے آگاہ کر دوں گا۔''

''لیکن ہیرے؟'' بینکر نے تجسس سے پوچھا۔

''مسٹر ہولڈر اگر آپ کے ہیرے حاصل کرنے میں کچھ رقم خرچ کرنا پڑے تو کیا آپ اس کی کوئی حد مقرر کرنا چاہیں گے؟''

''میں اپنی ساری پونجی دے کر بھی اس اسکینڈل سے بچنا چاہتا ہوں۔''

''اچھا تو میں چلتا ہوں۔ ممکن ہے اگلے چند گھنٹوں میں پھر یہاں آؤں۔''

دفتر پہنچ کر میں نے ایک لوفر کا بھیس بدلا، دو سینڈوچ جیب میں ڈالے اور اپنے آج کے مشاہدات کی تصدیق اور ثبوت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

اگلی صبح ٹھیک نو بجے مسٹر ہولڈر دفتر آ پہنچا۔ وہ کل سے کہیں زیادہ تھکا ہوا اور بوڑھا نظر آتا تھا۔

مسٹر ہولڈر نے دل گرفتہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''مسٹر میلکم نہ جانے مجھ سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہو گیا ہے کہ ایک کے بعد دوسری مصیبت میں مبتلا ہوئے چلا جا رہا ہوں۔ پہلے میری عزت و وقار داؤ پر لگا۔ دولت سے ہاتھ دھوئے۔ اپنے بیٹے کو کھویا اور اب میرا آخری سہارا میری بھتیجی بھی مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ جاتے ہوئے وہ یہ رقعہ چھوڑ گئی ہے جو میں آپ کے ملاحظہ کے لیے لے آیا ہوں۔''

میں نے رقعہ پڑھنا شروع کیا۔

''میرے پیارے چچا جان!

میں یہ خیال کرتی ہوں کہ اس ساری مصیبت کی ذمے دار

میں ہوں۔ آپ نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر میں نے آرتھر سے شادی کر لی ہوتی تو شاید آرتھر سدھر چکا ہوتا اور یہ المناک واقعہ کبھی پیش نہ آتا۔ چونکہ میں اپنے آپ کو قصوروار سمجھتی ہوں۔ اس لیے میرے لیے اس چھت کے نیچے رہنا مشکل ہو رہا تھا لہٰذا میں آپ کو چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ آپ میرے مستقبل کے لیے فکرمند نہ ہوں۔ کیونکہ ہر ذی روح اپنا مقدر ساتھ لے کر آتا ہے اور نہ ہی مجھے تلاش کرنے کی کوشش کیجیے گا کیونکہ ہر تلاش بے سود ثابت ہوگی۔

''آپ کی بھتیجی..... میری۔''

''کہیں وہ خودکشی نہ کر لے۔'' مسٹر ہولڈر نے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی مشکلات ختم ہونے کا وقت آ گیا ہے۔''

''کیا آپ کو کچھ معلوم ہو گیا ہے؟'' مسٹر ہولڈر نے جوش میں کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''ہیرے کہاں ہیں؟''

''مسٹر ہولڈر کیا آپ وہ ہیرے ایک ہزار پاؤنڈ فی ہیرا خریدنے کے لیے تیار ہیں۔''

''میں اس سے دگنی بلکہ تین گنا قیمت دینے پر تیار ہوں۔''

''تو پھر آپ چار ہزار پاؤنڈز کا چیک بنا دیجیے۔ تین ہزار ہیروں کے اور ایک ہزار انعام کے۔''

مسٹر ہولڈر نے بغیر ایک لمحہ ضائع کیے چیک لکھ کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے دراز سے تاج کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا نکال کر مسٹر ہولڈر کی طرف بڑھا دیا۔

مسٹر ہولڈر نے اسے جھپٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کو کہاں سے ملا؟''

''یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا پہلے آپ اپنے بیٹے کی رہائی کا انتظام کریں کیونکہ وہ بالکل بے قصور ہے۔''

''اگر آپ کو اس کی معصومیت کا یقین ہے تو آیئے جلدی کریں۔ میں اپنے پیارے بیٹے سے معافی مانگ لوں گا۔ معلوم نہیں وہ مجھے معاف بھی کرے گا یا نہیں؟''

''آپ فکرمند نہ ہوں مسٹر ہولڈر، میں اسے سب کچھ سمجھا کر آ رہا ہوں۔''

''میں آپ کا احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ ویسے اگر آپ مجھے تفصیل سے آگاہ کر دیں تو نوازش ہوگی۔''

''میں عموماً اپنے موکلوں کو تمام تر تفاصیل سے آگاہ کر دیا کرتا ہوں لیکن آپ کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ میں خود ہچکچاہٹ محسوس کر رہا ہوں اور نہیں چاہتا کہ آپ مزید پریشان ہوں۔ مسٹر ہولڈر میں نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کی بھتیجی اور سر جارج برن ویل آپس میں غیر اخلاقی روابط رکھتے تھے۔''

''میری بھتیجی.....! ناممکن۔'' بینکر نے غصے سے جواب دیا۔

''بدقسمتی سے یہ بالکل درست ہے۔ جب وہ پہلی بار آپ کے گھر آیا تھا تو آرتھر یا آپ کو بالکل علم نہ تھا کہ وہ کیسے کردار کا انسان ہے۔ حقیقت میں وہ انگلینڈ کے خطرناک لوگوں میں سے ایک ہے۔ وہ ایک ہارا ہوا جواری ہے جو اپنی قسمت سنوارنے کے لیے ہر داؤ لگانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ آپ کی بھتیجی اس کے میٹھے لہجے اور پروقار شخصیت سے مرعوب ہو کر ہر رات اس سے ملتی رہی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ سر جارج کے دل پر صرف اسی کا قبضہ ہے۔''

''مجھے اس بات کا ہرگز یقین نہیں اور نہ ہی کبھی یقین کروں گا۔ میں اپنی بھتیجی کے کردار سے خوب واقف ہوں۔'' مسٹر ہولڈر غصے سے سرخ ہو کر بولے۔

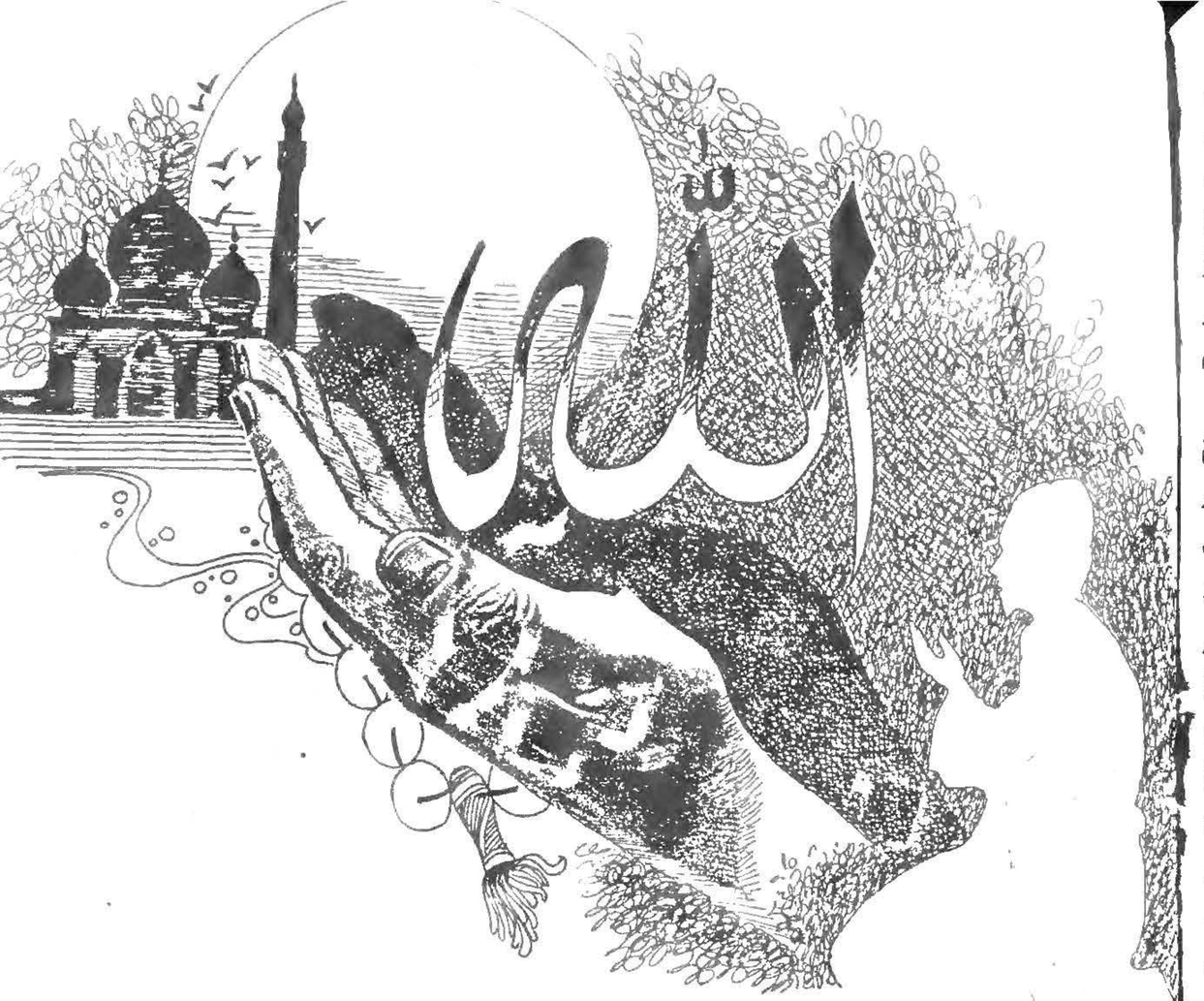
''مسٹر ہولڈر آپ تمام روداد سن کر یقیناً اپنا خیال تبدیل کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس رات جب آپ کی بھتیجی یہ سمجھتے ہوئے کہ آپ اپنے کمرے میں سونے چلے گئے ہیں اپنے محبوب سر جارج سے کھڑکی میں بات چیت کرنے لگ گئی۔ کھڑکی کے باہر برف میں بنے ہوئے قدموں کے نشانات کی میں نے پیمائش کر لی جو بعد میں سر جارج کے قدموں سے ملا کر دیکھے گئے اور وہ سر جارج کے قدموں کے نشان ہی ثابت ہوئے۔ بات چیت کے دوران میری نے اسے تاج کے متعلق بتایا تو سر جارج کی شیطانی سوچ نے فوراً اسے چرانے کا منصوبہ بنا لیا۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ آپ کی بھتیجی اس پر فوراً راضی نہیں ہوئی ہوگی۔ تاہم آخر کار اسے راضی ہونا پڑا۔ عورتوں میں ایک کمزوری یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ سارے رشتوں میں سے محبت کے رشتے کو ترجیح دیتی ہیں۔ وہ ابھی بہ مشکل اس کی ہدایات سن پائی تھی کہ آپ نیچے آ گئے اور اس سے کھڑکیوں وغیرہ کے بند ہونے کے متعلق پوچھنے لگے۔ اس نے آپ کی توجہ ملازمہ کے باہر جانے کی کہانی سنا کر دوسری طرف مبذول کرا دی اور یہ بھی حقیقت۔ ملازمہ بھی اپنے لنگڑے عاشق کو ملنے گئی تھی۔ اب اپنے بیٹے کی سنیے۔ آرتھر آپ سے دو سو پاؤنڈ زنہ ملنے کے غصے اور کلب میں قرضہ نہ چکانے پر ہونے والی بے عزتی کے متعلق سوچتا ہوا بستر میں کروٹیں بدل رہا تھا کہ اس نے اپنے کمرے کے باہر کسی کے دبے پاؤں چلنے کی آواز سنی۔ وہ

ننگے پاؤں باہر نکلا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری چوروں کی طرح آپ کے ڈریسنگ روم میں داخل ہو رہی ہے۔ وہ بھی چھپتا چھپاتا وہاں پہنچ کر کپڑوں کی الماری کے پیچھے رینگ گیا۔ میری نے سیف کھول کر تاج نکالا اور سیدھی کھڑکی کی طرف جا کر تاج باہر کھڑے ہوئے سر جارج کو پکڑا دیا۔ یہ دیکھ کر آرتھر کو صورت حال کا اندازہ ہوا۔ اور وہ میری کے واپس جانے کے فوراً بعد کھڑکی میں سے باہر کود گیا۔ میری کو اس کے باہر جانے کا قطعاً علم نہیں ہو سکا۔ آرتھر نے کھڑکی سے کچھ دور ہی سر جارج برن ویل کو جا پکڑا اور اس سے تاج چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ دونوں تاج کو پکڑے ہوئے ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ دونوں کی اس زور آزمائی میں تاج ایک طرف سے ٹوٹ گیا۔ خوش قسمتی سے تاج کا بڑا حصہ آرتھر کے ہاتھ میں رہا اور وہ یہ سمجھتے ہوئے کہ اس نے تاج چھین لیا ہے واپس بھاگ لیا۔ کھڑکی سے کود کر وہ اندر پہنچا اور یہ کودنے کی آواز ہی تھی جس نے آپ کی نیند میں خلل اندازی کی تھی۔ جونہی آرتھر کمرے کی روشنی میں آیا اس نے محسوس کیا کہ تاج کچھ ٹیڑھا ہو گیا ہے، وہ اسے سیدھا کرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ آپ آن پہنچے اور آپ نے اسے اس وقت گالیوں اور چور اور اسی نوع کے القاب سے نوازا جبکہ وہ آپ کی پدرانہ شفقت اور شکریے کا حق دار تھا۔ لہٰذا اس نے غصے میں چپ سادھ لی اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ اس نے میری کے متعلق، جس سے وہ پیار کرتا تھا کچھ کہنے سے گریز کیا۔ یہ بھی واضح کر دوں کہ میری یہ دیکھ کر کہ تاج دوبارہ آپ کے قبضے میں ہے بے ہوش ہو گئی تھی اور یہی ایک نقطہ اس کے ملوث ہونے کا پختہ ثبوت ہے۔ جب میں آپ کے گھر پہلی بار گیا تھا تو میں نے سب سے پہلے گھر کا چکر لگایا تھا۔ جب میں پچھلے دروازے پر پہنچا تو میں نے ایک عورت اور ایک مرد کے قدموں کے نشانات دیکھے یہ آپ کی ملازمہ اور سبزی فروش کے نشانات تھے۔ میں نے صرف ایک پاؤں اور دوسرے پاؤں کی جگہ گول گول گہرے نشانات دیکھتے ہوئے اندازہ لگا لیا کہ مرد کی ایک ٹانگ لکڑی کی ہے۔ جب میں بڑی کھڑکی کے سامنے سے گزرا تو میں نے سفید برف کی سطح پر لکھی ہوئی داستان چند لمحوں میں پڑھ لی۔ کھڑکی کے عین سامنے دو قدموں کے نشان تھے۔ ایک جوتوں والے قدم اور دوسرے ننگے پاؤں کے نشانات۔ مجھے احساس ہوا کہ ننگے پاؤں والا بعد میں اس راستے پر چلا ہے۔ کیونکہ کہیں کہیں جوتے کا نشان ننگے پاؤں کے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں ان نشانات کی راہنمائی میں اس جگہ جا پہنچا جہاں یہ دونوں نشانات آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے اور یہ وہی جگہ تھی جہاں آرتھر اور سر جارج میں تاج چھیننے کی کشمکش ہوئی تھی۔ ننگے پاؤں برف میں چلنے کی وجہ سے آرتھر کے پاؤں گیلے ہو گئے تھے چنانچہ جب وہ دوبارہ کھڑکی میں سے اندر داخل ہوا تو فریم پر ننگے پاؤں کا نشان بن گیا جس کا رخ ظاہر کرتا تھا کہ کوئی ننگے پاؤں اندر داخل ہوا ہے جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں بڑی مدد ملی کہ کیا واقعہ پیش آیا ہو گا۔

دفتر پہنچ کر میں نے ایک لوفر کا لباس پہنا اور سر جارج کی رہائش گاہ پر گیا وہاں اس کے ملازم سے واقفیت نکال کر معلوم کر لیا کہ پچھلی رات اس کے مالک کے سر پر چوٹ لگ گئی ہے اور دو پاؤنڈز خرچ کر کے سر جارج کا ایک پرانا جوتا حاصل کیا اور اس جوتے سمیت میں ایک بار پھر آپ کے گھر گیا اور کھڑکی کے سامنے موجود نشانات کا موازنہ سر جارج کے جوتوں سے کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس سارے دھندے کے پیچھے سر جارج ہی کا ہاتھ ہے۔ میں سر جارج سے ملا اور اس سے تاج کے متعلق استفسار کیا۔ پہلے تو وہ صاف مکر گیا لیکن جب میں نے اس سے ساری حقیقت بیان کی اور دھمکایا کہ پولیس نے اس کے قدموں کے نشانات محفوظ کر لیے ہیں اور اس کو پھنسانے کے لیے صرف نام لے دینا ہی کافی ہے تو اس نے دیوار پر ٹنگی ہوئی تلوار اتار کر مجھ پر حملہ کرنا چاہا لیکن میں نے اس سے قبل ہی پستول اس پر تان لیا۔ اس پر وہ کچھ دھیما پڑا اور جب میں نے اسے ایک ہزار پاؤنڈز فی ہیرا خریدنے کی پیشکش کی تو وہ پاگلوں کی طرح میرا منہ دیکھنے لگا۔ پھر مایوسی سے بولا کہ اس نے کسی کے ہاتھ تینوں ہیرے سات سو پاؤنڈز میں بیچ ڈالے، میں بڑی جدوجہد کے بعد خریدار کا نام معلوم کر کے اس کے پاس پہنچا اور اس سے کافی تگ ودو کے بعد تین ہزار پاؤنڈز میں تینوں ہیرے خریدنے میں کامیاب ہو گیا۔

مسٹر ہولڈر یہ ہے ساری رام کہانی۔ اب آپ کو اپنے بیٹے کی رہائی کا بندوبست کرنا چاہیے۔ ہاں ایک حقیقت اور سن لیجیے۔ جب آپ کے بیٹے نے پانچ منٹ باہر جانے کی اجازت طلب کی تھی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ باہر جا کر تاج کے ٹکڑے کو ڈھونڈنا چاہتا تھا جو اس کی دانست میں وہیں کہیں گر گیا تھا۔

میری کے متعلق صرف یہ کہوں گا کہ اب نہ تو سر جارج برن ویل آپ کو اس شہر میں ملے گا اور نہ ہی میری۔"



حضرت سلیمان علیہ السلام

رضوانہ ساجد

ایک عظیم بادشاہ اور عظیم پیغمبر حضرت سلیمانؑ کی روداد حیات

جب سے تخلیقِ کائنات عمل میں آئی ہے اور انسان کو دنیا میں اتارا گیا ہے... تب سے انسانیت اصلاحی مدارج طے کرتے ہوئے معراج انسانیت کی طرف گامزن تو ہے مگر... اصلاحِ اعمال کے لیے اللہ نے بعثت کا سلسلہ جاری کیا تاکہ خالق و مخلوق کے درمیان پہچان کا رشتہ قائم رہے... ان ہی برگزیدہ بندوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا بھی شمار ہوا۔ جنہیں اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح بادشاہت کے ساتھ ساتھ نبوت بھی عطا ہوئی اور جن وانس، چرند پرند آپ علیہ السلام کے تابع ہوئے... اور ایسا عظیم الشان دربار نصیب ہوا کہ کبھی کسی اور کے حصے میں نہ آیا کہ جہاں ہر مخلوق ہاتھ باندھے کھڑی تھی... سبحان اللہ۔

ہوا کو حکم ہوا کہ جب تک دعوت چلتی رہے ہوا ان کے تخت کو معلق رکھے تاکہ آپؑ انتظامات کی نگرانی کرتے رہیں۔ آپؑ لوگوں کو جمع ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ابھی کھانا شروع نہیں ہوا تھا کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ ایک بڑی مچھلی دریا سے نکلی اور ہوا میں بلند ہو کر آپؑ کے تخت کے قریب آ گئی۔

''آپؑ نے مجھے بلایا نہیں مگر میں پھر بھی آپؑ کی دعوت میں شامل ہونے آئی ہوں۔''

''ہم نے دریا کی مخلوق کو نہیں بلایا تھا لیکن ایسی کوئی پابندی بھی نہیں۔ تو آ گئی ہے تو ایک طرف بیٹھ جا۔ جب سب کھانا شروع کریں تو تو بھی کھا لینا۔ تیرا کھانا ہی کتنا ہوگا۔''

''مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ میں بہت بھوکی ہوں۔ مجھے تو ابھی کھانا چاہیے ہے۔ تیرے مہمان بعد میں کھاتے رہیں گے۔''

''اچھا جا، جتنا تجھے کھانا ہے کھا لے۔''

یہ سننا تھا کہ مچھلی کھانے کی طرف چل دی۔ یہ کوئی عام مچھلی نہیں تھی۔ یہ تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا امتحان لینے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ اس کا اندازہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس وقت ہوا جب وہ ہزاروں آدمیوں کا کھانا، تنہا ایک لقمے میں چٹ کر گئی اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔

''سلیمان، میرے لیے اور کھانا فراہم کر دے۔ میں اب بھی بھوکی ہوں۔''

''ہزاروں آدمیوں کا کھانا اکیلی کھا گئی اور اب بھی کہتی ہے بھوکی ہوں۔ میرے مہمان اب کیا کھائیں گے۔ تو نے تو کھانا ہی ختم کر دیا۔''

''اچھی دعوت ہے تیری۔ اتنے لوگوں کو کھانا کھلانے چلا ہے اور ایک کا پیٹ نہیں بھر سکا۔ اللہ تعالیٰ مجھ کو ہر روز کھانے کے لیے تین لقمے مہیا کرتا ہے اور یہ جو اس وقت میں نے کھایا ہے وہ میرے لیے صرف ایک لقمہ تھا۔ ابھی دو لقموں کی کسر ہے۔ رزق پہنچانا کھیل نہیں ہے جس کا دعویٰ تم لے کر اٹھے تھے۔

یہ سنتے ہی سب کچھ عیاں ہوگیا۔ اتنا کچھ دے کر بھی اللہ تعالیٰ کے پاس کتنا کچھ ہے۔ میں کسی کو ایک لقمہ بھی نہیں دے سکتا اور وہ اتنی مخلوق کو کھلا رہا ہے۔ اب اللہ کا نبی رو رہا تھا اور خدا سے عاجزانہ کہہ رہا تھا ''خدایا! میں نے بہت بڑا قصور کیا۔ میں نے یہ گمان کر لیا کہ میں تیری مخلوق کے کچھ حصے کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا سکتا ہوں۔ مجھ عاجز کو معاف کر دے۔ میں توبہ کرتا ہوں روزی دینے والا صرف تو ہی ہے اور سارے جہان کا تو ہی پیٹ پال سکتا ہے۔ میں مسکین ہوں تو توانا ہے۔''

اسرائیلی قصوں میں ایک قصہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ایک روز حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک جن کو بلایا۔ اس کا نام سمندون تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے پوچھا۔ ''اے سمندون! تو نے کوئی ایسی جگہ بھی دیکھی ہے جو عجیب و غریب بھی ہو اور دنیا کی نظروں سے اب تک پوشیدہ بھی ہو۔''

سمندون جن کچھ دیر سر کھجاتا رہا جیسے کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا ہو پھر جواب دیا۔ ''حضور! یہاں سے مغرب کی طرف ایک جزیرہ ہے اور اس میں ایک عظیم شہر موجود ہے۔ میرا اس شہر کی طرف سے گزر ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے اڑنا بھول گیا۔ ایسا خوبصورت شہر میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں دیکھتا پھر رہا تھا کہ ایک مکان پر نظر پڑی۔ یہ مکان سنگ مرمر سے بنایا گیا تھا۔ مکان کے اوپر بلند مینار تھا جس پر پتھر کے دو شیر بنے ہوئے تھے۔ ان کی شکلیں انسان جیسی تھیں۔ اس شیر جیسی دوسری بہت سی مورتیاں تھیں۔ مجھے تجسس ہوا تو میں محل کے اندر بھی گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ محل کے بیچ میں ایک عظیم الشان تخت بچھا ہوا ہے۔ اس تخت پر ایک عورت اور ایک لڑکی نہایت حسین بیٹھی تھیں۔ کچھ دیر بعد لڑکی تخت سے اتر گئی اور ایک حجرے کی طرف چلی۔ اس کے تخت سے اترتے ہی بے شمار لونڈیاں حرکت میں آ گئیں۔ میں فوراً ایک لونڈی کے پاس پہنچا اور خود کو ظاہر کر دیا۔ میں نے اس لونڈی سے اس کا نام پوچھا تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔

''اے شخص! تو کون ہے اور اس طلسم کدے میں کیسے چلا آیا؟''

''میں جو بھی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تو میرے سوالوں کے جواب دے۔''

''پوچھ کیا پوچھنا ہے؟''

''مجھے اس شہر اور اس محل کے بارے میں کچھ بتا اور یہ بتا کہ تخت پر بیٹھی عورت کون ہے اور جو ابھی حجرے میں گئی ہے وہ کون ہے۔''

اس لونڈی نے مجھے بتایا۔ ''اس شہر کا نام صیدون ہے۔ یہاں جو شکلیں اور مورتیاں تجھے نظر آ رہی ہیں وہ سب جادو کے کرشمے ہیں۔ جب کوئی دشمن ہماری طرف بڑھتا ہے تو یہ مورتیاں آوازیں دے دے کر دشمن کی آمد کی خبر دیتی ہیں۔ ہم ہوشیار

حضرت سلیمان (علیہ السلام) اور پرندے

ایک روز حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے سارے پرندوں کو حکم دیا کہ میرے دربار میں حاضر ہو کر ہر پرندہ بتائے کہ اس میں کیا کمال ہے۔

چنانچہ سب پرندے حاضر ہوئے۔ مور، کبوتر، ہدہد، کوا، وغیرہ۔ ہر پرندہ حاضر ہوگیا۔ سب اپنا اپنا کمال بیان کرنے لگے۔ ہدہد کی باری آئی تو اس نے کہا۔ ''حضور! مجھے یہ کمال حاصل ہے کہ چاہے کتنا اونچا اڑتا ہوں اور زمین سے کتنی ہی دور ہو جاؤں۔ میری نظر اتنی تیز ہے کہ میلوں دور اوپر سے میں زمین کے ذرّے ذرّے کو دیکھ لیتا ہوں۔ نہ صرف یہ کہ سطح زمین کی ہر چیز کو دیکھ لیتا ہوں بلکہ زمین کے اندر جہاں پانی ہو وہ بھی دیکھ لیتا ہوں اور پھر حضور اس پانی کا ذائقہ بھی معلوم کر لیتا ہوں کہ کڑوا ہے یا میٹھا۔

حضور! آپ مجھے اپنے ساتھ رکھا کیجیے۔ آپ اپنے تخت پر تشریف فرما کر ہوا پر سیر فرماتے ہوئے جہاں بھی جائیں مجھے ساتھ رکھیں۔ میں زمین پر نگاہ رکھا کروں گا۔ جہاں بھی زمین کے اندر میٹھا پانی نظر آیا کرے گا میں بتا دیا کروں گا۔ آپ اپنا تخت وہاں اتار کر اپنا دربار لگا لیا کیجیے۔''

حضرت سلیمان (علیہ السلام) اس کا یہ کمال سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا: ہم نے تمہیں اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دی۔

کوا ہدہد کا یہ کمال اور اس کی عزت افزائی سن کر حسد کے مارے جل بھن گیا اور کہنے لگا۔ ''حضور! ایک میری بھی عرض سن لیجیے۔ ہدہد نے بالکل جھوٹ بولا ہے۔ اس میں ہرگز یہ کمال نہیں ہے جو اس نے بیان کیا۔ اتنی دور آسمان پر اڑتے ہوئے اگر یہ زمین کی سطح کی چیزیں بھی دیکھ سکتا ہے تو شکاری کے جال میں کبھی نہ پھنستا۔ جال کے اندر جو دانہ پڑا ہوتا ہے اس کو کھانے کے لیے کود پڑتا ہے اور جال اسے نظر ہی نہیں آتا۔ اگر اتنا ہی باکمال ہوتا ہے تو اسے دانے کے ساتھ جال بھی نظر آ جایا کرتا۔''

حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے ہدہد سے فرمایا ''سنا کوّے کا اعتراض؟ تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟''

ہدہد نے کہا۔ ''حضور! یہ حاسد ہے اور حسد میں میرے کمال کا انکار کر رہا ہے۔ آپ میرا امتحان لے لیجیے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اگر صحیح نہ ہو تو ابھی میرا سر تن سے جدا کر دیجیے۔ حضور! نظر تو میری واقعی تیز ہے۔ لیکن جب اس پر قضا کا پردہ پڑ جاتا ہے تو پھر مجھے جال نظر نہیں آتا۔ اس حاسد کو میرے کمال پر اعتراض کرنا تو سوجھا لیکن اسے تقدیر و قضا کی حقیقت نہ سوجھی۔ (حیاۃ الحیوان)

ہو جاتے ہیں اور جنگ کی تیاری شروع کرتے ہیں اور یہ جو دو شیر تم دیکھ رہے ہو یہ حق اور انصاف کے داعی ہیں جب دو فریق کوئی دعویٰ لے کر آتے ہیں اور بادشاہ کو فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے تو دونوں فریقوں کو شیروں کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ان شیروں کی خاصیت یہ ہے کہ جو فریق جھوٹا ہوتا ہے، یہ شیر اسے چیر پھاڑ ڈالتے ہیں۔''

''تو نے پوچھا تخت پر بیٹھنے والیاں کون تھیں۔ کیا وہی اس عجیب و غریب شہر کی حکمران ہیں۔'' حضرت سلیمان علیہ السلام نے جن سے پوچھا۔

''حضور، ان میں ایک تو بادشاہ کی بیوی تھی دوسری اس ملک کی شہزادی۔''

''پوچھنے کی بات تو تو نے پوچھی ہی نہیں، اس شہر کے رہنے والوں کا مذہب کیا ہے۔''

''میں نے پوچھا تو نہیں لیکن اس لونڈی نے خود ہی بتا دیا تھا۔ ان لوگوں میں یہ دستور ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی پرستش کرتے ہیں۔''

''تم نے اس سے کہا نہیں کہ یہ سراسر گمراہی ہے؟''

''میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔''

''تم نے اس سے کچھ نہیں کہا لیکن ہم اس کے بادشاہ سے ضرور کہیں گے۔ اسے مجبور کریں گے کہ وہ دعوتِ حق قبول کرے۔ اگر وہ نہ مانا تو اسے سزا دیں گے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس بادشاہ کے خلاف جہاد کا حکم دے دیا۔ اس حکم کے ملتے ہی تمام لشکری تیار ہوگئے۔ آپؑ نے ہوا کو حکم دے دیا کہ ان سب کو شہر صیدون پہنچا دے۔ لشکر کو راستہ بتانے کے لیے سمندون جن آگے آگے چل رہا تھا۔

صیدون کے برج اور مینار چیخنے لگے۔ ''خبردار، ہوشیار۔ بادشاہ سلامت! فوج کو باہر نکالیں۔ دشمن کی فوج جنگ کے لیے آ رہی ہے۔''

شہری اور سپاہی ان آوازوں کا مطلب خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے تیاری کی اور شہر سے باہر نکلے۔ زمین خالی پڑی

تھی۔انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ کی اوران کے دل دھک سے رہ گئے۔ایک شہر تھا جو ہوا میں اڑتا چلا آرہا تھا۔یہ کیسا لشکر ہے؟لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے اور پھر وہ الٹے قدموں شہر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

''اے بادشاہ!ذرا باہر نکل کر تو دیکھ۔ایک عجیب وغریب فوج ہم نے دیکھی ہے جو ہوا میں اڑتی چلی آرہی ہے۔ایک شہر ہے جو ہوا میں اڑتا ہوا آرہا ہے۔اس فوج کا ہم کیسے مقابلہ کریں گے۔یہ فوج تو ہمارے صیدون کو تباہ کردے گی۔''بادشاہ کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ کوئی لشکر ایسا بھی ہوسکتا ہے جو ہوا میں اڑتا ہو لیکن جب وہ خود باہر نکلا اور دیکھا تو اس کے بھی ہوش اڑ گئے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر زمین پر اتر آیا تھا۔صیدون کے بادشاہ کی آنکھیں کھل جانی چاہیے تھیں کہ جو لشکر ہوا میں اڑسکتا ہے وہ کیسا طاقتور ہوگا لیکن موت اس کے انتظار میں تھی۔وہ اپنی فوج کو لشکر کے مقابل لے آیا۔تنکے اور طوفان کا کیا مقابلہ۔معمولی سے معرکے کے بعد فیصلہ ہوگیا۔صیدون پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا قبضہ ہوگیا۔اس جنگ میں شاہ صیدون بھی مارا گیا۔

محل سے زندہ بچ جانے والی شہزادی کو حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے ساتھ یروشلم لے آئے۔

یروشلم پہنچ کر جب وہ شہزادی آپؑ کے سامنے پیش ہوئی تو سخت گستاخی سے پیش آئی لیکن آپ نے اس کی باتیں یہ کہہ کر نظرانداز کردیں کہ اس کا باپ اور خاندان مارا گیا ہے۔اس کا شہر تباہ ہوا ہے،اتنا غصہ کرنا تو اس کا حق ہے۔جب اس لڑکی کا غصہ اتر گیا تو آپؑ نے اسے سمجھایا۔

''دیکھ لڑکی!تیرا باپ سخت گمراہی میں مبتلا تھا۔لوگوں سے اپنی پرستش کرواتا تھا۔اللہ نے مجھے حکم دیا کہ اس گمراہ کو سزا دی جائے۔وہ میرے مقابل آیا اور مارا گیا۔''

''میں جانتی ہوں تو ہوا میں اڑنے والا بادشاہ ہے۔طاقتور ہے لیکن مرنے والا میرا باپ تھا۔میں اس کے لیے ماتم کیوں نہ کروں؟''

''تیرا باپ مارا جاچکا۔اب تجھے چاہیے کہ تو ایک خدا پر ایمان لے آ۔''

''میں آپ کے کہنے پر ایک خدا پر ایمان لے آؤں گی لیکن اس سے پہلے میں اپنے باپ کی شکل دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''میں اس کی شکل تجھے کیسے دکھا سکتا ہوں۔وہ تو مر چکا۔''

''اس کا کٹا ہوا سر ہی مجھے دکھادے۔اگر تو ایسا نہ کرسکا تو میں ایمان لانے والی نہیں۔''

اس کا دل ایمان کی طرف راغب نہیں ہوا تھا۔اسی لیے وہ ایسی شرطیں رکھ رہی تھی۔وہ سمجھ رہی تھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس کے باپ کا سر نہیں لاسکیں گے اور وہ ایمان لانے سے بچ جائے گی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ کوئی اور نہیں حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے کسی جن کو حکم دیا کہ شاہ صیدون کا کٹا ہوا سر لایا جائے۔چشم زدن میں وہ سر لے آیا۔شہزادی کی نظر جیسے ہی کٹے ہوئے سر پر پڑی وہ بے ہوش ہوگئی۔اس کے بے ہوش ہونے میں شاید یہ صدمہ بھی شامل تھا کہ اب اسے ایمان لانا پڑے گا۔

اس شہزادی کا نام امینہ تھا۔

جب وہ ہوش میں آئی اور چند روز کی تسلیوں کے بعد اسے اپنی حالت پر صبر آگیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے خدائے واحد پر ایمان لانے کی تلقین کی۔وہ دل سے تیار نہیں تھی لیکن اب اس کے سامنے کوئی اور راستہ تھا بھی نہیں۔وہ ایمان لے آئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے شادی کرلی۔

اس کے دل میں اب تک باپ کی پرستش کا خیال کروٹیں لیتا رہتا تھا۔وہ بے چین رہتی تھی کہ باپ تو ہے نہیں۔پرستش کس کی کرے۔انسان جو کچھ سوچتا ہے ویسے ہی حالات پیدا ہوجاتے ہیں۔شیطان بھی اسے بہکاتا ہے جو بہکنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔امینہ کے دل کی کمزوری شیطان پر ظاہر ہوگئی۔اس نے بزرگ کا روپ دھارا اور محل میں داخل ہوگیا۔امینہ کے سامنے پہنچا تو وہ ایک اجنبی کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''آپ کون ہیں اور یہاں کیسے چلے آئے؟''امینہ نے پوچھا۔

''میں تیرے باپ عنکبود شاہ صیدون کا دوست ہوں۔جن دنوں صیدون پر تباہی آئی،میں صیدون سے باہر تھا،اب

مجھے معلوم ہوا کہ سلیمان تجھے اٹھالایا ہے اور تجھ سے شادی کرلی ہے تو میں تجھ سے ملنے آگیا۔''

''آپ کو اندر آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟''

''مجھے کچھ جادو آتا ہے لہٰذا میں نے خود کو چھپالیا تھا۔''اس کے بعد شیطان نے کہنا شروع کیا۔''میں نے سنا ہے تو سلیمانؑ کے خدا کی پرستش کرنے لگی ہے جبکہ تیرا باپ تو خود خدا تھا۔تجھے اس کی پرستش کرنی چاہیے۔''

''میں اس کی پرستش کیسے کرسکتی ہوں۔وہ تو مر چکا۔''

''تو پریشان کیوں ہوتی ہے۔میں تیرے باپ کا مجسمہ بنا کر تجھے دے دوں گا۔تو اس کی عبادت کیا کرنا۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام مجھے اس کی پرستش کرنے دیں گے؟''

''حضرت سلیمان علیہ السلام کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔تو اسے ایسی جگہ چھپا کر رکھنا کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔''

شیطان نے مجسمہ لاکر دے دیا۔امینہ اس مجسمے کی پرستش کرنے لگی۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کی سزا کے طور پر اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کچھ مدت کے لیے تخت سے محروم کردیے گئے اور شیطان قابض ہوگیا۔آپؑ کی انگشتری جس پر اسم اعظم کندہ تھا شیطان کے ہاتھ لگ گئی تھی جس کے زور پر وہ حکومت کرتا رہا پھر جب مدت ختم ہوئی تو انگشتری شیطان کے ہاتھ سے دریا میں گر گئی اور مچھلی اس کو نگل گئی اور وہ مچھلی حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس شکار ہوکر آئی اور اس طرح اس کے پیٹ سے انگشتری نکال کر انہوں نے اپنا ملک واپس لیا۔

تورات سلاطین 1 باب 11 میں بھی اس روایت سے ملتا جلتا ایک قصہ مذکور ہے اور اس میں بیویوں کی خاطر حضرت سلیمان علیہ السلام کا بت پرستی تک کرنا موجود ہے(العیاذ باللہ)

''خداوند سلیمانؑ سے ناراض ہوا کیونکہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے پھر گیا تھا جس نے اسے دو بار دکھائی دے کر اس کو اس بات کا حکم کیا تھا کہ وہ غیر معبودوں کی پیروی نہ کرے پر اس نے بات نہ مانی جس کا حکم خداوند نے دیا تھا۔''

''اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کرلیا اور اس کا دل اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا جیسا کہ اس کے باپ داؤد علیہ السلام کا دل تھا۔''

ان روایات میں ایک اولوالعزم پیغمبر کی جانب جس قدر خرافات اور ذلیل واقعات کی نسبت کی گئی ہے ایک عام آدمی بھی بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ ایسی روایات کا اسلام کی تعلیمات سے کیا واسطہ ہوسکتا ہے۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک پیغمبر کے گھر میں بت پرستی ہوتی رہے اور اسے بذریعہ وحی بھی معلوم نہ ہوسکے اور یہ کیسے، ہوسکتا ہے کہ ایک پیغمبر بیویوں کی خوشنودی کے لیے بت پرستی کی طرف مائل ہوجائے۔

یہ سب اس لیے ممکن ہوسکا کہ بنی اسرائیل نے اپنی الہامی کتب میں تحریف کردی تھی اور اپنی اغراض دنیوی کی خاطر ان میں ہر قسم کا ردوبدل کردیا تھا چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے معاملے میں تو اس درجہ جسارت اختیار کی کہ ان کی نبوت ورسالت سے بھی انکار کر کے ان پر طرح طرح کے الزام اور بے ہودہ بہتان لگائے۔ان کے نزدیک حضرت سلیمان علیہ السلام ایک پیغمبر نہیں بلکہ جادوگر تھے اور جادو ہی کے زور پر جن وانس اور وحوش وطیور کو مسخر کیے ہوئے تھے۔(نعوذ باللہ)

قرآن مجید نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے بنی اسرائیل کے لگائے ہوئے اس بہتان کی مدلل تردید کی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی پیغمبرانہ عظمت کو نمایاں اور روشن کیا۔اس نے بتایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا دامن جادو کی نجاست سے پاک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے کے لیے شیاطین نے سحر کو سکھایا اور اس کو مدون کیا اور بنی اسرائیل کتاب اللہ(توریت وزبور)کو پس پشت ڈال کر جادو سیکھنے اور سکھانے لگے اور جب بعض نیکوکاروں نے اس کی مخالفت کی اور سمجھایا کہ یہ گمراہی ہے تو انہوں نے کہنا شروع کردیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا سکھایا ہوا علم ہے۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس گمراہی کو روکنے کے لیے شیاطین کے ان تمام نوشتوں کو حاصل کرکے اپنے تخت کے نیچے دفن کردیا تاکہ جن وانس کسی کو وہاں تک پہنچنے کی جرأت نہ ہوسکے اور ساتھ ہی یہ فرمان جاری کردیا

شیاطین نے اس مدفون ذخیرے کو نکال لیا اور بنی اسرائیل میں یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ جادو کا یہ علم حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم ہے اور وہ اس کے زور پر جن وانس اور ہوا پر حکومت کرتے تھے اور اس طرح جادو کو پھر بنی اسرائیل میں رائج کر دیا۔

قرآن حکیم نے اس تاریخی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

''اور جب ان (بنی اسرائیل) کے پاس اللہ کی جانب سے رسول آیا جو تصدیق کر رہا ہے ان الہامی کتابوں کی جو ان کے پاس ہیں تو جو لوگ کتاب (توریت) سے نوازے گئے تھے انہوں نے اللہ کی کتاب (توریت) کو پس پشت ڈال دیا اور آپؐ کی صداقت کی بشارت) کے متعلق ایسے ہو گئے گویا وہ جانتے ہی نہیں۔ انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایسی چیز کی پیروی اختیار کر لی جو شیاطین پڑھتے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا تھا شیاطین نے کفر کیا تھا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔

قرآن مجید نے نہایت صاف اور واضح طور پر یہ بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا قاصد ہدہد پرندہ تھا۔

''اور پرندوں کا جائزہ لیا تو کہنے لگا کیا وجہ میں ہدہد کو نہیں پاتا..... سلیمانؑ نے کہا ہم اب دیکھتے ہیں کہ تو (ہدہد) اپنے قول میں سچا ہے یا جھوٹا ہے۔ لے یہ میرا خط لے جا اور ان کی طرف ڈال دے۔''

ابہام کی کوئی گنجائش نہیں لیکن ایسے لوگوں نے جو معجزات کو خلاف عقل قرار دیتے ہیں طرح طرح کی تاویلات پیش کرنی شروع کر دیں چنانچہ اوّل پرندے کا بات چیت کرنا خلاف عقل قرار دیا گیا اور پھر زیر بحث واقعہ سے متعلق آیت کے خود ساختہ معنی بیان کیے گئے اور کہا گیا کہ پہلے زمانے میں یہ دستور تھا کہ مشرکین اکثر اپنی اولاد کے نام دیوتاؤں کے نام پر رکھ لیا کرتے تھے جن میں حیوانات کے نام بھی تھے لہٰذا اس جگہ بھی ہدہد سے پرندہ مراد نہیں ہے بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا قاصد ''انسان'' مراد ہے جس کا نام غالباً ہدہد ہوگا۔

جب یہ اعتراض وارد ہوا کہ ترجمہ تو یہ ہے کہ ''پرندوں کا جائزہ لیا گیا'' تو ایک مفسر نے اس کی یہ توجیہہ پیش کی کہ ''طیر'' کے معنی فوج کے ہیں۔

''ان کے یہ معنی بے سند اور عربی لغت کے پیش نظر باطل ہیں اور یہ مسلم ہے کہ لغت میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے بلکہ وہ اہل زبان کے استعمال کے تابع ہے اور اہل عرب حقیقی اور مجازی کسی معنی کے اعتبار سے بھی ''طیر'' بہ معنی نہیں استعمال کرتے بلکہ صرف پرندے ہی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔'' (قصص القرآن)

سید سلیمان ندوی نے بھی اس کے بین بین راستہ اختیار کیا ہے۔

''فرض کر لو کہ نامہ بر کبوتروں کی طرح تربیت یافتہ نامہ بر ہدہد ہوگا اور اس کے بولنے سے مقصود اس مضمون کا خط اس کے پاس ہونا سمجھ لو جیسا کہ خود اس موقع پر قرآن مجید میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط دے کر اس کو ملکہ سبا کے پاس بھیجا۔ اسی طرح پہلے بھی خط لے کر آیا ہوگا۔''

تعجب ہے کہ جبکہ قرآن مجید ''نملہ (چیونٹی) اور ہدہد کے واقعات کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے عظیم الشان نعمت اور احسان ظاہر کر رہا ہے اور قرآن مجید کا سیاق وسباق ان واقعات کو ایسے انداز میں ہونا بیان کرتا ہے جس سے ہدہد کا پرندہ ہو کر حضرت سلیمان علیہ السلام سے باتیں کرنا صاف صاف اور صریح معلوم ہوتا ہے تو پھر وحی کے دیے ہوئے علم کے انکار پر تاویلوں کی لکیریں کھینچنے کا کیا فائدہ۔

ملکہ سبا کے تخت کا معاملہ بھی مفسرین میں زیر بحث رہا ہے۔ کسی نے کہا یہ منگوایا نہیں گیا تھا بلکہ تحفے کے طور پر آیا تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے خاص طور پر بنوایا گیا تھا۔ کسی نے کہا منگوانے کے معنی یہ تھے کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے توشہ خانے میں تھا، ملک یمن سے نہیں منگوایا گیا تھا۔

''عربی محاورے میں کتاب اکثر ''خط'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خود اسی جگہ قرآن میں دو جگہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس لیے آیت کا مقصود یہ ہے کہ درباریوں میں سے ملکہ سبا کے مضمون خط کا جس کو علم تھا وہ بہ طور تحفہ اپنے ساتھ ایک تخت لائی ہے۔ اس نے کہا۔ ''میں ابھی لاتا ہوں۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کا تخت جس خاص طریقے سے منگوایا وہ ایسا طریقہ ہے جس کو موجودہ علوم ابھی

حضرت سلیمان (علیہ السلام) پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے

تفسیر ''مواہب علیہ'' میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو پرندوں کی زبان کی تعلیم فرمائی تھی۔ اس لیے وہ ہر پرندے کی بولی سمجھتے تھے۔ تفسیر ''مدارک'' میں ہے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے فرمایا۔

☆..... فاختہ بولتی ہے: لیت الخلص لم یخلق ''کاش کہ دنیا پیدا نہ ہوئی ہوتی۔

☆..... مور بولتا ہے: کما تدین تدان ''جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔''

☆..... سنگ خوردہ کہتا ہے: من سکت سلم ومن سلم نجا ''جو شخص خاموش رہا، سلامت رہا۔ جس شخص کو سلامتی حاصل ہوئی اس نے نجات پائی۔''

☆..... گرگٹ کہتا ہے: یا ابن آدم عش ماشئت اخرک الموت ''اے ابن آدم! دنیا میں جب تک جی چاہے جیتا رہ انجام کار موت آئے گی۔''

ہدہد کہتا ہے: من لا یرحم لا یرحم ''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا..... اے گناہ گاروں اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو۔''

☆..... قمری کہتی ہے: سبحان ربی الاعلی۔ ''پاک ہے میرا بلند رب۔''

☆..... طوطا بولتا ہے: کل حی یموت کل جدید بال ''ہر زندہ کو موت ہے اور نئی چیز ایک دن بوسیدہ ہو جائے گی۔''

☆..... چیل بولتی ہے: کل شئ ٔ ھالک الا وجھہ۔ ''رب کے علاوہ ہر شے نے فنا ہونا ہے۔''

☆..... بلبل کہتی ہے: سبحان الخالق الدائم۔ ''پاک ہے وہ پیدا کرنے والا ہمیشہ رہے گا۔''

☆..... کوا چغلی اور فیکس وصول کرنے والوں پر لعنت بھیجتا ہے۔ تفسیر ''وسیط'' میں سند صحیح ہے۔

خطاف (لمبے بازوؤں والا، چھوٹے پاؤں والا، سیاہ رنگ کا پرندہ) کی بولی سن کر کہا کہ یہ کہہ رہا ہے: ''نیکی کے کام کرو تا کہ آگے ان کی جزا پاؤ۔''

بھٹ تیتر کی آواز سن کر کہا کہ یہ کہہ رہا ہے ''جو خاموش رہا وہ سلامتی میں رہا۔''

مرغ کی آواز سن کر کہا یہ کہہ رہا ہے: ''اے غافلو! اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔''

گدھ کی آواز سن کر فرمایا ''یہ کہہ رہا ہے: اے انسان! جتنا چاہے زندہ رہے آخر تجھے موت آنی ہے۔''

عقاب کی آواز سن کر کہا یہ کہہ رہا ہے: ''لوگوں سے دور رہنے میں ہی انس ہے۔''

قرآن مجید میں ہے:

ترجمہ ''انہوں نے کہا۔ اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی اور ہر چیز میں سے ہم کو عطا ہوا۔ بے شک یہی ظاہر فضل ہے۔''

(ماخوذ از روح المعانی ومدارک)

تک نہیں پا سکے اور تخت کا یہ واقعہ صریح طور سے ثابت ہے۔ خارق عادات معجزات کا جب ثبوت موجود ہے تو انکار اور بے دلیل انکار سے کیا فائدہ۔ اس لیے کہ قوانین قدرت کا جو خالق ہے اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ قدرت کے کسی عمل کو توڑ پھوڑ دے۔ اس کے لیے یہ مشکل نہیں کہ وہ پلک جھپکنے میں ملک یمن سے تخت منگوا لے۔

مفسرین نے اس مسئلے پر بھی بحث کی ہے کہ یہ شخص انسانوں میں سے تھا یا قوم جن سے۔ اکثر کا یہ قول ہے کہ وہ انسانوں میں سے تھا۔

مفسرین کہتے ہیں کہ جس شخص کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ اس کے پاس کتاب علم تھا اس کا نام آصف برخیا تھا اور وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا معتمد خاص اور کاتب (وزیر) تھا۔ مفسرین نے لقب اور نام بھی لیے ہیں لیکن آصف برخیا پر ہی اتفاق ہے۔

قرآن میں ہے۔

''جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا میں تیری پلک جھپکتے اس کو حاضر کر سکتا ہوں۔''

یہ شخص آصف ہو یا کسی اور نام سے موسوم درحقیقت حضرت سلیمان علیہ السلام کا صحابی اور ان کا بہت مقرب تھا اور جس طرح حضور اکرم ﷺ کے صحابہ آپؐ کے تربیت یافتہ تھے اور ان میں سے بعض نمایاں تھے، آصف برخیا بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کا تربیت یافتہ تھا۔ اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس کو تورات وزبور اور دوسرے اسرار حقائق کا زبردست علم حاصل تھا چنانچہ جب جنوں میں سے ایک نے تخت سبا کو حاضر کرنے کا دعویٰ کیا اور یہ کہا کہ دربار کی برخاستگی سے قبل وہ تخت لے آئے گا۔ اگرچہ مقصد کے حاصل ہونے کے لیے یہ مدت کافی تھی لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام یہ چاہتے تھے کہ یہ عمل ''جن'' کے ذریعے نہیں بلکہ اللہ کے کسی خاص بندے کے ہاتھ سے ہونا چاہیے تا کہ ان کی پیغمبرانہ توجہ سے وہ عمل معجزہ بن کر ملکہ سبا کے سامنے پیش ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اسی نیت کو محسوس کرتے ہوئے آصف برخیا نے فوراً خود کو پیش کیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی مبارک توجہ اس اعجاز کو پورا کر دکھائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ اسی لیے آپؑ نے آصف کا نہیں اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔

یہ میرے پروردہ رہ ں ہے۔

اور یہ بھی کہ اس تخت کے منگوانے اور اس کی ہیئت میں تبدیلی سے اپنی شانِ خودنمائی مقصود نہیں تھی بلکہ ملکہ سبا کو دین حق کی طرف راغب کرنا تھا۔ اسی لیے تبدیلی کے وقت آپؑ نے فرمایا تھا۔

''دیکھیں وہ اس واقعے سے متاثر ہو کر ہدایت قبول کرتی ہے یا گمراہ ہی رہتی ہے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام سے متعلق نہایت دلچسپ اور عجیب وغریب واقعات مشہور ہیں جو سب کے سب اسرائیلی روایات (اسرائیلیات) سے ماخوذ ہیں۔ یہ قصے ان علمائے یہود کے ذریعے جو مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے، مسلمانوں میں بھی نقل ہو کر مشہور ہو گئے۔ مسلمان علما نے ان قصوں کو سچ سمجھ کر اپنی کتب میں داخل کر لیا۔ اسی لیے محققین کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ان قصوں میں سے صرف انہیں اہمیت دی جائے جو قرآن وحدیث کے مطابق ہوں۔

بنی اسرائیل کی روایات کا مدار بیشتر تورات پر ہے۔ تورات یا توریت کے علاوہ دوسرا سلسلہ تلمیم ہے۔ یہ عبرانی قاعدۂ لغت کے اعتبار سے ''نبی'' کی جمع ہے۔ یہ بنی اسرائیل کے انبیا کے مواعظ، مراثی اور بنی اسرائیل کے کلام اور مختصر تاریخ کا ذخیرہ ہے۔ تیسرا حصہ ''ترکوم'' ہے۔ عربی زبان میں ترجمہ کو کہتے ہیں۔ یہودی علما نے توریت اور تلمیم کی آرامی زبان میں تفسیر کی ہے جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے یہ تفسیر انبیا علیہم السلام سے سنی ہے۔ چوتھا حصہ مدارش ہے۔ اس کی حیثیت یہود کے یہاں وہ ہے جو اسلام میں حدیث کا درجہ ہے۔ پانچواں حصہ تالمود ہے۔ یہ بنی اسرائیل کا فقہ ہے اور ان سب کے علاوہ بعض وہ قصص وحکایات ہیں جن کو یہود سینہ بہ سینہ اپنی یادداشت سے مذہبی نقول کی طرح نقل اور بیان کرتے چلے آئے ہیں۔

ان سب کو اسرائیلیات کہا جاتا ہے۔

سورۂ سبا میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے جنوں کی ایک بہت بڑی جماعت ایک عظیم الشان عمارت بنانے میں مصروف تھی کہ آپؑ کو پیغام اجل آپہنچا مگر جنوں کو ان کی موت کی خبر نہ ہوئی اور وہ اپنی خدمات میں مصروف رہے اور عرصے کے بعد جب دیمک نے ان کی لاٹھی کو چاٹ کر اس توازن کو خراب کر دیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام جو لاٹھی سے ٹیک لگائے کھڑے نظر آتے تھے وہ گر گئے تب جنوں کو علم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔

''اور جب ہم نے اس (سلیمان) کی موت کا فیصلہ کر دیا تو ان (جنوں) کو اس موت کی کسی نے اطلاع نہیں دی مگر دیمک نے جو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی لاٹھی چاٹ رہی تھی اور جب حضرت سلیمان علیہ السلام گر پڑا تو جنوں پر یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ علم غیب رکھتے ہوتے تو اس سخت مصیبت میں مبتلا نہ ہوتے۔'' (سورہ سبا)

حضرت ابن عباسؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ سے مروی ہے آپؐ نے فرمایا جب اللہ کے نبی حضرت سلیمان علیہ السلام نماز ادا فرماتے تو سامنے ایک درخت لگا دیکھتے۔ آپؑ اس سے پوچھتے تیرا کیا نام ہے؟ وہ کہتا فلاں۔ آپ پوچھتے تو کس فائدے کے لیے ہے؟ نسل بڑھانے کے لیے یا کسی دوا کے لیے۔ تو ایک مرتبہ آپ نماز ادا فرما رہے تھے کہ آپ نے ایک درخت کو سامنے دیکھا تو اس سے پوچھا تیرا کیا نام ہے۔ عرض کیا خروبہ۔ آپ نے پوچھا کس چیز کے لیے ہے تو۔ عرض کیا اس گھر کی خرابی اور ویرانی کے لیے۔ آپ کو اشارہ مل گیا کہ آپ کی وفات قریب ہے۔ آپ نے دعا کی ''اے اللہ! سال بھر تک جنوں سے میری موت کو مخفی رکھنا تاکہ انسان جان لیں کہ جن غیب کا علم نہیں جانتے۔

اسی سے ملتی جلتی ایک اور روایت بھی نقل کی گئی ہے۔

''حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس میں ایک ایک دو دو سال اور ایک ایک دو دو مہینے تنہائی میں بسر کرتے تھے اور کبھی اس سے کم وزیادہ مدت بھی رہتے تھے اور جس مرتبہ آپؑ نے وفات پائی آپؑ اس میں داخل ہوئے اور وفات کے آثار یوں شروع ہوئے کہ جب بھی آپ صبح کرتے تو بیت المقدس میں کوئی پودا اگا ہوتا۔ آپؑ اس سے پوچھتے تیرا کیا نام ہے۔ وہ نام بتا دیتا۔ ایک مرتبہ ایک نیا پودا اگا۔ اس سے پوچھا تیرا کیا نام ہے۔ اس نے بتایا۔ ''خروبہ'' یعنی خرابی پھر پوچھا کس کام کے لیے ہے۔ عرض کیا اس مسجد بیت المقدس کی ویرانی وخرابی کے لیے ہوں۔ حضرت سلیمانؑ نے فرمایا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں زندہ ہوں اور اللہ پاک اس بیت المقدس کو ویران فرما دیں لہٰذا اب میری وفات کا وقت قریب معلوم ہوتا ہے اور

تیرے چہرے پر میری ہلاکت اور مسجد کی ویرانی لکھی ہوئی ہے۔ پھر آپؑ نے اس پودے کو اکھیڑا اور اپنے ایک باغ میں لگا دیا۔ پھر آپؑ دوبارہ محراب میں داخل ہوئے اور اپنے عصائے مبارک کے ساتھ ٹیک لگا کر نماز میں مشغول ہو گئے اور اسی حالت میں کھڑے کھڑے وفات ہو گئی اور حالت ایسی رہی کہ شیاطین وجن کو آپؑ کی وفات کا قطعی علم نہ ہو سکا۔

شیطان تو شیطان ہوتے ہیں۔ یہ ایک جانب سے داخل ہوتے اور دوسری جانب سے نکل جاتے۔ اگر کسی کی نظر حضرت سلیمان علیہ السلام پر پڑ جاتی تو وہ جل کر راکھ بھی ہو جاتا مگر پھر بھی باز نہ آتے تھے۔ تو ایک شیطان اسی غرض سے داخل ہوا کہ دیکھوں آپؑ کیا کر رہے ہیں۔ یہ اندر گیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی کوئی آواز یا آہٹ سنائی نہ دی اور نہ ہی جلا تو ہمت کر کے اندرونی کمرے میں داخل ہو گیا دیکھا تو ان کا انتقال ہو گیا۔ شیطان فوراً نکلا اور سب کو خبر دی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو تو کب کی موت آ چکی ہے لوگوں نے دروازہ کھول کر آپؑ کو نکالا اور دیکھا لاٹھی کو زمینی کیڑا کھا گیا تھا۔ لہٰذا اس کیڑے کو ایک دوسری لاٹھی پر رکھا اور وہ کیڑا دن رات اس کو کھاتا رہا۔ پھر حساب سے پتا چلا کہ تقریباً ایک سال پہلے آپؑ وفات پا چکے تھے۔

عبدالرحمن بن زید سے مروی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملک الموت کو کہا جب تجھے میرے متعلق حکم ملے تو مجھے بتلا دینا تو ملک الموت ان کے پاس آیا اور کہا اے حضرت سلیمان علیہ السلام مجھے آپ کے متعلق حکم ملا ہے۔ اب آپ کی عمر سے تھوڑی سی گھڑی رہ گئی ہے تو آپؑ نے شیاطین کو بلایا اور اپنے گرد شیشے کی عمارت بنوائی جس کا دروازہ نہ تھا۔ پھر اس میں عصا پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے۔ پھر ملک الموت داخل ہوئے اور روح قبض کر لی۔ پھر اللہ نے گھن لگنے والے کیڑے (دیمک) کو بھیجا جو لاٹھی کو کھاتا رہا حتیٰ کہ اندر سے لاٹھی کھوکھلی ہو گئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا بوجھ نہ سنبھال سکی اور آپؑ گر گئے۔ جب جنوں نے یہ صورت دیکھی تو فوراً بھاگ گئے اور کام کاج چھوڑ دیا۔

یہ اور اسی قسم کی روایات ہیں جو اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔ توریت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا واقعہ اسی طرح ہے۔

''غرض ساری مدت کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یروشلم میں سارے اسرائیل پر سلطنت کی اور حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے باپ دادوں کے ساتھ سو رہا اور اپنے باپ دادوں کے شہر صیہون میں گاڑ دیا گیا اور اس کا بیٹا رجعام اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔''

قرآن نے جس طرح اس واقعے کو بیان کیا ہے اس سے بنی اسرائیل کو ان کی حماقت پر متنبہ کرنا تھا کہ ان کے عقیدے کے مطابق اگر جن غیب داں ہوتے تو وہ عرصہ تک حضرت سلیمان علیہ السلام کے خوف سے تعمیر بیت المقدس یا کسی دوسرے شہر کی تعمیر کی صعوبتوں میں مبتلا نہ رہتے چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا جس صورت سے ان کو علم ہوا اس کے بعد خود شیاطین (جنوں) کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ہمارا دعویٰ غیب دانی قطعاً غلط ثابت ہوا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے توریت کے مطابق سات سو شادیاں کی تھیں اور تین سو حرمیں تھیں لیکن حضرت ابوہریرہؓ کے مطابق رسول ﷺ نے فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شہر بیویاں تھیں۔

انہوں نے چالیس سال حکومت کی۔ یہ تیرہ سال کی عمر میں بادشاہ بنائے گئے۔

ابن جریرؒ فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی کل عمر پچاس سال سے چند سال اوپر تھی۔

اور آپؑ نے اپنی سلطنت کے چوتھے سال میں بیت المقدس کی بنیاد کی ابتدا کی۔

اور آپؑ کے بعد آپؑ کا فرزند رجعام سترہ سال بادشاہ رہا۔ ابن جریرؒ نے اس کو روایت کیا۔

اور فرمایا اس کے بعد بنی اسرائیل کی سلطنت پارہ پارہ ہو گئی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام شاعر بھی تھے۔ توریت کی 22 ویں کتاب کا نام ''غزالغزلات'' ہے اور اس میں اعلیٰ پائے کی تمثیلی شاعری موجود ہے۔ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی چھ غزلیں ملتی ہیں۔

(عورت کا خطاب)

دیکھ تو ہی خوب صورت ہے اے میرے محبوب
بلکہ مرغوب خاطر ہے

ہمارا پلنگ بھی سبز ہے
ہمارے گھر کے شہتیر دیودار کے ہیں
اور ہماری کڑیاں صنوبر کی ہیں
میں شاروں کی نرگس
اور وادیوں کی سوسن ہوں
(مرد کا خطاب)
جیسی سوش جھاڑیوں میں
ویسی ہی میری محبوبہ کنواریوں میں
(عورت کا خطاب)
جیسا سیب کا درخت بن کے درختوں میں
ویسا ہی میرا محبوب نوجوانوں میں
میں نہایت شادمانی سے اس کے سائے میں بیٹھی
اور اس کا پھل میرے منہ میں میٹھا لگا
وہ مجھے مے خانے کے اندر لایا
اور اس کی محبت کا جھنڈا میرے اوپر تھا
کشمکش سے مجھے قرار دو سیبوں سے مجھے
تازہ دم کرو
کیونکہ میں عشق کی بیمار ہوں۔

✂✂✂

توریت ہی میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے اقوال درج ہیں۔
خداوند کا خوف علم کا شروع ہے لیکن احمق حکمت اور تربیت کی حقارت کرتے ہیں۔
حکمت کوچے میں زور سے پکارتی ہے
وہ راستوں میں اپنی آواز بلند کرتی ہے
وہ پھاٹکوں کے مدخل میں اور شہر میں یہ کہتی ہے
اے نادانو! تم کب تک نادانی کو دوست رکھو گے
احمق کب تک علم سے عداوت رکھیں گے
احمقوں کی فارغ البالی ان کی ہلاکت کا باعث ہوگی
دغا کی روٹی آدمی کو میٹھی لگتی ہے
لیکن آخر کو اس کا منہ کنکروں سے بھر جاتا ہے
آدمی کا ضمیر خداوند کا چراغ ہے
دولت بہت سے دوست پیدا کرتی ہے
پر مسکین اپنے ہی دوست سے بے گانہ ہے
کل کی بات پر گھمنڈ نہ کر
کیونکہ تو نہیں جانتا کہ ایک ہی دن میں کیا ہوگا۔

ماخذات: قصص القرآن۔قصص الانبیا۔توریت

"جیسی کرنی ویسی بھرنی" کی کھلی تفسیر

بنام سیٹھ

چھوٹا بخش

نجمہ شکور



از دفتر فرشتۂ مواصلات
شعبۂ پُراسرار۔آسمان ۳
۱۰ جولائی

بنام سیٹھ موٹا بخش مولا بخش

ایم اے جناح روڈ۔

کراچی!

جنابِ من!

چوتھے آسمان سے موصول ہونے والی ہدایات کے مطابق آپ کو مطلع کیا جاتا ہے۔آپ کی سخاوت، رحم دلی، کرم نوازی، ہمدردی، خلوص اور قربانی کو دیکھ کر آپ کا نام نامی یہاں کی اس کتاب میں جس کا عنوان "انسانوں کے سنہرے کارنامے" ہے، درج کرلیا گیا ہے۔ مجھے یہ کہنے کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ آپ کو جو اعزاز حاصل ہوا ہے وہ صدیوں اور قرنوں کے بعد اکّا دکّا انسان ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے قیام سے اب تک اس عظیم کتاب میں صرف پانچ نام درج کیے گئے ہیں اور پانچواں نامِ نامی آپ کا ہے۔

مجھ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ماہ جون میں آپ نے وقتاً فوقتاً جو دعائیں مانگی ہیں، ان کے بارے میں آپ کو مطلع کروں۔ چنانچہ حسبِ ہدایت عرض ہے کہ:

1۔آپ کی وہ دعا جو آپ نے کاغذ کی قیمت میں پانچ سو فی صد اضافہ کے لیے مانگی تھی قبول کرلی گئی ہے۔

2۔آپ کی اس دعا کو بھی شرفِ قبولیت بخشا گیا جس میں آپ نے مزدوروں، قلیوں اور کلرکوں کی تنخواہ میں کاروبار مندا ہونے کے باعث کمی کی درخواست کی تھی۔

3۔آپ کی وہ دعا زیرِ غور ہے جس میں آپ نے کہا ہے کہ کاغذ کی قیمت اور سونے کا بھاؤ ایک ہی ہونا چاہیے۔

4۔آپ کی وہ دعا بھی زیرِ غور ہے جس میں آپ نے کہا ہے کہ آپ کے ملازمین تنخواہیں بڑھانے کے بارے میں کچھ نہ کہیں۔

5۔آپ نے اپنے پڑوسی کے اس بچے کی موت کے بارے میں جس نے آپ کی بلی کی جانب پتھر پھینکا تھا جو بددعا کی تھی، وہ منظور کی جاتی ہے کیونکہ آپ کے پڑوسی نے بھی آپ کی بلی سے تنگ آکر اس کی موت کے لیے بددعا کی ہے اور یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ آپ کی بددعا تو قبول کی جائے اور آپ کے پڑوسی کی بددعا کو شرفِ قبولیت نہ بخشا جائے۔

6۔آپ کی یہ دعا کہ ماہِ جون میں آپ کو صرف بائیس لاکھ کا منافع حاصل ہوا، اسے بڑھا کر جولائی کے لیے اسّی لاکھ کردیا جائے، بڑی حد تک قبول کرلی گئی ہے۔ ماہ جولائی میں آپ کو ستر لاکھ منافع ہوگا۔ تاہم اگر آپ اس منافع پر راضی نہ ہوئے اور گڑگڑا گڑگڑا کر منافع بڑھانے کی دعائیں مانگتے رہے تو منافع میں بتدریج اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

7۔آخرت کے بارے میں آپ نے جو رسمی دعا مانگی تھی

۔وہ زیرِغور ہے۔

8۔حج کے بارے میں آپ کی مانگی ہوئی دعا کے متعلق یہ کہنا ہے کہ آپ نے ابھی نوسو چوہوں والی تعداد پوری نہیں کی۔

9۔چوتھی شادی والی درخواست قبول کی گئی۔اس سلسلہ میں آپ اپنی ٹائپسٹ کے باپ سے گفتگو کریں۔لالچی آدمی ہے چند ہزار لے کر اپنی لڑکی کی شادی آپ سے کردے گا۔

10۔''اچھا زمانہ آجائے'' والی درخواست رد کی جاتی ہے۔غالباً یہ دعا آپ نے انجانے طور پر مانگ لی تھی۔آپ کے لیے تو ہر زمانہ اچھا زمانہ ہے۔

11۔آپ کی یہ درخواست بھی رد کی گئی جس میں آپ نے اپنے حریف کے دیوالیا ہو جانے کا ذکر کیا ہے۔اپنی اگلی دعا میں یہ ضرور بتائیں کہ آپ اپنی مونا پلی کیوں چاہتے ہیں۔معقول وجہ معلوم ہونے پر ہوسکتا ہے آپ کی مونا پلی قائم کردی جائے۔

اگرچہ مجھے یہ ہدایت نہیں کی گئی کہ میں آپ کو ذاتی طور پر کچھ لکھوں لیکن منع بھی نہیں کیا گیا اس لیے آپ کو آپ کی دعاؤں کی رپورٹ پیش کرنے کے بعد مناسب سمجھتا ہوں کہ کچھ راز کی باتیں آپ کو بتاؤں۔حقیقت یہ ہے کہ آپ جیسا انتہا درجے کا کنجوس سخاوت کا کوئی کارنامہ انجام دیتا ہے تو اس کا بدلہ دس لاکھ گنا دیا جاتا ہے۔وجہ یہ ہے کہ ایک عام آدمی اور خصوصاً نیک آدمی کو اس ذہنی کرب اور تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جس سے کنجوس لوگوں کو سابقہ پڑتا ہے۔آسمانوں پر آپ جیسے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کسی عورت کا بچہ جننا اور کسی کنجوس کا جیب سے ایک پیسا نکالنا برابر ہوتا ہے دونوں کو ایک ہی جیسی تکلیف ہوتی ہے۔

کئی سال قبل جب آپ صرف لکھ پتی تھے اور آپ نے اپنے چچازاد بھائی کی بیوہ کی درخواست پر اسے چند ہزار دیے تھے،اُس وقت آسمانوں میں گنے چنے فرشتوں ہی کو آپ کی دریادلی پر اعتبار آیا تھا۔زیادہ تر ایسے فرشتے تھے جو اس خبر کو آپ کے حاشیہ برداروں کی اڑائی ہوئی بے پر کی سمجھتے تھے۔ کچھ فرشتے یہ بھی کہتے ہوئے پائے گئے کہ سیٹھ چھوٹا بخش موٹا بخش مولا بخش نے جعلی رقم دی ہوگی لیکن آپ کا کردار روز بروز بلند ہوتا گیا۔اس واقعہ کے ایک ہی سال بعد جب آپ نے اس بیوہ لڑکی کی اپیل پر منی آرڈر فیس وضع کیے بغیر ایک معقول رقم ارسال کی تو چند احتیاط پسند فرشتوں کے علاوہ سبھی کو یقین آگیا۔کئی روز تک پہلے آسمان سے لے کر ساتوں آسمان تک آپ ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔

دو سال بعد آپ نے اس نوجوان بیوہ کے بڑے لڑکے کے انتقال پر بھی کچھ رقم بھیجی تو ساتوں آسمانوں کے گوشے گوشے میں آپ کی شہرت ہوگئی۔ہر فرشتہ دوسرے فرشتے سے یہی کہتا نظر آتا تھا۔''تم نے سیٹھ چھوٹا بخش موٹا بخش مولا بخش کی سخاوت کے بارے میں کچھ سنا؟'' آپ کی روز افزوں دریادلی کے باعث ہر ہونٹ پر آپ ہی کا نام تھا۔شاید آپ کو نہیں معلوم کہ سارے آسمانوں کے فرشتے خاص طور پر جمعہ کے دن اس وقت آپ کو جھانک جھانک کر دیکھتے ہیں جب آپ اپنی لمبی سی کار میں بیٹھ کر جامع مسجد میں فریضۂ جمعہ ادا کرنے جاتے ہیں اور جب چندے والا اپنے ہاتھ میں گولک لیے ہوئے آپ کے پاس سے گزرتا ہے تو سب کے سب فرشتے چلّا اٹھتے ہیں۔''دیکھو دیکھو کچھ سکے سیٹھ کی جیب سے نکل رہے ہیں۔''

آپ کی سخاوت اور دریادلی اس وقت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی جب آپ کے چچازاد بھائی کی نوجوان بیوہ نے آپ کو یہ تحریر کیا کہ اسے کچھ روپے مل جائیں تو وہ لاہور جا کر کسی پرائمری اسکول میں ملازم ہو جائے۔جب آپ کو یہ خط موصول ہوا آپ اپنی ماہ جون کی بائیس لاکھ والی آمدنی کا حساب کر رہے تھے اور حیرت کر رہے تھے کہ کاغذ کی نایابی کے باوجود آپ کو اتنا کم نفع کیوں ہو رہا ہے اور سوچ رہے تھے کہ جولائی میں اسی لاکھ کا منافع کیوں کر ہوسکتا ہے۔مگر خط پڑھتے ہی آپ نے اپنی چیک بک اٹھائی اور چیک کاٹ کر اپنے منشی کو دیا کہ وہ فوراً حوالہ ڈاک کردے۔بس جناب،ہم آسمانوں والے آپ کے اس کارنامے پر جھوم اٹھے۔ہم نے یہ بھی نظر انداز کر دیا کہ آپ نے آنکھ مار کر اپنی ٹائپسٹ کو اپنی گود میں بٹھالیا ہے۔ایسا سخی دل،اتنا دریادل اور اس قدر رحم دل شخص ہماری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔خوشی کے باعث ہم سب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ہم نے ایک دوسرے کو گلے سے لگالیا اور ہم میں سے بہتوں نے کہا۔''اس کمینہ صفت بخیل انسان کی جیب سے چند روپے نکل جانا ایک ایسا عظیم الشان،رفیع الشان اور عالیشان کارنامہ ہے،جس کا آسمانوں اور زمینوں کی تواریخ میں کوئی ثانی نہیں ملتا۔''

اور تب ہم سب نے خلوصِ دل کے ساتھ طے کیا کہ جب آپ یہاں آئیں گے تو آپ کا بڑی شان سے استقبال کریں گے،آپ کے گلے میں ہار ڈالے جائیں گے۔آپ کے اوپر پھولوں کی بارش کی جائے گی۔پھر ہم سب مل جل کر آپ کو آپ کی منزل تک پہنچادیں گے اور دوزخ منہ پھاڑ کر اپنے لال لال شعلوں والے سینے سے آپ کو چمٹالے گی۔

پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے ایک شاطر مجرم کی عیاری

وارث

شمعرب بس

وراثت ایک مثبت عمل سہی مگر طمع کے ہاتھوں مجبور... کتنے ہی لوگ موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں... وہ بھی ایسا ہی ایک وارث تھا جسے صرف اپنی وراثت سے غرض تھی یہ اور بات کہ ان دشوار گزار رستوں پر اسے کتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑا... وہ جو چلتے چلتے تھک گیا تھا بالآخر ایک روز اسے وہ چال سوجھی جس کے سبب اس کے لڑکھڑاتے قدموں کی ساری تھکن دور ہوگئی...



اس روز بھی معمول کے مطابق اس کے گھر پر کاروباری ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔وہ اپنے شوہر ہال کے بالمقابل میز کے دوسرے سرے پر بیٹھی ہوئی تھی۔اس کے دائیں جانب بل اور جینی بیٹھے ہوئے تھے۔بل اس کے شوہر کا باس تھا اور تقریباً اس کا ہم عمر ہی تھا لیکن اس کا سرتیزی سے گنجا ہو رہا تھا۔اس کی بیوی جینی اس سے عمر میں کم از کم دس سال چھوٹی تھی لیکن اپنے لباس اور میک اپ کی وجہ سے اور بھی چھوٹی لگتی تھی،اس کی آنکھیں بلی کی طرح سبز تھیں اور سنہرے گھنگریالے بالوں کی وجہ سے وہ اور بھی زیادہ حسین نظر آتی تھی۔شاید یہی وجہ تھی کہ کیتھرین کا نوعمر لڑکا کھانے

لے دوران اسے ... دیکھے جا رہا تھا۔

کیتھرین کو یاد آیا کہ کسی زمانہ میں اسے بھی لڑکے اسی طرح دیکھا کرتے تھے لیکن اس کے شوہر نے کبھی اسے وہ پیار اور توجہ نہیں دی جو بیوی ہونے کے ناتے اس کا حق تھا۔ شاید اسی لیے وہ اپنے شوہر سے نفرت کرتی تھی لیکن اس کی تمام بداعمالیوں کے باوجود اسے برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ اس وقت بھی وہ کیتھرین کو نظرانداز کر کے جینی سے خوش گپیاں کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے آگے کی طرف جھک کر نہ جانے کیا کہا کہ جینی زوردار قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کا شوہر ہل کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی طنزیہ انداز میں مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔

کیتھرین نے یوں دیکھا جیسے کوئی پرانی فلم دوبارہ دیکھ رہی ہو۔ وہ ہونٹوں کی جنبش سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ ان کے درمیان کس قسم کی گفتگو ہو رہی ہوگی۔ کافی دیر بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ اس کے بارے میں ہی باتیں کر رہے تھے۔

''یقین نہیں آتا کہ تمہاری شادی کو اتنا عرصہ گزر گیا۔'' اس کے کانوں میں جینی کی آواز آئی تو وہ چونک پڑی اور اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟''

ہال نے اس کے تیور بھانپ لیے اور آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''میں کہہ رہا تھا کہ اس سال جنوری میں ہم اپنی شادی کی بیسویں سالگرہ منائیں گے۔ بل اور میں سان مارکوس میں ایک ہوٹل کھولنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں مجھے اس سلسلے میں دو مہینے بعد وہاں جانا ہوگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ تمہاری سالگرہ کے لیے اس سے بہتر تحفہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ تم بھی ایک ہفتہ کے لیے میرے ساتھ چلو۔ بچوں کو میری بہن دیکھ لے گی، کیا خیال ہے؟''

جینی سوچ رہی تھی کہ کیتھرین کتنی خوش قسمت ہے۔ کاش اس کی جگہ وہ وہاں جا سکتی۔ کیتھرین نے اس کے جذبات بھانپ لیے اور پلٹ کر اپنے شوہر کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

ہال اپنی بات جاری رکھے ہوئے بولا۔ ''سان مارکوس بڑی خوب صورت جگہ ہے۔ وہاں کے ساحلوں کی سفید ریت آنکھوں کو بہت بھلی لگتی ہے اور وہاں ہر قسم کی مچھلیاں ملتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں سورج کی روشنی کتنی پسند ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ایک طرح سے یہ ہمارا ہنی مون ہوگا۔''

''تم بہت خوش قسمت ہو۔'' وہ کیتھرین کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کاش میں بھی وہاں جا سکتی۔''

ہال نے اپنے سامنے رکھے ہوئے ... گھونٹ لیا اور بولا۔ ''سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہاں ایک چھوٹے سے ہوٹل کے ساتھ ایک عریاں ساحل بھی ہے۔ یاد ہے شادی سے پہلے تم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہمیں کسی دور دراز جزیرے پر جانا چاہیے جہاں اس طرح کا ساحل ہو۔''

جینی منہ دبا کر ہنستے ہوئے بولی۔ ''میں کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔''

''کیا واقعی؟'' ہال نے اس کے جسم پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا تو وہ شرما گئی اور سوچنے لگی کہ ان مردوں کی نظریں کتنی گندی ہوتی ہیں۔

کیتھرین کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ہال نے اپنی آواز نیچی کر دی جیسے وہ دونوں وہاں تنہا ہو اور اسے بتانے لگا کہ یہ سفر کتنا رومینٹک ہوگا۔ کیتھرین کو اس کے لفظ کھوکھلے اور بے معنی لگ رہے تھے۔ وہ نیپکن منہ پر رکھ کر کھانسنے لگی۔

جینی سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ رشک آمیز لہجے میں بولی۔ ''شادی کو اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی تم دونوں اس قدر رومانٹک ہو۔''

کیتھرین سویٹ ڈش لانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھی اور کچن میں جا کر بیسن پر جھک گئی، اسے بڑے زور کی متلی ہو رہی تھی۔

رات کو اس کے پہلو میں لیٹا ہوا ہال کہہ رہا تھا۔ ''آج کا ڈنر بہت شاندار رہا۔ لگتا ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی پی گیا۔ سیب اور آلو ساتھ میں ہوں تو میرا ہاتھ نہیں رکتا۔''

وہ ایک بے جان لاش کی طرح خاموش لیٹی اس کے سونے کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ ابھی سونے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''امید ہے کہ تمہیں جزیرے پر جانے کا آئیڈیا پسند آیا ہوگا؟''

جب اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ اسے اپنی جانب کھینچتے ہوئے بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ اس خوشی میں ان لمحات سے لطف اندوز ہوا جائے۔''

اب بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور یہ ظاہر کرنے لگی کہ وہ سو گئی ہے۔ اس نے کروٹ بدلی تو ہال کا ہاتھ کسی بے جان شے کی طرح بستر پر گر گیا۔ کیتھرین نے اپنا منہ تکیے میں چھپا لیا اور اس کے آنسو بہہ نکلے۔

دوسری صبح جب وہ بیدار ہوئی تو ہال کام پر اور لڑکے اسکول جا چکے تھے۔ اسے یہ تنہائی اچھی لگی۔ اس نے گرم پانی کا شاور لیا اور مارننگ واک پر جانے کے لیے لباس تبدیل کرنے لگی۔

دو مہینے بہت طویل عرصہ ہوتا ہے۔ اس دوران ہال کا ذہن تبدیل ہو سکتا تھا یا پھر وہ خود ہی اکیلے چلے جانے کا فیصلہ کر لیتا۔ وہ اسے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ اسے مارتا پیٹتا یا گھر سے نکال دیتا۔ یہ سوچ کر ہی اسے پسینا آنے لگا۔ اگر اس کی مرضی ہوئی تو اسے جانا ہی ہوگا۔ ان دونوں کے درمیان اسی طرح معاملات چل رہے تھے۔

اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولی۔ ''کم آن۔ ریڈ۔''

اس کا جرمن نسل کتا چھلانگیں مارتا ہوا لینڈ کروزر کی طرف بڑھا جس کا دروازہ وہ پہلے ہی کھول چکی تھی، اس نے چند منٹ رک کر کافی شاپ سے کافی پی اور پھر کتوں کی ورزش والے علاقہ کی طرف بڑھ گئی جو جنگل کے ساتھ چالیس ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا، وہاں تقریباً ایک درجن لوگ گیٹ کے ساتھ کھڑے کافی پی رہے اور گپیں لگا رہے تھے۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر جوڑا اور بقیہ اس کی عمر کی عورتیں تھیں جبکہ ان کے کتے کھلی فضا میں دوڑتے پھر رہے تھے۔

وہ ان سب عورتوں کو جانتی تھی۔ وہ کوئی کام نہیں کرتی تھیں اور نہ ہی ان کے چھوٹے بچے تھے۔ اس لیے صبح کے وقت وہ فارغ ہوتی تھیں۔ وہ زیادہ تر فلموں، گھر کی سجاوٹ اور خریداری سے متعلق باتیں کیا کرتی تھیں اور کیتھرین کو انہیں سننے میں مزہ آتا تھا۔

وہ ان کے درمیان کھڑی کافی کے ہلکے ہلکے گھونٹ لیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اتنی دولت اور فراغت ہونے کے باوجود ان عورتوں کی زندگی بھی اس کی طرح بے معنی ہے لیکن کم از کم ان کی بے عزتی تو نہیں کی جاتی۔ اسے اپنے شوہر کی تازہ ترین فرمائش یاد آ گئی اور وہ سوچنے لگی کہ کیا یہ عورتیں کسی پُرہجوم ساحل پر عریاں ہو کر چہل قدمی کرنا چاہیں گی۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنی قمیص کا کالر بند کر لیا۔

''آجاؤ۔ ریڈ!'' اس نے آواز لگائی۔

وہ غالباً اسی آواز کا منتظر تھا۔ لپکتا ہوا آیا اور اس چھوٹی پہاڑی کی طرف بڑھنے لگا جو میدان کے بقیہ حصے کی طرف جاتی تھی۔

کیتھرین کے علاوہ اس راستے پر ایک عورت اور تھی جو اس سے کافی فاصلے پر اپنے سیاہ رنگ کے کتے کے ساتھ جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کا کتا ریڈ بھی اسے تنہا چھوڑ کر سیاہ رنگ کے کتے کا تعاقب کرتے ہوئے میدان میں دوڑنے لگا.... دو روز پہلے کافی تیز بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے راستے میں کئی جگہ پانی جمع ہو گیا تھا۔ وہ باڑھ کے ساتھ ساتھ گیلی گھاس اور بکھرے ہوئے پتوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔

وہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آ جاتی۔ اسے سخت زمین پر چلنے میں مزہ آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی گردن سے پسینا بہنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے فرحت کا احساس دلا رہے تھے۔ اسی لمحے اس نے محسوس کیا کہ اس سے تقریباً بیس گز پیچھے ایک شخص اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس کی تصدیق کرنے کے لیے وہ چلتے چلتے اچانک رک گئی اور یوں ظاہر کیا کہ اس کی کوئی چیز گر گئی ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، وہ شخص بھی رک گیا تھا۔ اس نے سیاہ کوٹ اور سرمئی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کا رنگ گہرا اور جسامت کے لحاظ سے فربہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے بال کانوں تک لٹک رہے تھے اور ناک یوں پچکی ہوئی تھی جیسے ٹوٹ گئی ہو۔ اس عجیب و غریب حلیہ میں دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

اس نے کیتھرین کو نہیں دیکھا بلکہ اس کی نظریں میدان پر جمی ہوئی تھیں جیسے اپنے کتے کو تلاش کر رہا ہو۔ ریڈ چھلانگیں مارتا ہوا واپس آیا پھر اس نے آگے کی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔ کیتھرین بھی اس کے پیچھے چل دی۔ ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں کرتی اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی جیسے کسی خطرے کا احساس دلا رہی ہو۔ اس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا اور جب تک وہ پارکنگ لاٹ کے قریب نہ پہنچ گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ممکن ہے کہ درختوں کی آڑ میں گھات لگائے بیٹھا ہو یا پارکنگ لاٹ میں اس کا انتظار کر رہا ہو تاکہ گھر تک اس کا تعاقب کر سکے۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنی گاڑی تک پہنچی اور گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔

''تو تم نے دوبارہ مصوری شروع کر دی؟'' ہال نے رات کو کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔

اس واقعے کو دو دن گزر چکے تھے اور کیتھرین نے اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا کیونکہ وہ تیقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ شخص اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ بہت سے لوگ اس پارک میں آتے ہیں اور ان میں سے کئی ایک کے پاس تو کتے بھی نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہاں آنے والا ہر شخص اسی کا پیچھا کر رہا ہو۔ وہ ہال کو یہ قصہ سنا کر اپنے آپ کو کمزور ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''میں نے دیکھا ہے کہ تم نے پرانے کینوس اور رنگ کے ڈبے اسٹور سے نکال کر پورچ میں رکھ دیے ہیں۔''

''پرانے رنگ خراب ہوگئے تھے۔ اس لیے مجھے نئے لانے پڑے۔''

''تمہیں دوبارہ مصوری کرنے کا خیال کیوں آیا؟''

''یہ تو نہیں معلوم۔ بس میں کچھ کرنا چاہ رہی تھی۔'' کیتھرین نے اسے ٹالنا چاہا۔

''کیا تم پورچ میں کام کرسکو گی۔ وہاں بہت سردی ہوتی ہے۔ کھڑکیاں پوری طرح بند نہیں ہوتیں۔ خزاں کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن سردیوں میں وہاں کام نہیں ہوسکے گا۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اتنی سردی برداشت کرسکتی ہوں۔''

''لڑکے وہاں کھیلتے ہیں۔ اس طرح تمہاری چیزوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔''

وہ جانتی تھی کہ یہ بھی اسے بے عزت کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ اسے اعتراض تھا کہ پورچ میں سردی ہوتی ہے اگر وہ اس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے اپنا سامان اندر لے آتی تو کہتا کہ رنگوں کی بو سے اس کا دماغ پھٹا جارہا ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک بار پھر اسے مصوری کا سامان اسٹور میں بند کرنا پڑتا۔ دراصل ہال نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوئی کام کرے۔

''تم کیا پینٹ کررہی ہو؟'' اس نے آلو کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

کیتھرائن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ وہ اس موضوع کو بھول کر کوئی دوسری بات کرے لیکن جب اس نے دوبارہ یہی سوال کیا تو وہ جواب دینے پر مجبور ہوگئی۔

''میں کچھ نہیں جانتی۔ بس یونہی کچھ مشق کررہی ہوں۔''

ہال کو اس کے لہجے میں چھپی ہوئی تلخی کو محسوس کرلینا چاہیے تھا لیکن وہ محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔

دوسری صبح اس نے اپنے کتے کے ساتھ پارک کے دو چکر لگائے۔ جب اس کا سانس پھولنے لگا تو وہ گھر واپس چلی آئی اور پورچ میں بیٹھ کر تصویریں بنانے لگی۔ سارا دن یونہی گزر گیا۔ وہ اپنے کام میں اس قدر محو تھی کہ رات کا کھانا بنانا بھی یاد نہ رہا۔ مجبوراً ہال کو باہر سے فرائیڈ چکن لانا پڑا۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ اور پریشانی عیاں تھی جسے اس کے دونوں لڑکے بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ کھانے کے دوران اسے حیرت سے دیکھتے رہے لیکن زبان سے کچھ نہیں بولے۔

کھانا ختم کرنے کے بعد وہ دوبارہ پورچ میں چلی آئی اور دوبارہ تصویریں بنانے میں مصروف ہوگئی۔ خزاں کا موسم ختم ہوا۔ سردی بڑھتی جارہی تھی لیکن کیتھرین نے گھر کے اندر بیٹھ کر تصویریں بنانے سے انکار کردیا تو ہال نے اصرار کیا کہ وہ پورچ میں ہیٹر لگوالے۔ اس کے باوجود سردی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

کیتھرین رات گئے تک اپنے کام میں مصروف رہتی اور صبح دیر تک سوتی رہتی۔ بعض اوقات تو وہ پورچ کے کونے میں رکھے ہوئے کاؤچ پر ہی سوجاتی۔ اس کا کتا بھی وہیں فرش پر لیٹا رہتا، گھر میں جو کچھ ہوتا وہی ناشتے میں کھالیتی پھر وہ کتے کو لے کر پارک چلی جاتی۔ ٹھنڈی ہوا اس کے کان میں سرگوشیاں کرتی تو اس کے خون کی حدت تیز ہوجاتی اور یوں لگتا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔

اس کا وزن کم ہورہا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ پرکشش نظر آرہی تھی۔ ہال نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ وہ ہر شام پورچ میں آتا، اس کی بنائی ہوئی تصویروں کی تعریف کرتا اور اسے یہ یاد دلانا نہ بھولتا کہ اگلے مہینے وہ اس کے ساتھ سان مارکوس کے جزیرے جارہی ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ کیتھرین اپنے جسم کو متناسب اور پرکشش بنانے کے لیے جو کوشش کررہی ہے، یہ وہاں جانے کی تیاری کا حصہ ہے کیونکہ اس ساحل پر عورتیں آزادانہ عریاں ہوکر گھومتی ہیں اور اسی لیے وہ چاہتی ہے کہ دیکھنے میں وہ بھدی نہ لگے۔

اس سفر پر جانے سے کچھ دن پہلے ایک جمعہ کی شام وہ گھر پر اکیلی تھی۔ ہال کسی ڈنر میٹنگ میں گیا ہوا تھا جبکہ دونوں لڑکوں کا بھی اپنے دوستوں کے ساتھ رات باہر گزارنے کا پروگرام تھا۔ یہاں تک کہ اس کا کتا بھی کچھ سست نظر آرہا تھا اس لیے جلد ہی سوگیا۔ باہر برف گر رہی تھی جس نے پتوں اور درخت کی شاخوں کو پوری طرح ڈھانپ لیا تھا۔ وہ کام شروع کرنے کے ارادے سے ایزل کی طرف بڑھی اور اس نے اسی شخص کی تصویر بنانا شروع کردی جسے اس نے جنگل میں دیکھا تھا اور وہ اس کی یادداشت میں محفوظ ہوگیا تھا۔ اب وہ اس سے پہلے کی طرح نہیں ڈرتی تھی بلکہ اس کے بارے میں جاننے کی خواہش مند تھی۔ چاہے اسے کوئی خطرہ ہی کیوں نہ مول لینا پڑے۔ خطرہ تو اس کی شیر جیسی آنکھوں اور مضبوط ہاتھوں کی تصویر کشی میں بھی تھا لیکن اب وہ اس ڈر سے باہر نکل آئی تھی۔

وہ شیر جیسی آواز ہی تھی۔ رات کے سناٹے میں اس نے پتوں کے چرچرانے اور ایک ٹہنی کے ٹوٹنے کی آواز سنی۔ اس نے کھڑکی میں سے ایک سائے کو گزرتے دیکھا۔ جب

چاند کی روشنی اس پر پڑی تو وہ جان گئی کہ یہ وہی شخص تھا جسے اس نے پارک میں دیکھا اور وہ جس کی تصویر بنارہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ جم کر رہ گئی اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے ہاتھ میں کوئی لمبی اور نوکیلی چیز ہے۔ وہ خوف سے کانپنے لگی۔ اس نے کرسی کو پیچھے دھکیلا اور لڑکھڑاتے قدموں سے گھر میں چلی گئی۔ اسٹڈی میں پہنچ کر اس نے لائٹ آن کی اور مدد کے لیے پولیس کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس نے گھبراہٹ میں ہال کی میز کی دراز کھولی تو وہ نیچے فرش پر گرگئی۔ اس میں رکھی ہوئی چیزیں قالین پر بکھر گئیں۔ اسے ایک چھوٹی سی چھری نظر آئی جو خط کھولنے کے کام آتی تھی۔ اس نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور میز کے پیچھے چھپ گئی۔

وہ اس کی آمد سے خوفزدہ تھی اور یہ بھی چاہتی تھی کہ اسے قریب سے دیکھ سکے۔ اس نے آنکھیں بند کرکے تصور میں اسے اندھیرے سے نکل کر اپنی طرف آتے دیکھا تو اس کے سامنے ساحل کا منظر آگیا۔ وہ پانی سے نکل رہا تھا۔ دروازے پر دستک کی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسٹڈی کی کھڑکی کے باہر کوئی ٹارچ کی روشنی ڈال رہا تھا پھر کسی نے زور سے چلاتے ہوئے کہا۔ ''پولیس!''

وہ اسے تلاش کرتے ہوئے اسٹڈی میں آگئے۔ کیتھرین ابھی تک میز کے پیچھے چھپی خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ دیکھنے میں مہربان اور خوش اخلاق لگ رہے تھے لیکن نہ جانے کیوں کیتھرین کو ان کا آنا اچھا نہ لگا۔ اس کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ وہاں سے چلے جائیں۔ کاش اس نے انہیں فون نہ کیا ہوتا۔

''ہم نے یہاں کسی کو نہیں دیکھا۔'' ان میں سے ایک پولیس والا بولا۔ ''ایک پیٹرول کار علاقے میں گشت کررہی ہے۔ تمہارا کہنا ہے کہ تم نے کسی شخص کو عقبی صحن میں دیکھا تھا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

''میں نے اس جگہ کو اچھی طرح دیکھا ہے۔ وہاں کی لائٹیں روشن ہیں۔ کیا اس وقت بھی وہاں روشنی تھی جب تم نے اس شخص کو دیکھا؟''

کیتھرین کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ خوفزدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''نہیں..... میں نہیں جانتی۔''

''اگر تم چاہو تو ہم تمہاری حفاظت کے لیے یہاں کسی کی ڈیوٹی لگا سکتے ہیں۔ تمہارا شوہر کہاں ہے؟''

''تمہارا تنہا رہنا ٹھیک نہیں۔''

''نہیں۔ میں نے کہا نا کہ اس کی ضرورت نہیں۔''

پولیس والے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہاں سے چل دیے۔ ان میں سے ایک آفیسر نے جاتے ہوئے کہا کہ وہ ایک پیٹرول کار کا بندوبست کردے گا جو علاقے میں رات بھر گشت کرتی رہے۔

ان کے جانے کے بعد کیتھرین کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے دراز کو اپنی جگہ پر لگایا اور قالین پر بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹنے لگی۔ ان میں ان دونوں کا پاسپورٹ، ٹکٹ اور ٹورسٹ گائڈ بھی موجود تھی۔ اس کی نظر ایک کاغذ پر پڑی جس پر ہال نے کچھ لکھ رکھا تھا۔ اس میں کئی کالم بنے ہوئے تھے جن میں اس کے کاروباری منصوبوں کی تفصیل درج تھی اور دوسرے کالم میں ہر ایک کے سامنے نمبرز دیے گئے تھے جن میں زیادہ تر منفی تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے بیشتر کاروباری منصوبوں میں نقصان ہورہا تھا۔

انہی کاغذات میں اس کی بیمہ پالیسی بھی تھی جو لفافے سے باہر گرگئی تھی۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ پالیسی کتنی مالیت کی تھی۔ اس نے پہلی بار اسے تفصیل سے پڑھا پھر اس نے تمام چیزیں ترتیب سے دراز میں رکھیں اور پورچ میں آکر دوبارہ مصوری میں مشغول ہوگئی۔ جب ہال چند گھنٹوں بعد گھر واپس آیا تو اس نے کچھ دیر قبل پیش آنے والے واقعے اور پولیس کی آمد کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔ وہ جانتی تھی کہ ہال ہمدردی کرنے کے بجائے اس کا مضحکہ اڑائے گا اور ایسے ریمارکس دے گا جن میں اس کی توہین کا پہلو نکلتا ہو۔

ایک ہفتے بعد وہ چھٹیاں گزارنے کے لیے سان مارکوس روانہ ہوگئے، جہاز سے نیچے کا منظر بڑا خوب صورت تھا اور سان مارکوس کا ساحل ویسا ہی نظر آرہا تھا جیسا وہ اپنے خواب میں دیکھا کرتی تھی۔ جیسے ہی وہ جہاز سے باہر آئے، گرم ہوا کے جھونکے نے ان کا استقبال کیا۔ نیلے سوٹ میں ملبوس ایک نوجوان شخص ان کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ وہ خوش شکل اور خوش گفتار ہونے کے ساتھ خوب صورت لہجے کا بھی مالک تھا۔ جب گاڑی منزل کی جانب روانہ ہوئی تو وہ پچھلی سیٹ کی طرف گردن موڑ کر بتانے لگا کہ اس وقت یہاں کے منصوبوں میں سرمایہ کاری کتنا مفید ثابت ہوگا۔ ہال نے کسی ناراض شخص کی طرح اپنے ہونٹ بھینچ لیے لیکن زبان

ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں سفر کرنے کے باوجود اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ جب اس سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ بول پڑی۔ ''مجھے پیاس لگ رہی ہے، کہیں گاڑی روکو تاکہ مجھے پینے کے لیے کچھ مل سکے۔''

وہ گنے کے کھیتوں کے پاس سے گزر رہے تھے اور سڑک کے کونے پر انہیں پھلوں کا کیبن نظر آیا۔ وہاں میز پر آم، امرود، سنگترے اور ناریل رکھے ہوئے تھے، ایک بوڑھے شخص نے ہسپانوی زبان میں ان کا استقبال کیا اور کیتھرین میز پر ہاتھ جما کر کیبن کا جائزہ لینے لگی۔

''میں اسے بتا چکا ہوں کہ تم پیاسی ہو۔'' ڈرائیور نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

اس بوڑھے شخص نے میز کی دراز سے ایک بڑا سا چاقو نکالا اور ناریل کے اوپری حصے میں سوراخ کر کے اس کا پانی بڑے سے کاغذ کے گلاس میں انڈیل دیا۔ کیتھرین نے گھونٹ لے کر اسے چکھا۔ وہ مشروب اسے خوش ذائقہ لگا اور وہ مزے لے کر اسے پینے لگی۔ تھوڑا سا پانی اس کی ٹھوڑی سے بہتا ہوا گردن تک چلا گیا۔ اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور بلی کی طرح اپنا چہرہ چاٹنے لگی۔ ڈرائیور بھی ہنس دیا لیکن ہال کچھ نہیں بولا اور کار کی جانب بڑھ گیا۔

بوڑھے دکان دار نے ناریل کو میز پر رکھا اور چاقو سے اس کی بالائی سطح کو چھیلنے لگا پھر اس نے اسے قاشوں میں تقسیم کر کے کاغذ کی پلیٹ میں انہیں پیش کیا۔ کیتھرین اور ڈرائیور دونوں ہی اس کے ذائقہ سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ باقی کا سفر خاموشی سے گزرا، سارے راستے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔

ان کا کمرا ہوٹل کی اٹھارویں منزل پر تھا جہاں سے سمندر بالکل صاف اور واضح دکھائی دیتا تھا۔ ہال نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور اسے بتانے لگا کہ وہ دوپہر کا کھانا اپنے پارٹنرز کے ساتھ کھائے گا۔

''تم گراؤنڈ فلور پر واقع ریستوران میں لنچ کر سکتی ہو۔ چاہو تو تھوڑی دیر آرام کر لو۔ شام کو ہم کسی ایسے ریستوران میں جائیں گے جہاں عمدہ قسم کی مچھلی اور جھینگے ملتے ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد کیتھرین نے لباس تبدیل کیا۔ بغیر آستین کے سرخ بلاؤز اور اس سے میچ کرتی ہاف پینٹ میں وہ اپنی عمر سے کہیں کم اور خاصی پرکشش لگ رہی تھی۔ اس کے بعد وہ ہلکا سا میک اپ کر کے ہوٹل سے باہر آ گئی۔ وہاں تقریباً سارے ہی ہوٹل ایک جیسے کثیر المنزلہ تھے جن کے سامنے پام کے درختوں کی قطار اور دروازے پر مسکراتے ہوئے دربان کھڑے ہوتے تھے۔ دو بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک نسبتاً چھوٹے ہوٹل کے سامنے کھڑی ہوئی تھی، اس کی سیڑھیوں اور سائبان پر رنگین ٹائل لگے ہوئے تھے جبکہ بیرونی دیواریں گہرے اورنج رنگ کی تھیں، صدر دروازے پر ہوٹل کا نیون سائن جگمگا رہا تھا۔ ہوٹل بلیوس ڈیل سول اور اس کے نیچے ایک تختی لٹک رہی تھی جس پر لکھا ہوا تھا ''صرف مہمانوں کے لیے'' یہ وہی ہوٹل تھا جس کے بارے میں ہال نے اسے پہلی بار اس وقت بتایا تھا جب وہ یہاں آنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ یہ ان ہوٹلوں میں سے ایک تھا جن کے ساتھ عریاں ساحل تھے۔

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ استقبالیہ پر ایک لڑکی نیلا لباس پہنے ہوئے بیٹھی تھی۔ عین اسی وقت ایک جوڑا اس کے پاس سے گزرا، مرد کی توند نکلی ہوئی تھی۔ وہ چیک کی قمیص اور سلیٹی رنگ کی پتلون پہنے ہوئے تھا جبکہ عورت بہت زیادہ دبلی تھی۔ اس گرم موسم میں اس نے گرم سوٹ اور تنکوں کا بنا ہوا ہیٹ پہن رکھا تھا اور دونوں کسی کارٹون فلم کا کردار لگ رہے تھے۔ شاید وہ دونوں صبح سویرے ساحل پر عریاں حالت میں سن باتھ لیتے رہے ہوں گے اور سورج کی کرنیں کسی محبوب کی طرح ان کے جسم کا نظارہ کر رہی ہوں گی۔ اس سے زیادہ بے شرمی اور کیا ہو سکتی تھی۔

کیتھرین نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ کچھ سوچ کر رک گئی۔ وہ اس ہوٹل کی مہمان نہیں تھی اگر کسی نے اس سے یہاں آنے کا مقصد پوچھ لیا تو وہ کیا جواب دے گی، لہٰذا اس نے اندر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور شہر کے پرانے حصے کی طرف چل دی۔ چند بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سڑکیں تنگ ہونے لگیں اور اسے تلی ہوئی مچھلی، بھنے ہوئے گوشت اور مختلف پھلوں کی خوشبو آنے لگی۔ ریڈیو پر تیز آواز میں مختلف دھنیں بج رہی تھیں اور چوڑے شانوں والے مرد، مختصر اسکرٹ میں ملبوس عورتوں کے ساتھ ان دھنوں پر رقص کر رہے تھے۔

وہ مختلف دکانوں کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھتی گئی۔ ان دکانوں میں انواع و اقسام کا سامان بھرا ہوا تھا۔ ان میں چاندی کے زیورات، ملبوسات اور شالیں وغیرہ سجی ہوئی تھیں۔ دروازوں پر کھڑے سیلز مین آوازیں دے کر اسے اپنی جانب متوجہ کرنے لگے۔ وہ ایک بیکری میں چلی گئی جہاں پھلوں، چینی اور دودھ سے بنی ہوئی رنگ برنگی پیسٹریاں سجی ہوئی تھیں، اس نے ایک پیسٹری لی اور وہیں کھڑے ہو کر کھانے لگی لیکن اس طرح اس کی بھوک ختم نہیں ہوئی لہٰذا وہ کسی ایسے ہوٹل کی تلاش میں چل دی جہاں بیٹھ کر وہ لنچ کر سکے۔

ایک موڑ سے گزرتے ہوئے اس نے پیچھے دیکھا۔ آدھے بلاک کے فاصلے پر ایک آدمی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اسے رکتے دیکھ کر وہ بھی رک گیا اور فوراً ہی ایک اسٹور میں چلا گیا۔ وہ طویل قامت اور گہرے سانولے رنگ کا تھا اور سڑک پر جو لوگ چل رہے تھے۔ ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں لگ رہا تھا۔ کیتھرین کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور وہ جلدی سے ایک ریستوران میں گھس گئی۔

وہاں ایک بار بھی تھا اور لکڑی کے فرش پر کچھ جوڑے رقص کر رہے تھے۔ کھڑکیوں کے ساتھ ساتھ لکڑی کی گول میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور چھت پر دو پنکھے لٹک رہے تھے۔ کیتھرین ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور اس نے ٹوٹی پھوٹی ہسپانوی زبان میں چکن اسٹو اور بیئر کا آرڈر دیا۔ ویٹریس نے آرڈر کی تعمیل میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ کھانا لذیذ تھا، اس نے مزے لے لے کر کھایا اور ساتھ ساتھ بیئر کے گھونٹ بھی لیتی رہی۔ کھانا ختم کر کے اس نے منہ صاف کیا اور کرسی کی پشت سے لگ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

سڑک کے دوسری جانب ایک دکان کے باہر چاول اور دالوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جبکہ ایک موٹی عورت دروازے میں کھڑی کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ کیتھرین نے اپنے پرس سے پنسل نکالی اور نیپکن پر اس عورت کا اسکیچ بنانے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ایک اور بیئر کا آرڈر دیا اور بار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگی، اسی دوران ایک جوڑا اندر داخل ہوا تھا۔ ان دونوں کی پشت اس کی جانب تھی۔ عورت نے سبز رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے لمبے سیاہ بال شانوں سے نیچے لٹک رہے تھے۔ وہ اپنے ساتھی سے زور زور سے باتیں کر رہی تھی۔ کیتھرین نے ایک اور نیپکن اٹھایا اور اس جوڑے کا اسکیچ بنانا شروع کر دیا پھر اچانک ہی اس عورت نے زوردار قہقہہ لگایا اور پیچھے کی جانب ہٹی تو اس کے ساتھی کا چہرہ بھی نظروں کے سامنے آ گیا۔

یہ وہی شخص تھا جسے کیتھرین نے چند منٹ پہلے سڑک پر دیکھا تھا۔ وہ اس کو کیسے بھول سکتی تھی جس نے ڈاگ پارک میں اس کا تعاقب کیا تھا اور اس کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ وہی کانوں پر لٹکتے ہوئے گھنگریالے بال، چپٹی ناک اور غار کی طرح کھلا ہوا منہ۔ اس شخص نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے کیتھرین کو نہ دیکھا ہو لیکن اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بل ادا کیا اور ریسٹورنٹ سے باہر چلی آئی۔

وہ تیز تیز قدم بڑھاتی اپنے ہوٹل کی جانب چلی جا رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت اور تیز چلنے سے اس کا بلاؤز پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ اسے یوں لگا کہ وہ راستہ بھول گئی ہے تاہم اسے ہوٹل کا نام یاد تھا۔ اس نے سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ایک خوانچہ فروش سے وہاں کا پتا پوچھا تو اس نے بائیں جانب اشارہ کر دیا۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے اس طرف چل پڑی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اسے سمندر نظر آ گیا۔ اس نے اپنی رفتار ہلکی کی اور ہوٹل کو جانے والے راستے پر قدم بڑھا دیے۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا لیکن کوئی شخص اس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔

کیتھرائن نے کمرے میں پہنچ کر دروازہ اندر سے لاک کیا اور نہانے کے لیے چلی گئی۔ اس نے اس شخص کے خیال کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ بند دروازے سے بھی اندر داخل ہو سکتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ جلدی میں تالا ٹھیک سے نہ لگا سکی ہو۔ اس خیال کے آتے ہی وہ وحشت زدہ ہو گئی اور گیلے بدن پر تولیا لپیٹ کر دروازے کی جانب بھاگی لیکن وہ پوری طرح مقفل تھا۔

باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر گیلری میں لگے ہوئے قد آدم آئینے پر گئی۔ اس نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تصور میں اپنے آپ کو ریستوران میں بیٹھے ہوئے مردوں کے ساتھ رقص کرتے دیکھا۔ کیا وہ ان کے لیے پارٹنرز کی طرح قابل قبول ہو گی جو بجلی کی طرح تھرکتی ہیں۔

اسے لگا کہ کوئی شخص دروازے کے تالے میں چابی گھما رہا ہے جبکہ اس نے اندر سے چٹخنی چڑھا رکھی تھی۔ پھر اس کے کانوں میں ہال کی آواز آئی۔ ''دروازہ کھولو، یہ میں ہوں۔''

اس نے تولیا کو اپنے جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹا اور دروازہ کھولنے کے لیے چل دی۔ اس نے ہال کے اندر آنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور بستر پر چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ کیتھرین نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس وقت ہال کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ جب اس نے چند لمحوں بعد آنکھیں کھولیں تو وہ اس پر جھکا حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں غصے سے لال ہو رہی تھیں۔ ایسا اس وقت ہوتا جب اسے کاروبار میں نقصان ہو رہا ہو یا کسی سودے میں ناکامی ہوتی ہو۔

''تمہیں میری ذرا بھی پروا نہیں۔'' وہ غرایا۔

جب اس نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی تو وہ گھٹنوں کے بل جھکا اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

''تم نہیں جانتیں کہ ہم کتنی مشکل میں ہیں۔ اس سودے کو ہر حال میں کامیاب ہونا چاہیے ورنہ میں دیوالیا ہو جاؤں گا۔''

وہ بولتا رہا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ وہ اس کی بات نہ سمجھ سکی اور اس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس نے سختی سے اسے جکڑ لیا اور بولا۔

"تمہیں اس بات کی بالکل بھی پروا نہیں کہ میں کتنی محنت کرتا ہوں۔ تم میرا ذرہ برابر خیال نہیں رکھتیں۔"

یوں لگا جیسے وہ اسے مار ڈالے گا۔ کیا اسے اس جزیرے پر لانے کی یہی وجہ تھی۔ اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا جس پر وہ مزید بھڑک گیا جیسے ہی ہال کے ہاتھ اس کے گلے کی طرف بڑھے اس نے اسے زور سے دھکا دیا اور اپنے گھٹنے سے اس کی ٹانگوں کے درمیان ضرب لگائی۔ اس نے زوردار چیخ ماری اور وہ اس کی گرفت سے آزاد ہوگئی۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بستر کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ اس کی نگاہ ہال کے چہرے پر گئی جس پر تکلیف کے آثار تھے اور آنکھوں میں غصہ جھلک رہا تھا۔ دونوں ہی زور زور سے سانس لے رہے تھے، اس کا تولیا جسم سے ڈھلک گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اسے مضبوطی سے لپیٹا اور بالکونی کی جانب بڑھ گئی اور سمندر کا نظارہ کرنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ شیر اپنے شکار کو کبھی نہیں چھوڑتا، وہ انتظار کر رہی تھی کہ ہال اسے کب بالکونی سے دھکا دیتا ہے۔

ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بلکہ ہال نے اس سے یہ کہہ کر معافی مانگی کہ وہ زیادہ پی جانے کے سبب بہک گیا تھا اور اسے نہیں معلوم کہ نشے کی حالت میں وہ کیا کرتا رہا ہے۔ وہ کافی دیر تک اس کے پاس کھڑا سرگوشیاں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے معاف کر دینے کے انداز میں اپنا سر ہلانا پڑا۔ اس نے بتایا کہ آج رات وہ اپنے پارٹنر کے ساتھ ڈنر پر مدعو ہے جو کہ ایک طرح کا کاروباری ڈنر ہے اور اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے لہٰذا وہ اپنے دل و دماغ کو سکون پہنچانے کے لیے ٹھنڈے پانی سے نہانا پسند کرے گا۔

وہ باتھ روم میں گیا تو کیتھرین نے وہ سرخ لباس زیب تن کر لیا جو شام کی پارٹیوں کے لیے مخصوص تھا اور جسے اس نے حال ہی میں خریدا تھا۔ دوران ڈنر ہال ایک عمر رسیدہ شخص سے کاروباری گفتگو کرتا رہا جس کا لہجہ جرمنوں جیسا تھا جبکہ اس کی بیوی جلے ہوئے توس کی طرح خشک لگ رہی تھی۔ اس نے پلیٹ میں رکھے ہوئے چکن کو کئی ٹکڑوں میں کاٹا اور منہ میں ڈالنے سے پہلے ان کا بغور معائنہ کرتی رہی۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر کیتھرین کو اس کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا۔ دوسرا شخص وہی تھا جو انہیں ایئرپورٹ سے لے کر آیا تھا۔ اس کی بیوی کو انگریزی بولنا نہیں آتی تھی۔ اس لیے وہ ڈنر کے دوران خاموش رہی۔

نوجوان شخص نے کیتھرین کے لباس کی تعریف کی اور بار بار یہی کہتا رہا کہ وہ بہت خوب صورت اور جوان لگ رہی ہے۔ بعض اوقات اس کا ہاتھ کیتھرین کے بازو کو چھو جاتا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کے ساتھ فلرٹ کر رہا تھا اور شادی کے بعد پہلی بار کیتھرین کو احساس ہوا کہ وہ بھی کسی دوسرے مرد سے تعلقات استوار کر سکتی ہے۔ ہال بھی اسی جانب دیکھ رہا تھا۔ کیتھرین نے اس کی طرف دیکھا اور اسے جلانے کے لیے نوجوان شخص کی کسی بات پر زور سے قہقہہ لگایا جس طرح اس عورت نے دوپہر کے وقت اپنے ساتھی مرد سے گفتگو کے دوران قہقہہ لگایا تھا۔

اپنے ہوٹل کے کمرے میں واپس آنے کے بعد ہال نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ دونوں جہازی سائز کے بیڈ پر ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر لیٹے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہال کے خراٹے گونجنے لگے۔ کیتھرین کو بھی نیند آ رہی تھی لیکن سونے سے پہلے وہ اس نوجوان شخص کے ہاتھوں کے لمس کو نہ بھول سکی۔ اسے لگا جیسے وہ اب بھی اس کی نرم جلد پر اپنا ہاتھ پھیر رہا ہے۔

دوسری صبح وہ باتھ روم سے باہر آئی تو ہال کسی سے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔

"اس مرتبہ پہلے سے بہتر کام ہوگا۔"

اسے دیکھ کر وہ کچھ گھبرا گیا اور اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔

"مجھے لنچ کے بعد ایک میٹنگ میں جانا ہے۔" اس نے کہا۔ "تمہارا صبح میں کیا پروگرام ہے؟"

"واک پر جاؤں گی۔ ممکن ہے کہ کچھ شاپنگ بھی کر لوں۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اچھا ہے میری ٹانگوں کی ورزش ہو جائے گی۔"

راستے میں ہال اس سے اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے ان کے درمیان کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ شہر کے پرانے حصے کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر راستے میں ہوٹل بیسوس ڈیل سول پر پڑی۔ ہال کا کہنا تھا کہ وہ آج سودا نمٹا لے گا اور ان چھٹیوں کو وہ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اس نے جب بھی کیتھرین کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی وہ اس کی گرفت سے مچھلی کی طرح پھسل گئی اور زیادہ تیزی سے چلنے لگی تاکہ اس تک پہنچنے کے لیے ہال کو بھی زیادہ تیزی دکھانا پڑے۔

راستے میں کئی دکانوں پر رکے۔ ان میں زیادہ تر آرٹ گیلریز تھیں۔ وہ ہر گیلری میں جا کر سرسری انداز میں تصویریں دیکھتی اور واپس آ جاتی۔ ہال بڑے صبر کے ساتھ یہ ساری کارروائی دیکھتا رہا پھر وہ اسے ریستوران کے سامنے واقع ایک اسٹور میں لے گئی۔ یہ وہی ریستوران تھا جہاں وہ گزشتہ روز لنچ کے لیے گئی تھی۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہوئی عورت نے ان کا استقبال کیا اور انہیں مختلف چیزیں دکھانے لگی۔ ان میں تازہ پھل، سبزیاں، ڈبوں میں بند خوراک، کپڑے اور مقامی موسیقی کے کیسٹ وسی ڈیز شامل تھیں۔ ایک خانے سے اس نے سفید رنگ کی قمیص نکالی اور ہال کے سینے سے لگا دی۔

کیتھرین بولی۔ "ٹھیک ہے، تم اسے پہن کر دیکھ لو۔"

ہال سر ہلاتا ہوا ٹرائی روم کی طرف چلا گیا۔ اس کی پشت کیتھرین کی جانب تھی۔ اس کے جاتے ہی کیتھرین تیزی سے چلتی ہوئی اسٹور سے باہر آ گئی۔ وہ اس سے دور ہونا چاہ رہی تھی۔ اسے یہ فکر نہیں تھی کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ سڑک آگے جا کر تنگ ہوگئی تھی اور وہاں بالکل سناٹا تھا۔

اس نے عقب سے ایک سایے کو اپنی جانب جھپٹتے دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی۔ وہ اسے ایک گلی میں دھکیل چکا تھا۔ اس نے اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا اور اس پر اپنا دباؤ بڑھانے لگا۔ یہ وہی شخص تھا جسے اس نے گزشتہ روز ریستوران میں دیکھا تھا اور جو اس وقت سے کیتھرین کا پیچھا کر رہا تھا جب سے وہ ڈاگ پارک میں اسے نظر آئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور یوں لگا جیسے اس شخص کے ہاتھ کیتھرین کے جسم پر رینگ رہے ہوں۔ وہ شخص اسے بری طرح جھٹکے دے رہا تھا اور وہ خود کو بادلوں کے درمیان تیرتا ہوا محسوس کر رہی تھی پھر اچانک ہی وہ اس سے الگ ہوگیا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" ہال چلاتے ہوئے بولا۔

یہ کہہ کر اس نے اس شخص کو زوردار ٹکر ماری۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا لیکن جیسے ہی ہال اس پر دوبارہ حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس شخص نے ہال کے پیٹ میں کوئی چمک دار شے گھونپ دی۔ دونوں ہی ایک ساتھ زمین پر گرے پھر اسے اپنے عقب میں ایک عورت کی چیخ سنائی دی۔

وہ مجمع کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی اور اس پولیس والے کے پاس سے گزرتی چلی گئی جو اس عورت کی چیخ کی آواز سن کر اسی جانب چلا آ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو پرسکون محسوس کیا جیسے اپنے کتے کے ساتھ ٹہلنے کے لیے باہر نکلی ہو اور اسے اپنی منزل کا پتا ہو۔ وہ اسی راستے پر واپس چل دی جہاں سے آئی تھی۔ ہوٹلوں کی قطار سے گزرتے ہوئے وہ بیسوس ڈیل سول کی سیڑھیوں پر قدم رکھ رہی تھی۔ اندر جانے کے بعد اسے استقبالیہ کاؤنٹر پر کچھ سوالوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ انہیں جیسے تیسے مطمئن کر کے ساحل کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے اپنے سینڈل اتار دیے۔ چشمہ ایک جانب اچھال دیا اور لباس کے اوپری بٹن کھولنے لگی۔ اس کے نرم پیر ساحل کی گرم ریت میں دھنس رہے تھے لیکن وہ اپنی دھن میں مست آگے کی جانب بڑھتی گئی۔ وہاں اور بھی کئی مرد اور عورتیں موجود تھیں جو چھتریوں کے نیچے لیٹی یا سمندر میں تیر رہی تھیں۔ کیتھرین نے بھی کپڑے اتار دیے اور پانی میں قدم رکھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پیچھے کی طرف جھک گئی۔ سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں جیسے اس کی بلائیں لے رہی ہوں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خود کو سمندر کی موجوں کے حوالے کر دیا۔ ذلت کی زندگی گزارنے سے بہتر تھا کہ وہ عزت کی موت کو گلے لگا لے۔

وہ شروع سے ہی جانتی تھی کہ ہال اسے کس لیے یہاں لایا ہے۔ اس کاروباری سودے کی تکمیل کا بہت کچھ دارومدار اس پروگرام پر تھا جو اس کا شوہر اپنے کاروباری دوستوں کے ساتھ ترتیب دے چکا تھا۔ وہ بے غیرت تھا جو دوسروں کے سامنے اپنی بیوی کو اس ساحل پر بے لباس کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے ہمیشہ ہی کیتھرین کی بے عزتی کی تھی جسے وہ اپنا گھر بچانے کی خاطر برداشت کرتی آ رہی تھی لیکن اس بے عزتی کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے کئی بار چاہا کہ ہال کو چھوڑ کر کسی دوسرے شخص کے بازوؤں میں پناہ لے لے لیکن سبھی مرد ناقابل اعتبار تھے۔ اس کا پیچھا کرنے والا وہ پُراسرار شخص بھی بالآخر ایک بھیڑیا ہی ثابت ہوا۔

دوسری طرف اسپتال کے بستر پر لیٹے ہوئے ہال کو جب کیتھرین کے ڈوبنے کی اطلاع ملی تو اس کا دل چاہا کہ زور زور سے قہقہے لگائے لیکن اس طرح اس کے زخم کے ٹانکے ٹوٹ جاتے۔ لہٰذا اس نے مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ کیتھرین کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا جو جاتے جاتے اس کا نقصان پورا کر گئی تھی۔ اب وہ بے چینی سے اپنے صحت یاب ہونے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ واپس جا کر کیتھرین کے انشورنس کی رقم وصول کر سکے کیونکہ لڑکے ابھی نابالغ تھے اور وہی اس کا حقیقی وارث تھا۔



طبقاتی نظام کی کشمکش، بکھرتی سوچوں کا انتشار اور محبت کے مہربان لمحات کا احوال

پانچواں آدمی

اچ اقبال

بے شک زندگی مجموعہ اضداد سہی، اس کے باوجود انہی تضادات میں رہ کر انسان کو اپنے لیے مثبت راہوں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے... مگر اس نے اپنے لیے جن رستوں کو چنا سوئے اتفاق ان کے اختتام پر کسی منزل کا ڈیرا نہ تھا... اور جب پیروں کے آبلوں نے تھک کر طویل مسافت طے کرنے سے انکار کیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کس قدر غلط سمت میں محو سفر تھا۔ شاید بدقسمتی کے ساتھ ساتھ خوش بختی بھی اس کے تعاقب میں تھی تب ہی ان ویرانوں میں اس کے بکھرے وجود کو محبت نے بڑے مان سے سمیٹ لیا... تباہ حال معاشرتی نظام نے ایسے جانے کتنے حوصلہ مندوں کو آزمائش میں مبتلا کیا ہوا ہے یہ اور بات کہ ہر ایک پر محبت کی دیوی مہربان نہیں ہوتی مگر... جن پر ہوجائے وہ مقدر کے بادشاہ کہلاتے ہیں اس حوالے سے اسے بھی کسی کے دل پر حکمرانی حاصل تھی اور وہ صرف اسی کے نام پر دھڑکتا تھا... اگرچہ اسے خبر نہ تھی اور اسی بے خبری میں جانے کتنے سنہرے دن ہوا ہوگئے... جب ادراک ہوا تو احساس ندامت نے چاہتوں کی سمت نظر اٹھنے ہی نہ دی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس کے تغافل کے آزار تلے خاک ہوجاتا، زندگی نے ایک خوبصورت موڑ لیا اور خواہشوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا... اس بار محبت کی دیوی اس پر سچے دل سے مہربان ہوئی تھی۔

وہ ایک چھوٹا اور معمولی سا میڈیکل اسٹور تھا جو سیف ہمدانی کی محنت، گاہکوں سے مشفقانہ طرزِ عمل اور ان کے نستعلیق انداز گفتگو کے باعث اوسط درجے کا ایک اچھا خاصا اسٹور بن گیا تھا۔ ابتدا میں سیف ہمدانی اسٹور پر اکیلے ہی ہوتے تھے لیکن اب انہوں نے دو ملازم بھی رکھ لیے تھے۔ اسٹور صبح دس بجے سے دو بجے تک اور شام کو چھ بجے سے رات ایک بجے تک کھلا رہتا تھا۔

دس سالہ محنت کے بعد اب وہ قدرے آسودہ مگر اطمینان بخش زندگی گزارنے لگے تھے، مگر کچھ دنوں سے ان کا اطمینان رخصت ہوگیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے بابر کی وجہ سے متفکر رہنے لگے تھے۔

بابر پولیٹیکل سائنس میں ڈگری لینے کے بعد دو سال سے ملازمت کی تلاش میں تھا۔ سیف ہمدانی کی خواہش تو یہ تھی کہ بابر میڈیکل اسٹور کے معاملات میں ان کا ہاتھ بٹائے تو وہ ایک ملازم کو فارغ کردیں لیکن بابر کی افتادِ طبع کچھ اور تھی۔ وہ کسی بہت اچھی ملازمت کا متلاشی تھا اور ''بہت اچھی'' ملازمت کسی سفارش کے بغیر مل نہیں سکتی تھی۔ اسی لیے صحیح معنوں میں اس کا وقت ملازمت کے بجائے کسی ''سفارش کنندہ'' کی تلاش میں گزرتا رہا تھا۔

چھ ماہ قبل دوپہر کے کھانے پر سیف ہمدانی نے بابر سے کہا تھا۔

''کیا بات ہے؟ آج تم کسی گہری سوچ میں ڈوبے نظر آرہے ہو؟''

''آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے ابا جان.....! دو سال سے میں آپ پر بوجھ بنا ہوا ہوں۔ اب مجھے اس پر شرم آنے لگی ہے۔''

''اولاد کبھی والدین پر بوجھ نہیں بنتی۔'' سیف ہمدانی نے سنجیدگی سے بیٹے پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ''اگر تم اسٹور پر میرا

ہاتھ بٹانا شروع کر دو تو تمہاری یہ شرمندگی ختم ہو جائے گی۔"

"وہ میرے مزاج کے خلاف ہے ابا جان! بالکل اسی طرح جیسے آپ کو ملازمت کرنا پسند نہیں تھا۔"

"لیکن تم ملازمت بھی حاصل نہیں کر سکے!"

"سفارش کے بغیر کوئی اچھی ملازمت نہیں ملتی۔"

"چھوٹی ملازمت سے بھی بڑے عہدوں تک پہنچا جاسکتا ہے، اگر انسان میں صلاحیت ہو تو تم اپنے چچا ہی کی مثال لے لو۔ وہ محکمۂ پولیس میں کیا تھا؟ صرف اے ایس آئی، مگر آج وہ اس شہر کی پولیس کا ڈی آئی جی ہے۔ صلاحیت تھی اس میں، سو وہ....."

"جوڑ توڑ کی صلاحیت۔" بابر نے بات کاٹ دی تھی۔

"کچھ بھی ہو! کچھ ہو تو سہی!"

"لیکن میں معمولی ملازمت حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ مجھ سے کم تعلیم حاصل کرنے والوں کو اچھی ملازمتیں ملی ہیں۔"

"اچھا۔" سیف ہمدانی نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔ "تو ڈھونڈتے رہو سفارش..... لیکن یہ مت سمجھو کہ تم مجھ پر بوجھ ہو۔"

"لیکن اب میں سفارش تلاش کرتے کرتے بھی تھک گیا ہوں۔"

"تو پھر؟"

"آج کا معاشرہ۔" بابر کے لہجے میں تلخی آگئی تھی۔ "بڑا بے رحم معاشرہ ہے۔ کسی کو اس کا حق نہیں دیتا۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حق جب آسانی سے حاصل نہ ہو تو پھر جبر کرنا پڑتا ہے۔ اپنا حق چھیننا پڑتا ہے۔"

اس جواب پر سیف ہمدانی نے چونک کر بیٹے کو دیکھا تھا۔ ان دونوں کی باتوں کے دوران میں سیف ہمدانی کی بیوی عذرا بیگم اور بیٹی عنبر خاموشی سے کھانا کھاتی رہی تھیں اور کبھی کبھی سر اٹھا کر باپ بیٹے پر اچٹتی سی نظریں ڈال لیتی تھیں۔

"بابر!" سیف ہمدانی نے بیٹے کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔ "کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا بیٹے کہ مجھے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔"

اس بات کا بابر نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ سر جھکائے خاموشی سے کھانا کھاتا رہا تھا۔

پھر کوئی ایک ہی مہینا گزرا تھا کہ بابر کے جسم پر نہایت عمدہ کپڑے اور اچھی تراش کا سوٹ نظر آیا۔ دوسرے دن اس کے جسم پر جب دوسرا سوٹ بھی نظر آیا تو سیف ہمدانی چونک اٹھے تھے۔ وہ بابر کو جو ماہانہ جیب خرچ دیا کرتے سلوا سکتا۔

"کیا تمہیں کوئی ملازمت مل گئی ہے؟" سیف ہمدانی نے پوچھا تھا۔

"جی ہاں ابا جان! کوئی بہت اچھی ملازمت تو نہیں ملی مگر کچھ ایسی بری بھی نہیں ہے۔"

"اور تم نے مجھے بتایا نہیں؟"

"میں نے سوچا تھا کہ جب پہلی تنخواہ ملے گی تو بتاؤں گا۔"

"ابھی تنخواہ نہیں ملی؟"

"جی نہیں۔"

"اور تم اتنے قیمتی کپڑے بھی سلوانے لگے؟"

"دس ہزار روپے ایڈوانس مل گئے تھے۔"

"دس ہزار؟" سیف ہمدانی چونکے۔ "ایڈوانس؟"

"جی!"

"تنخواہ کتنی ہوگی؟"

"چالیس ہزار۔"

"اور تم اسے معمولی ملازمت کہہ رہے ہو؟"

"میں زیادہ آگے جانا چاہتا ہوں ابا جان..... اور وقت بہت کم ہوتا ہے انسان کے پاس! عمر چاہے سو سال کی ہو لیکن انسان کو جو کچھ بننا ہوتا ہے، وہ چالیس پینتالیس سال کی عمر تک بن جاتا ہے۔ اس حساب سے میرے پاس صرف پندرہ بیس سال بچے ہیں۔"

"تم ایک متوسط گھرانے کے فرد ہو بابر! اتنی اونچی پرواز کے بارے میں سوچنا تمہارے لیے خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔" سیف ہمدانی کے لہجے میں سختی نہیں تھی۔ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔

"ابا جان!" بابر نے کہا۔ "انسان کو حق حاصل ہے کہ وہ اونچی سے اونچی پرواز کے بارے میں سوچے، خواہ اس کا تعلق پست ترین گھرانے سے ہو۔"

"میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ یہ خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔"

"زندگی بنانے کے لیے رسک تو لینا ہی پڑتے ہیں ابا جان!" بابر نے کہا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

ان دونوں میں یہ باتیں دروازے کے قریب ہوئی تھیں۔ سیف ہمدانی بھی اپنے اسٹور جانے والے تھے۔ اسٹور گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سیف ہمدانی ٹہلتے ہوئے بھی جاتے تو پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔

پھر وقت گزرنے کے ساتھ ان کی فکرمندی بڑھتی ہی چلی گئی۔ بابر کو جب تنخواہ ملتی تو وہ پندرہ ہزار روپے ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔ عذرا بیگم اس صورت حال سے بہت خوش تھیں اور عنبر تو نہال ہوئی جارہی تھی۔ ہر ماہ اس کے لیے دو ایک نئے جوڑے بننے لگے تھے۔ چھ ماہ بعد تو وہ بڑے ٹھاٹ باٹ سے کالج جانے لگی۔ وہ فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔

ایک رات سیف ہمدانی نے اپنی بیوی سے کہا۔ "عذرا بیگم! ذرا اپنے لاڈلے سے پوچھیے تو سہی کہ وہ کہاں ملازمت کر رہا ہے۔ مجھے اس نے اپنی تنخواہ چالیس ہزار روپے بتائی تھی لیکن جس طرح کی زندگی وہ گزار رہا ہے، وہ چالیس ہزار کی تنخواہ میں ممکن نہیں۔ پندرہ ہزار تو وہ آپ ہی کو دے دیتا ہے۔"

"ترقی ہوگئی ہوگی اس کی!" عذرا بیگم نے کہا۔

"اتنی جلدی؟..... اتنی ترقی؟ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ آپ اس سے پوچھیں۔"

"آپ خود پوچھ لیں۔"

"مجھے ڈر لگنے لگا ہے اب اس سے؟"

عذرا بیگم ہنس پڑیں۔ "کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ بیٹے سے ڈر لگنے لگا آپ کو؟"

"ہاں۔" سیف ہمدانی کمرے میں ٹہلنے لگے۔ وہ بہت زیادہ فکرمند نظر آرہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "میں محسوس کر رہا ہوں کہ گزشتہ چند ماہ میں بابر کے مزاج میں کچھ سرکشی آگئی ہے۔ آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ مجھے غصہ بہت کم آتا ہے اور جب آتا ہے تو پھر جیسے قیامت آجاتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بابر کوئی ایسا جواب دے بیٹھے کہ مجھے غصہ آجائے۔"

ان باتوں سے عذرا بیگم سنجیدہ ہوگئیں۔ "اچھا! میں بات کروں گی اس سے۔"

"آنے کا کوئی وقت بھی تو نہیں رہا ہے اب اس کا!" سیف ہمدانی نے ٹھنڈی سانس لی اور بستر پر لیٹ گئے۔ "کبھی دن میں ہی آجاتا ہے اور کبھی رات کو دو دو بجا دیتا ہے۔"

مگر اس وقت دن تھا۔ سیف ہمدانی اسٹور سے آکر کھانے کے بعد عذرا بیگم سے باتیں کر رہے تھے۔

عنبر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ کھانے کے بعد وہ ایک گھنٹا آرام کر کے دو گھنٹے تک پڑھتی تھی۔ سیف ہمدانی دو تین گھنٹے کے لیے سو جاتے تھے مگر اس دن ان کی آنکھوں سے نیند بہت دور تھی۔ اس دن کوئی انجانا سا احساس انہیں خاصا پریشان کیے ہوئے تھا۔ وہ محسوس کر رہے تھے جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہے۔

عذرا بیگم کمرے سے چلی گئی تھیں۔ وہ اس وقت گھر کے کام کاج میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ بابر کی پندرہ ہزار کی اضافی آمدنی کے باعث کوئی ملازمہ بڑی آسانی سے رکھی جاسکتی تھی لیکن عذرا بیگم اسے فضول خرچی سمجھتی تھیں۔ وہ کہا کرتیں۔ "میری صحت پر رشک کرتی ہیں پڑوس کی عورتیں۔ میں آسانی سے گھر کے سب کام دیکھ سکتی ہوں۔ ملازمہ کیوں رکھی جائے۔"

وہ صرف رات کے کھانے کی تیاری میں عنبر کو اپنے ساتھ رکھتی تھیں تاکہ اسے بھی اچھے سے اچھا کھانا پکانا آجائے۔ دن میں وہ موقع دیکھ کر عنبر کو سینا پرونا بھی سکھاتی تھیں

چٹکلا

ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ باقی نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا ہوا تھا اور لوٹتے وقت تک اہالیان لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جارہا ہے چنانچہ اب وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ جہاں بہ حرف جلی "محمد علی دندان ساز" لکھا ہے وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے "خالص گھی کی مٹھائی" امتیاز علی تاج صاحب کا مکان ہے۔ "کرشنا بیوٹی کریم" شالامار باغ کو اور "کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔" (پطرس کے مضامین)

کیا واقعی دنیا گول ہے

اس لڑکے کا قصہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ آدھ سیر تیل لینے کے لیے کٹورا لے کر گیا تھا۔ کٹورا تھا چھوٹا، بھر گیا تو دکاندار نے کہا کہ "باقی کس چیز میں ڈالوں۔" برخوردار نے کٹورا اوندھا کر کے کہا۔ "ادھر پیندے کے حلقے میں ڈال دو۔" پیندا اوپر کر کے گھر گیا تو ماں نے کہا۔ "میں نے آدھا سیر تیل لانے کو کہا تھا۔ بس اتنا سا؟ بس یہی؟"

اس دانش مند نے اسے بھی الٹا کر کہا "ادھر بھی تو ہے۔"

انتخاب: دنیا گول ہے..... مرسلہ فرحان الفت، پلادپور

''آخر ایک دن پرائے گھر جانا ہے اسے!'' وہ سیف ہمدانی سے کہا کرتی تھیں۔ ''تعلیم کے ساتھ لڑکی کو گھرداری میں بھی طاق ہونا چاہیے۔''

سیف ہمدانی کو ان سے اتفاق تھا۔

اس دن عذرا بیگم گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر کمرے میں لوٹیں۔ انہوں نے سیف ہمدانی کو جاگتا دیکھا تو ان کی فکرمندی سمجھ گئیں۔ اسی لیے وہ ان کا ذہن بٹانے کے لیے بولیں۔ ''میں چاہتی ہوں، عنبر قریشیا کا کام بھی سیکھے لیکن اس سے وہ بھاگتی ہے۔''

''کیا کیا سیکھے! کیا کیا کرے؟'' سیف ہمدانی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہر وقت ہی مصروف رکھتی ہیں آپ اسے! کالج بھی جاتی ہے وہ۔ گھر میں بھی پڑھتی ہے۔ کپڑے سینا اور کھانا پکانا بھی آپ اسے سکھا رہی ہیں۔''

اس موضوع پر ان کی مزید بات اس لیے نہیں ہو سکی کہ کئی سائرنوں کی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا تھا۔

سیف ہمدانی جلدی سے اٹھے۔ ''شاید کیف آیا ہے۔''

ڈی آئی جی کیف ہمدانی مہینے میں ایک آدھ بار اپنے بڑے بھائی اور بھاوج سے ملنے ضرور آتا تھا۔ ڈی آئی جی بننے کے بعد اس کی حفاظتی فورس بھی خاصی ہوتی تھی۔ ان دنوں شہر کے حالات بھی ٹھیک نہیں تھے۔ کیف ہمدانی کی کار کے ساتھ چار پولیس موبائلز ضرور ہوتی تھیں جن کے سائرنوں سے سیف ہمدانی اور ان کے گھر کے افراد کو کیف ہمدانی کی آمد کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

وہ دونوں کمرے سے نکلے ہی تھے کہ سامنے عنبر بھی اپنے کمرے سے باہر آتی نظر آ گئی۔

''چچا جان ہوں گے۔'' وہ بہت خوش نظر آنے لگی تھی۔ ''میں کھولتی ہوں دروازہ۔'' وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

اس وقت آنے والی گاڑیوں کے انجن بند کیے جا چکے تھے۔ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ سیف ہمدانی کے گھر کے سامنے ہی رکی تھیں۔

''آج اس وقت کیسے آ گیا وہ!'' سیف ہمدانی کے لہجے میں الجھن تھی۔ ''مہینے کے پہلے ہفتے کے دنوں میں آتا ہے۔''

ان دنوں مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔

''دل چاہا ہوگا ملنے کو!'' عذرا بیگم بولیں۔ ''بھائی ہے آپ کا! کسی دن بھی آ سکتا ہے۔''

لیکن سیف ہمدانی کے چہرے سے الجھن کم نہیں ہوئی۔

کیف ہمدانی اپنی مکمل وردی میں سامنے آ گیا۔ عنبر اس کے سینے سے لگی ہوئی آ رہی تھی۔ چچا بھتیجی دونوں ہی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس کے برعکس بابر اپنے چچا سے ایسی قربت نہیں رکھتا تھا۔

ڈی آئی جی کیف ہمدانی نے بڑے بھائی اور بھاوج کو سلام کیا اور ان دونوں نے اسے دعائیں دیں۔ عنبر اب کیف ہمدانی کے سینے سے الگ ہو گئی تھی مگر اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔

کیف ہمدانی کو ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا گیا جہاں کی آرائش اور ساز و سامان میں سادگی تھی۔ سیف ہمدانی ایک بیٹی کے باپ بننے کی وجہ سے نہایت کفایت شعار تھے۔

''آج کیسے آ گئے کیف!'' سیف ہمدانی بولے۔

''بس یوں ہی..... دل چاہا ملنے کو!'' کیف ہمدانی نے جواب دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

اب عنبر جلدی سے اٹھ کر چلی گئی۔ عذرا بیگم کو یقین تھا کہ اس نے چچا کی خاطر مدارات کے لیے کچن کا رخ کیا ہوگا۔

''بابر دکھائی نہیں دے رہا ہے۔'' کیف ہمدانی نے اپنی بات میں اضافہ کیا۔ انداز سرسری سا تھا۔

''ہاں۔'' سیف ہمدانی نے طویل سانس لی۔ ''اب کوئی وقت مقرر نہیں رہا ہے اس کے آنے کا!''

''شاید اسے کوئی اچھی ملازمت مل گئی ہے۔'' کیف ہمدانی نے کہا۔ ''دو تین مرتبہ گھر آیا تھا۔ خاصے ٹھاٹ باٹ ہو گئے ہیں اس کے! چلیں اچھا ہے۔ بہت دن بیکار بھی تو رہا۔ بھائی صاحب آپ بھی میری بات مان لیتے تو کوئی حرج نہیں تھا۔ آخر چھوٹا بھائی ہوں آپ کا، غیر تو نہیں ہوں۔ اگر میں آپ کی کوئی خدمت کروں گا تو یہ میرا فرض ہوگا۔''

سیف ہمدانی اس کا مطلب سمجھ گئے۔ کیف ہمدانی پہلے بھی کہتا رہا تھا کہ سیف ہمدانی کسی فیشن ایبل علاقے میں کوئی بڑا میڈیکل اسٹور کھول لیں اور سرمائے کی فکر نہ کریں۔ کیف ہمدانی سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا لیکن سیف ہمدانی کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ چھوٹے بھائی کے مرہون منت ہوں۔

''کوئی اور بات کرو کیف!'' سیف ہمدانی اس وقت بھی اسے ٹال گئے۔ ''رخسار کیسی ہے؟ دلہن کا کیا حال ہے؟''

رخسار، کیف ہمدانی کی بیٹی کا نام تھا جو اس وقت بی اے کے آخری سال میں تھی۔

سیف ہمدانی، کیف ہمدانی کی بیوی کو دلہن کہا کرتے تھے۔ انہوں نے مشرقی اقدار کو کبھی خود سے دور نہیں کیا تھا۔

ان رسمی باتوں میں کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ عنبر ایک ٹرے لے آئی جس میں چائے اور کچھ لوازمات تھے۔

''ابھی تو آپ کی صحت اچھی ہے بھائی صاحب!'' کیف ہمدانی نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ہمیشہ تو ایسا نہیں رہے گا۔ اس وقت میڈیکل اسٹور کو اتنا زیادہ وقت دینا آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا۔''

''عنبر کی شادی کر دوں۔'' سیف ہمدانی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اس کے بعد مجھے یہ فکر رہے گی بھی نہیں کہ میری صحت ٹھیک رہتی ہے یا نہیں! ہم میاں بیوی کی گزر اوقات ہر حال میں ہو جائے گی۔ رہ گیا بابر، تو اسے میں پڑھا لکھا چکا ہوں۔ وہ اب اپنا برا بھلا خود سوچ سکتا ہے۔ اب وہ جانے اور اس کا مستقبل!''

''بچے کتنے بھی بڑے ہو جائیں، ان کے مستقبل کی فکر ان کے بڑوں کو ہمیشہ رہنا چاہیے بھائی صاحب!''

سیف ہمدانی نے غور سے چھوٹے بھائی کو دیکھا اور نہایت سنجیدگی سے بولے۔ ''تم اتنی دیر سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے ہو لیکن کئی مرتبہ مجھے محسوس ہو چکا ہے کہ تم ذہنی طور پر کہیں گم ہو۔ مجھے گمان ہو رہا ہے کہ اس وقت تم دراصل بابر ہی سے ملنے آئے تھے۔ اگر تم آنے سے پہلے فون کر لیتے تو میں بتا دیتا کہ وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' کیف ہمدانی کھڑا ہو گیا۔ ''کل صبح اسے میرے دفتر بھیج دیجیے گا۔''

''بیٹھو نا کیف!'' عذرا بیگم بولیں۔

''نہیں بھابی! اب میں چلوں گا۔''

''کیف!'' سیف ہمدانی سنجیدگی سے کہتے ہوئے کھڑے ہوئے۔ ''تم اسے دفتر میں کیوں بلانا چاہتے ہو؟''

''یوں ہی بھائی صاحب! ملنے کے لیے۔ بہت دن سے دیکھا نہیں اسے۔''

''کسی سے ملاقات کرنا ہو تو اسے گھر پر بلایا جاتا ہے۔'' سیف ہمدانی نے کہا۔ ''دفتر میں بلایا جائے تو مقصد کچھ اور ہوتا ہے۔''

''ارے نہیں بھائی صاحب!'' کیف ہمدانی نے کہا۔ ''آپ کو اندازہ ہوگا ہی کہ شہر کے حالات آج کل کیا ہیں! مجھے بہت مصروفیت رہتی ہے۔ کچھ طے نہیں ہوتا کہ میں کب گھر پر ہوں گا اور کب نہیں! کبھی کبھی تو رات بھر گھر جانا نصیب نہیں ہوتا۔''

''چچا جان!'' عنبر بول پڑی۔ ''آپ وردی میں بہت اچھے لگتے ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ ایسی وردی پہنا کروں۔''

''پہلے تعلیم مکمل کر لو۔'' کیف ہمدانی نے ہنس کر عنبر کا گال تھپتھپایا۔ ''پھر اگر تم بھائی صاحب سے اجازت لے لو گی تو لیڈی پولیس میں کروا دوں گا۔ اچھا بھائی صاحب! خدا حافظ۔''

عذرا بیگم نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

کیف ہمدانی کے جاتے ہی سیف ہمدانی نے عنبر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم تہذیب سے دور کیوں ہوتی جا رہی ہو۔''

''کیا.....! کیا ہوا ابا جان؟'' عنبر سٹپٹا گئی۔

''جب میں کیف سے بات کر رہا تھا تو تم بیچ میں کیوں بول پڑیں؟ کیا تم بھول گئیں کہ جب بڑے بات کر رہے ہوں تو بیچ میں نہیں بولنا چاہیے۔''

''جی!'' عنبر نے نظریں جھکا لیں۔ ''میں معافی چاہتی ہوں ابا جان! بھول ہو گئی مجھ سے۔''

سیف ہمدانی ایک دم اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔

عذرا بیگم ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے بولیں۔ ''ذرا سی بات تھی اور آپ بگڑ گئے عنبر پر!''

''ذرا سی بات نہیں تھی، بدتمیزی تھی۔'' سیف ہمدانی نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بول پڑنے کی وجہ سے میری بات بھی پوری نہیں ہو سکی۔ میں کیف سے معلوم کر کے رہتا کہ اس نے بابر کو اپنے دفتر کیوں بلایا ہے۔''

''اس نے بتا تو دیا تھا۔''

''غلط بتایا تھا۔'' سیف ہمدانی نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''بات کچھ اور ہی ہے۔ آپ کے صاحب زادے ضرور کوئی نامعقول حرکت کر بیٹھے ہیں۔ کیف نہیں چاہتا ہوگا کہ مجھے مکدر کرے اس لیے مجھے ٹال گیا۔''

سیف ہمدانی کا جواب ایسا تھا کہ عذرا بیگم کے چہرے پر بھی سنجیدگی آ گئی۔

→→→

دوسری صبح دس بجے کے قریب ڈی آئی جی کیف ہمدانی اپنے دفتر میں میز پر کھلی ہوئی ایک فائل پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس کے سامنے کی کرسی پر بابر بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد کیف ہمدانی نے فائل بند کر کے بابر کی طرف دیکھا۔ بابر نے نظریں جھکا لیں۔

کیف ہمدانی چند لمحے بڑی سنجیدگی سے بابر کی طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''کیا اب میں تمہیں اینگری ینگ مین کہہ کر مخاطب کیا کروں؟''

بابر نے پل بھر کے لیے سر اٹھا کر کیف ہمدانی کی طرف دیکھا اور دوبارہ نظریں جھکا لیں۔

©2012

کیف ہمدانی بولا۔ ''کل رات تم نے ایم پی اے ناصر جمال کی پٹائی کی تھی جس کے نتیجے میں تم اس وقت حوالات میں بھی ہوسکتے تھے۔''

بابر نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔

کیف ہمدانی نے ذرا سا رک کر اپنی بات جاری رکھی۔ ''مجھے اس کا علم بروقت ہوگیا تھا۔ میں فوراً اپنے ایک ایس ایس پی کو حرکت میں لایا۔ ناصر جمال سے اس کے ذاتی تعلقات ہیں۔ وہ ناصر جمال کو تمہارے خلاف ایف آئی آر کٹوانے سے بہ مشکل روک سکا۔''

بابر کی نظریں بہ دستور جھکی رہیں۔

کیف ہمدانی کی بات جاری رہی۔ ''ناصر جمال کا تعلق اپوزیشن کی ایک مضبوط پارٹی سے ہے اس لیے اس نے اخبارات میں یہ خبر آنے سے رکوادی۔ ٹی وی نیوز چینلز پر بھی دباؤ ڈالا گیا تھا۔ اس سلسلے میں خود مجھے بھی کوششیں کرنا پڑی تھیں ورنہ خبر میں یہ بھی آسکتا تھا کہ غنڈا گردی کرنے والا نوجوان ڈی آئی جی کیف ہمدانی کا بھتیجا ہے۔''

بابر کے لیے خاموش رہنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔

کیف ہمدانی اپنی کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنی کرسی کے قریب رکا لیکن کرسی پر بیٹھنے کے بجائے اس کے پیچھے کھڑا ہوکر بابر کو گھورتے ہوئے بولا۔

''میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے اسے کیوں مارا تھا؟''

بابر نے کچھ رک کر جواب دیا۔ ''کچھ بدتمیزی کی تھی اس نے۔''

''کیا بدتمیزی کی تھی؟''

''مجھے۔'' بابر نے اس مرتبہ بھی ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس نے..... اس نے..... شوکت باجوہ کا چمچہ کہا تھا۔''

''شوکت باجوہ۔'' ڈی آئی جی کیف نے کہا۔ ''سابق ایم این اے؟''

''جی۔''

''گزشتہ دنوں میں نے تمہارے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر اپنے طور پر تحقیق کروالی تھی۔ مجھے معلوم ہوچکا ہے کہ تم شوکت باجوہ کے ایڈوائزر بن گئے ہو۔ مجھے تبھی سے تشویش تھی کہ نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا اور ایسا آخر ہوکر رہا۔ یہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ ناصر جمال کے ساتھ اس کے باڈی گارڈز نہیں تھے ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ تمہیں ناصر جمال پر جھپٹتے دیکھ کر وہ تم پر گولی چلا دیتے۔ میری معلومات کے مطابق وہ ہوٹل میں مقیم کسی شخص سے ملنے گیا تھا۔ کیونکہ اس کی تصویر بھی کسی اخبار میں نہیں چھپی اور وہ ٹی وی چینلز پر بھی کبھی نہیں آیا اس لیے اسے اطمینان ہوگا کہ کوئی اسے پہچان نہیں سکے گا۔''

''میں نے بھی اسے نہیں پہچانا تھا۔'' بابر بولا۔ ''لیکن جب اس نے بدتمیزی کی تو میں سمجھ گیا کہ وہ باجوہ صاحب کی کسی مخالف سیاسی پارٹی کا آدمی ہوگا۔''

''اسی لیے تم نے جھپٹ کر اس کے جبڑے پر گھونسا مار دیا۔'' کیف ہمدانی نے تیز لہجے میں کہا۔ ''غالباً تم نے سوچا ہوگا کہ تمہیں حق نمک ضرور ادا کرنا چاہیے۔''

بابر خاموش رہا۔

اب کیف ہمدانی گھوم کر اپنی کرسی کے آگے آیا اور بیٹھ کر بابر کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''میں نے رات کے واقعے کی مکمل تحقیقات کروائی ہے..... لیکن کیا تم بتاؤ گے کہ واقعہ کس طرح پیش آیا؟''

بابر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ''اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔ میں اسے بھی نہیں جانتا۔ اس نے آنکھوں سے میری طرف اشارہ کرکے ناصر جمال سے کچھ کہا تھا۔ جواب میں ناصر جمال نے ہنس کر کہا کہ اس کے علم کے مطابق باجوہ نے آج کل چمچے جمع کرنا شروع کردیے ہیں۔ اسی بات پر مجھے غصہ آگیا۔''

''کیوں؟'' کیف ہمدانی نے تیز لہجے میں کہا۔ ''کیا تم باجوہ کے چمچے ہو جو تم کو غصہ آیا؟ باجوہ نے تم کو اپنا ایڈوائزر بنایا ہے۔''

''لیکن اس نے جملہ مجھ پر ہی کسا تھا۔''

''ابھی تم کہہ چکے ہو کہ تم اسے جانتے نہیں تھے؟''

''جی۔'' بابر نے کہا۔ ''کچھ لوگوں نے بہت تیزی سے بیچ بچاؤ کرادیا تھا اور انہی میں سے کسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپوزیشن کی ایک جماعت کا ایم پی اے ناصر جمال ہے۔''

''شوکت باجوہ کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟''

''وہ ایک سابق ایم این اے ہیں؟''

''سابق کیوں؟''

اس سوال پر بابر خاموش رہا۔

''نہیں بتانا چاہتے؟'' کیف ہمدانی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''خیر! میں تو جانتا ہوں۔ وہ اگرچہ حکمران جماعت سے تعلق رکھتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہوا تھا لیکن بعد میں حکومتی پارٹی کے ساتھ ہوگیا تھا۔ وہ دو سال تک ایم این اے رہا اور ایک سال قبل سابق ایم این اے ہوگیا۔ دو سال پہلے اس پر اپوزیشن نے کچھ سنگین الزامات عائد کیے تھے۔ کچھ

معاملات عدالت میں ابھی کسی وجہ سے التوا کا شکار ہیں لیکن ایک مقدمے میں سال بھر قبل ہائی کورٹ نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس فیصلے کے باعث اسمبلی سے اس کی رکنیت ختم ہوگئی۔''

''یہ معاملات اتنی وضاحت کے ساتھ میرے سامنے نہیں آئے۔ باجوہ صاحب نے مجھے اتنا کچھ نہیں بتایا۔''

''خوب!'' کیف ہمدانی کا لہجہ اب بھی طنزیہ تھا۔ ''تم اس کے ایڈوائزر رہو اور اس نے تمہیں وضاحت سے کچھ نہیں بتایا۔''

''انہوں نے مجھے صرف ایک کام سونپا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''میں ان کی کیرکٹر بلڈنگ کروں۔''

''واہ! اور تم اس کی کیرکٹر بلڈنگ اس طرح کر رہے ہو کہ ایک ایم پی اے کے منہ پر گھونسا مار بیٹھے۔''

''وہ میرا ایک جذباتی قدم تھا۔''

''اس کی کیرکٹر بلڈنگ تم کس طرح کرسکو گے؟''

''میں ایک اخبار میں اس کے لیے کالم لکھ رہا ہوں۔''

اس جواب نے کیف ہمدانی کو چونکا دیا۔ ''میں نے تمہارا نام کسی اخبار میں نہیں دیکھا۔'' اس نے کہا، پھر تیزی سے بولا۔ ''مگر ہاں.....! ایک اخبار میں جاوید اشرفی کے نام سے ایک کالم چھپ رہا ہے جس میں شوکت باجوہ کے بارے میں، بلکہ اس کے کردار کے بارے میں کچھ مثبت باتیں ہوتی ہیں۔''

''وہ کالم فرضی نام سے میں ہی لکھ رہا ہوں لیکن یہ بات آپ سے پہلے میں نے کسی پر افشا نہیں ہونے دی۔ اخبار والے بھی نہیں جانتے کہ جاوید اشرفی کون ہے۔ میں مضمون ٹائپ کرکے میل کردیتا ہوں۔''

''وہ تمہیں اس کا معاوضہ کیسے دیتا ہے؟ میرا مطلب ہے، وہ اخبار.....''

''میں معاوضہ نہیں لیتا۔ اگر لیتا تو مجھے کم از کم اپنا اکاؤنٹ نمبر تو دینا ہوتا اور اس طرح اخبار والوں پر میرا نام ظاہر ہوجاتا۔''

''مفت میں کالم لکھنے کے لیے بھی اتنے بڑے اخبار کے دروازے ہر ایک کے لیے نہیں کھلتے۔''

''مجھے علم نہیں کہ اس کا بندوبست باجوہ صاحب نے کس طرح کیا ہوگا۔ بس انہوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں کسی فرضی نام سے اس اخبار کو کالم بھیجنا شروع کردوں۔ میں نے اپنی میل کی آئی ڈی اسی فرضی نام سے بنالی ہے۔ اسی سے اخبار کو مضمون بھیجتا ہوں۔''

''اور باجوہ تمہارے اس کام سے بہت خوش ہے۔''

کیف ہمدانی نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اسی لیے تمہیں اس نے نئی کار بھی دلوادی ہے۔''

بابر نے جلدی سے نظریں اٹھا کر کیف ہمدانی کی طرف دیکھا۔

''میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی کہ تم چونکو۔'' کیف ہمدانی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تم اسی کار پر یہاں آئے ہو، بات یہ ہے کہ میں اس کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں لیکن مت بھولو کہ میں اس محکمے کا ڈپٹی انسپکٹر جنرل ہوں۔ مجھے یہیں بیٹھے بیٹھے بہت سی اطلاعات مل جاتی ہیں۔ یہ کار کل شام سے تمہارے پاس ہے۔''

بابر خاموش رہا۔

ڈی آئی جی کیف ہمدانی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم یہ بھی نہیں جانتے ہوگے کہ اسمبلی سے اس کی رکنیت کیوں ختم ہوئی اور اس پر کیا کیا الزامات ہیں؟''

''الزامات تو الزامات ہی ہوتے ہیں۔ مجرم کوئی اس وقت بنتا ہے جب اس پر الزامات ثابت ہوجائیں۔''

''ایک الزام ثابت ہوچکا ہے جس کے باعث اسمبلی سے اس کی رکنیت ختم ہوئی۔''

''وہ ایک اخلاقی معاملہ تھا۔''

''بداخلاقی کا معاملہ تھا۔'' کیف ہمدانی نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اس کے علاوہ کروڑوں روپے کے دو اسکینڈلز کا الزام بھی ہے اس پر..... اس کی دو شوگر ملز بھی ہیں۔''

''وہ اس کے بھائی کی ہیں۔''

''بھائی کی نہیں، بھائی کے نام پر ہیں۔'' کیف ہمدانی نے تلخی سے کہا۔ ''جب وہ ایم این اے نہیں بنا تھا تو نہ اس کے اور نہ اس کے بھائی کے مالی حالات اتنے اچھے تھے کہ وہ شوگر ملز قائم کرسکیں۔''

''معاملات ابھی عدالت میں زیرِ سماعت ہیں۔ وقت آنے پر ثابت ہوجائے گا کہ باجوہ صاحب پر لگائے جانے والے الزامات غلط ہیں۔''

کیف ہمدانی نے فوراً کچھ نہیں کہا۔ بیس پچیس سیکنڈ تک بابر کو گھورتا رہا، پھر بولا۔ ''خیر! میں اب اس معاملے میں تم سے زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتا لیکن تم بھائی صاحب کے اکلوتے بیٹے اور میرے بھتیجے ہو، اس لیے میں تمہیں خبردار ضرور کرنا چاہوں گا۔''

اب بابر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

کیف ہمدانی بولا۔ ''باجوہ کے مقدمات عدالت میں ہیں لیکن اس کے بارے میں مزید تفتیش بھی جاری ہے۔

مجھے ڈر ہے کہ تم کسی خفیہ ایجنسی کی نظر میں آجاؤ گے یا شاید آچکے ہو۔ ان لوگوں سے یہ بات بھی چھپی نہیں رہ سکے گی کہ تم ایک اخبار میں فرضی نام سے شوکت باجوہ کے بارے میں لکھتے رہتے ہو۔''

''فرضی نام سے کسی اخبار میں لکھنا کوئی جرم تو نہیں؟''

''ہاں یہ تو جرم نہیں لیکن خفیہ ایجنسی یہ ضرور سوچ سکتی ہے کہ تمہیں فرضی نام سے لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ خفیہ ایجنسی کے لیے یہ بات بھی چونکا دینے والی ثابت ہوسکتی ہے کہ تمہارے مالی حالات بہت تیزی سے بہتر ہو رہے ہیں۔ ایک ایڈوائزر کو باجوہ کا اتنا زیادہ نوازنا بھی ایجنسی کی نظر میں معنی خیز ہوسکتا ہے۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ باجوہ پر ایک غیر قانونی کام جاری رکھنے کا شبہ بھی کیا جارہا ہے۔ اگر اس معاملے میں کسی بھی وجہ سے تم پر کوئی شبہ ہوگیا تو تم مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ اس صورت میں یہ نہ سوچنا کہ اس شہر کا ڈی آئی جی تمہارا چچا ہے۔ میں اس قسم کے معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔''

''اگر میں آپ کی بات مان لوں کہ باجوہ صاحب کوئی غیر قانونی کام بھی جاری رکھے ہوئے ہیں تو بہرحال اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔''

''اور باجوہ اپنے ایڈوائزر کو بارہ لاکھ کی کار بھی دلوا چکا ہے۔''

''آج کل سیاست داں صحافیوں کو اس سے کہیں زیادہ دے رہے ہیں۔ شاید ہی کوئی صحافی ہوگا جس کا دامن اس معاملے میں صاف ہو۔''

''تم بھی اپنا شمار انہی ضمیر فروشوں میں کروانا چاہتے ہو؟''

''میں نے اپنا ضمیر نہیں بیچا۔ مجھے اپنی صلاحیتوں کا معاوضہ مل رہا ہے۔ میرا کالم بہت مقبول ہو چکا ہے۔ عوامی سطح پر کافی لوگ میری ہی تحریروں کی وجہ سے یہ سوچنے لگے ہیں کہ شوکت باجوہ کسی سازش کا شکار ہوئے ہیں۔''

''مجھے ڈر ہے کہ اگر تم کسی سازش کا شکار ہوگئے تو بھائی صاحب کے وہ سارے خواب بکھر جائیں گے جو انہوں نے تمہارے لیے دیکھے تھے۔''

''میری کامیابیوں سے ان کے خواب بکھر جائیں گے؟''

''کامیابیوں کی نوعیت بھی دیکھی جاتی ہے۔ خیر! میں اب ان باتوں کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ میں نے تمہیں اپنے دفتر اس لیے بلایا تھا کہ بھائی صاحب کو ان سب باتوں کا علم ہوجاتا تو ابھی سے ان کی جان آدھی ہوجاتی۔ میں نے تمہیں سب اونچ نیچ سمجھا دی ہے۔ تمہارے حق میں بہتر ہوگا کہ باجوہ سے اپنی جان چھڑا لو۔''

بابر خاموش رہا۔

''بس۔'' کیف ہمدانی نے کہا۔ ''اب تم جاسکتے ہو۔ میری باتوں پر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا۔''

بابر کھڑا ہوا اور سلام کرکے دروازے کی طرف مڑ گیا۔ کیف ہمدانی تشویش زدہ نظروں سے اپنے بھتیجے کو جاتے دیکھتا رہا۔

✈✈✈

بابر کی زندگی میں وہ انقلاب کچھ پُراسرار انداز میں آیا تھا۔ ایک روز اسے اپنے موبائل پر ایک اجنبی نمبر سے میسیج ملا۔

''تم بہت اچھے مضمون نگار ہو!''

بابر پیغام پڑھ کر بہت تلخی سے مسکرا دیا تھا۔ اسے خیال آیا تھا کہ پیغام بھیجنے والی ہستی اس کے اسکول یا کالج کے زمانے کا کوئی دوست ہوسکتا تھا اور وہ دوست یا شناسا کوئی لڑکی بھی ہوسکتی تھی۔ مضمون نگاری کا شوق بابر کو نوعمری ہی سے تھا۔ ساتویں جماعت کے زمانے ہی میں اس نے مضمون لکھنا شروع کردیے تھے۔ وہ اسکول کے سالانہ جریدوں میں چھپے بھی اور انہیں سراہا بھی گیا تھا۔ کالج کے زمانے میں اس نے سیاست پر مضمون نگاری شروع کی تھی اور چاہا تھا کہ وہ بڑے اخباروں میں شائع ہوں لیکن بڑے اخبارات نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ چھوٹے موٹے اخبارات نے اس کے مضامین شائع تو کیے تھے لیکن اس طرح جیسے خالی جگہ رہ جانے کی صورت میں انہیں کام میں لایا گیا ہو۔ وہ مضامین بروقت شائع نہ ہونے کے باعث بے مزہ ہوگئے تھے۔ اس سے بابر نے دل شکستہ ہوکر مضمون نگاری چھوڑ دی تھی۔ پھر تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب وہ کسی اچھی ملازمت کی تلاش میں تھا تو اسے کالم نگاری کا خیال لوگوں کی یہ باتیں سن کر آیا تھا کہ بیشتر کالم نگاروں کو کسی سیاسی جماعت یا کسی سیاست داں کی پشت پناہی حاصل ہوجاتی تھی اور اس پشت پناہی کے باعث کالم نگاروں کو غیر معمولی آسودگی حاصل ہوجاتی تھی۔

بابر کو کسی بھی سیاست داں یا کسی سیاسی پارٹی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے خیال کے مطابق وہ سبھی مفاد پرست تھے۔ ملک و قوم سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن بابر نے سوچا تھا کہ وہ کسی کا بھی آلۂ کار بن سکتا ہے۔ اسے صرف اپنی زندگی بنانے سے دلچسپی تھی۔ اس نے ایک روز ''کرنٹ افیئرز'' کے حوالے سے ایک مضمون لکھا اور خود جاکر ایک اخبار کے

ڈپٹی ایڈیٹر کو دیا۔ ڈپٹی ایڈیٹر کو اس لیے کہ ایڈیٹر یا چیف ایڈیٹر تک پہنچنے کے لیے کسی سفارش کی ضرورت تھی لیکن اس کا وہ مضمون بھی نہیں چھپا۔

اس کا چچا ڈی آئی جی تھا۔ اس کی سفارش سے بابر کو تعلیم مکمل کرتے ہی کوئی اچھی ملازمت مل سکتی تھی لیکن کیف ہمدانی، بابر کے خیال کے مطابق ''تصورات کی دنیا کا اصول پرست'' تھا۔ سفارش کا سخت مخالف!

''میں خود کسی سفارش کے بغیر صرف اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر اس عہدے تک آیا ہوں۔'' کیف ہمدانی کا کہنا تھا۔

یہ بات درست ہوسکتی تھی لیکن بابر اپنے معاملے میں جن تجربات سے گزر رہا تھا، وہ اس کے لیے تلخ ہی تھے۔ اس کا مشاہدہ تھا کہ اس سے کم تعلیم یافتہ اور کم صلاحیت کے لوگوں کو سفارش سے اچھی اچھی ملازمتیں مل گئی تھیں۔ وہ اخبارات میں بھی پڑھتا رہتا تھا کہ حکومت میں جو بھی پارٹی آتی تھی، اس کے پسندیدہ لوگ کم تعلیم یافتہ اور کم صلاحیت ہونے کے باوجود بڑے بڑے منصبوں پر فائز ہوجاتے تھے۔

اس معاشرتی کجی اور بے انصافی کو بابر محسوس کرتا رہا اور اس کے رگ و پے میں رچنے بسنے والی تلخی بڑھتی ہی رہی۔ کبھی کبھی تو اس کے دماغ میں یہ خیال بھی آجاتا تھا کہ اگر کبھی اسے کسی غلط کام کے سہارے بھی اپنی زندگی بنانے کا موقع ملا تو وہ اسے گنوائے گا نہیں۔

زندگی کے اسی بحران میں اپنے موبائل پر وہ پیغام ملا تو اس نے اسی اجنبی نمبر پر جوابی پیغام بھیجا۔

''میں نے کبھی کوئی اچھا مضمون نہیں لکھا۔ جھک مارتا رہا ہوں۔''

''ناقدری کا شکار ہوئے ہو تم۔'' پیغام آیا۔

''تم ہو کون؟'' بابر نے ایس ایم ایس کے ذریعے پوچھا۔

''تمہارا ایک قدرداں۔''

''کیا تم مجھے اسکول یا کالج کے زمانے سے جانتے ہو؟''

''نہیں۔'' جواب آیا۔ ''میں تمہارے لیے قطعی اجنبی ہوں۔''

''کسی اجنبی کو میرے معاملات سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟''

''اچھا سوال کیا تم نے، لیکن ابھی میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔''

اس مرتبہ بابر نے ایس ایم ایس کرنے کے بجائے وہ نمبر ملایا جس نمبر سے ایس ایم ایس آرہے تھے۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ بابر نے منہ بنا کے رابطہ منقطع کیا اور موبائل ایک طرف ڈال دیا۔ اسے خیال آیا تھا کہ اس کا کوئی جاننے والا اپنا وقت گزارنے کے لیے یہ حرکت کر رہا تھا۔

رات ہوچکی تھی۔ بابر اپنے بستر پر لیٹا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میسیج ٹون پھر سنائی دی۔ بابر نے منہ بنا کے موبائل اٹھایا۔ اس مرتبہ یہ پیغام آیا تھا۔

''مجھ سے بات کرنے کی کوشش فضول ہوگی۔ تم مجھے کسی اجنبی نمبر سے رنگ کرو گے تب بھی میں کال ریسیو نہیں کروں گا۔ ہم فی الحال صرف ایس ایم ایس کے ذریعے گفتگو کرسکتے ہیں۔''

بابر نے پھر منہ بنا کر موبائل ایک طرف ڈال دیا تھا۔ اسے اس قسم کی وقت گزاری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کچھ وقفے سے میسیج ٹون پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ بابر نے موبائل اٹھا کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ دو تین منٹ بعد میسیج ٹون پھر سنائی دی۔

بابر نے جھنجلا کر موبائل اٹھایا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ میسیج دیکھنے کے بعد وہ جواب دیے بغیر موبائل آف کرکے رکھ دے گا لیکن اس مرتبہ کی عبارت ایسی تھی جس نے بابر کو چونکا دیا۔

اسکرین پر حرف چمک رہے تھے۔ ''سوچ لو! تمہیں ایک کالم کے عوض دس ہزار روپے مل سکتے ہیں۔''

اس مرتبہ بابر کی پلکیں تک نہیں جھپکیں۔ اس کی نظر پیغام پر جم کر رہ گئی تھی اور دماغ میں یہ خیال چکرانے لگا تھا کہ کوئی بھی اہم طاقت کسی بھی وقت کسی کو اپنا آلۂ کار بنانے کا فیصلہ کرسکتی ہے۔

خیالات سے باہر آکر بابر نے پچھلا پیغام دیکھا۔

''تمہیں ایک کالم کے عوض دس ہزار روپے مل سکتے ہیں۔ مہینے میں چار کالم! چالیس ہزار روپے۔''

ایک بار پھر میسیج ٹون سنائی دی۔ بابر نے نیا پیغام دیکھا۔

''تم جواب نہیں دے رہے ہو۔ خیر! سوچ لو۔ قسمت کی دیوی دروازے پر بار بار دستک نہیں دیتی۔ تم اسے اگر مذاق سمجھ رہے ہو تو اب میں تمہیں میسیج نہیں بھیجوں گا۔''

بابر نے تیزی سے سوچا۔ شاید یہ مذاق نہ ہو اور بات وہی ہو جو چند لمحے پہلے اس کے دماغ میں چکرائی تھی۔

''میں تمہاری بات پر کیسے یقین کرلوں؟'' بابر نے میسیج بھیجا۔

''میں تمہارے اکاؤنٹ نمبر سے بھی واقف ہوں اور اس بات سے بھی کہ اس وقت تمہارے اکاؤنٹ میں چند سو روپے پڑے ہیں۔ تم کل ڈھائی بجے کے بعد اپنے بینک جا کر اپنا بیلنس معلوم کرنا۔''

''کیوں؟''

''تمہارے اکاؤنٹ میں دس ہزار روپے کا اضافہ ہو چکا ہوگا۔ یہ تمہارے ایک کالم کی ایڈوانس رقم ہوگی۔''

''ٹھیک ہے۔'' بابر نے میسیج کیا۔ ''میں کل بینک جا کر یہ جان لوں گا کہ مجھ سے مذاق کیا گیا ہے۔''

لیکن وہ مذاق نہیں تھا۔ بابر نے دوسرے دن ڈھائی بجے اپنے بینک جا کر دیکھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں دس ہزار کا اضافہ ہو چکا تھا۔

بابر نے کاؤنٹر کلرک سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس کے اکاؤنٹ میں اسی دن دس ہزار روپے کس نے جمع کرائے تھے لیکن اسے معلوم نہیں ہوسکا۔ اگر وہ بینک کا اہم اکاؤنٹ ہولڈر ہوتا، تبھی کاؤنٹر کلرک کو جمع کرانے والے کی شخصیت یاد رہ سکتی تھی۔ بابر کے اکاؤنٹ میں تو کبھی ایک ہزار سے زیادہ نہیں رہے تھے۔ اسے اپنے والد سے جیب خرچ کے لیے کبھی اتنی زیادہ رقم نہیں ملتی تھی۔

تین بجے بابر کے موبائل پر میسیج آیا۔ بابر نے وہ بڑی بے قراری سے دیکھا۔ ''یقین آگیا؟'' پیغام کے ذریعے پوچھا گیا تھا۔

''ہاں۔''

''اب کیا ارادہ ہے؟''

''کیا لکھوانا چاہتے ہو؟''

''گڈ! اس کا مطلب ہے کہ تم تیار ہو..... ٹھیک! تم کل کا اخبار دیکھ کر کسی بھی اہم خبر پر کالم کی صورت میں اپنی سوچ کا اظہار کردو۔''

بابر کو اس جواب پر تعجب ہوا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق تو اس سے کسی خاص انداز میں لکھوانے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔

''خاموش کیوں ہوگئے؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

بابر نے جھوٹا جواب دیا۔ ''میں سوچنے لگا تھا کہ اس کالم کا ہوگا کیا؟ وہ کہیں چھپنے سے تو رہا!''

''چھپے گا۔'' دوسری طرف سے جواب آیا۔

''کہاں؟''

دوسری طرف سے ایک بڑے اخبار کا نام بتا کر لکھا گیا۔ ''اور کالم تم ایک فرضی نام سے لکھ کر اخبار کے دفتر میں ایڈیٹر گردیزی کے گھر فیکس کردو گے۔ اس کا فیکس نمبر لکھ لو۔'' اس نے نمبر بتانے کے بعد پوچھا۔ ''تمہارے پاس کمپیوٹر تو ہے نا؟''

''ہاں، کمپیوٹر تو ہے۔''

''بس تو پھر.....! ہاں ایک کام اور کرنا۔ مضمون پر اپنے نام کے ساتھ معرفت گلاب شاہ ضرور لکھ دینا۔ پھر یہ ناممکن ہے کہ پرسوں کے اخبار میں تمہارا کالم شائع نہ ہو۔''

''اس کے بعد؟''

''تمہارا کالم دیکھ لوں۔ اس کے بعد بات ہوگی۔''

''کیا تم سے ملاقات نہیں ہوسکتی؟'' بابر نے پیغام بھیجا۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

بابر نے کھوئے کھوئے سے انداز میں موبائل اپنی جیب میں ڈال لیا۔ بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکرا رہے تھے۔

اس نے دوسرے دن کے اخبارات کی خبریں دیکھیں اور ایک متنازعہ معاملے پر کالم لکھ کر فیکس کردیا۔

پھر اگلے دن اس نے اخبار دیکھا۔ اس کا مضمون اخبار میں تھا۔

ایک گھنٹے بعد اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ بابر یہ دیکھ کر چونک گیا کہ کال اسی نمبر سے آئی تھی جس سے ایس ایم ایس آتے رہے تھے۔

''ہیلو!'' بابر کی آواز جانے کیوں بھرا گئی۔

''بہت اچھا کالم لکھا ہے تم نے!'' دوسری طرف سے اردو ہی میں کہا گیا مگر لہجہ اہل زبان کا نہیں تھا۔

''شکریہ۔'' بابر نے کہا۔

''اب تم آج شام شوکت باجوہ صاحب سے مل لو۔ یہ نام تمہارے لیے اجنبی تو نہیں ہوگا۔''

''نہیں۔'' بابر نے طویل سانس لی۔ ''نامور سیاست دانوں کے نام سے کوئی بھی پڑھا لکھا شخص ناواقف نہیں ہوسکتا۔''

''بس تو آج شام ان سے مل لو۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

شام کو بابر، شوکت باجوہ سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا۔ کلین شیو شوکت باجوہ خاصی بھاری بھرکم شخصیت کا

مالک تھا۔ سین اس کی چندیا درمیان سے صاف تھی۔ آنکھیں سیاہ اور چمک دار تھیں۔ بابر نے اسے بتایا کہ اسے گلاب خان نے بھیجا ہے۔

اسی وقت ایک مختصر میٹنگ میں طے پا گیا کہ آئندہ بابر کو کس انداز میں لکھنا ہے۔ اس کی تنخواہ بھی طے ہوگئی، پچاس ہزار!

بابر نے اپنے گھر والوں کو اپنی تنخواہ کم بتائی تھی۔ اس کے بعد کالم نگاری کا سلسلہ چل پڑا۔ شوکت باجوہ سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں۔

گلاب شاہ سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی۔ بابر کے خیال کے مطابق وہ کوئی غیر ملکی تھا جس نے اردو بولنا سیکھ لی تھی۔ یہ سمجھ کر بابر کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔ پہلے ہی اس کا خیال تھا کہ اس کے ملک کے بیشتر سیاست دان کسی بڑی طاقت کے اشاروں پر کام کرتے تھے۔

بابر کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ کون کس کے لیے کام کررہا تھا۔ اسے اپنے ملک کی مفاد پرستانہ سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی آسودگی کے لیے یہ کافی تھا کہ اب اس کی تنخواہ ستر ہزار روپے ہوگئی تھی اور وہ ایک کار کا مالک بھی بن گیا تھا۔

اس کے والد سیف ہمدانی ان حالات سے پریشان تھے۔

''یہ سب کچھ تمہارے پاس کہاں سے آرہا ہے بابر؟'' انہوں نے ایک دن پوچھا تھا۔

''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں شوکت باجوہ صاحب کا ایڈوائزر بن گیا ہوں۔'' بابر نے جواب دیا تھا۔

''ایڈوائزر کو اتنا نوازا جاتا ہے؟''

''اس سے کہیں زیادہ۔'' بابر نے جواب دیا۔ ''آج کی سیاست میں پیسا بہت اچھالا جاتا ہے۔''

''جہاں زیادہ پیسا اچھالا جاتا ہے، وہاں اچھے کام نہیں ہوتے..... مجھے ڈر ہے تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔''

''جہاں زیادہ پیسا اچھالا جاتا ہے، وہاں کوئی پھنستا بھی نہیں ہے۔ پھر یہ کہ میں شوکت باجوہ صاحب کو برا آدمی نہیں سمجھتا۔''

''ہمارے سیاست دانوں میں اب شاید ہی کوئی بے داغ ہو۔''

''باجوہ صاحب اچھے آدمی ہیں۔ انہیں پروپیگنڈا کر کے بدنام کیا گیا تھا لیکن اب آہستہ آہستہ عوام کو یقین آتا جارہا ہے کہ باجوہ صاحب کے خلاف سازشیں کی گئی ہیں ورنہ وہ ایسے آدمی نہیں۔''

''عوام کی رائے میں تبدیلی کا سب سے بڑا سبب جاوید اشرفی کے کالم ہیں۔''

اس بات پر بابر باپ سے نظر بچا کر زیر لب مسکرا دیا۔

''وہ غضب کا قلم کار سامنے آیا ہے۔'' سیف ہمدانی کہتے رہے۔ ''نہایت جادو اثر فقرے لکھتا ہے وہ شوکت باجوہ کے حق میں! مجھے یقین ہے کہ اسی کی وجہ سے لوگ شوکت باجوہ کے حق میں ہوتے جارہے ہیں۔''

بابر کو اسی بات سے یقین ہوا تھا کہ اس کے چچا کیف ہمدانی نے اس کا یہ ''راز'' اس کے باپ پر افشا نہیں کیا تھا کہ جاوید اشرفی کے نام سے کالم لکھنے والا وہی تھا۔

✈✈✈

اپنی بہن عنبر کی فرمائش پر ایک خاص قسم کا ایمی ٹیشن جیولری سیٹ خریدنے کے لیے بابر شہر کے ایک بہت ماڈرن شاپنگ سینٹر میں داخل ہوا ہی تھا کہ رخسار سے آمنا سامنا ہوگیا جو ڈی آئی جی کیف ہمدانی کی بیٹی تھی۔ اس کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھا۔ وہ کچھ خریداری کر کے جارہی تھی۔

''ہائے بابر!'' رخسار اسے دیکھتے ہی پُرجوش ہوگئی۔

''ہائے!'' بابر مسکرایا۔

دونوں آمنے سامنے رک گئے تھے۔

''کہاں ہوا تم تین دن سے؟'' رخسار نے شکایت کرنے والے انداز میں پوچھا۔

کیف ہمدانی سے بات کرنے کے بعد بابر اس کے گھر نہیں گیا تھا۔ اس کی ہمت ہی نہیں ہوسکی تھی۔ وہ ہنس کر بولا۔

''ابھی پرسوں ہی تو تم آئی تھیں گھر! ملاقات تو ہوئی تھی۔''

''تم تو نہیں آئے نا.....! وہاں تو میں چچا جان اور چچی جان کے سامنے تم سے کوئی خاص بات نہیں کرسکتی تھی۔''

''کوئی خاص بات؟''

''ہاں۔ آؤ ذرا کینٹین میں بیٹھتے ہیں۔ تمہیں جلدی تو نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

وہ دونوں شاپنگ سینٹر کی اوپری منزل پر بنی ہوئی خوب صورت کینٹین میں جا پہنچے۔ میز پر بیٹھتے ہی رخسار نے کافی کا آرڈر دے دیا۔ وہ جانتی تھی کہ بابر شام کے بعد کافی پینا پسند کرتا تھا۔

''اب بولو! اگر کوئی خاص بات تم ابا جان کے سامنے نہیں کرنا چاہتی تھیں تو مجھ سے موبائل فون پر بات کرسکتی تھیں۔ نمبر تو ہے نا تمہارے پاس!''

موباس پر کسی بات چیت کرنے سے مجھے بہت الجھن ہوتی ہے۔'' رخسار نے جواب دیا۔

''اچھا تو اب بتاؤ!''

''تم کسی بہت اچھی جگہ ملازم ہو گئے ہو؟''

''ہاں۔''

''ڈیڈی نے سرسری طور پر بتایا تھا مجھے! ویسے تمہارے حالات بھی سامنے ہی ہیں۔ کار بھی آ گئی ہے تمہارے پاس!''

''ہوں۔'' بابر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''خیر!'' رخسار نے اپنی گھڑی پر نظر ڈال کر کہا۔ ''مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے اس لیے میں تمہاری ملازمت کی نوعیت کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گی۔ صرف یہ بتاؤ کہ.....'' وہ ذرا سا رکی، پھر نظریں جھکا کر بولی۔ ''جب تم زیرِ تعلیم تھے، اس وقت تم مجھ سے کس طرح ملتے تھے؟''

اب بابر نے نظریں جھکا لیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ رخسار سے محبت کرتا تھا، اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات رخسار نے نہ صرف سمجھ لی تھی بلکہ وہ بھی بابر کو چاہنے لگی تھی۔ اگرچہ اظہار محبت کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی لیکن اشاروں کنایوں میں ان دونوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ سن لیا تھا۔

بابر کو توقع تھی کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسے کوئی بہت اچھی جاب مل جائے گی لیکن جب ایسا نہ ہوا اور بابر کو ٹھوکریں کھانا پڑیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ رخسار کا خیال اپنے ذہن سے نکال دے۔

رخسار اس کی چچازاد بہن سہی لیکن ایک مال دار باپ کی بیٹی تھی جس نے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی۔ بابر اسے وہ عیش و عشرت کی زندگی تو کیا، آسودہ حالی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد ہی اس نے رخسار سے کٹنا شروع کر دیا تھا۔

اب کچھ عرصے سے بابر کے حالات ٹھیک ہو گئے تھے اور اسے مزید بہتر مستقبل کی توقع بھی ہو گئی تھی لیکن اب اس نے سوچا تھا کہ اس کی دو سال کی بے رخی محسوس کرنے کے بعد رخسار نے بھی اسے اپنے دل سے نکال دیا ہو گا۔ اسی لیے اس نے دوبارہ رخسار کی طرف جھکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

بابر کی وہ خاموشی اس لیے کچھ زیادہ طویل ہو گئی کہ اس کے دماغ میں ماضی کی وہ باتیں چکرانے لگی تھیں جو وہ اور رخسار ایک دوسرے سے کیا کرتے تھے۔ ویٹر کافی میز پر رکھ رہا تھا تو بابر ان خیالات سے چونکا۔ رخسار نے بھی اتنی دیر تک خاموشی سادھے رکھی تھی۔ جب ویٹر چلا گیا تو رخسار بڑی سنجیدگی سے پیالیوں میں کافی بنانے لگی۔

کافی کی پیالی بابر کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ ''کافی پی کر ہم یہاں سے فوراً اٹھ جائیں گے۔ اگر تم میری بات کا جواب نہیں دینا چاہتے تو میں اصرار نہیں کروں گی۔ شاید مجھے اصرار کرنے کا حق بھی نہیں ہے۔''

''یہ بات نہیں رخسار!'' بابر نے پہلو بدلتے ہوئے جذباتی انداز میں بڑی تیزی سے کہا۔ ''تمہیں ہر بات کا حق ہے۔''

''تو پھر جواب دینے کے بجائے تم چپ کیوں ہو گئے؟''

''میں ماضی میں کھو گیا تھا۔''

''اس ماضی پر پچھتا رہے تھے۔'' رخسار پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''تم پھر غلط سمجھ رہی ہو۔''

''تو صحیح کیا ہے، وہ سمجھا دو۔''

''میں..... میں.....'' بابر ذرا سا اٹکا لیکن اس کے بعد جذباتی انداز میں بولتا ہی چلا گیا۔ اس نے اپنے تمام خیالات رخسار پر ظاہر کر دیے۔

اس کی باتیں سنتے ہوئے رخسار کے چہرے کی افسردگی دھیرے دھیرے ختم ہوتی چلی گئی۔ بابر خاموش ہوا تو وہ بہت خوش نظر آنے لگی تھی۔ ''اب کیا کہوں میں تمہاری اس بے ہنگم سوچ پر!'' رخسار یکا یک ہنس پڑی، پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو کر جذباتی لہجے میں بولی۔ ''میں تو قدم بہ قدم تمہارے ساتھ خارزار جنگلوں میں چلنے کے لیے بھی تیار ہوں بابر!''

اس جواب پر بابر اس شدت سے جذباتی ہوا کہ اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔ اس کے ہونٹ کپکپا گئے۔ نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

''بس ٹھیک ہے۔'' رخسار نے اس سے نظریں ملائے بغیر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے چہرے سے ظاہر ہو گیا کہ اب تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ ہم نے پہلے بھی کبھی زبان سے کچھ زیادہ نہیں کہا۔''

حقیقت یہی تھی۔ رخسار نے اس وقت کھل کر جتنا کچھ کہا تھا، ماضی میں وہ دونوں ایک دوسرے پر اتنے نہیں کھلے تھے۔

رخسار کی بات پر بابر مسکرا دیا۔

''چلو کافی ختم کرو۔'' رخسار نے اپنی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے بتایا تھا نا تمہیں! اس وقت میں زیادہ

نہیں رک سکتی۔ گھر پر کچھ مہمان آنے والے ہیں۔ ممی نے مجھے تاکید کی تھی کہ جلدی لوٹوں۔''

''ایک مہینے بعد تمہارے امتحانات ہونے والے ہیں نا؟''

''بہت باخبر ہو!'' رخسار شوخی سے مسکرائی۔

''تمہاری طرف سے بے خبر کبھی نہیں رہا۔''

''تو سمجھ لو۔ اپنے بڑوں کو کچھ بتانے کے لیے ہمارے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔'' یہ کہتے کہتے رخسار کی پلکیں جھک گئی تھیں۔

''ایک مہینا بہت ہے اس کام کے لیے!'' بابر بہت کھل کر مسکرایا۔

رخسار نے اپنے کالج کے کچھ دلچسپ قصے چھیڑ دیے۔ مقصد یہی تھا کہ ماضی کی طرح اب بھی کھل کر زیادہ باتیں نہ کی جائیں۔

کافی پی کر وہ دونوں کینٹین سے نکلے۔ بابر اپنے رگ وپے میں مسرت کی لہریں دوڑتی محسوس کر رہا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ اسے کچھ خریداری کرنا تھی۔ وہ رخسار کے ساتھ شاپنگ سینٹر سے نکل آیا۔

''ارے!'' رخسار ہی چونک کر بولی۔ ''تم تو یہاں کچھ لینے آئے ہو گے نا؟''

''ہاں۔'' بابر ہنس پڑا۔ ''یاد ہی نہیں رہا۔ خیر چھوڑو۔ خرید لوں گا، پہلے تمہیں رخصت کر دوں۔ تمہاری گاڑی کہاں ہے؟''

''ادھر ہے۔'' رخسار نے ایک طرف اشارہ کیا۔

''چلو۔'' بابر نے اسی طرف قدم بڑھائے۔

''میں چلی جاؤں گی بابر! تم جا کے.....''

''ارے چلو بھی!'' بابر نے اس کا بازو پکڑ کر اسے آگے بڑھایا۔ رخسار کا چہرہ یک لخت سرخ ہو گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب بابر نے اس کا جسم چھوا تھا۔ صرف بازو ہی سہی لیکن پہلے کبھی وہ ایک دوسرے سے اتنا قریب بھی نہیں ہوئے تھے۔ فوراً ہی بابر کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ کیا کر بیٹھا تھا۔ اس نے جلدی سے رخسار کا بازو چھوڑ دیا۔ ''سوری رخسار!'' اس کے منہ سے نکلا۔

رخسار کچھ نہیں بولی۔ اسے بابر کی وہ حرکت بری نہیں لگی تھی لیکن پھر کار کے قریب پہنچنے تک وہ خاموش ہی رہی۔ ''رات کو کسی وقت موبائل پر تم سے بات کروں گی۔'' اس نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں انتظار کروں گا رخسار!'' بابر کا لہجہ خمار آلود ہو گیا۔

رخسار نے انجن اسٹارٹ کیا اور اسے اتنی احتیاط سے بیک کرنے لگی کہ دائیں بائیں کھڑی ہوئی کسی گاڑی سے نہ لگے۔

پارکنگ سے باہر نکل کر اس نے گاڑی سیدھی کی اور بابر کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ اس کے بعد وہ کار کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔

بابر مسکراتا ہوا واپس لوٹا۔ جب وہ دوبارہ شاپنگ سینٹر میں داخل ہو رہا تھا تو اس کے عقب میں بھگدڑ سی مچی اور چیختی ہوئی ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

''بچاؤ۔''

بابر نے دیکھا کہ سڑک پر کھڑی ہوئی ایک کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور دو آدمی ایک لڑکی کو کار میں دھکیل رہے تھے۔ ان دونوں میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور وہ اپنا ہاتھ اس طرح اوپر اٹھائے ہوئے تھا کہ ریوالور وہاں موجود ہر شخص کو دکھائی دے جائے۔

ریوالور ہی کی وجہ سے لوگوں میں بھگدڑ مچی تھی۔

''بچاؤ!'' لڑکی ایک بار پھر چیخی حالانکہ اسے کار میں دھکیلنے کے بعد ایک آدمی نے کار میں گھسنے کے بعد دروازہ بند کر لیا تھا۔ ریوالور والے نے جلدی سے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھتے ہی کار بڑی تیزی سے حرکت میں آ گئی۔

بابر سکتے کی سی حالت میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ بزدل تو نہیں تھا لیکن لڑکی کو بچانے کے لیے بے وقوفانہ بہادری بھی نہیں دکھا سکتا تھا۔ اس کا ارادہ بھانپتے ہی ریوالور والا اس پر گولی چلا دیتا۔ سبھی لوگ تیزی سے منتشر ہونے لگے۔ ان دنوں شہر کے حالات کچھ ایسے ہی تھے۔ موبائل، موٹر سائیکلیں اور کاریں چھینی جا رہی تھیں۔ بینکوں میں ڈاکے پڑ رہے تھے۔ اس قسم کی وارداتیں دیکھ کر لوگوں کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ جائے واردات سے دور نکل جائیں تاکہ انہیں پولیس کے بکھیڑوں میں نہ پڑنا پڑے۔

بابر اپنی کار کی طرف بڑھا۔ اس وقت اس کے ذہن میں تھوڑی سی خلش تھی۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ اس شخص کو پہلے کہیں دیکھ چکا ہے جس نے لڑکی کو کار میں دھکیلا تھا اور خود بھی اس کے ساتھ پچھلی ہی نشست پر بیٹھا تھا۔

بابر کو یاد نہیں آ سکا کہ اس نے اس شخص کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔ اس نے اپنی کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا۔

اور بہت سی کاریں بھی اسٹارٹ ہو رہی تھیں۔ جو لوگ شاپنگ سینٹر کے باہر تھے، وہ جلد از جلد وہاں سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔

بابر نے اپنی کار، پارکنگ سے نکالی۔ وہ بھی وہاں سے

دور جانا چاہتا تھا۔ اس وقت یہ بات اس کے سان گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ اس کے سامنے جو واردات ہوئی تھی، وہ خود اس کے لیے بھی ایک بڑی مشکل کھڑی کرنے والی تھی۔

✈✈✈

اخبار پر اس کا نام کے، ایس گردیزی چھپتا تھا، اس کے اخبار نے کچھ ہی عرصہ پہلے تیزی سے ابھرنا شروع کیا تھا۔ وہ اس اخبار کا چیف ایڈیٹر بھی تھا اور مالک بھی! اسی کے اخبار میں بابر کا کالم جاوید اشرفی کے نام سے چھپتا تھا۔

آٹھ بجنے والے تھے جب وہ اخبار کے دفتر جانے کے لیے اپنے بنگلے سے نکلا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے شوفر نے پورچ میں کھڑی ہوئی اس کی کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ گردیزی اس کی طرف دو ہی قدم بڑھا تھا کہ اس کے کوٹ کی جیب میں پڑے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے موبائل جیب سے نکالا اور اسے آن کرتے ہوئے کان سے لگالیا۔ بے دھیانی میں اس نے اسکرین پر نظر ڈال کر یہ نہیں جانا تھا کہ کال کس کی تھی ورنہ ایک اجنبی نمبر دیکھ کر وہ کال ریسیو ہی نہیں کرتا۔ کچھ دن سے اس نے یہی رویہ اختیار کر رکھا تھا۔

''یس!'' وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔

''ڈیڈی!'' دوسری طرف سے اس کی بیٹی افروز کی چیختی ہوئی آواز آئی۔

کار کی طرف بڑھتے ہوئے گردیزی کے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔

''کیا بات ہے افروز؟'' وہ تیزی سے بولا۔

لیکن اب اسے دوسری طرف سے اپنی بیٹی کے بجائے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ''اب تو تمہیں بتانا ہی پڑے گا گردیزی کہ تمہارا کالم نگار جاوید اشرفی کہاں رہتا ہے۔ اگر تم نہیں بتاؤ گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ تمہاری بیٹی اس وقت میرے قبضے میں ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' گردیزی کی آواز کانپ گئی۔

''اچھا تو پھر اپنی بیٹی کی آواز سن لو۔''

گردیزی کا سارا جسم سنسنانے لگا تھا۔ اس نے افروز کی آواز سنی۔ ''انہیں بتا دیجیے نا ڈیڈی!'' وہ روہانسی آواز میں بول رہی تھی۔ ''ان لوگوں نے مجھے اغوا کرلیا ہے۔''

''کہاں ہو تم؟'' گردیزی کو خود ہی اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

''مجھے نہیں معلوم ڈیڈی! میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ اب میں ایک کمرے میں ہوں اور یہ تین آدمی.....''

پھر غالباً افروز کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا گیا تھا۔

گردیزی نے مردانہ آواز سنی۔ ''اب بتاؤ گردیزی!''

گردیزی اب کار کی طرف بڑھنے کے بجائے مڑ کر گھر کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے قدم بہت بوجھل تھے۔

شوفر نے اسے واپس جاتے دیکھ کر تعجب سے سر ہلایا اور کار کا دروازہ بند کر دیا۔

''جواب دو گردیزی!'' اس مرتبہ مردانہ آواز میں سختی تھی۔

''نہ جانے کون ہو تم لوگ اور کیوں جاوید اشرفی کے بارے میں جاننا چاہتے ہو۔'' گردیزی اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا تھا۔

''اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں، اس کا جواب دو۔''

''کیا جواب دوں میں تمہیں۔'' گردیزی اپنے گھر میں داخل ہو گیا تھا۔ ''میں نہیں جانتا کہ جاوید اشرفی کہاں رہتا ہے۔ میں کبھی اس سے ملا ہی نہیں۔''

''ایسا جھوٹ نہ بولو، جس پر کوئی بچہ بھی یقین نہ کر سکے۔ تم اس کے کالم چھاپتے ہو اور اسے جانتے بھی نہیں۔''

''یقین کرو، میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

گردیزی ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر اس طرح بیٹھا جیسے گر پڑا ہو۔

''گردیزی!'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''تمہاری بیٹی کو اغوا کرنے کے بعد ہم نے اب تک اسے کوئی تکلیف نہیں دی ہے لیکن تم اگر اپنی ضد پر اڑے رہے تو پھر.....''

''خدا کے لیے میری بیٹی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرنا۔'' گردیزی کی آواز پہلے سے زیادہ کانپنے لگی۔ ''میں تمہیں قسم کھا کے بتا رہا ہوں کہ میں اس سے کبھی نہیں ملا۔ وہ اپنا مضمون ای میل کے ذریعے بھیجتا ہے۔''

''اور اپنا معاوضہ بھی ای۔میل کے ذریعے لیتا ہے؟'' طنزیہ انداز میں کہا گیا۔

''اس نے کبھی معاوضے کی بات ہی نہیں کی۔ نہ کبھی اس نے مجھے فون کیا۔'' گردیزی نے اب اپنا حلق بھی خشک ہوتا محسوس کیا۔ ''اس کے مضمون بہت عرصے سے آرہے تھے۔ مجھے پسند نہیں آتے تھے۔ پھر جب اس کے مضمون مجھے پسند آنے لگے تو میں نے چھاپنا شروع کر دیا۔''

''ای میل ایڈریس کیا ہے اس کا؟'' طنزیہ انداز میں پوچھا گیا۔

گردیزی کو ای میل ایڈریس زبانی یاد تھا۔ وہ اس نے بتادیا۔ لیکن بتاتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ پارکنز نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ جاوید اشرفی کے بارے میں کسی کو کبھی کچھ نہ بتائے مگر اس وقت اس کے اعصاب ٹوٹ رہے تھے، دماغ جیسے شل ہوا جارہا تھا۔ ایک باپ کے لیے یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ اس کی بیٹی کو اغوا کرلیا گیا تھا۔ اس کیفیت میں وہ غلطی کر بیٹھا۔

''بہت خوب!'' دوسری طرف سے طنزیہ انداز میں کہا گیا۔ ''تم نے ای میل کے ذریعے اسے کبھی کوئی پیغام نہیں بھیجا؟''

''بھیجا تھا۔'' گردیزی نے جھوٹ بولا۔ ''میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ کبھی دفتر آکے مجھ سے ملے۔''

''پھر؟''

''اس نے ای میل ہی کے ذریعے جواب دے دیا کہ اگر اس نے کبھی مجھ سے ملنا ضروری سمجھا تو دفتر آجائے گا۔''

''تم مسلسل جھوٹ بولے جارہے ہو گردیزی!'' دوسری طرف سے گرج کر کہا گیا۔ ''شاید تم اپنی بیٹی کی خیریت نہیں چاہتے۔''

''یہ بات نہیں..... یہ بات نہیں۔'' گردیزی جلدی سے بولا۔ ''تم ہی بتاؤ! آخر میں کس طرح تمہیں یقین دلاؤں کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔''

''اچھا کیا اس کے کالم چھاپنے کے لیے تم سے شوکت باجوہ نے کہا تھا؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''نہیں۔'' گردیزی نے جواب دیا۔

''وہ صرف شوکت باجوہ کے حق میں لکھتا رہا ہے، تمہیں اس پر اعتراض تو ہونا چاہیے تھا۔''

''میں نے اپنے کسی کالم نگار پر کبھی کوئی قدغن نہیں لگائی۔ جو جس کے لیے چاہتا ہے، لکھتا ہے۔ میں اس سے کوئی غرض ہی نہیں رکھتا۔ تم میرے اخبار کی ساری فائل دیکھ ڈالو۔ سب کالم نگار مختلف لوگوں کے حق میں لکھتے ہیں۔''

''تمہاری یہ بات تو سچ ہے گردیزی لیکن اس پر یقین نہیں کیا جاسکتا کہ تم جاوید اشرفی کے ای میل ایڈریس کے علاوہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

''میں کس طرح تمہیں یقین دلاؤں۔ سوچ سوچ کر میرا تو دماغ پھٹا جارہا ہے۔'' گردیزی نے تھوک نگلنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کا حلق بالکل خشک ہوچکا تھا، کانٹے سے پڑنے لگے تھے۔

''میں تمہیں ایک گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں گردیزی!'' دوسری طرف سے سرد لہجے میں کہا گیا۔ ''سوچ لو کہ تمہیں اپنی بیٹی عزیز ہے یا جاوید اشرفی کے بارے میں رازداری.....! ایک گھنٹے بعد تمہیں پھر فون کروں گا۔ اس وقت تک فیصلہ کرلینا۔ اگر پولیس سے رابطہ کرنا چاہو تو یہ شوق بھی پورا کرلینا۔ پولیس کو ہماری یا تمہاری بیٹی کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔''

دوسری طرف سے بولنے والے نے گردیزی کی مزید کوئی بات سنے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔

گرمی نہ ہونے کے باوجود گردیزی کے چہرے پر پسینا چمکنے لگا تھا۔ افروز اس کی اکلوتی بیٹی تھی جو اس کی مرحوم بیوی کی نشانی تھی۔

گردیزی نے پانی لانے کے لیے ایک ملازم کو پکارا۔ جب پانی آگیا تو اس نے ایک گھونٹ لینے کے بعد چند لمبی سانسیں لیں اور پھر باقی گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ گلاس واپس دے کر وہ رومال سے اپنے چہرے کا پسینا خشک کرنے لگا۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے صاحب؟'' ملازم نے تشویش سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں، تم جاؤ۔''

ملازم سوچ میں ڈوبا ہوا سا وہاں سے چلا گیا۔

گردیزی کا دماغ بری طرح چکرایا ہوا تھا۔ وہ فیصلہ کرنے میں دشواری محسوس کررہا تھا کہ پہلے پولیس سے رابطہ کرے یا پارکنز کو حالات سے آگاہ کرے۔ اپنی بعض کمزوریوں کے باعث پولیس سے رابطہ کرنے میں اسے ہچکچاہٹ بھی تھی۔ پولیس والوں کے کسی سوال کے جواب میں اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل سکتی تھی جس سے اس کے لیے ایک اور پریشانی کھڑی ہوجاتی۔ آخر اس نے پارکنز سے ہی رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

''ہاں گردیزی! کیا بات ہے؟'' موبائل فون پر رابطہ ہوجانے کے بعد دوسری طرف سے انگریزی میں کہا گیا۔

''پارکنز!'' گردیزی کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''میری بیٹی کو اغوا کرلیا گیا ہے۔''

''کیا!'' دوسری طرف پارکنز چونکا اور پھر اس نے تیزی سے پوچھا۔ ''یہ کیسے ہوا؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن اغوا کرنے والوں نے ابھی مجھے فون کیا تھا۔ مجھے افروز کی خوف زدہ آواز بھی سنوائی تھی۔

وہ مجھ سے جاوید اشرفی کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔''

''تفصیل سے بتاؤ!'' پارکنز نے مضطرب لہجے میں کہا۔

''یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں کہ ہفتہ بھر سے میرے پاس نامعلوم لوگوں کے فون آنے لگے تھے جو خود کو جاوید اشرفی کا مداح ظاہر کرکے اس کا فون نمبر یا گھر کا پتا جاننا چاہتے تھے۔''

''یہ بتاؤ کہ تمہاری بیٹی کو اغوا کرنے والے نے تم سے کیا کہا!''

گردیزی کو جو کچھ یاد تھا، وہ اس نے بتادیا۔ اپنی اس غلطی سے بھی آگاہ کردیا کہ اس نے اغوا کرنے والے کو جاوید اشرفی کا ای میل ایڈریس بتادیا تھا۔

''یہ تم نے بہت بڑی غلطی کی۔'' پارکنز کے لہجے میں تشویش تھی۔

''اس اعتبار سے تو غلطی ہی ہے کہ تم نے کسی کو کچھ نہ بتانے کی تاکید کی تھی لیکن صرف ای میل ایڈریس بتانے سے تو.....''

دوسری طرف سے بات کاٹ دی گئی۔ ''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ کیا پولیس کو اطلاع دو گے؟''

''میں تم سے یہی مشورہ تو کرنا چاہتا ہوں۔''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی، پھر پارکنز نے کہا۔ ''مجھے شبہ ہے کہ وہ دوبارہ تمہیں فون نہیں کرے گا۔ ہاں اگر فون آئے تو تم کہہ دینا کہ جو کچھ تم اس سے کہہ چکے ہو، وہ حقیقت ہے لیکن تم اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے کسی نہ کسی طرح کل صبح تک جاوید اشرفی کے بارے میں سب کچھ معلوم کرکے اسے بتادو گے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ فون نہیں کرے گا۔''

''کسی وجہ سے مجھے شبہ ہے لیکن تم اس بارے میں سوچ کر اپنا دماغ نہ تھکاؤ۔''

''کیا مجھے پولیس سے رابطہ نہیں کرنا چاہیے؟''

''کل صبح تک نہ کرو۔''

''میری بیٹی۔'' گردیزی کی آواز بھرا گئی۔

''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ ان لوگوں کو صرف جاوید اشرفی سے دلچسپی ہے۔ وہ تمہاری بیٹی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

''کیا تم ان لوگوں کو جانتے ہو؟''

''شاید.....! اچھا اب میں بند کررہا ہوں۔ جلد ہی تم سے خود رابطہ کروں گا۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

گردیزی موبائل فون ایک طرف ڈال کر رومال سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگا۔ اس کی سانسیں ناہمواری سے چل رہی تھیں اور سارا جسم اب بھی سنسنا رہا تھا۔ یہ بات اس کے لیے ناقابل فہم تھی کہ پارکنز اس کی بیٹی کو اغوا کرنے والوں سے شاید واقف تھا اور اسے یہ توقع بھی تھی کہ وہ اس کی بیٹی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائیں گے کیونکہ دراصل انہیں صرف جاوید اشرفی سے دلچسپی تھی۔

صورت حال ایسی تھی کہ گردیزی دفتر جانا بھول گیا اور اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

گردیزی کو اخبار نکالے ہوئے صرف دو سال گزرے تھے۔ دو سال پہلے وہ ایک بڑے اخبار کا ڈپٹی ایڈیٹر تھا۔ چیف ایڈیٹر سے اس کے تعلقات میں کشیدگی رہتی تھی۔ وہ کیونکہ ایک بڑی سفارش سے ملازم ہوا تھا اس لیے چیف ایڈیٹر اس کی ملازمت ختم نہیں کرسکتا تھا۔ دراصل اس کے اور چیف ایڈیٹر کے سیاسی خیالات میں بعدالمشرقین تھا۔ چیف ایڈیٹر موجودہ حکومت کے حق میں تھا لیکن اخبار میں گردیزی کی بعض ایسی تحریریں چھپ جاتی تھیں جو اس کے باغیانہ خیالات کی عکاس تھیں۔ وہ اپنے ملک کی حکومت ہی سے نہیں، تمام سیاست دانوں سے دل برداشتہ تھا۔

ایک سیمینار میں بہ ظاہر اتفاقیہ طور پر اس کی ملاقات پارکنز سے ہوئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ پارکنز سے اس کے تعلقات بڑھتے چلے گئے۔ اسے معلوم ہوا کہ پارکنز خاصا دولت مند شخص تھا جس نے ایک مقامی عورت سے شادی کرنے کے بعد وہیں کی شہریت بھی حاصل کرلی تھی اور اپنا سرمایہ بھی وہیں منتقل کرواکے اپنی بیوی کے نام سے ایک کمپنی کھولی تھی اور بڑے پیمانے پر دوائیں امپورٹ کرنے لگا تھا۔ اسی کے بہ قول اس کے دو ایک کاروبار اور تھے جن کی تفصیل اس نے گردیزی کو نہیں بتائی تھی۔

چند ماہ بعد ہی گردیزی کی باتوں سے پارکنز پر ظاہر ہوا کہ گردیزی اپنے چیف ایڈیٹر سے خوش نہیں تھا۔ پارکنز نے اس سے کہا کہ وہ اپنا اخبار نکال لے۔ گردیزی نے مالی مشکلات کی بات کی تو پارکنز نے اسے سرمائے کی پیشکش کی۔ پیشکش نہایت سنجیدگی سے کی گئی تھی۔ گردیزی کی باچھیں کھل گئیں۔ پارکنز کی شرط صرف یہ تھی کہ اخبار کے معاملے میں اس کا نام کہیں نہ آنے پائے۔ گردیزی کو اس پر کوئی اعتراض ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے اس کے علاوہ کچھ نہیں سمجھا کہ قدرت اچانک اس پر مہربان ہوگئی تھی۔ پارکنز نے اسے جو سرمایہ فراہم کیا، اس کی اس سے صرف رسید لی جس میں

گردیزی کی آسانی کے لیے یہ بھی لکھا تھا پارکنز کی رقم وہ اس وقت واپس کرے گا جب ادا کرنے کے قابل ہوگا۔ مدت کی کوئی قید نہیں تھی لہٰذا یہ بھی گردیزی کے حق میں تھا۔

اخبار نکلا اور اسے اپنے قدم جمانے میں بہت زیادہ وقت نہیں لگا کیونکہ عوام تو حکومت اور سیاست دانوں سے بیزار ہو ہی چکے تھے۔ انہیں گردیزی کے اخبار میں وہی کچھ پڑھنے کو ملا تھا جو وہ چاہتے تھے۔ گردیزی لکھتا بھی وہی کچھ چاہتا تھا۔

سال بھر قبل پارکنز نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ اس کے اخبار میں ملازمت یا لکھنے لکھانے کے سلسلے میں کسی کی سفارش کرے گا تو ایک فرضی نام ''گلاب خاں'' استعمال کرے گا کیونکہ وہ اخبار کے معاملے میں اپنا نام تو کسی طور پر بھی نہیں آنے دینا چاہتا۔

گردیزی کے لیے یہ پارکنز کی معمولی سی فرمائش تھی لیکن کئی ماہ تک پارکنز نے کسی کی سفارش ہی نہیں کی۔ اب سے چند ماہ پہلے اس کے پاس جاوید اشرفی کا کالم آیا تھا جس کے ساتھ گلاب خاں کا نام لکھا ہوا تھا۔ گردیزی نے موبائل فون پر اس سفارش کی تصدیق بھی کرلی اور جاوید اشرفی کے کالم چھاپنا شروع کردیے۔

یہ پہلا موقع تھا جب پارکنز کی وجہ سے گردیزی کو ذہنی اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔ جاوید اشرفی ایک سیاست داں کے حق میں لکھتا تھا اور سیاست داں بھی ایسا جس پر بڑے سنگین الزامات تھے جبکہ گردیزی کے اخبار کی پالیسی ہی یہ نہ تھی کہ وہ سیاست دانوں کے حق میں لکھے۔

گردیزی جاوید اشرفی کے کالم چھاپتا رہا۔ بہ تدریج یہ اس کے لیے اور زیادہ تکلیف دہ ہوگیا کہ جاوید اشرفی کے قلم کی جادوگری کے باعث عوامی رائے شوکت باجوہ کے حق میں ہموار ہونے لگی لیکن گردیزی یہ تکلیف برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ پارکنز نے اسے رقم ہی اتنی بڑی دی تھی جو واپس کرنا ابھی اس کے لیے خاصا مشکل تھا۔

ذہنی اذیت برداشت کرتے ہوئے گردیزی کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ اب اس پر جاوید اشرفی کی وجہ سے ایسی افتاد آپڑی تھی کہ اس کی جان آدھی ہوگئی تھی۔ بیٹی کا اغوا ہوجانا کسی باپ کے لیے معمولی سانحہ نہیں ہوسکتا۔ گردیزی بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہا۔ موجودہ صورت حال میں وہ اپنے دفتر تو جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ اس کا شوفر کار کے ساتھ پورچ میں اس کا منتظر ہوگا۔ وہ ڈرائنگ روم سے باہر نکلا۔ شوفر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''آج میں دفتر نہیں جاؤں گا۔'' گردیزی نے اس سے کہا۔

شوفر نے سر ہلایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ انجن اسٹارٹ کرکے وہ کار گیرج کی طرف لے جانے لگا۔

گردیزی نے برآمدے میں کھڑے کھڑے اپنے موبائل پر دفتر سے رابطہ کیا اور اپنے ڈپٹی سے کہا۔ ''آج میں نہیں آسکوں گا۔ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تم دیکھ لینا۔''

ذہنی حالت ایسی تھی کہ اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔ پھر وہ اندر جانے کے لیے واپس مڑنے ہی والا تھا کہ بنگلے کے پھاٹک کے باہر اسے کسی کار کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ ہیڈ لائٹس کا رخ بند پھاٹک کی طرف تھا۔ گویا کوئی کار اس کے بنگلے میں آنا چاہتی تھی۔ گردیزی نے ہارن کی آواز بھی سنی۔

ہارن کی آواز سن کر پھاٹک کے قریب موجود چوکیدار بھی سر گھما کر پھاٹک کی طرف دیکھنے لگا۔

پھر یکایک ہیڈ لائٹس تیزی سے پیچھے ہوئیں۔ کار نہایت برق رفتی سے پیچھے ہٹی تھی۔ پھر ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ کسی نے کار والے سے رکنے کے لیے کہا تھا۔ انداز میں دھمکی تھی۔

کار تیزی سے مڑ کر ایک طرف جانے لگی۔ اس وقت ایک فائر ہوا۔ گردیزی کو خیال آیا کہ شاید وہ گولی کار پر ہی چلائی گئی تھی۔

کار تیز رفتاری سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔ پھر ایسی آواز سنائی دی جیسے قریب ہی کہیں کوئی اور کار اسٹارٹ کی گئی ہو، اس کی ہیڈ لائٹس کی چمک بھی دکھائی دی۔ گردیزی نے ہیڈ لائٹس ہی کی حرکت سے اندازہ لگایا کہ وہ کار تیزی سے اسی جانب روانہ ہوئی تھی جس طرف پہلی کار گئی تھی۔

رہائشی علاقہ ہونے کے باعث گردیزی کے بنگلے کی سامنے کی سڑک اندھیرا پھیلنے کے بعد تقریباً سنسان ہی ہوجاتی تھی۔ اکا دکا ہی گاڑیاں گزرتی نظر آتی تھیں لیکن جب یہ واقعہ ہوا، اس وقت دور تک شاید کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔

گردیزی حیران کھڑا تھا کہ اس نے سڑک پر ان چوکیداروں کی شور مچاتی آوازیں سنیں جو آس پاس کے بنگلوں کے ملازم تھے۔

✈✈✈

اتفاق ہی تھا کہ اس دن بابر اندھیرا پھیلنے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی اپنے گھر پہنچ گیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوکر وہ کپڑے تبدیل کرنے والا ہی تھا کہ اس کے موبائل فون کی

گھنٹی بج اٹھی۔ بابر نے موبائل جیب سے نکال کر اس کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ چمکتے ہوئے حروف ''گلاب خاں'' کا نام ظاہر کررہے تھے۔

بابر نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو!''

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' دوسری طرف سے بے چین انداز میں پوچھا گیا۔ آواز بابر کے لیے جانی پہچانی تھی۔ وہ گلاب خاں ہی تھا۔

''میں ابھی اپنے گھر پہنچا ہوں۔''

اس جواب کے بعد بابر کچھ اور بھی کہتا لیکن دوسری طرف سے فوراً کہا گیا۔ ''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ یہ بتاؤ، تمہارے پاس یو ایس بی ہے؟''

''ہاں، یوں ہی ایک مرتبہ خرید کر ڈال لی تھی۔ مجھے اس کی ضرورت تو نہیں۔''

''اس وقت پڑ گئی ہے ضرورت۔'' دوسری طرف سے بڑی تیزی سے کہا گیا۔ ''تم کالموں کے سلسلے میں یادداشتیں بھی محفوظ کرتے ہوگے، لیکن اس وقت بات صرف یادداشتوں کی نہیں۔ تم کمپیوٹر سے اپنا سارا ڈیٹا یو ایس بی میں منتقل کرلو، کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک بھی نکال لو، کمپیوٹر خالی کردو اور اپنے گھر سے نکل آؤ۔ تمہیں اپنے علاقے کے میکڈونلڈ تک پہنچنے میں دس منٹ سے زیادہ نہ لگیں۔'' لہجہ تاکیدی ہوگیا تھا۔ ''میں بھی اتنی دیر میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ سرخ شیراڈ ہے میرے پاس! اس کا نمبر ذہن نشین کرلو۔'' گلاب خاں نے نمبر بتایا جو بہت آسانی سے ذہن نشین ہوسکتا تھا۔

''آخر بات کیا ہے؟'' بابر نے پریشانی سے پوچھا۔

''یہ ان باتوں کا وقت نہیں۔ جلدی کرو ورنہ خطرے میں پڑ جاؤ گے۔ کمپیوٹر سے اپنا سارا ڈیٹا یو ایس بی میں منتقل کرکے دونوں چیزوں کے ساتھ میکڈونلڈ پہنچو۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

''خطرے'' کا لفظ سن کر بابر کا جسم سنسنا گیا تھا۔ صحافیوں کے لیے خطرات اس کے لیے کوئی ان سنی بات نہیں تھی۔ گزشتہ ڈیڑھ سال میں کئی صحافی اغوا کیے جاچکے تھے اور ایک دو کو ہلاک بھی کیا جاچکا تھا۔

بابر کو یہ احساس بھی تھا کہ اس نے اپنے بعض کالموں میں کچھ غیر معمولی انکشافات بھی کیے تھے۔ ان رازوں سے پردہ اٹھانے والا خود گلاب خاں تھا۔ اس نے بذریعہ ای میل ان باتوں کے ثبوت بھی بابر کو بھیجے تھے۔ انہی باتوں کی وجہ سے بابر کو گلاب خاں کی زبانی ملنے والی خطرے کی اطلاع بے وزن نہیں معلوم ہوئی۔ اس کے دماغ میں یہ سوال بھی ابھرا کہ خطرے کی نوعیت کیا ہوسکتی ہے اور اسے خطرہ کس کی طرف سے ہوسکتا ہے؟

ان خیالات کے ساتھ ہی اس نے کمپیوٹر کا سارا ڈیٹا ایک یو ایس بی پر منتقل کرلیا۔ پھر ہارڈ ڈسک نکالنے کے لیے اسے دو پیچ کھولنا تھے۔ وہ پیچ کھولنے سے پہلے اس نے ایک فیصلہ بہرحال کرلیا۔ اس نے موبائل فون سے ایک کال کی اور دو تین ہی جملوں میں بات مکمل کرکے کمپیوٹر سے ہارڈ ڈسک نکالنے لگا۔

ذرا دیر بعد وہ اپنے کمرے سے نکلا تو اس کے انداز سے عجلت صاف ظاہر ہورہی تھی۔ فوراً ہی اس کا سامنا عنبر سے ہوگیا۔

''کیا پھر کہیں جارہے ہیں بھیا؟'' وہ بابر کے ہاتھ میں ایک موٹا سا بریف کیس دیکھتے ہی تیزی سے بولی۔

''ہاں۔'' بابر نے بریف کیس ایک طرف رکھ کر عنبر کو بڑی محبت سے اپنے قریب کیا اور اس کی پیشانی چومی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کچھ جذباتی بھی ہوگیا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ بات چکرا رہی تھی کہ اب وہ اپنی بہن سے نہ جانے کب مل سکے۔

''ابھی تو آئے تھے آپ!'' عنبر بولی۔ ''اب پھر.....''

بابر نے اس کی بات کاٹی۔ ''امی جان کہاں ہیں؟''

''کچن میں۔ آخر بات کیا ہے، آپ کچھ پریشان نظر آرہے ہیں۔''

''آؤ!'' بابر نے ایک ہاتھ سے بریف کیس اٹھا کر دوسرا ہاتھ عنبر کے شانوں پر پھیلا دیا اور اسی طرح اسے اپنے ساتھ لیے ہوئے کچن کی طرف بڑھا۔

''کچھ بتائیں تو بھیا!'' عنبر پریشان نظر آنے لگی۔

''آخر.....''

''کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے عنبر!'' بابر نے کہا۔ ''اچانک ہی ایک ضروری کام سے جانا پڑ رہا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے دو چار دن کے لیے شہر سے جانا پڑ جائے۔''

''کہاں؟'' عنبر چونک کر بولی۔

''لاہور۔'' بابر نے یوں ہی کہہ دیا۔ اسے ابھی بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے وقت میں اسے کب، کہاں، کیا فیصلہ کرنا پڑے گا۔

عنبر بولی۔ ''تو کیا ابھی واپس نہیں آئیں گے؟ میرا مطلب ہے، جہاں آپ ابھی جارہے ہیں، کسی کام سے!''

''ہاں عنبر!'' بابر نے کہا۔ ''شاید میں وہیں سے چلا جاؤں۔''

وہ دونوں کچن کے قریب پہنچ گئے تھے۔ عذرا بیگم کچن سے باہر آتی دکھائی دیں۔

''امی جان!'' عنبر نے تقریباً چیخنے کے سے انداز میں کہا۔ ''بھیالا ہو رہا ہے۔''

''خیریت.....؟ کیوں؟'' عذرا بیگم چونکیں۔

''اچانک کچھ کام پڑ گیا ہے۔ ابھی تو یہیں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دو گھنٹے میں واپس آجاؤں لیکن اگر ضروری ہوا تو وہیں سے ایر پورٹ چلا جاؤں گا۔ دو گھنٹے بعد ایک فلائٹ لاہور جانے کے لیے تیار ہوگی۔''

حقیقتاً بابر کو اس کا علم نہیں تھا کہ دو گھنٹے بعد کوئی فلائٹ لاہور جانے والی ہوگی۔

''بس آپ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دے دیں۔'' بابر نے مزید کہا۔

''تم تو اس طرح بہت پریشان کر کے جا رہے ہو۔'' عذرا بیگم نے کہا مگر ساتھ ہی انہوں نے بابر کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

بابر بولا۔ ''دعا کیجیے گا کہ میں کامیاب لوٹوں۔''

''ماں کی دعائیں تو اولاد کے ساتھ ہمیشہ رہتی ہیں بیٹا!'' عذرا بیگم نے کہا، پھر بولیں۔ ''اپنے باپ سے مل کر نہیں جاؤ گے؟''

''وقت کم ہے امی جان!'' بابر نے کہا۔ ''میڈیکل اسٹور جاؤں گا تو دیر ہوسکتی ہے۔''

سیف ہدانی اس وقت میڈیکل اسٹور ہوتے تھے۔

عنبر کی پلکیں اس وقت بھیگ گئی تھیں۔ وہ بھرائی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ''زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ چوبیس گھنٹے کے لیے بھی گھر سے دور رہے ہوں۔''

''کام تو کام ہوتا ہے پگلی!'' بابر نے جبری ہنسی کے ساتھ عنبر کا گال تھپکا۔ ''اچھا امی جان! اجازت دیجیے۔''

''جاؤ بیٹا! اللہ کے سپرد!''

عنبر، بابر کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

''ارے! یہ کیا پگلی!'' بابر خود اتنا الجھا ہوا تھا کہ اسے ہنسنے کے لیے خود پر ایک بار پھر جبر کرنا پڑا۔ ''ارے یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ میں دو گھنٹے بعد ہی واپس آجاؤں۔ لاہور جانا ہی نہ پڑے۔''

حقیقتاً بابر کو اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے وقت میں اسے کیا فیصلہ کرنا پڑے گا۔ بس کچھ قیاسات تھے جو اس کے دماغ میں چکرا رہے تھے۔

عذرا بیگم اور عنبر اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے تک آئیں۔

''اچھا خدا حافظ۔'' بابر نے کہا اور باہر نکل کر تیزی سے کار کی طرف بڑھا جو گھر کے باہر ہی کھڑی رہتی تھی۔ جب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، اس وقت بھی عذرا بیگم اور عنبر دروازے پر کھڑی ہوئی تھیں۔ بابر سے نظریں ملتے ہی ان دونوں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلائے۔ جواب میں بابر نے بھی ہاتھ ہلایا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔

کار کچھ آگے نکل گئی تو بابر نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ عنبر دروازے سے باہر آکر کار کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلا رہی تھی۔

بابر نے ٹھنڈی سانس لے کر ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ وہ اب جذباتیت سے تو نکل آیا تھا لیکن فکرمندی اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ بارونق اور کم ٹریفک کی سڑکوں سے گزرتا ہوا وہ تیزی سے ایک جانب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جہاں بھی اسے موقع ملتا، کار کی رفتار تیز ہو جاتی۔ بار بار وہ اپنی گھڑی پر بھی نظر ڈالتا جا رہا تھا۔

موبائل کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ ذرا بھی نہیں چونکا۔ اسے اس کی توقع تھی۔ کال کرنے والا گلاب خاں تھا۔

بابر نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے اور کار کی رفتار کچھ کم کرتے ہوئے موبائل کان سے لگایا۔ ''ہیلو!''

''تم کہاں رہ گئے بابر!'' گلاب خاں کی آواز میں اضطراب تھا۔ ''میں پانچ منٹ سے تمہارا منتظر ہوں۔''

''میں ابھی تمہیں فون کرنے ہی والا تھا کہ مجھے تھوڑی سی دیر ہو جائے گی۔'' بابر نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیوں؟ کیا کام میں کسی قسم کی رکاوٹ پڑ گئی؟'' بے چینی سے پوچھا گیا۔

''نہیں۔ کام تو میں نے کر لیا ہے۔ دونوں چیزیں اس وقت میرے پاس ہیں۔ دراصل ابا جان کا فون آ گیا تھا۔ انہوں نے ایک ضروری لیکن چھوٹا سا کام میرے سپرد کر دیا ہے۔ وہ کام کر کے میں پون گھنٹے میں میکڈونلڈ پہنچ جاؤں گا۔''

''تم نے وہ کام ٹال کیوں نہیں دیا؟'' گلاب خاں کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی لیکن پھر فوراً ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں تمہیں کس خطرے سے بچانا چاہتا ہوں۔''

''مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے۔ غالباً کسی کو میرا ای میل ایڈریس معلوم ہو گیا ہے اور وہ مجھے ٹریس کر سکتا ہے۔''

''ذہین آدمی ہو، تم نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔ اب تم

کہاں ہو؟''

''ابا جان کے کام سے جا رہا ہوں۔ ہارڈ ڈسک بھی میرے پاس ہے اور یو ایس بی بھی!'' بابر نے جواب دیا۔ ''میں دس منٹ میں اس جگہ پہنچ جاؤں گا جہاں کام ہے۔ وہاں بس پانچ منٹ رکنا ہے۔ اس کے بعد مجھے میکڈونلڈ پہنچنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا۔ مجھے ایک اطمینان یہ بھی ہے گلاب خاں کہ میرا گھر اتنی جلدی ٹریس نہیں کیا جا سکتا۔ تم مطمئن رہو۔ میں پون گھنٹے میں تم تک پہنچ جاؤں گا۔''

''کیا گڑبڑ کی ہے تم نے!'' دوسری طرف گلاب خاں نے ایک طویل سانس لی۔ ''خیر!..... میں میکڈونلڈ کے باہر کار میں ہی تمہارا منتظر رہوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

بابر نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے چہرے سے اب بھی پریشانی اور سوچ بچار کا اظہار ہو رہا تھا۔

دس منٹ بعد اس نے کار کی رفتار کم کرنا شروع کی اور پھر ایک جگہ روک دی۔ اس کی دائیں جانب سڑک پار وہی شاپنگ سینٹر تھا جہاں اس کی ملاقات رخسار سے ہوئی تھی۔ اس نے رخسار کی کار دیکھ لی جو پارکنگ میں نہیں لگائی گئی تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر رخسار موجود تھی اور اس نے بھی بابر کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر ہلایا۔ جواب میں بابر نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ اپنی کار ہی میں بیٹھی رہے۔

بابر نے کمپیوٹر سے ڈسک نکالتے وقت ایک مختصر سی کال رخسار ہی کو کی تھی اور اسے اسی جگہ بلایا تھا۔ وہ جگہ بابر اور رخسار کے گھر کے تقریباً درمیان میں تھی۔ اس طرح وہ دونوں کم وقت میں ایک دوسرے تک پہنچ گئے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس وقت بابر چاہتا بھی نہیں تھا کہ رخسار کے گھر جائے۔

کار کا انجن بند کر کے اس نے برابر کی سیٹ پر رکھا ہوا بریف کیس اٹھایا۔ اس میں ہارڈ ڈسک کے ساتھ ایک چھوٹا سا بریف کیس بھی تھا۔ بابر نے وہ بریف کیس نکال کر بڑا بریف کیس بند کر کے سیٹ پر رکھا اور چھوٹا بریف کیس ہاتھ میں لیے کار سے اتر آیا۔ سڑک پار کرنے سے پہلے وہ اپنی کار لاک کرنا نہیں بھولا تھا۔ اس نے عادت ڈال لی تھی کہ دروازہ چابی ہی سے لاک کیا کرے۔

سڑک پار کر کے وہ رخسار کی کار کی اس سمت میں پہنچا جو ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کی سیٹ کی طرف تھی۔ رخسار نے اس کے لیے خود دروازہ کھول دیا۔ بابر نے اندر بیٹھ کر خود دروازہ بند کیا۔

''آخر بات کیا ہے بابر!'' رخسار کے لہجے سے الجھن آشکارا تھی۔ ''فون پر تم نے اس کے علاوہ کچھ کہا ہی نہیں کہ میں فوراً یہاں پہنچوں۔''

''وقت نہیں تھا کہ تمہیں تفصیل بتا سکتا۔ میں تمہیں اپنی ایک امانت سونپنا چاہتا ہوں۔'' بابر نے کہتے ہوئے چھوٹا سا بریف کیس رخسار کی گود میں رکھ دیا۔

''کیا ہے یہ؟''

''بریف کیس۔''

''وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔'' رخسار تھوڑی سی جھنجلا گئی۔ ''بریف کیس میں کیا ہے؟''

''میں کوئی تخریب کار نہیں ہوں کہ اس میں بم رکھ کر تمہیں دے دوں۔'' بابر نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، پھر بولا۔ ''یہ بھول جاؤ کہ اس میں کیا ہے۔ بس یہ اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کا علم چچا جان کو بھی ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمہیں اپنی قسم دیتا ہوں کہ اس بارے میں تمہیں اپنی زبان بالکل بند رکھنا ہے۔''

''آخر معاملہ کیا ہے بابر!'' رخسار پریشان ہو گئی۔

''میں بہت جلدی میں ہوں۔ اس وقت تمہیں تفصیل نہیں بتا سکتا۔'' بابر نے کار سے اترنے کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد تم سے رابطہ کر کے اپنی امانت واپس لے لوں۔ اسی وقت تمہیں تفصیل بھی بتا دوں گا۔''

''لیکن.....''

''پلیز رخسار! کوئی سوال نہیں۔ میں بہت جلدی میں ہوں۔ اچھا بس۔'' بابر کار سے اترنے لگا۔

''تم مجھے بہت الجھن میں ڈال کر جا رہے ہو۔'' رخسار کی آواز بھرا گئی۔

''مجبوری ہے کچھ رخسار!'' بابر نے دروازہ بند کر کے کھڑکی سے رخسار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں جلد ہی تم سے رابطہ کروں گا۔''

لیکن اس وقت بابر کو علم نہیں تھا کہ وہ رخسار سے کب رابطہ کر سکے گا۔ اس نے بس رخسار کو کسی حد تک مطمئن کرنے کے لیے یہ بات کہہ دی تھی۔ اس نے رخسار کے مزید کچھ بولنے کا انتظار نہیں کیا اور تیزی سے مڑ کر سڑک پار کر کے اپنی کار کی طرف جانے لگا۔

جب اس نے کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا تو دیکھا کہ رخسار اپنی کار حرکت میں نہیں لائی تھی اور بابر کی طرف

دیکھے جارہی تھی۔

بابر نے دوبارہ اس کی طرف نہیں دیکھا اور اپنی کار چلادی۔ وہ مطمئن تھا کہ اس نے رخسار پر اعتماد کرکے غلطی نہیں کی تھی۔ وہ اس معاملے میں کسی اور پر اعتماد کر ہی نہیں سکتا تھا۔

کار اب تیز رفتاری سے میکڈونلڈ کی طرف جارہی تھی۔ جو خیالات اس کے دماغ میں ابتدا ہی سے دوڑنے لگے تھے، ان سے اب بھی اس کا دماغ خالی نہیں تھا۔ کالم نگاری کی ابتدا ہی میں اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ کسی ایجنسی کا آلہ کار بن گیا ہے اور وہ ایجنسی کسی بھی وجہ سے شوکت باجوہ کو سیاسی طور پر اوپر لانا چاہتی ہے۔

بابر کے خیال کے مطابق اگر اس معاملے میں ایجنسی کا کردار نہ ہوتا تو خود شوکت باجوہ ہی اس سے رابطہ کرتا۔ کسی غیر ملکی کو اس سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی جس نے اسے اپنا نام گلاب خاں بتایا تھا، اس نے فون پر اردو ہی میں بات کی تھی لیکن اس کا لہجہ کسی اہل زبان کا نہیں ہوسکتا تھا۔ بابر کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ یہ بات عام طور پر سننے میں آئی تھی کہ بعض صحافی کسی نہ کسی ایجنسی کے آلہ کار بن کر ٹھاٹ سے زندگی گزار رہے تھے لہٰذا بابر نے بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لینا برا نہ سمجھا۔ ویسے بھی اسے اپنے ملک کے سیاست دانوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ کسی ایسے موقعے کی تلاش میں بھی تھا جو اسے اس کے خیال کے مطابق معجزانہ طور پر ملا تھا۔

جب اسے گلاب خاں سے خطرے کی اطلاع کے ساتھ کچھ ہدایات بھی ملی تھیں تو بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکرا گئے تھے۔ ان میں سے ایک خیال یہ بھی تھا کہ کوئی مقامی خفیہ ایجنسی اس کے کالموں کو کسی خاص نظر سے دیکھتی رہی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس غیر ملکی ایجنٹ سے بھی واقف ہوگئی ہو اور اس نے کسی طرح وہ ای میل ایڈریس معلوم کرلیا ہو جس سے وہ مضامین کے، اے گردیزی کے ای میل ایڈریس پر بھیجے جاتے تھے۔ ایسی صورت میں مقامی ایجنسی وہ جگہ ٹریس کرسکتی تھی جہاں سے وہ مضامین بھیجے جاتے تھے۔

مقامی ایجنسی کے باخبر ہونے کی خبر گلاب خاں کو بھی مل سکتی تھی اور بابر کے خیال کے مطابق ایسا ہی ہوا تھا۔ اسی لیے گلاب خاں نے اسے یہ ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے کمپیوٹر کا ڈیٹا یو ایس بی میں منتقل کرنے کے ساتھ ہی کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک بھی نکال کر فوراً اپنا گھر چھوڑ دے تاکہ مقامی ایجنسی کے ہاتھوں پکڑا نہ جاسکے۔

بابر اچھی طرح جانتا تھا کہ غیر ملکی ایجنٹوں کو اس حص کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی جسے وہ اپنا آلۂ کار بناتے ہیں۔ صورتِ حال میں کسی خرابی کے باعث اگر ان کا مہرہ یعنی ان کا آلۂ کار، پٹ جائے تو ان کی بلا سے۔

لیکن گلاب خاں بابر کو بچانا چاہتا تھا یا نہیں، اس کا اندازہ ابھی بابر کو نہیں تھا۔ گلاب خاں کو یہ فکر لاحق ہوسکتی تھی کہ وہ بابر کو جو خفیہ معلومات فراہم کرتا رہتا تھا، وہ بھی ہارڈ ڈسک میں مقامی ایجنسی کو مل جاتیں اور اس طرح گلاب خان کو کسی قسم کا نقصان پہنچ سکتا تھا لہٰذا یہ بات بھی ممکن تھی کہ اسے صرف ہارڈ ڈسک حاصل کرنے سے دلچسپی ہو۔

بابر کو خوب اندازہ تھا کہ جن باتوں نے اس کے کالم کو مقبول بنایا تھا، اس میں ان خفیہ معلومات کا بہت ہاتھ تھا جو گلاب خان اسے فراہم کرتا رہتا تھا۔ وہ معلومات حاصل کرنے کے لیے اس نے سرکاری دفاتر کے اہلکاروں کو پیسے کے بل پر اپنی مٹھی میں لے رکھا ہوگا۔

بابر ان معلومات کو اپنے کالم میں جوں کا توں استعمال کرنے کے بجائے صرف اشاروں کنایوں سے کام لیا کرتا تھا لیکن ایسی مہارت کے ساتھ کہ اشارے کنائے سمجھنے والے پوری بات سمجھ لیتے تھے۔

ہارڈ ڈسک کے ساتھ ہی گلاب خان نے سارا ڈیٹا یو ایس بی میں بھی منتقل کرایا تھا۔ اس کا صرف یہی ایک مقصد ہوسکتا تھا کہ یو ایس بی کے ذریعے وہ سارا ڈیٹا کسی لیپ ٹاپ میں منتقل کیا جاسکے۔ ہارڈ ڈسک لیپ ٹاپ میں استعمال نہیں کی جاسکتی تھی اور لیپ ٹاپ کے ذریعے کام کرنے والا اپنا مقام سکونت تیزی سے تبدیل کرتا رہتا تو خفیہ ایجنسی لیپ ٹاپ کے ذریعے کام کرنے والے تک کسی صورت نہیں پہنچ سکتی تھی۔

✈✈✈

گردیزی کے گھر کے باہر جو صورت حال پیدا ہوئی تھی، اس کی اطلاع پڑوس ہی کے کسی شخص نے پولیس کو دے دی تھی۔ جس کے نتیجے میں پولیس کو گردیزی کے گھر پہنچنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

گردیزی کو پولیس آفیسر کے سوالات کا سامنا کرنا پڑا۔

''وہ کون تھا جو آپ سے ملنے آیا تھا؟''

''مجھ سے ملنے تو کوئی نہیں آیا۔'' گردیزی نے جواب دیا۔

''لیکن ہمیں تو یہی اطلاع ملی ہے کہ ایک کار آپ کے

گھر کے پھاٹک پر آکر رکی تھی۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔

''ہیڈ لائٹس کا رخ آپ کے پھاٹک کی طرف تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کار میں جو بھی تھا، اسے پھاٹک کھلنے کا انتظار ہوگا۔''

''میں اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ وہ کون ہوسکتا ہے۔'' گردیزی نے جواب دیا۔ ''مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم ہوسکا تھا کہ باہر کیا صورتِ حال پیش آئی تھی۔ وہ تو میرے چوکیدار نے باہر جاکر معلومات کی تھیں اور پھر واپس آکر اسی نے مجھے بتایا تھا کہ جو کار میرے پھاٹک پر آکر رکی تھی، وہی اچانک اس وقت بھاگ نکلی جب آس پاس کسی جگہ موجود افراد تیزی سے اس کار کی طرف لپکے۔ پڑوس کے چوکیداروں کے بیان کے مطابق انہی لوگوں کو دیکھ کر وہ کار والا شاید گھبرا گیا تھا اور یہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ جو لوگ اس کی کار کی طرف بڑھے تھے، انہی میں سے کسی نے چیخ کر اس کار والے سے رکنے کے لیے کہا تھا لیکن جب وہ نہیں رکی تو انہی لوگوں میں سے کسی نے اس کار پر گولی چلائی لیکن یا تو نشانہ خطا گیا تھا یا کار ہی تیز رفتاری سے اتنی دور نکل گئی تھی کہ ریوالور سے چلائی جانے والی گولی اس تک نہیں پہنچ سکی۔ پھر نہ جانے کدھر سے ایک اور کار وہاں آئی۔ وہ لوگ اس کار میں بیٹھ گئے اور وہ کار شاید اس کار کے تعاقب میں دوڑ گئی جو یہاں سے فرار ہوئی تھی۔'' گردیزی نے وضاحت سے جواب دینے کے بعد پوچھا۔ ''کیا آپ لوگوں کو ان کاروں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوسکا۔''

''ہم جادوگر نہیں ہیں مسٹر گردیزی!'' پولیس آفیسر کا لہجہ خشک ہوگیا۔ ''ہمیں پوچھ گچھ کرنے ہی سے کوئی سراغ مل سکتا ہے۔ یہاں جن چوکیداروں نے ان کاروں کو دیکھا تھا، ان میں سے کوئی بھی ان دونوں کاروں میں سے کسی ایک کا نمبر بھی نہیں بتا سکا ہے۔ اب تو ہم آپ ہی سے کچھ توقع کرسکتے تھے۔''

''مجھ سے.....؟ توقع..... کیا مطلب؟''

''یہی کہ آپ سے ملنے کون آیا تھا؟''

''میں پہلے ہی جواب دے چکا ہوں کہ میں اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔''

یہ جوابات دیتے ہوئے گردیزی پریشان بھی تھا۔ اسے اپنی اغوا شدہ بیٹی کی فکر لاحق تھی۔ اگرچہ پارکنز نے اسے تسلی دی تھی کہ اس کی بیٹی کو کچھ نہیں ہوگا لیکن یہ بات گردیزی کے لیے اطمینان بخش نہیں تھی۔ پارکنز نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ اس کی بیٹی کو اغوا کرنے والا اب شاید اسے فون نہ کرے لیکن یہ بات بھی گردیزی کی فہم سے بالاتر تھی۔ اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آرہا تھا کہ پارکنز نے ایسی باتیں کیوں کی تھیں۔ گردیزی کے لیے وہ باتیں عجیب وغریب ہی تھیں۔

وہ بہ دستور پریشان تھا کہ دس پانچ منٹ میں اس شخص کا فون آنے والا ہوگا جس نے اس کی بیٹی کو اغوا کیا تھا۔

پولیس آفیسر نے کوئی سوال کیا تو وہ چونک گیا۔

''کیا کہا آپ نے؟'' اس نے بے اختیار پوچھا۔

پولیس آفیسر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ اتنے پریشان کیوں ہیں مسٹر گردیزی؟''

''میرے گھر کے سامنے ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے اور مجھے اس وقت بلاوجہ آپ لوگوں کے سامنے جواب دہی کرنا پڑ رہی ہے۔'' گردیزی نے جواب دیا اور پھر جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ''کیا یہ میرے لیے پریشان کن صورت حال نہیں؟''

''میرا خیال ہے، اتنی زیادہ پریشان کن نہیں کہ آپ یکا یک ایسے خیالوں میں کھو گئے کہ میرا سوال ہی نہیں سن سکے۔''

''جس پر گزرتی ہے، وہی جانتا ہے۔'' گردیزی نے منہ بنا کر کہا۔ ''آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے، جلدی سے پوچھ لیں۔''

''میں نے یہ معلوم کیا تھا کہ آپ یہاں اکیلے ہی رہتے ہیں؟ میرا مطلب ہے، ملازمین کے علاوہ!''

''میں یہاں اپنی بیٹی کے ساتھ رہتا ہوں اور کوئی نہیں ہے۔ میری بیوی کا انتقال ہوچکا ہے۔''

''آپ کی بیٹی کہاں ہیں؟''

''کسی سے ملنے گئی ہوئی ہے۔'' گردیزی نے جواب دیا، پھر جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اب شاید آپ اس کا نام بھی پوچھیں گے۔ میں بتائے دیتا ہوں، اس کا نام افروز ہے۔ آخر اس قسم کے سوالات کا آپ کی تفتیش سے کیا تعلق؟''

اس سے پہلے کہ پولیس آفیسر کچھ کہتا، ڈرائنگ روم میں موجود ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''ایکسکیوزمی!'' گردیزی نے پولیس آفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے خشک لہجے میں کہا اور اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

ڈرائنگ روم خاصا وسیع تھا۔ اس کے ایک کونے میں رکھے ہوئے ٹیلی فون پر کی جانے والی بات کی ہلکی سی بھنک بھی پولیس آفیسر کے کانوں میں نہیں پڑ سکتی تھی اگر لہجہ دھیما رکھا جاتا۔

ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے گردیزی نے کہا۔
''ہیلو!''
''تم اب بھی اپنی بیٹی کے لیے پریشان ہوگے؟''
دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر گردیزی چونک پڑا۔ وہ کال پارکنز کی تھی۔
''تم!'' گردیزی کے منہ سے نکلا۔ ''میرا مطلب ہے..... ٹیلی فون پر! آج سے پہلے تم نے ہمیشہ میرے موبائل پر ہی کال کی ہے۔''
''اس وقت میں نے احتیاط سے کام لیا ہے۔'' پارکنز کی آواز آئی۔ ''مجھے اس واقعے کی اطلاع مل گئی تھی جو تمہارے گھر کے سامنے پیش آیا تھا اور یہ بات بھی معلوم ہوگئی تھی کہ پولیس تمہارے گھر پہنچ چکی ہے۔ وہ لوگ تم سے اس کار کے بارے میں پوچھ گچھ کررہے ہوں گے۔''
''ہاں۔'' جواب دیتے ہوئے گردیزی مڑا تاکہ پولیس آفیسر پر نظر رکھ سکے جو اس وقت اسی کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن گردیزی کو اپنی طرف متوجہ پاکر اس نے نظریں چرالیں۔
اس وقت گردیزی نے کوشش کی کہ اس کا چہرہ جذبات سے عاری رہے۔ وہ پارکنز کی آواز سن رہا تھا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم نے پولیس والوں کو اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہوگا۔''
''لیکن میں اس کے لیے پریشان ہوں۔''
''میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ فکرمند نہ ہو۔ کچھ نہیں ہوگا تمہاری بیٹی کو۔'' پارکنز نے کہا، پھر پوچھا۔ ''فون تو نہیں آیا اس نامعلوم شخص کا؟''
''ابھی پورا ایک گھنٹا نہیں ہوا۔'' گردیزی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔
''مجھے امید ہے کہ ایک گھنٹے بعد بھی فون نہیں آئے گا اور میرا خیال غلط ثابت ہو تو تم اس سے وہی بات کہہ دینا جو میں تمہیں سمجھا چکا ہوں۔ ابھی مجھے یقین تھا کہ تم پولیس والوں کے ساتھ بیٹھے ہوگے اس لیے مناسب نہیں تھا کہ میں تمہارے موبائل پر کال کرتا۔ یہ میں دیکھ چکا ہوں کہ ڈرائنگ روم میں ٹیلی فون کہاں رکھا ہوا ہے۔ وہاں سے تمہاری آواز پولیس والوں تک نہیں پہنچ سکتی۔''
گردیزی ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔
پارکنز بولتا رہا۔ ''اب تم پولیس والوں سے چھٹکارا حاصل کرو۔ یہ لوگ بڑی عیاری سے سوالات کرتے ہیں۔ تمہارے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو بعد میں تمہارے لیے پریشانی کا سبب بنے۔''
''میں کیسے چھٹکارا حاصل کروں؟ کیسے کہہ دوں کہ وہ جائیں!''
''کہہ سکتے ہو تم! کوئی جرم نہیں کیا ہے تم نے کہ وہ تم پر کسی قسم کا دباؤ ڈال سکیں۔ تم ان سے یہ بہانہ کرو کہ تمہیں اپنے دفتر جانا ہے اور تمہیں پہلے ہی خاصی تاخیر ہو چکی ہے۔''
گردیزی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں! یہ بہانہ کیا جاسکتا ہے۔''
''بہانہ ہی نہیں، اس پر عمل بھی کرنا ہوگا۔ اگر رخصت ہوجانے کے بعد بھی پولیس کا کوئی آدمی آس پاس ہو تو وہ دیکھ لے کہ تم واقعی اپنے گھر سے روانہ ہوگئے ہو۔ تم واقعی اپنے دفتر چلے جاؤ۔ میں کچھ دیر بعد تمہیں وہیں فون کروں گا۔''
''ٹھیک ہے، لیکن میں بہت پریشان ہوں پارکنز!''
''وقتی بات ہے، سب ٹھیک ہوجائے گا۔''
''اچھا!'' گردیزی نے مردہ دلی سے کہا۔ ''تو میں چلتا ہوں۔''
''گڈ لک۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔
گردیزی نے سلسلہ منقطع ہونے کی آواز بھی سنی اور ریسیور رکھ کر پولیس آفیسر کی طرف بڑھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون آف کردیا تھا۔
''میرے دفتر سے فون آیا تھا۔'' گردیزی نے پولیس آفیسر کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو اگر کچھ اور معلوم کرنا ہے تو جلدی کرلیجیے؟ ویسے اگر بعد میں بھی ضرورت ہو تو آپ مجھ سے رابطہ کرسکتے ہیں۔ یہ میرا کارڈ ہے۔'' اس نے کارڈ پولیس آفیسر کی طرف بڑھایا۔ ''دفتر، گھر، کسی بھی جگہ کے فون نمبرز موجود ہیں اس پر! موبائل نمبر بھی ہے۔''
''شکریہ۔'' پولیس آفیسر کھڑا ہوگیا۔ ''اگر ضرورت پڑی تو میں آپ سے رابطہ کرلوں گا۔''
''ضرور۔''
پولیس آفیسر گردیزی کے ساتھ ہی باہر نکلا۔ برآمدے میں دو کانسٹیبل موجود تھے۔ پورچ میں پولیس موبائل کھڑی تھی۔ اس میں بھی پولیس والے موجود تھے۔
گردیزی نے برآمدے میں کھڑے کھڑے شوفر کو آواز دے کر اس سے کار نکالنے کے لیے کہا۔
پولیس موبائل جب پھاٹک کی طرف جارہی تھی تو گردیزی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا موبائل فون آن کرلیا۔ اسے آف کرنے کا خیال اس خدشے کے تحت آیا تھا کہ پولیس آفیسر کے سامنے ہی اس شخص کی کال نہ آجائے جس نے اس کی بیٹی کو اغوا کیا تھا۔

شوفر کار لے آیا اور جلدی سے اتر کر پچھلی نشست کا دروازہ کھولنا چاہتا تھا کہ گردیزی خود ہی دروازہ کھول کر کار میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''چلو۔''
پولیس موبائل پھاٹک سے باہر جاچکی تھی لیکن چوکیدار پھاٹک کھولے کھڑا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ گردیزی جانے کے لیے تیار ہے۔
کار پھاٹک سے نکلی۔
''دفتر ہی چلنا ہے نا صاحب؟'' شوفر نے پوچھا۔
''ہوں۔'' گردیزی نے اثبات میں سر بھی ہلایا۔
پولیس آفیسر کے سامنے اس نے کسی نہ کسی حد تک خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی تھی مگر اب اضطراب اس کے چہرے پر پوری طرح نمایاں تھا۔ بیٹی کی فکر تو تھی ہی، وہ کسی بھی لمحے اغوا کرنے والے کی کال کی توقع بھی کررہا تھا۔ اب ایک گھنٹا ہوچکا تھا۔
روشنیوں سے جگمگاتی سڑکوں پر کار رواں دواں تھی۔ اسے کسی کسی سگنل پر رکنا بھی پڑ رہا تھا۔ وہ ایک سگنل پر رکی تو اچانک گردیزی کی طرف کا دروازہ کھلا اور کوئی اسے دھکیلتا ہوا اندر آگیا۔ اسی نے دروازہ بھی بند کرلیا تھا۔ یہ سارے کام برقی سرعت سے کیے گئے تھے اور پھر گردیزی نے ایک پستول کی ہلکی سی جھلک دیکھی جس کی نال اس کی کمر سے لگادی گئی۔
''ڈرائیور!'' پستول والے نے شوفر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنے ہاتھ اسٹیئرنگ سے نہ ہٹانا ورنہ میں تمہارے مالک کو گولی ماردوں گا۔''
شوفر بوکھلا گیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ سر موڑ کر پیچھے تو دیکھا لیکن اسٹیئرنگ سے اپنے ہاتھ نہیں ہٹائے۔
''سب کچھ اپنی جیب سے نکال دو۔'' گردیزی کو حکم دیا گیا۔ ''پرس بھی اور اپنا موبائل بھی۔''
گردیزی کے لیے حکم کی تعمیل کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ شہر میں ان دنوں اس قسم کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ لوگوں کو سرراہ لوٹا جاتا تھا اور مزاحمت کرنے والوں کو بے دریغ گولی ماردی جاتی تھی۔ سگنل کی سبز روشنی کے ساتھ ٹریفک حرکت میں آیا۔
پستول والے نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ ''آگے بائیں ہاتھ پر ایک گلی آئے گی، کار اسی میں موڑ لینا۔'' اس نے گردیزی سے اس کا پرس اور موبائل لے لیے تھے۔
پرس میں اچھی خاصی رقم تھی لیکن گردیزی کی پریشانی کا سبب موبائل کا ہاتھ سے نکل جانا تھا۔ اگرچہ ابھی تک اس کی بیٹی کو اغوا کرنے والے کی کال نہیں آئی تھی اور ایک گھنٹے سے پندرہ منٹ زیادہ ہوچکے تھے لیکن یہ ممکن تھا کہ اسے ذرا دیر سے فون کیا جاتا۔
''میرا موبائل واپس کردو۔'' گردیزی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں تمہیں کل رقم کا چیک دے دیتا ہوں۔ یہ موبائل پندرہ ہزار کا ہے۔ میں تمہیں تیس ہزار کا چیک دے دوں گا۔''
''بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔'' پستول والے نے منہ بنا کر کہا۔ ''اپنے بینک میں گرفتار کروانا چاہتے ہو مجھے۔''
گردیزی چپ رہا۔ اسے اندازہ بھی ہوگیا کہ اس نے ایک احمقانہ پیشکش کی تھی۔ اس قسم کے لوگ ایسی کوئی پیشکش قبول نہیں کرسکتے تھے۔
کار اب سگنل سے گزر چکی تھی۔
پستول والے نے پرس اور موبائل اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھ لیے تھے۔ گردیزی نے اپنے ہونٹ خشک ہوتے محسوس کیے۔
جلد ہی کار اس گلی میں مڑی جس کے بارے میں اس نے کہا تھا۔
اس گلی میں ٹریفک نہیں تھا۔ اِکّا دُکّا راہ گیر آجارہے تھے۔
''بس روک دو گاڑی'' اس نے کہا۔ ''یہاں میں اتر جاؤں گا۔ میرے اترتے ہی تم سیدھے نکلے چلے جانا۔ اس طرف بھی مین روڈ ہے۔ اگر تم لوگوں نے شور مچایا تو میں تمہاری کار پر گولیاں برسادوں گا۔ تم دونوں مارے جاسکتے ہو۔''
شوفر نے گاڑی روک دی۔ اس نے تیزی سے اتر کر دروازہ بھی بند کردیا۔ اس وقت پستول اس نے چھپالیا تھا ورنہ کسی راہ گیر کی نظر اس پر پڑ جاتی۔
''تیزی سے نکل چلو۔'' گردیزی نے شوفر سے کہا۔ وہ اس وقت اس طرح ہانپنے لگا تھا جیسے کوئی چڑھائی طے کی ہو۔
''پپ..... پولیس اسٹیشن؟''
''نہیں۔''
گردیزی جانتا تھا کہ اس قسم کی رپورٹس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس نے پرس اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ پستول والے نے صرف رقم نکالنے پر اکتفا کیا تھا۔ پرس سیٹ پر ہی ڈال گیا تھا۔
پندرہ منٹ میں وہ دفتر پہنچ گیا۔ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے ٹیلی فون پر اپنے موبائل کا نمبر ملایا۔ اسے توقع تھی کہ کوئی جواب نہیں ملے گا۔ اس کے موبائل کی سم نکالی جاچکی

ہوگی لیکن اس وقت اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا جب دوسری طرف نہ صرف گھنٹی بجی بلکہ کال بھی ریسیو کی گئی۔

''سنو!'' دوسری طرف سے بڑے سرد لہجے میں کہا گیا۔ ''میرا یہ خیال تو صحیح ثابت ہوا ہے کہ تم نے رپورٹ کرانے کے لیے پولیس اسٹیشن کا رخ نہیں کیا۔ اب دوسری عقل مندی یہ بھی کرنا کہ اس کمپنی کو بھی چوری کی اطلاع نہ دینا جس کی سم تمہارے موبائل میں ہے۔ تم کوئی دوسرا موبائل خرید لو۔ یہ تمہارے لیے کوئی بڑا نقصان نہیں ہے۔ مجھے تمہارے روپوں کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ میں نے صرف اس لیے نکال لیے تھے کہ تمہارا ڈرائیور اسے عام قسم کی واردات سمجھے..... اگر تم نے میری ان ہدایات کے خلاف کچھ کیا تو اس کا خمیازہ بھی بھگتو گے۔''

گردیزی کا جواب سنے بغیر دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

ریسیور رکھنے کے بعد گردیزی کا ہاتھ ریسیور پر ہی رہ گیا۔ ایک بار پھر سنسناہٹ اس کی ایڑی سے چوٹی تک پھیل گئی تھی۔ اس کے دماغ میں پہلا خیال یہ آیا تھا کہ اس کا موبائل اڑانے کی حرکت بھی شاید انہی لوگوں کی ہو جنہوں نے اس کی بیٹی کو اغوا کیا تھا۔

مگر کیوں؟

اس کا جواب گردیزی کے پاس نہیں تھا۔

ان حالات نے اس کی حالت غیر کر دی تھی۔ ابتدا میں تو جب پارکنز نے اسے اخبار کے لیے سرمایہ فراہم کیا تھا تو اس نے اسے صرف ایک دوست کا خلوص سمجھا تھا لیکن جب جاوید اشرفی کے کالم چھپنا شروع ہوئے تھے تو پہلی مرتبہ اسے کسی گڑبڑ کا شبہ ہوا تھا اور اب جو حالات پیدا ہوئے تھے، انہوں نے تو اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ کسی خطرناک جال میں پھنس چکا ہے۔

دوسرے ٹیلی فون کی گھنٹی نے اسے چونکایا۔ اس کا دایاں ہاتھ ریسیور پر ہی جما رہا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے دوسرے فون کا ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آپریٹر بولا تھا۔ اس نے اطلاع دی تھی کہ پشاور سے اس کے اخبار کا نمائندہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔

''وہ بتا رہا تھا کہ موبائل پر آپ کال ریسیو نہیں کر رہے ہیں۔'' آپریٹر نے مزید کہا۔ ''حالانکہ اسے گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی ہے۔''

گردیزی کی ذہنی کیفیت اس وقت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنے اخبار کے نمائندوں سے بات کر سکتا، وہ بولا۔ ''اس سے کہو، میں کچھ مصروف ہوں۔ بعد میں اسے خود فون کر لوں گا۔''

آپریٹر کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ یہ بات اس کے لیے ناقابل فہم تھی کہ اس کے موبائل کی گھنٹی اب بھی بج رہی تھی۔ پشاور کے نمائندے نے یہی بتایا تھا۔ وہ خاصا الجھ گیا۔ اس کے موبائل سے سم اب تک نہیں نکالی گئی تھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ اسی فون کے ریسیور پر گردیزی کا ہاتھ تھا۔ یہ اس کا ڈائریکٹ فون تھا۔

''ہیلو!'' اس نے ریسیور اٹھاتے وقت بڑے تعجب سے دیکھا تھا کہ سی ایل آئی پر نظر آنے والے نمبر اس کے لیے اجنبی تھے۔

''گلاب خاں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

گردیزی چونکا۔ ''مگر یہ نمبر؟''

''میں دوسرے موبائل سے بات کر رہا ہوں۔ یہ پوچھنا تھا کہ اس کی کال تو نہیں آئی؟''

''میرا موبائل ہی چھن گیا ہے۔''

''کب؟''

گردیزی کو عجیب سا لگا کہ پارکنز ذرا بھی نہیں چونکا تھا۔ گردیزی نے اسے وقت بتایا۔

پارکنز بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ سوا گھنٹے بعد بھی تمہیں فون نہیں کیا گیا۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ فون نہیں کرے گا اور تمہاری بیٹی بھی خیریت سے رہے گی۔''

''ابھی اس شخص سے بھی بات ہوئی تھی جس نے موبائل چھینا تھا۔''

''کیا کہہ رہا تھا؟'' پارکنز نے پوچھا۔

گردیزی نے ساری بات بتا دی۔

پارکنز بولا۔ ''تم نے اس کی ہدایت کی خلاف ورزی تو نہیں کی؟''

''نہیں۔''

''یہ تم نے اچھا کیا۔ حالات ایسے ہی ہیں کہ تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔ اچھا خیر! میں نے بس یہی پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔''

گردیزی کا دماغ پھر چکرانے لگا۔ پارکنز نے وہ ساری باتیں بڑے سرسری انداز میں کی تھیں۔ گردیزی کے دماغ میں سوال ابھرا، کیا اس کا موبائل پارکنز ہی نے چھنوایا ہے؟

مگر کیوں؟..... کیوں؟..... کیوں؟

یہ سوالات گردیزی کے دماغ میں کسی وزنی شے کی طرح دھمک پیدا کر رہے تھے۔ وہ بے چینی سے اٹھا اور ٹہلنے

لگا۔ اس کی حرکات وسکنات سے اس کے بڑھے ہوئے اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔ پہلی مرتبہ اس کے دماغ میں یہ بات آ رہی تھی کہ کیا وہ اس شرط پر پولیس کو سب کچھ بتا دے کہ سارا معاملہ خفیہ رکھا جائے گا؟

✈✈✈

بابر کی کار میکڈونلڈ پہنچ گئی۔ سرخ شیراڈ پر اس کی نظریں فوراً پڑ گئیں۔ وہ پارک کی ہوئی کاروں کے پیچھے اس طرح کھڑی ہوئی تھی جیسے اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کسی کا انتظار ہو۔ اس کے قریب ہوتے ہوتے بابر نے اس کا نمبر بھی دیکھ لیا۔ وہی نمبر تھا جو گلاب خاں نے اسے بتایا تھا۔

بابر آہستگی سے اپنی کار شیراڈ کے برابر میں لے گیا تو اسے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص بھی نظر آ گیا۔ اپنے نقش ونگار کے باعث وہ کوئی غیر ملکی ہی معلوم ہو رہا تھا۔

''گلاب خاں۔'' وہ بابر کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ ''میری گاڑی کے پیچھے پیچھے آؤ۔''

بابر کے کچھ بولنے سے پہلے شیراڈ حرکت میں آ چکی تھی۔

بابر کے چہرے پر فکرمندی کے تاثرات تو پہلے ہی تھے، اب ان تاثرات میں تشویش کا رنگ بھی گھل گیا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ اس سے میکڈونلڈ ہی میں ملاقات ہوگی اور وہ وہیں اس سے ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی مانگے گا لیکن وہ اسے اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتا تھا۔

شیراڈ کے پیچھے پیچھے اپنی کار چلاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ صورت حال اس کی توقع کے خلاف سامنے آئی تھی۔

بہرحال، بابر نے سوچا، اس نے کچھ بندوبست تو کر ہی لیا ہے۔

سفر پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ شیراڈ قدیم طرز کے ایک چھوٹے سے بنگلے کے سامنے رکی جو مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

شیراڈ کی ہیڈ لائٹس بجھا کر وہ غیر ملکی اس سے اترا جواب تک بابر کو اپنا نام گلاب خاں بتاتا رہا تھا۔ بابر نے اسے پھاٹک کی طرف جاتے دیکھا۔ بابر نے اپنی کار کی ہیڈ لائٹس بند نہیں کی تھیں۔ ہلکی سی روشنی پھاٹک پر بھی پڑ رہی تھی۔ بابر نے اس میں قفل پڑا ہوا دیکھا۔ غیر ملکی اسے کھول رہا تھا۔ پھر اس نے پھاٹک بھی پوری طرح کھول دیا اور شیراڈ میں واپس آ بیٹھا۔ اس نے ہاتھ سے بابر کو اشارہ کیا تھا۔ اس اشارے کا مطلب یہ تھا کہ بابر بھی اپنی کار بنگلے کے احاطے میں لے آئے۔

بابر کے تذبذب میں اضافہ ہوا لیکن کچھ سوچنے اور فیصلہ کرنے کی مہلت اسے مل ہی نہیں سکی کیونکہ شیراڈ کے اندر جانے کے بعد اسے اپنی کار بھی حرکت میں لانا ہی پڑی تھی۔

چھوٹے سے بنگلے کا احاطہ بھی چھوٹا ہی سا تھا۔ دو کاریں کھڑی ہونے کے بعد وہاں بالکل گنجائش نہیں رہی۔ دائیں جانب چھوٹا سا لان تھا۔

شیراڈ کی ہیڈ لائٹس اور انجن بند ہوا تو بابر کو بھی ایسا ہی کرنا پڑا۔ غیر ملکی شیراڈ سے اتر کر قریب آیا۔

''اتر آؤ تم بھی۔'' اس نے بابر سے کہا۔ ''میں ذرا پھاٹک بند کر آؤں۔''

بابر کار سے اتر آیا۔ پھاٹک بند کر کے غیر ملکی لوٹا۔

''ہارڈ ڈسک لائے ہو نا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' بابر نے جواب دیا۔ ''بریف کیس میں ہے۔''

''تو بریف کیس نکال لو اور میرے پیچھے آؤ۔''

وہ تیزی سے بنگلے کے برآمدے کی طرف بڑھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے بابر کی طرف سے بالکل بے فکر ہو۔

بابر بریف کیس لے کر اس کے قریب پہنچا۔

برآمدے میں دو دروازے دائیں بائیں اور ایک سامنے کی جانب تھا۔ غیر ملکی نے اسی کا لاک کھولا۔ اب اس نے اپنی جیب سے ایک پنسل ٹارچ نکال لی تھی۔ اس کی روشنی میں وہ اندر داخل ہوا۔

روشنی میں بابر نے غیر ملکی کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ وہ نہایت سرخ وسفید رنگ کا مالک تھا۔ آنکھیں سمندر کی طرح سبزی مائل نیلی تھیں۔ گل مچھوں کی طرح سر کے بال بھی بھورے اور خاصے بڑے بڑے تھے۔

''آؤ!'' اس نے مڑ کر بابر سے کہا۔

اس وقت بابر کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئی تھیں۔ وہ اندر داخل ہوا۔ غیر ملکی نے دروازہ بند کیا اور پھر قریب ہی کے سوئچ بورڈ کے کئی بٹن دبائے۔ کمرا بقعہ نور بن گیا۔ وہاں کے فرنیچر سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کمرا صرف ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہوگا۔ اندرونی جانب اس کے دو دروازے تھے جن میں سے ایک بند تھا، دوسرے پر ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں کمپیوٹر رکھا تھا۔ اس کے سامنے ایک کرسی پڑی ہوئی تھی۔

''آؤ، بیٹھو!'' غیر ملکی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''معاف کرنا۔ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔ تمہاری خاطر مدارات نہیں کر سکوں گا۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' بابر نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

وہ ہنسا۔ ''سمجھ گئے تم؟''

''تمہیں دیکھ کر کوئی بھی سمجھ سکتا ہے کہ تم غیر ملکی ہو۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم! میرا نام پارکنز ہے۔''

''اور تمہارا تعلق کسی غیر ملکی ایجنسی سے ہے۔''

''حالات کے باعث تم یہ بھی سمجھ سکتے ہو، لیکن کیا اس سے تمہارے لیے کوئی فرق پڑتا ہے؟''

''نہیں۔'' بابر نے کہا۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ میرے ملک میں غیر ملکی سرگرمیاں بہت تیزی سے بڑھ رہی ہیں لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ میں صرف پیسا کمانا چاہتا ہوں۔ طریقہ کوئی بھی ہو۔''

''ہارڈ ڈسک نکالو۔'' پارکنز نے کہا۔ وہ بہت سکون سے باتیں کر رہا تھا لیکن بابر نے محسوس کر لیا کہ وہ ہارڈ ڈسک کے لیے بہت بے چین تھا۔

بابر نے ہنڈ سے سیٹ کر کے بریف کیس کھولا۔ اس میں سے ہارڈ ڈسک نکال کر تپائی پر رکھی، پھر جیب سے ایک یو ایس بی بھی نکال کر ڈسک کے قریب رکھ دی۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ سب کچھ کیوں؟'' بابر بولا۔

''ہاں۔'' پارکنز ایک ٹھنڈی سانس لے کر صوفے سے اٹھا اور ٹہلتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اس کا بے حد افسوس ہے کہ گردیزی کی حماقت سے میں تم جیسا ایک قلم کار ضائع کر بیٹھا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''جب تم یہ سمجھ چکے ہو کہ میرا تعلق کسی غیر ملکی ایجنسی سے ہے، تو پھر تم یہ اندازہ بھی لگا سکتے ہو کہ یہاں کی خفیہ ایجنسیاں میری دشمن ہوں گی۔''

بابر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

پارکنز بولتا رہا۔ ''ایک ایجنسی کو تمہارے قلمی نام، یعنی جاوید اشرفی پر شبہ ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے سرسری انداز میں گردیزی سے تمہارے بارے میں..... یعنی جاوید اشرفی کے بارے میں جاننا چاہا۔ جب گردیزی نے انہیں کچھ نہیں بتایا تو انہوں نے گردیزی کی بیٹی کو اغوا کر لیا۔''

''اوہ!'' بابر کے منہ سے نکلا۔

''اس وقت گردیزی کے اعصاب ٹوٹ گئے۔'' پارکنز کہتا رہا۔ ''وہ ان لوگوں کو تمہارا ای میل ایڈریس بتا بیٹھا۔ یہ تم بھی جانتے ہو گے کہ اس ذریعے سے ہر اس آدمی کا پتا لگایا جا سکتا ہے جس کا ای میل ایڈریس معلوم ہو جائے۔''

بابر کے ہونٹ بھنچ گئے۔

''زیادہ سے زیادہ کل صبح تک وہ تمہارے گھر تک بھی پہنچ جائیں گے۔'' پارکنز نے بات جاری رکھی۔ ''تمہارے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک کے باعث وہ جان لیتے کہ تمہی جاوید اشرفی کے نام سے لکھتے ہو۔ انہیں وہ معلومات بھی حاصل ہو جاتیں جو میں وقتاً فوقتاً تمہیں بھیجتا رہا ہوں۔ اس طرح انہیں میرا ای میل ایڈریس بھی معلوم ہو جاتا اور وہ میرا یہ گھر بھی ٹریس کر لیتے۔''

''ہوں!'' بابر نے ایک طویل سانس لی۔ فی الحال وہ کچھ بولنے کی پوزیشن میں تھا ہی نہیں۔ اس کے دماغ میں صرف یہ سوال چکرا رہا تھا کہ اب پارکنز آئندہ کے لیے کیا سوچے گا یا کیا سوچ چکا ہے؟

''اسی لیے میں نے تم سے ہارڈ ڈسک منگوائی۔'' پارکنز کہہ رہا تھا۔ ''یو ایس بی میں وہ سب کچھ اس لیے منتقل کروایا کہ اب یہ لیپ ٹاپ میں استعمال کی جا سکتی ہے۔ ہارڈ ڈسک تو لیپ ٹاپ میں لگ نہیں سکتی اور لیپ ٹاپ پر کام کرتے ہوئے اگر جگہ تیزی سے تبدیل کی جاتی رہے تو یہ کام کرنے والے کو ٹریس نہیں کیا جا سکتا۔''

''تو کیا اب تم یہ چاہتے ہو کہ میں لیپ ٹاپ کے ساتھ تمہاری ہدایت کے مطابق کام کرتے ہوئے کراچی میں ادھر ادھر گھومتا رہوں؟''

''فوری طور پر..... میرا مطلب ہے جب میں نے تم سے ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی منگوائی تھی، میرے دماغ میں یہی خیال ابھرا تھا لیکن میں نے کراچی کی بات نہیں سوچی تھی۔ یہ سوچا تھا کہ تم کسی دور دراز شہر میں چلے جاؤ۔ کیونکہ اب خفیہ ایجنسی والوں کو تمہاری شخصیت کا علم ہو جائے گا اس لیے اگر تم کراچی میں رہے تو وہ تمہیں آسانی سے ڈھونڈ نکالیں گے۔ تم بیرون شہر جا کے ہی میری ہدایات کے مطابق کام کر سکتے ہو لیکن میں اس وقت سے اب تک اسی سوچ میں ہوں کہ کیا تم ایسا کر سکو گے..... میں اس بارے میں پوری یکسوئی سے سوچتا تو کوئی فیصلہ کر لیتا لیکن اس دوران میں مجھے دوسری الجھنیں بھی لاحق رہیں۔ موبائل پر میں اپنے دوسرے ساتھیوں سے رابطے میں رہا اور کیونکہ یہاں میں ہیڈ ہوں اس لیے ساری ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ مجھے ہر پہلو سے بچاؤ کے لیے سوچنا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ گردیزی نے شاید اپنے موبائل فون پر میرے بارے میں کچھ یادداشتیں فیڈ کر رکھی ہوں اس لیے میری ہدایت پر میرے آدمی نے اس سے اس کا موبائل فون چھین لیا ہے۔ اسی دوران میں مجھے ایک مرتبہ گردیزی سے بھی بات کرنا پڑی۔

احتیاطاً میں نے اپنا موبائل فون بھی بند کر دیا ہے اور سیٹلائٹ فون استعمال کر رہا ہوں۔ دراصل مجھے شبہ تھا کہ گردیزی کا موبائل فون اگر یہاں کی ایجنسی نے اس سے لے لیا تو انہیں میرا موبائل فون نمبر بھی معلوم ہو جائے گا۔ وہ میرا سراغ بھی لگا لیں گے۔''

''گردیزی سے تمہیں موبائل فون چھنوانا کیوں پڑا؟ کیا وہ تم سے تعاون نہیں کر رہا ہے؟'' بابر نے پوچھا۔

''وہ تعاون تو کر رہا تھا۔ اسی لیے میں نے اپنے ایک آدمی کو اس کے گھر بھیجا تھا۔ وہ گلاب خاں کا نام لیتا تو گردیزی اس کی ہر بات مان لیتا یا زیادہ سے زیادہ مجھے خود بھی اسے فون کرنا پڑتا لیکن اس کی نوبت نہیں آ سکی۔ میرے آدمی کی کار گردیزی کے بنگلے کے پھاٹک پر رکی ہی تھی کہ ادھر ادھر چھپے ہوئے کچھ آدمی اس پر جھپٹ پڑے۔ وہ یہاں کی خفیہ ایجنسی ہی کے لوگ ہوں گے۔ میرے آدمی کو دیکھتے ہی انہوں نے سمجھ لیا ہو گا کہ وہ مغربی ملک کا ہے۔ وہ اس نتیجے پر بھی پہنچ گئے ہوں گے کہ وہ میرا ساتھی ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنی طرف جھپٹتے دیکھ کر میرا آدمی وہاں سے بھاگ نکلا۔ ان میں سے کسی نے فائر کر کے میرے آدمی کی کار کا ٹائر برسٹ کرنا چاہا تھا لیکن اس کا نشانہ خطا گیا۔ پھر دوسرا فائر کرنے کی نوبت اس لیے نہیں آئی کہ میرے آدمی نے کار ایک سڑک پر موڑ لی تھی۔ خفیہ ایجنسی والے ایک کار میں بیٹھ کر اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ اگرچہ میرا آدمی ان کے ہاتھ نہیں لگ سکا لیکن میں نے اس سے موبائل فون پر رابطہ کر لیا تھا۔ میری ہی ہدایات کے مطابق عمل کر کے وہ یہاں کی ایجنسی والوں کو غچہ دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو سکا۔''

بابر نے اس دوران میں دو باتیں محسوس کیں۔ ایک تو یہ کہ پارکنز مضطرب تھا۔ اضطراب ہی کی وجہ سے وہ ہل ہل کر باتیں کر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ بولتے بولتے اس طرح رک بھی جاتا جیسے اس کے دماغ میں کوئی خیال آ گیا ہو۔ پھر کسی حد تک چونکے ہوئے انداز میں بولنا شروع کر دیتا۔

''ابھی ایک کام اور باقی ہے۔'' پارکنز کہہ رہا تھا۔ ''گردیزی کے کمپیوٹر کی ڈسک بھی میرے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے دو آدمیوں کو اس بارے میں ہدایات دے دی ہیں۔ وہ آج رات کسی وقت گردیزی کے گھر میں گھس کر ہارڈ ڈسک وہاں سے نکال لائیں گے۔''

بابر نے پرخیال انداز میں سر ہلایا، پھر بولا۔ ''تم نے میری اس بات کا جواب نہیں دیا کہ گردیزی سے موبائل چھنوانے کی ضرورت کیوں پیش آئی جبکہ وہ اب بھی تم سے تعاون کر رہا ہے۔''

''حالات کی وجہ سے۔'' پارکنز نے جواب دیا۔ ''مجھے اس کا موبائل جلد از جلد حاصل کر لینا تھا۔ میں نے اسے فون پر ہدایت کی کہ وہ پولیس والوں سے چھٹکارا حاصل کر کے.....''

''پولیس؟'' بابر چونکا۔

''ہاں۔'' پارکنز پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ''اس کے بنگلے کے پھاٹک پر رکنے والی کار اچانک بھاگ نکلی تھی اور اس پر کیے جانے والے فائر کی وجہ سے آس پاس کے علاقے میں ہیجان پھیل گیا تھا۔ ایسے میں کسی نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس وہاں پہنچ گئی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ مفرور کار گردیزی کے پھاٹک پر رکی تھی، اس لیے ظاہر ہے کہ پولیس والے گردیزی سے پوچھ گچھ تو کریں گے۔''

''ہوں۔'' بابر نے سر ہلایا۔

''تو میں یہ بتا رہا تھا کہ جب گردیزی اپنے گھر سے اپنے دفتر کی طرف روانہ ہوا تو.....''

پارکنز نے بابر کو وہ صورت حال بتائی جس سے گردیزی دوچار ہوا تھا۔ وہ جیسے ہی خاموش ہوا، بابر بول پڑا۔

''لیکن وہ آدمی گلاب خاں کا نام لے کر بھی تو گردیزی سے اس کا موبائل فون لے سکتا تھا۔''

''گردیزی کے ساتھ اس کا شوفر بھی تھا۔ اسے شبہ ہو جاتا۔ یہ بات ناممکن نہیں کہی جا سکتی کہ وہ کسی وقت پولیس کو کچھ بتا بیٹھتا۔''

بابر یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ پارکنز کے آدمی گردیزی کے گھر سے اس کے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک کس طرح حاصل کریں گے لیکن اس سوال کے بجائے بابر کا دھیان دوسری طرف چلا گیا۔

پارکنز ٹہلتے ٹہلتے اس اندرونی دروازے پر جا رکا تھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ پردہ بالکل درست حالت میں تھا لیکن گردیزی اسے ادھر ادھر سے خوامخواہ ٹھیک کرنے لگا۔

''تم بہت بے چین نظر آ رہے ہو پارکنز!'' بابر بولے بغیر نہ رہ سکا۔

پارکنز چونکے ہوئے سے انداز میں مڑا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''صحیح سمجھا تم نے! میں نے ابھی تمہیں بتایا تھا کہ انہی سب حالات میں الجھا رہنے کی وجہ سے میں فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ تم سے اب کس طرح کام لیا جائے۔ یہاں آنے کے بعد بھی تم سے باتیں کرتے ہوئے میں اسی سوچ بچار میں رہا ہوں۔''

اب بابر کی سمجھ میں آیا کہ پارکنز بے چین کیوں تھا اور

بولتے بولتے اچانک اس طرح رک کیوں جاتا تھا جیسے دماغ میں کوئی خیال آیا ہو۔

''لیکن آخر کار..... اب۔'' پارکنز نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہ پردہ ٹھیک کرتے ہوئے میں اس فیصلے پر پہنچا کہ اب پردہ گر جانا ہی مناسب ہوگا۔ کھیل ختم ہو چکا ہے۔''

''کیا مطلب!'' بابر نے تعجب سے پوچھا۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

پارکنز جہاں تھا، وہیں کھڑا رہا۔ اب اچانک اس کے چہرے پر گمبھیر تاثرات پھیل گئے تھے۔

''بابر!'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''میں دراصل اب تک یہ سوچتا رہا ہوں کہ اب تم سے کام لوں یا نہ لوں! ایک صورت یہ ممکن تھی کہ میں تمہیں ایک لیپ ٹاپ کے ساتھ اس شہر سے کہیں دور بھیج دیتا لیکن آخر میں اس نتیجے تک پہنچ گیا ہوں کہ یہ ممکن نہیں۔ تم ساری زندگی تو اپنے گھر والوں سے دور نہیں رہ سکتے۔ کسی نتیجے تک پہنچنے ہی کے لیے میں تم سے اتنی دیر تک باتیں کرتا رہا ہوں، لیکن مجھ سے ایک غلطی اور ہوئی۔ میں نے تمہیں ایسی باتیں بھی بتا دیں جو مجھے نہیں بتانا چاہیے تھیں۔ ان باتوں سے پہلے میں یہ فیصلہ بھی کر سکتا تھا کہ اب تم اپنے گھر واپس چلے جاؤ۔ یہاں کے ادارے تم پر کوئی سنگین مقدمہ نہیں بنا سکتے تھے۔ تمہارا یہ بیان کافی ہوتا کہ تم نادانستگی میں کسی کے آلۂ کار بن گئے تھے لیکن اب یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تمہیں واپس بھیج دوں۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ تمہیں اپنے ملک اور یہاں حکومت کرنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن میری یہ باتیں، جو میں ابھی کر چکا ہوں، اگر کسی وقت بے خیالی میں بھی تمہاری زبان پر آ گئیں تو میرے لیے پریشانی کا سبب بن سکتی ہیں۔''

''تو؟'' بابر بے چین ہوا۔ ''اب تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''ابھی میں نے کہا تھا نا! پردہ گر جانا چاہیے۔ کھیل ختم ہو چکا ہے۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھا!''

''مجھے بے حد افسوس ہے۔'' پارکنز نے دھیمی آواز میں کہتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ''تم نے میرے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا لیکن اب تمہاری زندگی میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔'' اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب سے باہر آیا تو بابر کا سارا جسم سنسنا گیا۔

پارکنز کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نال بابر کو نشانہ بنائے ہوئے تھی۔ بابر گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔

''میں ابھی کہہ چکا ہوں بابر کہ مجھے بے حد افسوس ہے۔ مجھے یہ فیصلہ مجبوراً کرنا پڑ رہا ہے۔'' پارکنز نے کوٹ کی دوسری جیب سے سائیلنسر نکالا اور ریوالور کی نال پر فٹ کرنے لگا۔

''مجھے خیال آیا تھا کہ میں کسی خطرے میں پڑ سکتا ہوں۔'' بابر نے تیزی سے کہا۔ ''اسی لیے میں نے اپنے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی کہیں اور پہنچا دی ہے۔''

''کیا!'' پارکنز چونکا۔

''ہاں۔'' بابر نے کہا۔ ''میں نے تم سے بہانہ کیا تھا کہ مجھے میرے والد نے کسی کام سے بھیج دیا ہے۔ دراصل میں ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی کسی جگہ چھپانے گیا تھا۔ جو ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی میں لایا ہوں، یہ خالی ہے۔ اس میں کچھ نہیں ہے۔ میرے پاس اسپیئر ہارڈ ڈسک بھی تھی۔''

پارکنز کا چہرہ فق پڑ گیا۔

''ہاں پارکنز!'' بابر نے کہا۔ ''اگر تم نے مجھے مار ڈالا تو وہ ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی میرے ایک دوست کو مل جائے گی اور تم اس کی وجہ سے پریشانی میں پڑ جاؤ گے۔'' وہ ہارڈ ڈسک ہی اب میری زندگی کی ضمانت ہے۔''

''بکواس کر رہے ہو تم اپنی جان بچانے کے لیے!'' پارکنز غرایا۔ اس کا لہجہ اب یکسر بدل گیا تھا۔

''یہاں کمپیوٹر موجود ہے۔'' بابر نے کہا۔ ''تم چیک کر سکتے ہو کہ یہ ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی خالی ہیں۔''

پارکنز کے چہرے سے اب بھی بے اعتباری مترشح تھی لیکن اس کے باوجود وہ غصے میں نظر آنے لگا تھا۔

بابر نے اس خیال سے سکون محسوس کیا کہ پارکنز اب اسے گولی نہیں مارے گا، وہ بولا۔ ''تم چیک کر لو یہ دونوں چیزیں۔''

پارکنز کے ہونٹ بھنچ گئے۔ وہ بابر کو بڑی تیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ غالباً اب اس کی بے اعتباری بھی ختم ہو رہی تھی۔

''چند قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔'' وہ یکا یک غرایا۔

بابر پیچھے ہٹ گیا تو پارکنز نے آگے آ کر ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی اٹھائی۔ اس کے ریوالور کا رخ اب بھی بابر ہی کی طرف تھا۔ کمپیوٹر کی طرف جاتے ہوئے بھی اس نے بابر کی طرف پشت نہیں کی تھی۔

بابر اب قدرے مطمئن ہونے کے باوجود اس خیال سے ہیجان اور پریشانی کا شکار بھی تھا کہ ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی خالی ملنے کے بعد پارکنز کا ردِ عمل کیا ہوگا۔

جلد ہی پارکنز کو معلوم ہو گیا کہ بابر نے غلط نہیں بتایا تھا۔

''اب مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں رہی۔'' وہ بابر کو گھورتے ہوئے کھا جانے والے انداز میں بولا۔ ''اور تمہیں یہ تو بتانا ہی پڑے گا کہ اصل ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی کہاں ہے؟''

''یہ بتا کر میں اپنی موت کو دعوت نہیں دے سکتا پارکنز!'' بابر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ حاصل کرنے کے بعد تم مجھے زندہ تو نہیں چھوڑو گے۔''

''یہ تو ظاہر ہے، لیکن اگر تم نہیں بتاؤ گے تو میں تمہارا وہ حال کر دوں گا کہ تم موت کی خواہش کرو گے۔''

''تم مجھ پر تشدد کرو گے؟''

''یقیناً۔''

''تو میں سسک سسک کر مر جاؤں گا لیکن زبان نہیں کھولوں گا۔'' بابر نے کہا۔ ''اگر موت ہر حال میں میرا مقدر بن چکی ہے تو میں دوسری صورت میں مرنے کو ترجیح دوں گا۔ اس طرح میرے بعد تم بھی نہیں بچ سکو گے۔ اصل ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی آخر کار یہاں کی ایجنسی والوں کو مل ہی جائے گی۔''

''اس سے پہلے کہ وہ ایجنسی والوں کے ہاتھ لگے، میں خود اس کا سراغ لگا لوں گا۔ وہ تم نے یا تو اپنے گھر پر ہی کہیں چھپائی ہوگی یا اس لڑکی کو دے آئے ہو گے جس سے تم محبت کرتے ہو۔ میں تمہارے بارے میں مکمل چھان بین کرنے کے بعد ہی تمہاری طرف متوجہ ہوا تھا۔ ہارڈ ڈسک میں کسی طرح بھی حاصل کر لوں گا اور موت تمہارا مقدر بن چکی ہے۔'' پارکنز کے انداز سے ایسا ظاہر ہوا جیسے اس نے فوراً ہی بابر کو گولی مار دینے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

بابر کے جسم میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ موت کو سامنے دیکھنا آسان نہیں ہوتا۔

یکا یک اس دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی جس سے وہ دونوں اندر آئے تھے۔ پارکنز چونکا۔ باہر سے کسی نے دروازے کو دھکا دیا۔ اندر سے بولٹ نہیں کیا گیا تھا، دروازہ چوپٹ کھل گیا۔

وہ منظر بابر کے لیے بھی حیران کن تھا کہ ریوالور ہاتھ میں لیے اندر آنے والی رخسار تھی۔

غصے اور گھبراہٹ میں پارکنز کے منہ سے کچھ عجیب سی آواز نکلی۔ اسی عالم میں اس نے بابر پر فائر جھونک دیا، اس کے بعد وہ رخسار کو نشانہ بنانا چاہتا ہوگا لیکن جس وقت پارکنز کے ریوالور سے گولی نکلی، ٹھیک اسی وقت رخسار کے ریوالور سے بھی فائر ہوا تھا۔

بابر کے جسم کو جھٹکا لگا، گولی اس کی پسلیوں کے پاس سے اس کے جسم میں داخل ہوئی تھی۔

رخسار کی چلائی ہوئی گولی نے پارکنز کے اس ہاتھ کو زخمی کیا تھا جس میں ریوالور تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ پارکنز نے فوراً اس دروازے کی طرف جست لگائی جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

''رک جاؤ!'' رخسار انگریزی میں چیخی۔ ساتھ ہی اس نے دوسرا فائر بھی کیا لیکن اس کا نشانہ خطا گیا۔ پارکنز دوسری طرف نکل گیا تھا۔

بابر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ اسی عالم میں وہ ڈگمگا کر فرش پر گرا۔ تیزی سے بہتا ہوا خون اس کے کپڑے تر بہ تر کر رہا تھا۔

✈✈✈

''بابر!..... بابر!'' رخسار کی آواز بابر کو کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں زور سے بھینچ کر کھولیں۔ اس طرح اس نے اپنی آنکھوں کے آگے آتا ہوا اندھیرا ختم کرنے کی کوشش کی تھی اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب رہا۔ اس نے دیکھا کہ رخسار اپنے بائیں ہاتھ میں دبا ہوا موبائل فون کان سے لگائے ہوئے تھی اور دوسرا ہاتھ اس نے بابر کے زخم پر سختی سے جما رکھا تھا۔ اس طرح وہ خون کے بہاؤ کی شدت روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا وہ ہاتھ بابر کے خون میں رنگا ہوا تھا۔

''وہ..... وہ..... پا..... پارکن.....'' بابر پورا نام نہیں لے سکا۔

''اگر تم اس غیر ملکی کی بات کر رہے ہو تو وہ فرار ہو چکا ہے۔ اس کمرے میں ایک کھڑکی ہے جس سے.....'' رخسار نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور موبائل فون پر کسی سے کہنے لگی۔ ''ہاں خالد! میں ہی بول رہی ہوں۔ تم فوراً ایمبولینس لے کر میرے بتائے ہوئے پتے پر پہنچو.....! بہت جلدی خالد! بہت جلدی، ایمبولینس میں آکسیجن اور طبی امداد کا سامان ضرور ہونا چاہیے!'' پھر اس نے اس جگہ کے بارے میں بتایا جہاں بنگلا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسپتال کا نام بھی بتایا جو اس جگہ سے دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔

بابر کی پلکیں پھر جھکتی چلی جا رہی تھیں۔

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا بابر! تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔'' رخسار اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہذیانی انداز میں بولی مگر اس وقت اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ''میں پارکنز کا تعاقب کرتی لیکن تمہاری حالت کی وجہ سے.....'' اس کی آواز اس کے حلق میں گھٹ گئی۔

بابر نے اس کی آواز شاید ہی سنی ہو۔ اس پر غشی طاری ہونے لگی تھی یا طاری ہو چکی تھی۔

رخسار کی حالت اس وقت کچھ غیر سی تھی۔ ایک طرف بابر کا خیال تھا اور دوسری طرف اس غیر ملکی کے فرار ہو جانے کا افسوس! ساتھ ہی ساتھ یہ خیالات بھی اس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے کہ وہ بابر کے گھر والوں کو اس صورت حال کی اطلاع دے یا نہ دے۔

بابر اس وقت ہوش میں ہوتا تو حیران ضرور ہوتا کہ رخسار اچانک وہاں کیسے پہنچ گئی؟ اس کے پاس ریوالور کی موجودگی اور پھر گولی چلانے کی مشاقی؟ بابر کے لیے سبھی کچھ حیران کن ثابت ہوتا۔ اسے قطعاً علم نہیں تھا کہ رخسار جب فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی تو اس نے ''اسپائنگ اینڈ کاؤنٹر اسپائنگ'' کے نام سے انگریزی میں ایک مضمون لکھ کر ملک کے کئی خفیہ اداروں کو چونکا دیا تھا۔ انہی میں سے ایک ادارے نے اس سے رابطہ بھی کیا تھا۔ ان کی زبان سے سراغ رسانی کے معاملے میں اپنی بیٹی کی ذہانت کا علم ہونے پر کیف ہمدانی کو بے حد خوشی ہوئی تھی۔ رخسار کے لیے تو وہ بڑے خوش کن اور سنسنی خیز لمحات تھے جب اس ادارے نے اس کی خدمات حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس نے اس شرط کے ساتھ اس ادارے کی پیشکش قبول کر لی کہ وہ اپنی تعلیم نامکمل نہیں چھوڑے گی۔ خود کیف ہمدانی بھی یہی چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی کم از کم گریجویشن ضرور کر لے۔

خفیہ ادارے نے رخسار کی شرط مان لی تھی۔ اس کے بعد کا ڈھائی سال کا عرصہ اس طرح گزرا تھا کہ رخسار نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی تھی اور خفیہ ادارہ اس کی تربیت بھی کرتا رہا تھا۔

چھ ماہ قبل رخسار اس ادارے کی باقاعدہ رکن بن چکی تھی۔ اس عرصے میں اس نے دہشت گردوں کے ایک گروہ کے چار آدمیوں کو گرفتار بھی کرایا تھا لیکن ادارہ خود یہ چاہتا تھا کہ رخسار جب تک اپنی تعلیم مکمل نہ کر لے، اس پر زیادہ کام کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔

رخسار بھی اپنی تعلیم پر بھرپور توجہ دے رہی تھی کیونکہ یہ اس کا آخری سال تھا لیکن شہر کے حالات اور چار دہشت گردوں کو گرفتار کرانے کے باعث وہ خود کو خطرے میں محسوس کرتی تھی۔ اسی خطرے کے باعث اسے محتاط رہنا پڑتا تھا۔ جب بھی وہ گھر نکلتی، اس کے پاس ریوالور ضرور ہوتا تھا۔

اس رات جب بابر نے پریشان سے لب و لہجے میں اس سے موبائل پر بات کی اور اس سے ایک خاص جگہ پہنچ کر ملاقات کے لیے کہا تو بھی وہ ریوالور کے ساتھ ہی وہاں پہنچی تھی۔ بابر جب اسے بریف کیس دے کر گیا تھا تو وہ بہت فاصلے سے اس کی کار کے تعاقب میں لگ گئی تھی۔ اس نے بابر کے چہرے سے ظاہر پریشانی سے اندازہ لگا لیا تھا کہ بابر کسی غیر معمولی صورت حال سے دوچار ہے۔ یہ اندازہ اس وقت یقین میں بدل گیا جب اس نے بابر کی کار ایک سرخ شیراڈ کے پاس رکتے دیکھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی غیر ملکی بیٹھا تھا۔

جب بابر کی کار سرخ شیراڈ کے پیچھے جا رہی تھی، اس وقت بھی رخسار نے بابر کا تعاقب جاری رکھا تھا۔

بنگلے میں ان دونوں کے چلے جانے کے بعد رخسار اپنی کار کچھ فاصلے پر کھڑی کر کے بابر کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگی تھی لیکن اس سے زیادہ انتظار نہیں ہو سکا تھا۔ بابر کی پریشانی اسے احساس دلا رہی تھی کہ بابر کسی خطرے میں پڑ سکتا تھا۔

اس کے بعد ناممکن تھا کہ رخسار اس بنگلے میں داخل نہ ہوتی۔ وہ کمرے کے دروازے پر اس وقت پہنچی تھی جب پارکنز بابر سے کسی ہارڈ ڈسک کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ وہ اسے کسی نہ کسی طرح حاصل کر لے گا اور بابر کو ختم کرنا اب اس کے لیے لازمی ہو چکا ہے۔

رخسار نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اندر سے بند نہیں تھا لہٰذا وہ دروازے کو زور سے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو گئی تھی۔ تربیت کے باعث رخسار کو یقین تھا کہ دروازہ کھلنے کی غیر متوقع آواز بابر کے دشمن کو چونکا دے گی لہٰذا وہ انہی دو تین لمحوں میں صورت حال کو اپنے حق میں کر لے گی لیکن جب اس نے دیکھا کہ پارکنز بابر پر گولی چلانے ہی والا تھا تو وہ بھی پارکنز کے ہاتھ پر فائر کر بیٹھی۔

پارکنز زخمی تو ہو گیا تھا لیکن وہ دوسرے کمرے کی کھڑکی سے کود کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا اور رخسار اس کے پیچھے جانے کے بجائے بابر کو دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

اب اس نے خالد نامی جس شخص کو ایمبولینس کے ساتھ بلایا تھا، وہ خفیہ ادارے میں اس کے ساتھ کام کرتا تھا۔ خالد جب ایمبولینس کے ساتھ وہاں پہنچا تو رخسار بے ہوش بابر کو کسی نہ کسی طرح کمرے سے برآمدے میں لے آئی تھی۔

جس وقت بابر کا اسٹریچر ایمبولینس میں چڑھایا جا رہا تھا، رخسار نے خالد سے پوچھا۔ ''تمہاری گاڑی کہاں ہے؟''

''میں ایمبولینس میں ہی آ گیا۔ کار اسپتال میں چھوڑ دی تھی۔''

''یہ اچھا ہوا۔'' رخسار نے کہا۔ ''تم میری گاڑی میں آؤ۔ میں ایمبولینس میں ہی جاؤں گی۔''

اسی وقت ایک اور تیز رفتار کار وہاں آ کے رکی۔ اس میں سے چار آدمی اتر کر تیزی سے آگے آئے۔ ان لوگوں کا تعلق بھی رخسار ہی کے ادارے سے تھا۔ انہیں بھی رخسار ہی نے فون کر کے بلایا تھا۔ اس نے ان تینوں کو اس بنگلے اور وہاں موجود سرخ شیراڈ کے بارے میں بتایا اور ایمبولینس میں سوار ہو گئی۔

ایمبولینس میں موجود اسپتال کے افراد بابر کو ابتدائی طبی امداد دینے میں مصروف ہو گئے۔ یہ ضروری تھا کہ بابر کے خون کا بہاؤ کم سے کم کیا جا سکے۔ اتنی دیر میں بھی اس کا اتنا خون بہہ چکا تھا کہ چہرے پر زردی چھانے لگی تھی۔

''بابر!'' رخسار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ ''یہ میرا عہد ہے اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں اس شخص کو ڈھونڈ کر اس کے ٹکڑے اڑا دوں گی۔''

ایمبولینس سائرن بجاتی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔

رخسار نے موبائل فون پر خالد سے رابطہ کیا۔

''میری گاڑی میں ایک بریف کیس ہے خالد!'' اس نے کہا۔ ''وہ نمبروں کی ترتیب سے کھل سکتا ہے اور نمبروں کا مجھے علم نہیں۔ تم اسے توڑ ڈالو اور دیکھو کہ اس میں کیا ہے، میں تمہاری کال کا انتظار کروں گی۔''

اس کو یہ ہدایت دینے کے بعد رخسار نے اپنے والد کیف ہمدانی سے رابطہ کیا۔ باپ کو اس نے صرف اتنا بتایا کہ بابر کو کسی نے گولی مار دی ہے اور وہ بابر کو اسپتال لے جا رہی ہے۔

''یہ کیسے ہوا؟'' کیف ہمدانی نے تیزی سے پوچھا، پھر جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔ ''تم نے بھائی صاحب کو اطلاع دی؟''

''انہیں آپ فون کیجیے! بس خیریت معلوم کیجیے! انہیں ابھی کچھ اور نہ بتائیں تو بہتر ہے۔ بابر کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' رخسار کی آواز بھرا گئی۔ پھر اس نے اس اسپتال کا نام بتایا جہاں وہ بابر کو لے جا رہی تھی۔

بات ختم کرنے کے بعد وہ بے چین نگاہوں سے بابر کی طرف دیکھنے لگی جسے آکسیجن دی جا رہی تھی۔

ایمبولینس اسپتال کے قریب پہنچنے والی تھی۔ رخسار نے خالد کی کال وصول کی۔ ''میں نے کھول لیا ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''اس میں کسی کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک اور ایک یو ایس بی کے علاوہ کچھ نہیں۔''

ہارڈ ڈسک کی بات نے رخسار کو چونکا دیا۔ وہ اس بنگلے

بدصورت

ایران کے جزیرۂ کیش کے ایک مرد درویش نے اپنی بدصورت بیوی کو چہرے پر پاؤڈر لگاتے ہوئے دیکھ کر کیا ہی اچھا جملہ کہا۔ ''جب تقدیر کے ہاتھوں نے تجھے بدصورت بنایا ہے تو پھر چہرے پر پاؤڈر ملنے سے کیا حاصل؟ نہ تو طاقت سے نیک بختی خریدی جا سکتی ہے اور نہ ہی اندھی آنکھ سرمہ لگانے سے روشن ہو سکتی ہے۔ کتے سلائی کا کام نہیں کر سکتے اور کمینے نیک بختوں والا کام نہیں کر سکتے اور اگر یونان و روم کے تمام فلسفی بھی اکٹھے ہو جائیں تو تھور سے شہد نہیں بنا سکتے۔ جتنی بھی کوشش کر لو وحشی، انسان نہیں بن سکے گا، کوشش ہی ضائع ہو گی۔ آئینہ کا زنگ تو صاف ہو سکتا ہے مگر پتھر کا آئینہ بننا محال ہے۔ بیر کی شاخ سے پھول کبھی نہ اگے گا اور حبشی کو پورا سمندر بھی سفید نہ کر سکے گا۔

شیخ سعدیؒ کی کتاب ''بوستان سعدی'' کے ترجمہ مولانا غلام حسن قادری سے اقتباس

طمع

ایک بھوکی بلی ایک فاقوں کی ماری ہوئی بوڑھی عورت کے گھر میں گھس گئی۔ چند دن بچے کچھے ٹکڑے کھا کر گزارا کرتی رہی۔ ایک دن ترنوالے کے لالچ میں امیر شہر کے محل میں جا کر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ امیر کے نوکروں نے ایسا تیر مارا کہ بے چاری بلی زخمی ہو کر بھاگ نکلی، خون ہڈیوں سے بہہ رہا تھا اور زبان حال سے کہہ رہی تھی۔ ''اگر خدا نے میری جان بچائی تو میں چوہے کھا کر گزارا کر لوں گی لیکن بڑھیا کی جھونپڑی نہیں چھوڑوں گی۔''

شیخ سعدیؒ کی کتاب ''بوستان سعدی'' کے ترجمہ مولانا غلام حسن قادری سے اقتباس

مرسلہ: محمد مجید ارشد خان، لیہ

میں غیر ملکی کی آواز سن چکی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ہارڈ ڈسک تو کسی نہ کسی طرح حاصل کرلی جائے گی۔

''خالد!'' رخسار نے تیزی سے کہا۔ ''تم اسپتال کی طرف آنے کے بجائے سیدھے اپنے گھر جاؤ۔ ہارڈ ڈسک اپنے کمپیوٹر میں لگا کر دیکھو کہ اس میں کیا ڈیٹا ہے اور یو ایس بی بھی چیک کرلینا۔''

''بہتر۔''

رخسار نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس وقت ایمبولینس اسپتال کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ رخسار نے وہاں دو پولیس موبائلز دیکھیں۔

بابر کو ایمبولینس سے اتار کر تیزی سے آپریشن تھیٹر کی طرف لے جایا جانے لگا۔ اس وقت پولیس والے بھی تیزی سے قریب آگئے۔ وہ رخسار کو کیف ہمدانی کی بیٹی کی حیثیت سے جانتے تھے۔ وہ اپنے ایس پی کی ہدایت پر وہاں پہنچے تھے اور اسپتال میں خود ایس پی بھی موجود تھا۔ رخسار سمجھ گئی کہ ایس پی کو اس کے والد نے اسپتال پہنچنے کی ہدایت کی ہوگی۔

ایس پی کے ساتھ رخسار بے چینی سے آپریشن تھیٹر کے سامنے ٹہلنے لگی۔ ایس پی کو اس نے ٹھیک ٹھیک نہیں بتایا کہ بابر کو کہاں گولی ماری گئی تھی اور کس نے ماری تھی۔

رخسار کے موبائل کی گھنٹی بجی تو اس نے دیکھا کہ کال اس کے والد کی تھی۔

''جی ڈیڈی!'' اس نے کال ریسیو کی۔

''میں اسپتال آرہا تھا رخسار.....''

وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن رخسار تیزی سے بول پڑی۔

''آپ نے چچا جان کو فون کیا؟''

''کر چکا ہوں، بھائی صاحب تو ابھی اسٹور پر ہی ہیں۔ بھابی اور عنبر پریشان ہیں۔ بابر بڑی پریشانی کی حالت میں گھر سے گیا تھا۔ عنبر اور بھابی کی پریشانی کا سبب بابر کی یہ بات ہے کہ وہ شاید کچھ دن کے لیے شہر سے چلا جائے۔''

آخری جملہ رخسار کے لیے قابل غور تھا۔

''بہرحال۔'' کیف ہمدانی کی بات جاری رہی۔ ''میں نے ابھی ان لوگوں کو بابر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ میں اسپتال پہنچ کر تم سے اس بارے میں بات کرتا لیکن راستے ہی میں مجھے ایک ایسا فون مل گیا کہ میں اب دفتر کی طرف جارہا ہوں۔ اطلاع ملی ہے کہ بہ یک وقت دو علاقوں میں دو گروہوں میں تصادم ہوگیا ہے۔ شدید فائرنگ ہو رہی ہے۔ ہدایات تو میں نے جاری کر دی ہیں لیکن دفتر جا کے ساری صورت حال مانیٹر تو کرنا ہوگی۔ تم مجھے بابر کی حالت سے باخبر کرتی رہنا۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو بھائی صاحب اور.....'' ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ کیف ہمدانی نے خاموشی اختیار کرلی۔

''میں آپ سے رابطے میں رہوں گی۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ کیف ہمدانی کا مزاج کچھ ایسا ہی تھا۔ اگر بابر کے بجائے رخسار کو گولی لگی ہوتی تب بھی وہ اپنے بنیادی فرائض کو ترجیح دیتا۔

آدھے گھنٹے بعد رخسار نے خالد کی کال ریسیو کی۔

''ڈسک چیک کرلی ہے میں نے۔'' خالد کہہ رہا تھا۔ ''اس سے تو ظاہر ہو رہا ہے کہ بابر صاحب جاوید اشرفی کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے اور یہ ڈسک انہی کے کمپیوٹر کی ہے۔''

رخسار چونک گئی۔

خالد کہتا رہا۔ ''بابر صاحب کا کسی گلاب خاں سے بھی رابطہ تھا۔ اس سے بابر صاحب کو بڑی اہم بلکہ غیر معمولی رپورٹس ملا کرتی تھیں۔''

''ڈسک محفوظ کر کے فوراً اسپتال آجاؤ۔'' رخسار نے تیزی سے کہا۔ ''گلاب خاں کا ای میل ایڈریس مجھے ایس ایم ایس کردو۔''

''بہتر۔''

رخسار کے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی تھی۔ یہ جان کر اس کے دماغ کو خاصا جھٹکا لگا تھا کہ بابر ہی جاوید اشرفی تھا۔ اس نے موبائل پر اپنے ادارے کے ایک شخص جعفری سے رابطہ کیا۔

''خیریت تو ہے رخسار صاحبہ!'' جعفری خوش مزاجی سے بولا۔

''ایک بات پوچھنا ہے۔ جاوید اشرفی کے بارے میں تحقیقات کی ذمے داری آپ ہی کو سونپی گئی تھی۔ کچھ معلوم ہوا اس کے بارے میں؟''

''آپ کو اس کا خیال کیوں آگیا؟'' جعفری نے تعجب سے پوچھا۔

''تفصیلی بات ہے۔ ملاقات پر ہی ہوسکے گی لیکن فی الحال میں کہیں الجھی ہوئی ہوں۔ آپ میری بات کا جواب تو دے دیں۔''

''بس اب کچھ ہی دیر میں وہ جگہ معلوم ہوجائے گی جہاں سے جاوید اشرفی اخبار کے ایڈیٹر کو اپنے مضمون ای میل کرتا تھا۔''

''اب اس چکر میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔'' رخسار

نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ جاوید اشرفی فرضی نام ہے۔ اس نام سے جو شخص کالم لکھتا تھا، وہ اس وقت اسپتال میں ہے۔ اسے گولی ماری گئی ہے۔''

''وہاٹ!'' جعفری تقریباً چیخ پڑا۔

''جی ہاں۔'' رخسار نے کہا۔ ''آپ اسپتال آجائیں تو بہتر ہوگا۔''

''میں آتا ہوں۔'' جعفری نے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی تھی۔ ''لیکن جہاں میں ہوں، یہاں مجھے پانچ منٹ لگیں گے۔ یہاں سے میں سیدھا اسپتال ہی آؤں گا۔ اسپتال.....؟''

رخسار نے جعفری کی بات مکمل ہونے سے پہلے اسپتال کا نام بتادیا۔

✈✈✈

جعفری نے موبائل بند کر کے گردیزی کی طرف دیکھا۔ اس کی بیٹی افروز صوفے پر اس کے شانے سے لگی بیٹھی تھی۔ وہ گردیزی کے دفتری کمرے کے برابر کا کمرا تھا۔

''یہ آپ کے حق میں بہت اچھا ہوا ہے کہ آپ نے مجھے سارے حالات سے آگاہ کردیا۔ اگر آپ رازداری برتتے تو آپ کے لیے سخت مشکلات پیدا ہوسکتی تھیں۔ اب آپ سرکاری گواہ بن کر اس بکھیڑے سے نکل جائیں گے۔ آپ کو یقین تو آچکا ہے نا کہ آپ ایک غیر ملکی ایجنٹ کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے ہیں؟''

''اب اس میں کسی شبہے کی گنجائش ہی نہیں۔'' گردیزی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''پارکنز نے بھی بڑے یقین سے کہا تھا کہ میری بیٹی کو کچھ نہیں ہوگا۔ غیر ملکی ایجنٹ ہونے ہی کی وجہ سے اس کو خیال آیا ہوگا کہ میری بیٹی کے اغوا میں مقامی ایجنسی کا ہاتھ ہے جو ظاہر ہے کہ میری بیٹی کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔''

''اب آپ صبح تک اپنے گھر نہیں جائیے گا اور اپنی بیٹی کو بھی یہیں رکھیے گا۔ دفتر میں بھی کسی کو معلوم نہیں ہونے پائے کہ آپ کی بیٹی یہاں ہیں۔''

جعفری افروز کو برقعہ اوڑھا کر بہت خفیہ طریقے سے گردیزی کے دفتر پہنچ کر اس سے ملا تھا۔

گردیزی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ افروز اس دوران میں بالکل خاموش بیٹھی رہی تھی۔

جعفری کھڑا ہوگیا۔

''اگر پارکنز مجھے فون کرے؟'' گردیزی جلدی سے بولا۔

''آپ اپنی بیٹی کے سلسلے میں پریشانی کا ہی اظہار کرتے رہیے گا۔'' جعفری نے کہا۔ ''اس کے علاوہ آپ نے کوئی بات کی تو وہ آپ کے حق میں بہتر نہیں ہوگی اور مجھے اس بات کا علم بھی ہوجائے گا۔ اس وقت آپ کے تمام فون انڈر آبزرویشن ہیں۔ آپ کی بیٹی کا موبائل فون فی الحال میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے اور آپ کا موبائل فون چھینا جاچکا ہے۔ اس بارے میں آپ یقین کرلیں کہ وہ اس وقت پارکنز کے پاس ہوگا۔ اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ آپ سے دو ایک باتیں اور کرنا تھیں لیکن وہ کچھ زیادہ اہم نہیں۔ بعد میں بھی کی جاسکتی ہیں۔ مجھے ابھی جلد از جلد کسی جگہ پہنچنا ہے۔''

گردیزی اپنی جگہ سے اٹھا۔ وہ کبھی کبھی اپنے دفتر آنے کے لیے ایک ایسا راستہ بھی استعمال کرتا تھا کہ دفتر والوں کو اس کے آنے جانے کا علم ہی نہیں ہو پاتا تھا۔ جعفری افروز کو لے کر اسی راستے سے آیا تھا۔ اب اسی راستے سے وہ رخصت بھی ہوا۔

کار تیز رفتاری سے اسپتال کی طرف روانہ ہوئی لیکن روانگی سے قبل جعفری نے ایس ایم ایس کے ذریعے اپنے کسی آدمی کو پارکنز کے ای میل ایڈریس سے آگاہ کرنے کے بعد مختصر ہدایات بھی دی تھیں۔ پارکنز کا وہ ایڈریس اسے

جنت میں داخلے کا سبب

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کہا۔

''مجھے ایسا عمل بتائیں جو مجھے جنت میں داخل کردے؟'' لوگوں نے کہا۔ ''اسے کیا ہے، اسے کیا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ ''اسے کوئی اہم حاجت ہے؟ (پھر اس کے سوال کے جواب میں فرمایا) تو صرف ایک اللہ کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کر، نماز قائم کر، زکوٰۃ ادا کر اور صلہ رحمی کر (یعنی قرابت داروں کا حق ادا کر)

صحیح بخاری سے اقتباس

مرسلہ: محمد قیصر شہزاد، داجل، ضلع راجن پور

گردیزی ہی سے معلوم ہوا تھا اور اسے اب ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ گردیزی نے اسے غلط ایڈریس بتایا ہوگا۔ اس کے علاوہ آئندہ بھی اس کی طرف سے دھوکا دہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ بہت خوف زدہ ہو چکا تھا۔

جعفری اس وقت اسپتال پہنچا جب بابر کو آپریشن تھیٹر سے آئی سی یو میں منتقل کیا جارہا تھا۔ جعفری نے حیرت سے دیکھا کہ اس وقت رخسار کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

جعفری کے چہرے پر آنے والا سوال رخسار نے پڑھ لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہ میرا کزن بابر ہے جعفری!''

جعفری چونکا۔ ''کیف صاحب کا بھتیجا؟''

''ہاں۔'' رخسار نے جواب دیتے ہوئے رومال سے اپنی آنکھیں خشک کیں اور ایک طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''چلیں کینٹین میں چل کر بات کرتے ہیں۔ بابر سے ابھی ملاقات نہیں ہوسکتی۔ گولی تو اس کے جسم سے نکال لی گئی ہے۔ گولی سے مہلک زخم بھی نہیں آیا ہے لیکن خون بہت زیادہ نکل جانے کے باعث.....'' اس کی آواز پھر رندھ گئی۔

''ڈاکٹر نے کہا ہوگا کہ ابھی اس سے ملاقات نہیں کی جاسکتی۔''

''ہاں۔'' رخسار نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ بابر ہی جاوید اشرفی کے نام سے.....''

''بیٹھ کر باتیں کریں گے۔'' رخسار نے بات کاٹ دی۔

جعفری اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

وہ دونوں کینٹین کے ایک گوشے میں جا بیٹھے! جعفری سوالیہ نظروں سے رخسار کی طرف دیکھنے لگا۔

رخسار نے پوچھا۔ ''ہمارے ادارے کو جاوید اشرفی کے نام پر کیا شبہ تھا کہ آپ کو اس کے بارے میں چھان بین کی ہدایات ملیں۔''

''شبے کا سبب اس کے اخباری کالم بنے تھے۔'' جعفری نے جواب دیا۔ ''باہر سے ہمارے ادارے کو اطلاعات ملی تھیں کہ آئندہ انتخابات سے پہلے پہلے شوکت باجوہ کو قومی دھارے میں لانے اور اسے ایک مقبول لیڈر بنانے کی کوششیں کی جائیں گی۔ ایک مغربی طاقت اسے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے اور اس کام کے لیے کئی جاسوس بھی غیر قانونی یا قانونی طور پر ہمارے ملک میں بھیج دیے گئے ہیں۔ انہی اطلاعات کے باعث جاوید اشرفی پر شبہ کیا گیا کیونکہ وہ اپنے کالموں میں شوکت باجوہ کی کیریکٹر بلڈنگ کررہا تھا۔''

''اس وقت تفصیلات میں نہ جایئے گا۔'' رخسار بولی۔ ''میرا ذہن بابر میں الجھا ہوا ہے۔ مختصر طور پر بتا دیجیے کہ اب تک کی پروگریس کیا ہے!''

''تین غیر ملکی ہماری نظر میں آچکے ہیں۔ ان کی کڑی نگرانی کی جارہی ہے۔ وہ صحافیوں سے میل جول بڑھا رہے ہیں۔ ان کے موبائل فون کے ایس ایم ایس ٹریس کرنے سے اندازہ ہوا ہے کہ ان لوگوں کی تعداد پانچ ہے اور انہی پانچوں میں سے ایک ان چاروں کا ہیڈ ہے۔ آج ایک نیا نام سامنے آیا ہے۔ میرا مطلب ہے، چوتھا شخص!..... پانچواں ابھی سامنے نہیں آیا۔ آپ ابھی بتا چکی ہیں کہ بابر صاحب کو جس غیر ملکی نے گولی ماری تھی، اس کا نام پارکن ہے لیکن بات شاید یوں ہے کہ بابر صاحب زخمی ہونے کے باعث اس کا پورا نام زبان پر نہیں لا سکے۔ اس کا نام غالباً پارکنز ہوگا۔ یہی نام مجھے گردیزی نے بتایا ہے جو اس اخبار کا مالک ہے جس میں جاوید اشرفی کے نام سے کالم چھپتے رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہی اپنے باقی چاروں ساتھیوں کا ہیڈ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ان پانچوں کو بہ یک وقت گرفتار کیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ آج ہی رات وہ پانچواں شخص بھی سامنے آجائے۔''

ان باتوں میں کئی مقامات ایسے تھے کہ رخسار کے ذہن میں کچھ سوالات ابھرنا چاہیے تھے لیکن وہ بابر کے بارے میں پوچھ بیٹھی۔

''اس سارے معاملے میں بابر کی قانونی پوزیشن کیا ہوگی؟''

''واقعی آپ کا ذہن بہت الجھا ہوا ہے۔'' جعفری نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''یہ آپ خود بھی سمجھ سکتی ہیں کہ بابر صاحب کے بیان سے پہلے ان کی قانونی پوزیشن واضح نہیں ہوسکتی مگر زیادہ امکان یہ ہے کہ ان پر کوئی بڑا چارج نہیں لگ سکے گا۔ اس قسم کے معاملات میں بعض صحافی نادانستہ طور پر غیر ملکیوں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں اور.....''

جعفری کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک ویٹر جو کچھ دیر سے ان کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا، آخر خود ہی ان کے قریب آگیا۔ جعفری نے اس سے چائے کے لیے کہہ کر اسے رخصت کردیا۔

رخسار نے یکا یک ایک جانب دیکھا تو جعفری کی

نظریں بھی اس کی طرف اٹھ گئیں۔ کینٹین میں داخل ہونے والا شخص خالد تھا جس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات بھی دبے ہوئے تھے۔ اسے کسی سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ رخسار کو کینٹین کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

''مجھے آنے میں کچھ دیر ہوگئی۔'' وہ قریب آکر چھوٹتے ہی بولا۔ ''دراصل ہارڈ ڈسک میں کچھ ایسی چیزیں تھیں جو مجھے مشتبہ محسوس ہوئیں۔ میں ان سب کے پرنٹ نکال لایا ہوں۔'' اس نے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذات رخسار کے سامنے رکھ دیے۔ وہ جعفری کو جانتا تھا ورنہ اس کے سامنے رخسار سے یہ سب کچھ نہ کہتا۔

''آپ دیکھ لیں۔'' رخسار نے کاغذات جعفری کی طرف بڑھاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

جعفری نے کاغذات اٹھائے اور ان پر اچٹتی سی نظریں دوڑانے لگا۔

خالد بولا۔ ''اس میں کسی گلاب خاں کے ای میل بھی ہیں جو مجھے مشتبہ معلوم ہوئے۔''

''بالکل ٹھیک۔'' جعفری کاغذات پر نظریں جمائے ہوئے بڑبڑایا۔ ''اس میں کچھ اہم سرکاری اطلاعات ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ جو پانچواں شخص ابھی میری نظر میں نہیں آیا، وہ اپنی جگہ سرکاری شخصیات میں بنا رہا ہے۔''

اس وقت رخسار چونکی جب اس نے ایک نرس کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ رخسار کچھ پریشان ہوکر کھڑی ہوگئی۔ جعفری نے اس کی حالت دیکھ کر کاغذات سمیٹ لیے۔ خالد بھی نرس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

''گھبرایئے نہیں۔'' نرس نے قریب آکر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ رخسار سے کہا۔ ''میں ایک اچھی اطلاع لائی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کو توقع نہیں تھی کہ بابر صاحب کو اتنی جلدی ہوش آجائے گا۔''

''اوہ!'' رخسار کے تن جانے والے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

''آپ آئی سی یو میں جاکر بابر صاحب سے مل سکتی ہیں۔'' نرس نے مزید کہا۔ ''لیکن زیادہ سے زیادہ دو منٹ کے لیے۔''

''شکریہ۔'' رخسار کے منہ سے نکلا اور اس نے تیزی سے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''چائے منگوائی تھی ابھی۔'' جعفری نے خالد سے کہا۔ ''تم بل ادا کردینا۔''

صبر اور اجر

حضرت علی کرم اللہ وجہہ بازار سے گزر رہے تھے۔ دکان دار گوشت فروخت کررہا تھا اس نے آپ سے کہا۔ ''سرکار، گوشت خرید لیجیے۔''

حضرت علی نے فرمایا۔ ''میری جیب اجازت نہیں دیتی۔''

اس نے کہا۔ ''میں آپ سے ادھار بھی کرسکتا ہوں۔''

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ ''تم سے ادھار کرنے سے بہتر ہے کیوں نہ میں اپنے پیٹ سے ادھار کرلوں، اس صبر کا اجر مجھے حشر کے دن بہت زیادہ ملے گا۔''

مرسلہ: تفسیر عباس بابر۔ اوکاڑہ

پھر جعفری بھی تیزی سے رخسار کے پیچھے قدم بڑھاتا چلا گیا۔ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی تو وہ اس نے جیب سے نکال کر کان سے لگایا۔ ''یس!''

دوسری طرف سے کوئی ایسی اطلاع دی گئی کہ اس کے چہرے سے تعجب کا اظہار ہوا۔

''بنگلے کی سخت نگرانی سخت کی جائے۔'' وہ رخسار کے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''زیادہ افراد کی ضرورت ہو تو اپنے ساتھیوں کو بلالو۔ پندرہ منٹ بعد میں تم سے پھر رابطہ کروں گا۔''

دوسری طرف سے کچھ سن کر اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

اس وقت آگے جاتی ہوئی رخسار اپنے موبائل پر کہہ رہی تھی۔ ''نہیں ڈیڈی!..... چچا جان کو ابھی اطلاع نہ دیں۔ ممکن ہے کہ صبح تک بابر کو آئی سی یو سے کمرے میں منتقل کردیا جائے۔ چچا جان وغیرہ اسی وقت یہاں آئیں تو بہتر ہے۔''

جعفری سمجھ گیا کہ رخسار اس وقت اپنے ڈیڈی ڈی آئی جی کیف ہمدانی سے بات کررہی تھی۔ جب اس نے رابطہ منقطع کیا تو جعفری اس کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔

رخسار کا خیال درست ثابت ہوا۔ دوسری صبح بابر کو ایک کمرے میں منتقل کردیا گیا۔ سیف ہمدانی کو اطلاع دے دی گئی۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ اسپتال پہنچ گئے۔

ڈاکٹر نے ایک وقت میں دو سے زیادہ افراد کو بابر کے

کمرے میں جانے کی اجازت نہیں دی اور ان سب کو صرف آدھا گھنٹا دیا۔ گویا دو دو افراد دس دس منٹ سے زیادہ نہیں مل سکتے تھے۔

ڈی آئی جی کیف ہمدانی رات گئے اسپتال کا ایک چکر لگا چکا تھا۔ اس وقت وہ پھر آ گیا تھا۔ وہ سیف ہمدانی کے ساتھ بابر کے کمرے میں گیا۔ دس منٹ بعد جب وہ نکل آئے تو عذرا بیگم اپنی بیٹی عنبر کے ساتھ گئیں۔ ان دونوں کے بعد رخسار کو جانا تھا۔ وہ رات بھر اسپتال ہی میں رہی تھی۔ جعفری رات کو چلا گیا تھا اور خالد کو بھی رخسار نے رخصت کر دیا تھا۔ ڈی آئی جی کیف ہمدانی گھر سے رخسار کا کوٹ لیتا آیا تھا کیونکہ صبح سردی کچھ بڑھ گئی تھی۔

''مجھے اب دفتر جانا ہے۔'' کیف ہمدانی نے رخسار سے کہا۔ ''تم بھی بابر سے مل کر اب گھر جا کے آرام کرنا۔ رات بھر کی جاگی ہوئی ہو۔''

''جی ڈیڈی!''

کیف ہمدانی چلا گیا۔ رخسار نے کوٹ پہن لیا تھا اور ٹھنڈ سے بچ کر آسودگی محسوس کی تھی۔ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف جعفری تھا۔

''کیا پوزیشن ہے؟'' اس نے پوچھا۔

رخسار نے اسے صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ ''اب بابر سے ملنے کے بعد میں گھر جاؤں گی۔''

''ابھی آپ اسپتال میں رکیں۔ میں پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔''

''بابر کا بیان.....''

''نہیں۔'' جعفری نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں ڈاکٹر سے بات کر چکا ہوں۔ بیان لینے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ ڈاکٹر سے مجھے اجازت نہیں ملی۔ بابر کا بیان کل صبح لیا جا سکے گا۔''

''تو پھر آپ کیوں آ رہے ہیں؟''

''آپ ہی سے کچھ کام ہے۔''

''مجھ سے؟''

''ہاں۔ میں نے ابھی تک اس معاملے کے اہم کردار شوکت باجوہ سے ملاقات نہیں کی ہے۔ اب اس سے ملنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔''

''میری کیا ضرورت ہے؟'' رخسار الجھ گئی۔

''وہاں آ کر ہی بتاؤں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' رخسار نے جلدی سے رابطہ منقطع کر دیا کیونکہ اس نے عذرا بیگم اور عنبر کو بابر کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

✈✈✈

پندرہ منٹ بعد جعفری وہاں پہنچ گیا۔ رخسار نے اسے ہدایت دی۔ سیف ہمدانی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ جا چکے تھے۔ جعفری کے محکمے کا ایک آدمی اور تھا۔

''تم میری کار لے کر پیچھے آؤ۔'' جعفری نے اس سے کہا، پھر رخسار سے کہا۔ ''میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

رخسار کی کار رات سے اسپتال ہی میں تھی۔

ذرا دیر بعد اس کی کار اسپتال کے احاطے سے نکلی۔ جعفری ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔

رخسار نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ میری الجھن ختم کر دیں تو اچھا ہے۔ آپ مجھے اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟''

''کیا بابر صاحب کی وجہ سے آپ کو اس معاملے سے دلچسپی نہیں؟''

''دلچسپی تو یقیناً ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ باجوہ سے ملنے جا رہے ہیں تو مجھے خود یہ خواہش ہوتی کہ آپ کے ساتھ جاؤں اور دیکھوں کہ شوکت باجوہ کی گفتگو سے کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ اب براہ راست اس سے بھی پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہوں گے۔ مجھے الجھن یہ ہے کہ آپ نے مجھے ساتھ لے جانا کیوں ضروری سمجھا۔''

''رات کو مجھے ایک ایسی ہی اطلاع ملی تھی کہ اب شوکت باجوہ سے ملنا ضروری ہو گیا ہے۔ جو غیر ملکی میری نظر میں آ چکے ہیں، ان میں سے دو آدمی ایک ڈاکٹر کو اغوا کر کے شوکت باجوہ کے گھر لے گئے تھے۔''

رخسار چونکی۔

جعفری نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ڈاکٹر کو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر شوکت باجوہ کے بنگلے میں لے جایا گیا تھا۔ بعد میں اسے واپس اس کے گھر بھی چھوڑا جا چکا ہے۔ واپسی میں بھی ڈاکٹر کی آنکھوں پر پٹی رکھی گئی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے.....'' رخسار تیزی سے بولی۔

''جی ہاں۔'' جعفری نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ ''آپ نے بتایا تھا کہ پارکنز کا ہاتھ آپ کی چلائی ہوئی گولی سے زخمی ہوا تھا۔ اسی لیے مجھے خیال آیا کہ پارکنز ہی کی ڈریسنگ کروانے کے لیے ڈاکٹر کو اغوا کیا گیا ہوگا۔ رات بھر شوکت باجوہ کے گھر کی کڑی نگرانی کی گئی ہے۔ کسی کو وہاں سے جاتے نہیں دیکھا گیا۔ اس کا مطلب

ہے کہ پارکنز اب بھی وہیں ہے۔ اس سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پارکنز کی سکونت صرف اس بنگلے میں تھی جہاں وہ بابر صاحب کو لے گیا تھا۔ اب چونکہ وہ بنگلا اس کے لیے مخدوش ہو چکا ہے اس لیے اس نے دوبارہ وہاں جانا خطرناک سمجھا ہوگا۔''

''وہ اپنے ساتھیوں میں سے بھی کسی کے گھر جا سکتا تھا۔'' رخسار بولی۔

''ہاں، لیکن مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ اس نے شوکت باجوہ ہی کے گھر میں پناہ لی ہے۔ جب تک اس کا ہاتھ ٹھیک نہیں ہو جاتا، وہ وہیں رہے گا یا اس دوران میں اس کے ساتھی اس کے لیے کسی دوسری جگہ کا بندوبست کر لیں گے۔''

''آپ مجھے اس لیے لے جا رہے ہیں کہ میں پارکنز کو پہچان سکتی ہوں؟''

''جی.....'' جعفری نے کہا۔ ''اسے آپ یا بابر صاحب ہی شناخت کر سکتے ہیں۔''

رخسار نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بولی۔ ''اگر پارکنز وہیں ہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ شوکت باجوہ نادانستگی میں ان غیر ملکیوں کا آلۂ کار نہیں بن رہا ہے۔''

''ظاہر ہے۔'' جعفری نے کہا، پھر بولا۔ ''ایک اور وجہ سے بھی مجھے یقین ہے کہ پارکنز وہیں ہوگا۔ جو چار افراد میری نظر میں آ چکے ہیں، ان کے موبائل فون برابر ٹریس کیے جا رہے ہیں۔ ان دونوں کو ہدایت ملی تھی کہ رات کو وہ گردیزی کے گھر میں گھسیں اور ہر صورت میں اس کے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک نکال لائیں۔''

رخسار نے بے اختیار ایک طویل سانس لی۔ ''ہارڈ ڈسک۔''

''ہاں۔'' جعفری خفیف سا مسکرایا۔ ''وہ بابر صاحب کے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک کے لیے بھی پریشان رہا تھا جو اسے نہیں مل سکی لیکن گردیزی کے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک رات کو اس کے آدمی نکال کر لے گئے۔ میں اس میں رکاوٹ بھی نہیں بنا۔ بس ان دونوں آدمیوں کی نگرانی جاری رہی۔ وہ دونوں بھی شوکت باجوہ کے گھر گئے تھے۔ ہارڈ ڈسک انہیں پارکنز کو دینا ہوگی۔''

''تو وہ دونوں بھی وہاں ہو سکتے ہیں۔''

''نہیں۔'' جعفری نے جواب دیا۔ ''وہ دو چار منٹ بعد ہی باجوہ کے گھر سے چلے گئے تھے۔''

''اگر پارکنز وہاں مل گیا تو شوکت باجوہ کی گردن بھی پوری طرح پھنس جائے گی۔''

ڈسپلن

چوہوں کا انسانی زندگی میں اہم رول ہے۔ یہ چوہوں کا انکسار ہے کہ وہ جنگوں میں آزادی سے گھومنے کے بجائے ہمارے گھروں میں گھسنے اور بلوں میں گھسنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بعض جانور دل میں گھر کر جاتے ہیں جبکہ چوہے گھر میں بل کر جاتے ہیں۔ انسان پر دواؤں اور جراحی کے تجربے کرنے سے پہلے چوہوں کی ہی چیر پھاڑ کی جاتی ہے۔ گویا دونوں ایک سی صفات کے حامل ہیں۔ انسان تو انسان، بلی بھی مرے ہوئے چوہے کو نہیں بخشتی۔ اسے اچھال اچھال کر اپنے بچوں کو جھپٹنے پلٹنے، پلٹ کر جھپٹنے کی مشق کراتی ہے لیکن وہ بڑے ہو کر سب سبق بھول جاتے ہیں اور تمام عمر خواب میں چھچھڑے ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ کہاں گئیں وہ بلیاں، چوہے کو دیکھ کر جن کی رگِ ہلاکت، پھڑکتی تھی؟ دوسری طرف چوہے بھی اپنے بچوں کو بلی سے بچنے اور اسے چکما دینے کے گر سکھاتے ہیں لیکن وہ بھی بڑے ہو کر بلی کو چکما دینے کے بجائے اس کی چمکتی آنکھوں میں اپنی بجھتی آنکھیں ڈال کر پلیٹنج کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا پہلے ہی دن بلی مارنا چاہتے ہوں۔

چوہوں کی ایک عادت ہمیں پسند نہیں کہ ان کے ہاں ڈسپلن نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جتنا کھاتے ہیں اس سے کہیں زیادہ خانہ خرابی کرتے ہیں اور جب ان 'کھانا خرابوں' کی چوری پکڑی جاتی ہے تو بوکھلاہٹ میں یہ آگے پیچھے نہیں دیکھتے۔ بندوق کی گولی کی طرح سٹ سٹ چھوٹتے ہیں۔ بندوق کی گولی تو کم از کم لحاظ رکھتے ہوئے نشانے کے آس پاس سے گزر جاتی ہے، لیکن یہ جس سے بچنا چاہتے ہیں اُسی کی ٹانگوں میں آ جاتے ہیں۔ ڈسپلن تو چیونٹیوں کے ہاں ہوتا ہے۔ چاہے کچھ ہو جائے، وہ اپنی ترتیب بگڑنے نہیں دیتیں۔ اس ڈسپلن کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے، جس کی توقع چوہوں سے نہیں کی جا سکتی۔

نادر خان سرگروہ کی کتاب
''باادب بامحاورہ ہوشیار'' سے اقتباس

''اگر کی بات نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ پارکنز وہیں ہوگا۔''

اس گفتگو کے دوران میں جعفری ہاتھ کے اشارے سے راستوں کے بارے میں بتاتا رہا تھا کیونکہ رخسار، باجوہ کے گھر سے واقف نہیں تھی۔

کار جب شوکت باجوہ کے گھر میں داخل ہو رہی تھی، اس وقت جعفری نے رخسار کو یہ بھی بتایا کہ وہ فون پر شوکت باجوہ کو بتا چکا تھا کہ وہ ایک خاص معاملے میں پوچھ گچھ کرنے کے لیے اس کے گھر آ رہا ہے۔

رخسار بولی۔ ''وہ پریشان تو ہوا ہوگا۔''

''ہونا چاہیے، لیکن بات کرتے ہوئے اس نے خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی تھی اور تعجب کا اظہار بھی کیا تھا کہ میرے محکمے کو اس سے آخر کس قسم کی پوچھ گچھ کرنا ہے۔'' جعفری نے جواب میں کہا۔ ''میں نے اس سے کہا تھا کہ یہ میں اسے ملاقات پر ہی بتا سکوں گا۔''

رخسار نے برآمدے کے قریب کار روک دی اور جعفری کے ساتھ اتری۔

شوکت باجوہ نے ایک ملازم کے ذریعے ان دونوں کو فوراً ڈرائنگ روم میں بلوالیا۔

''تشریف رکھیے!'' اس نے غور سے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی رعونت سے کہا۔ ''میں حیران ہوں کہ آپ کے محکمے کو اچانک مجھ سے کیا دلچسپی ہوگئی۔''

''کچھ ایسے ہی حالات سامنے آئے ہیں باجوہ صاحب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے ایڈوائزر مسٹر بابر اس وقت کہاں ہوں گے۔''

''اپنے گھر پر ہوگا اور کہاں ہوگا۔''

''کیا وہ آپ کی خواہش کے مطابق ایک فرضی نام سے ایک اخبار میں کالم لکھتے رہے ہیں؟''

اس سوال پر شوکت باجوہ قدرے بے چین نظر آیا اور بولا۔ ''اگر ایسی کوئی بات ہے تو میرے علم میں نہیں ہے۔''

''آپ کے علم میں غالباً یہ بھی نہیں ہوگا کہ ایک مغربی طاقت سیاست کے میدان میں آپ کو ایک قدآور شخصیت بنانا چاہتی ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ!'' شوکت باجوہ نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہنے کی کوشش کی۔ ''کس نے حق دیا ہے آپ کو کہ مجھ سے اس قسم کی باتیں کریں؟''

جعفری کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ جعفری نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کال ریسیو کی۔ ''ہاں، بولو!''

رخسار قریب ہی بیٹھی تھی۔ اس نے دوسری طرف سے بولنے والے کی مدھم آواز سنی۔ ''رینجرز آ گئے ہیں سر!''

''ٹھیک ہے۔ میں نے یہی وقت دیا تھا۔''

فوراً دوسری طرف سے پھر کہا گیا۔ ''میجر صاحب میرے قریب کھڑے ہیں اور آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''کراؤ بات!'' جعفری نے کہا۔

اب دوسری طرف سے ایک نئی آواز سنائی دی۔ جعفری نے اس سے کہا۔ ''آپ سب تیزی سے اندر آ جائیں اور بنگلے کے گرد پہرا بھی کڑا رہے۔ چڑیا کا ایک بچہ بھی یہاں سے نہیں نکلنا چاہیے۔''

شوکت باجوہ تیزی سے کھڑا ہوا۔ ''کیسی باتیں ہو رہی ہیں یہ!''

جعفری نے موبائل اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میری اطلاع کے مطابق کل رات ایک ڈاکٹر کو اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ کل رات ہی غیر ملکی جاسوسوں میں سے ایک زخمی ہو کر فرار ہوا تھا۔ مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ اس کے ہاتھ کی ڈریسنگ کرانے ہی کے لیے ڈاکٹر کو اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا۔''

''بکواس ہے یہ سب!'' شوکت باجوہ گرجا۔ ''کوئی غیر ملکی نہیں ہے میرے گھر میں۔''

''خاصا بڑا گھر ہے آپ کا۔'' جعفری نے سکون سے کہا۔ ''تلاشی لینے میں خاصا وقت لگ سکتا ہے۔''

''مذاق ہے کوئی!'' شوکت باجوہ بہ دستور بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں کسی کو یہ اختیار نہیں دے سکتا کہ وہ میرے گھر کی تلاشی لے۔''

''سرچ وارنٹ لے کر آیا ہوں میں باجوہ صاحب!'' جعفری نے جیب سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔

رخسار اس دوران میں کچھ نہیں بولی تھی لیکن پوری طرح شوکت باجوہ کی طرف متوجہ رہی تھی۔

سرچ وارنٹ دیکھنے کے بعد وہ شوکت باجوہ نے غصے سے ایک طرف پھینکا اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولا۔ ''پچھتاؤ گے تم! میرے گھر میں تمہیں کوئی غیر ملکی نہیں ملے گا۔''

''کیا کوئی خفیہ تہ خانہ بھی ہے یہاں؟'' جعفری نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

شوکت باجوہ اسے گھورتا رہ گیا۔ اسی وقت وزنی جوتوں کی دھمک تیزی سے قریب آتی چلی گئی۔

''تمام ملازمین کو گھر سے باہر نکال کر اپنے آدمیوں کی تحویل میں دے دیں۔'' جعفری نے میجر سے کہا۔ ''اور اس

گھر کے ایک ایک چپے کی تلاشی لیں۔''

رخسار کو اس کا علم بعد میں ہوا کہ شوکت باجوہ کی جو ایک جاگیر تھی، وہیں اس کی ایک حویلی بھی تھی۔ اس کے بیوی بچے اسی حویلی میں رہتے تھے۔

رینجرز بنگلے میں پھیل گئے۔ صرف دو اہلکار ڈرائنگ روم ہی میں رکے تھے اور اپنے اسلحے کے ساتھ پوری طرح مستعد تھے۔

''یہاں میرے علاوہ کوئی نہیں ہے، تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا آفیسر!'' شوکت باجوہ نے جعفری کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ معاملہ بہت اوپر تک لے جاؤں گا۔''

''آسمان تک لے جانا۔'' جعفری نے بے پروائی سے کہا اور کھڑے ہو کر رخسار سے بولا۔ ''آپ یہیں بیٹھیں!''

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''رینجرز کو صرف اتنا معلوم ہے کہ انہیں یہاں کسی غیر ملکی کو تلاش کرنا ہے۔ میں یہ بھی چیک کرتا ہوں کہ یہاں کوئی خفیہ تہ خانہ بھی ہو سکتا ہے۔''

ذرا دیر پہلے بھی جعفری کی زبان پر تہ خانے کا ذکر آ چکا تھا لیکن اس مرتبہ رخسار نے محسوس کیا کہ اس بار شوکت باجوہ قدرے بے چین نظر آیا تھا۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے اس نے عجیب انداز میں پہلو بدلا تھا۔ رخسار غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

بنگلے میں وزنی جوتوں کی دھمک ادھر سے ادھر پھیلتی رہی۔ ملازمین کو بنگلے کے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ وہ سب بہت خوف زدہ نظر آ رہے تھے۔

آدھے گھنٹے کے قریب گزر چکا تھا کہ رخسار نے یکایک اپنا موبائل سنبھالا اور اس پر کوئی پیغام ٹائپ کرنے لگی۔ شوکت باجوہ جواب تک رخسار کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے رہا تھا، ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ رخسار کیا کر رہی تھی۔

رخسار نے پیغام ٹائپ کر کے جعفری کے موبائل نمبر پر بھیج دیا اور بے تعلقی سے فرش کی طرف دیکھنے لگی۔

رینجرز کے دونوں اہل کار اس وقت بھی پوری طرح مستعد تھے۔

پانچ منٹ اور گزرے تھے کہ تلاشی لینے والے رینجرز واپس آنا شروع ہوگئے۔ اب ان کا رخ بیرونی دروازے کی طرف تھا۔ ان سب کے بعد میجر اور جعفری ڈرائنگ روم میں آئے۔

''مل گیا غیر ملکی؟'' شوکت باجوہ نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے تھے مسٹر باجوہ!'' جعفری نے کہا اور شوکت باجوہ کے صوفے کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''یہاں تمہارے علاوہ کوئی نہیں ہے۔''

''تو سوچ لو کہ اب تمہیں اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا۔''

''آپ کا ایس ایم ایس مجھے مل گیا تھا رخسار!'' جعفری ٹہلنے کے سے انداز میں اس صوفے کے عقب میں چلا گیا جس پر شوکت باجوہ بیٹھا ہوا تھا۔

رخسار سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

جعفری بولا۔ ''میں آپ کا ایس ایم ایس ملنے کے بعد فوراً یہاں آتا لیکن تھوڑی سی مصروفیت تھی، خیر!..... اب میں آپ کے مشاہدے کی حقیقت جان لوں گا۔ ممکن ہے آپ کا شک درست ہو۔ آپ کو مسٹر باجوہ اور پارکنز میں مشابہت نظر آئی ہے نا اور آپ کو ان کی چادر کے نیچے ایک زخمی ہاتھ کی جھلک بھی نظر آئی تھی لہٰذا.....''

شوکت باجوہ چونکا لیکن اس کے کسی بھی ردعمل سے پہلے جعفری نے ایک جھٹکے سے وہ شال کھینچ لی جو شوکت باجوہ اوڑھے ہوئے تھا۔

شال میں چھپا ہوا شوکت باجوہ کا دایاں ہاتھ سامنے آ گیا جو گردن میں پڑی ہوئی پٹی میں تھا۔ اس ہاتھ پر ڈریسنگ بھی نظر آ رہی تھی۔

رخسار بے اختیار کھڑی ہوگئی۔ وہ جو اتنی دیر سے اسے بہ غور دیکھ رہی تھی اور اچانک چھپے ہوئے ہاتھ پر نگاہ پڑ گئی تھی۔ اسے شک گزرا تھا کہ یہی پارکنز ہے۔ شوکت باجوہ کا چہرہ فق پڑ چکا تھا۔

''اب میں تمہیں کس نام سے مخاطب کروں؟'' جعفری نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مسٹر باجوہ یا مسٹر پارکنز؟''

ابتدائی ذہنی جھٹکے سے باہر آتے ہی باجوہ تیزی سے کھڑا ہوگیا۔ نہ جانے کہاں سے اس نے ریوالور بھی نکال لیا تھا۔ اس کی یہ حرکت اضطراری تھی۔ اس نے سوچا نہیں تھا کہ وہاں رینجرز کے دو اہلکار موجود تھے مگر ان اہلکاروں سے پہلے ان کے میجر نے ریوالور سے گولی چلا کر باجوہ کی ٹانگ زخمی کر دی۔

باجوہ ایک کراہ کے ساتھ گرا۔ ریوالور اب بھی اس کے

ہاتھ میں تھا لیکن دوسرے پل وہ اس سے محروم ہوگیا کیونکہ جعفری نے اس کے ہاتھ پر بہت زور سے ٹھوکر ماری تھی۔

باجوہ جہاں گرا تھا، وہیں پڑا رہ گیا۔ زخمی ٹانگ کی وجہ سے اس کے لیے کھڑا ہونا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کا ڈریسنگ کیا ہوا ہاتھ بھی گردن سے لٹکی پٹی سے نکل کر فرش سے ٹکرا گیا تھا۔ اذیت اس کے چہرے پر صاف دکھائی دی تھی لیکن اس نے دانت بھینچ کر خود کو کراہنے سے بھی باز رکھا تھا۔

میجر نے دونوں اہلکاروں کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔ ''اب اگر یہ کوئی غلط حرکت کرے تو گولیوں سے اس کی ٹانگیں چھلنی کر دینا۔''

رخسار نے جعفری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کو دیکھتے ہی مجھے خفیف سا احساس ہوا تھا کہ یہ پارکنز سے مشابہت رکھتا ہے۔ اگر اس کے چہرے پر گل مچھے اور بال بڑے بڑے اور بھورے ہوں تو اس میں اور پارکنز میں صرف آنکھوں کی رنگت کا فرق رہ جائے گا۔''

''گل مچھے تو یہ رہے۔'' جعفری نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک ماسک نکال کر دکھایا جس میں بھورے رنگ کے گل مچھے لگے ہوئے تھے۔

''بالوں کے لیے یہ وگ استعمال کرتا ہوگا۔'' جعفری نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''یہ مجھے ایک کمرے سے ملے ہیں جو اس کا بیڈروم ہوسکتا ہے۔ وگ بھی وہیں کہیں مل جائے گی۔ وہاں سے مجھے وہ ہارڈ ڈسک بھی مل گئی ہے جو کل رات گردیزی کے گھر سے چوری کی گئی ہے۔ رینجرز ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ میں اسی خیال سے تلاشی کی مہم میں شامل ہوا تھا۔''

''مگر اس کی آنکھوں کا رنگ؟''

''یہ کنٹیکٹ لینس ہوسکتے ہیں۔''

میجر آگے بڑھا اور فرش پر پڑے ہوئے باجوہ پر جھکا۔ اسی نے تصدیق کی کہ باجوہ لینس لگائے ہوئے تھا۔

''لیکن یہ شوکت باجوہ ہے یا پارکنز؟'' رخسار بولی۔

جعفری نے سوالیہ نظروں سے باجوہ کی طرف دیکھا تو باجوہ نے اپنے ہونٹ سختی سے بند کر کے گویا اشارہ دیا کہ وہ کچھ نہیں بتائے گا۔

''زبان تو تمہارے فرشتے بھی کھولیں گے۔'' جعفری نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے حقارت سے کہا۔ وہ اس وقت اپنے موبائل پر کسی سے رابطہ کر رہا تھا۔

''اب اس کا کیا کرنا ہے سر؟'' میجر نے جعفری سے پوچھا۔

اب شوکت باجوہ کی صرف ٹانگ سے ہی نہیں، دائیں ہاتھ سے بھی خون بہنے لگا تھا۔ اس کی بینڈیج کھل گئی تھی، خون فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔

''ایمبولینس منگوائیے!'' جعفری نے اسے جواب دیا اور پھر موبائل پر کسی سے کہا۔ ''اب ان چاروں کو گرفتار کرلو۔ پانچواں میرے ہاتھ لگ چکا ہے۔''

''آپ اب جائیں۔'' جعفری نے موبائل اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے رخسار سے کہا۔ ''رات بھر کی جاگی ہوئی ہیں۔ جا کر آرام کریں۔ مجھے تو ابھی یہاں خاصا وقت لگے گا۔''

رخسار کو اس دن شام کو موبائل پر جعفری سے معلوم ہوسکا کہ جسے گرفتار کیا گیا تھا، وہ پارکنز ہی تھا۔ چار دوسرے جاسوسوں کے ساتھ اسے یہاں بھیجا ہی اس لیے گیا تھا کہ وہ شوکت باجوہ سے حیرت انگیز طور پر مشابہت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اصل شوکت باجوہ کو اغوا کر کے ہلاک کر دیا تھا اور اس کی لاش ایک گٹر میں بہا دی تھی۔

دوسرے مقامی لوگوں سے رابطہ رکھنے کے لیے وہ گل مچھوں والا ماسک استعمال کرتا تھا۔

''بابر کے معاملے میں کیا رہے گا!'' رخسار نے پوچھا۔

''ان کا بیان میں کل لے سکوں گا لیکن اندازہ تو آپ بھی لگا سکتی ہیں کہ اس مقدمے میں ان کے خلاف کوئی شدید کارروائی غالباً ممکن نہیں ہوگی۔''

جعفری کی اس بات سے رخسار کو اتفاق تھا۔

دوسرے دن دوپہر کو رخسار اپنے والد کے ساتھ اسپتال میں بابر سے باتیں کر رہی تھی۔ سیف ہمدانی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ وہاں پہنچنے والے تھے۔

''بابر!'' ڈی آئی جی کیف ہمدانی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تمہیں اپنے ملک کے سیاست دانوں سے سخت اختلاف ہے لیکن تمہیں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جو تمہارے ملک کے لیے نقصان کا سبب بن جائے۔''

بابر نے نظریں جھکا لیں۔ رخسار خفیف سا مسکرا رہی تھی۔

''اور.....'' ڈی آئی جی نے کہا۔ ''میری بیٹی کو تو اس سے کوئی غرض ہی نہیں کہ تم دولت مند ہو یا نہیں!''

بات بالکل صاف تھی، رخسار جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب گئی اور اس کا پردہ درست کرنے لگی۔